''اب کیا گھر جاؤ گے؟'' بخشی نے پوچھا

''ہاں''

''تمہیں چھوڑ آئیں؟''

''نہیں میں چلا جاؤں گا'' ایلی بولا

''اچھی بات ہے'' بخشی نے کہا

''تم ذرا بیٹھو میں بل دے دوں'' بخاری نے کہا

''میرے پاس ہیں'' ایلی نے اپنی جیب کی طرف اشارہ کیا ''میرے پاس ہیں''

''نہیں میں دوں گا'' بخاری نے مسکرا کر کہا

پھر بخاری نے بخشی کو اشارہ کیا ''ذرا ادھر آنا'' اور وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔

ایلی کی نگاہوں میں اب چیزیں اور ان کا مفہوم ابھر رہا تھا اور وہ شرمندگی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد بخشی اور بخاری دونوں واپس آ گئے ''چلو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے'' بخاری نے کہا

''نہیں نہیں'' ایلی نے کہا ''آپ تکلیف نہ کریں''

''نہیں'' بخاری نے کہا ''ہم ادھر ہی جا رہے ہیں''

''اچھا'' ایلی لاجواب ہو گیا اور تینوں چل پڑے

جب وہ نانو گھر کے مقابل میں پہنچے تو دفعتاً ایلی کو یاد آیا اور وہ دیوانہ وار اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔

''کچھ کھو گیا ہے کیا؟'' بخاری نے پوچھا

''ہوٹل میں تم نے ایک کاغذ اس جیب میں ڈالا تھا'' بخاری نے یہ کہتے ہوئے ایلی کے کوٹ کی اوپر والی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ نکالا۔

''یہی ہے نا؟'' بخاری نے ایلی سے پوچھا

ایلی نے دیوانہ وار اسے کھولا۔ دیکھا اور پھر کہنے لگا "ہاں یہی ہے" اس کی آنکھیں جذبہ شکر گزاری سے پرنم ہو گئیں۔

"اچھا تو ہم کل صبح آئیں گے" بخاری نے کہا "کہیں چلے نہ جانا ہمارے آنے سے پہلے"

"نہیں تو" وہ بولا "میں کہاں جاؤں گا"

اگلے روز صبح سویرے ہی بخشی اور بخاری آ گئے۔

"آج تو طبیعت اچھی معلوم ہوتی ہے" بخاری نے بات شروع کی۔

"جی ہاں" ایلی نے جواب دیا

"کل کیا ہوا تھا؟" بخاری نے پوچھا

"کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا" ایلی نے جواب دیا

"تو کہاں گھوم رہے تھے تم؟"

"بس گھوم رہا تھا"

"کسی کام سے نکلے تھے کیا؟"

"نہیں تو ویسے ہی یہاں بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرا گئی تھی۔ جدھر منہ اٹھایا چل پڑا" ایلی نے ہنسنے کی کوشش کی۔

"آج تو نہیں گھبرا رہی طبیعت؟"

"نہیں تو" وہ ہنسنے لگا "آج تو کوئی ایسی بات نہیں"

"کل کیا بات تھی؟" بخشی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا

شاید ہم کچھ مدد کر سکیں بخاری نے کہا

"بات تو کوئی نہیں" ایلی نے جواب دیا

"تو اس بات کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"کس بات کے متعلق؟" ایلی نے پوچھا

''سوموار کو دو بجے'' اس نے حیرت سے بخاری کی طرف دیکھا پھر دفعتاً اسے یاد آیا۔

''ارے یعنی میرا مطلب ہے یعنی میرا'' ایلی گھبرا گیا

''دیکھو بھائی الیاس!'' بخشی مسکرایا اس کی مسکراہٹ بڑی تسلی بخش تھی'' بات یہ ہے ہم نے وہ خط پڑھ لیا ہے۔''

''خط؟''

''تم نے خود ہی تو دیا تھا ہمیں چائے کی دوکان میں'' بخاری مسکرانے لگا

''میں نے؟''

''گھبراؤ نہیں تمہارا راز ہمارے پاس محفوظ رہے گا'' بخاری نے اسے تسلی دی

ایلی سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

''تمہیں اس لڑکی سے محبت ہے کیا؟'' بخاری نے پوچھا

''محبت؟ مجھے معلوم نہیں'' ایلی نے جواب دیا

''ہوں''

''تو کیا تم دو بجے وہاں جاؤ گے؟''

''ہاں مجھے جانا ہی ہوگا''

''کیوں کوئی مجبوری ہے کیا'' بخشی نے پوچھا

''نہیں تو'' ایلی نے جواب دیا

''تو پھر جانا ہی ہوگا کیوں؟'' بخاری نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں اسے دھوکہ نہیں دے سکتا'' ایلی نے جواب دیا ''اور اگر میں نہ گیا تو؟''

''تو کیا؟'' بخاری نے پوچھا

''تو وہ ورنہ'' ایلی نے وضاحت کرنے کی کوشش کی

''ورنہ؟''

"ہاں" اس نے لکھا ہے ضرور آنا ورنہ

"ورنہ تو یہ ہمیشہ ہی لکھتی ہیں" بخاری ہنسنے لگا

"نہیں" ایلی بولا "تم اسے نہیں جانتے میں اسے جانتا ہوں اور اس کے ورنہ کو بھی"

"ہوں" وہ خاموش ہو گئے۔

"ایلی اس برا نہ مانو تو میں پوچھوں کہ وہ کون ہے؟" بخاری نے پوچھا

"کون ہے؟ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون ہے؟" ایلی نے جواب دیا

"میرا مطلب ہے کس گھرانے سے ہے؟" بخاری نے پوچھا

"میں نہیں جانتا مجھے اس کا علم نہیں" ایلی نے جواب دیا

بخشی اور بخاری نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا "اس کے رشتے داروں کے متعلق" بخشی نے پوچھا

"مجھے نہیں معلوم؟" ایلی نے بخشی کی بات کاٹ دی۔

"اچھا" وہ سوچ میں پڑ گئے "تعجب کی بات ہے" کچھ دیر تک وہ خاموش رہے

"تو کیا تمہارا فیصلہ اٹل ہے؟" بخاری نے پوچھا

"ہاں میں جاؤں گا" ایلی نے جواب دیا "مجھے جانا ہی ہوگا"

"اس کے نتائج سوچے ہیں تم نے؟"

"نہیں مجھے نتائج کی پروا نہیں"

"اوہ"

"تمہارے پاس کوئی جگہ ہے جہاں اسے لے جاسکو؟"

"نہیں"

"کوئی بھی نہیں"

"اونہوں"

"روپے کا انتظام ہے؟"

ایلی ہنس پڑا "میرے پاس روپیہ کہاں"

"کوئی دوست ہے؟"

"اونہوں"

کچھ دیر تک وہ خاموش رہے بخشی کی آنکھوں میں غم کی گھٹائیں چھائے جا رہی تھیں۔ بخاری کے ہونٹوں پر عجیب سا تبسم تھا۔

"اور اگر تم پکڑے گئے تو؟"

"پکڑا جاؤں گا اور کیا" ایلی نے کہا

"اور اگر لڑکی نے تمہارے خلاف بیان دے دیا پھر؟"

"نہیں" ایلی بولا

"نہیں کیا؟"

"وہ میرا ساتھ دے گی"

"تمہیں یقین ہے؟"

"ہاں"

"اور اگر"

"اونہوں" ایلی نے بخاری کی بات کاٹ دی "کوئی اگر مگر نہیں" کمرے پر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر کے بعد بخاری نے کہا "بھائی الیاس مجھے تم سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔"

"کیوں؟" ایلی نے پوچھا

"تم ان سوالات کا برا تو نہیں مان رہے"

"نہیں اب کیا ہے؟" وہ بولا

"اور اگر تم ہار گئے؟"

"تو کیا ہوا؟" ایلی نے کہا

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو"

"مجھے نہیں معلوم" ایلی نے کہا "اگر مجھے وہ نہ ملی تو میں محسوس کروں گا جیسے میں نے کچھ کھو دیا ہو"

"اچھا" بخشی نے کہا "ابھی تو دو دن باقی ہیں آج ہفتہ ہے نا"

"اچھا" ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ابھی دو دن باقی ہیں۔

"اگر تم ہمیں سارا قصہ سنا دو تو کوئی حرج ہے؟" بخاری نے پوچھا

"اب کیا ہے؟" ایلی نے کہا "لیکن جاہ کو پتہ نہ چلے"

"اچھا تو کل ہم پھر آئیں گے۔ شاید کچھ ہو سکے"

"بھگوان کرے" بخشی بولا اور وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

اگلے روز وہ دونوں اسے باغ میں لے گئے اور وہاں بیٹھ کر ایلی نے مختصر طور پر موٹے موٹے واقعات انہیں سنا دیئے اور ان کی خواہش پر واپسی پر سفید منزل انہیں دکھا دی۔

اللہ ہو اکبر

بخشی اور بخاری سے مل کر ایلی کو کافی تسلی ہو گئی۔ حالانکہ انہوں نے اس کی امداد کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ لیکن بخشی اور بخاری دو عجیب شخصیتیں تھیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اپنوں کے پاس ہو۔ بخاری کی باتیں تلخ تھیں۔ لیکن اس کے خشک رویہ سے محبت اور ہمدردی گویا رِستی تھی۔ بخشی کی باتیں مٹھاس بھری تھیں اور وہ یوں جذبات سے سرشار رہنے کا عادی تھا۔ جیسے بھیگا ہوا کبوتر ایلی نے عجیب سے تسلی محسوس کی تھی۔ نہ جانے کیسے ایلی کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ دوستوں سے گھرا ہوا ہے۔ پکڑے جانے یا قید ہو جانے کے فکر سے تو ایلی آزاد تھا۔ بلکہ ویسے ہی جیسے اس روز سلگتے ہوئے سگریٹ کے لئے وہ سادی کے زینے میں پانچ گھنٹے

بیٹھا رہا تھا۔ البتہ اسے ایک ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سوموار کو رات کے دو بجے مقررہ جگہ پہنچ نہ سکے۔ گویا اس وقت اس کا مقصد حیات صرف یہ تھا کہ رات کے دو بجے وہاں پہنچ جائے اس کے بعد کیا ہوگا۔ کیسے ہوگا اس کے متعلق اس نے کچھ نہ سوچا تھا۔ وہ اس کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بعد چاہے کچھ ہو جائے پڑا ہو۔

سوموار کے روز بخشی اور بخاری دونوں بار بار ایلی کے پاس آئے اور اسے موہوم سے تسلی دے کر پھر چلے گئے۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتظامات میں مصروف ہیں۔ ایلی کے پاس آ کر بھی وہ الگ ہو کر آپس میں بحث کرتے لڑتے جھگڑتے اور پھر کہیں چلے جاتے۔

شام کے وقت وہ دونوں ایلی کو باہر لے گئے۔

پارک میں پہنچ کر وہ ایک بنچ پر بیٹھ گئے بخاری نے ایلی کے دونوں شانے پکڑ لئے۔

”دیکھو بھائی جو کچھ ہم سے ہو سکا ہم نے کر دیا ہے۔ اب غور سے سن لو اور اچھی طرح سمجھ لو۔ رات کو تم اکیلے جاؤ گے لیکن ہم تمہارے بالکل قریب ہوں گے۔ فکر نہ کرنا۔ اگر کوئی مشکل پڑی تو۔“

اگر بات بن گئی تو تم اسے لے کر ادھر گھر کی طرف نہ آنا بلکہ اس سے متضاد سمت کی گلی سے ہوتے ہوئے سڑک پر پہنچ جانا۔ سڑک وہاں سے چالیس پچاس قدم دور ہے۔ وہاں تمہارے لئے ایک موٹر کھڑی ہوگی یہ موٹر تمہیں سیدھی کراچی لے جائے گی۔ اگر تم کراچی بخیر و عافیت پہنچ گئے تو پھر اللہ مالک ہے

عین اس وقت قریب کی مسجد سے موذن للکارا ”اللہ اکبر“

ایلی کی نس نس میں ایک برقی رو سی دوڑ گئی اس نے پہلی مرتبہ حیرت سے بخشی بخاری کی طرف دیکھا اور محسوس کیا۔ جیسے وہ اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہوں جو اللہ

واسطے اس کی امداد کر رہے ہوں بے مقصد بے لاگ امداد اللہ اس کے دل میں پہلی مرتبہ ایک گونج سی پیدا ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں شدت تاثر سے آنسو آ گئے۔

"میں میں" ایلی نے شکر گزاری سے ان کی طرف دیکھا "یعنی" وہ بولا اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی بخاری ہنس پڑا "ہم یہ کام تمہارے لئے نہیں کر رہے" اس نے کہا "اس میں احسان مندی یا شکر گزاری کا کوئی موقعہ محل نہیں" بخاری نے ایک دبی دبی آہ بھری اور پھر گلو گیر آواز میں بولا "جو خود روشنی سے محروم کر دیئے گئے ہوں وہ دوسروں کو راہ دکھانے میں مسرت محسوس کرتے ہیں"

ایلی نے حیرت سے بخاری کی طرف دیکھا اس نے محسوس کیا جیسے اس کے پہلو وں ایک لا متناہی خلا ہو جسے دنیا کی تمام نعمتیں اور مسرتیں پر نہ کر سکتی ہوں۔ اللہ ہو اکبر موذن اذان ختم کر رہا تھا۔

اللہ ہو اکبر ایلی کے دل کی گہرائیوں سے آواز آئی۔ سامنے بخاری مسکرانے کی شدید کوشش کر رہا تھا قریب ہی بخشی کی آنکھوں میں بوندا باندی ہو رہی تھی۔

تمام تفصیلات سمجھ کر وہ دونوں ایلی کو سفید منزل کی طرف لے گئے اور عملی طور پر اسے سمجھانے لگے "یہ گلی ہے ادھر سے تمہیں آنا ہے۔ اس طرف کو۔ یہاں موٹر کھڑی ہوگی عین اسی جگہ اور ہم تمہارے ساتھ رہیں گے۔ پاس نہیں بلکہ قریب یہ نہ سمجھنا کہ تم اکیلے ہو۔"

تمام تفصیلات سمجھانے کے بعد جب وہ تاؤ گھر پہنچے تو ساڑھے نو بجے تھے۔ وہ سیدھے اور پر نیم چھتی کی طرف چل دیئے۔ تاکہ جاہ بھا اور پال کو ان کی آمد کا علم نہ ہو۔

حد ہو گئی

جب وہ نیم چھتی میں پہنچے تو دروازے میں جمال کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جمال کو دیکھ کر ایلی کا دل بیٹھ گیا۔ جمال کو دیکھتے ہی یہ احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا

کہ وہ مجرم ہے۔ اس نے جمال کو دھوکا دیا ہے۔ احساس گناہ سے اس کی گردن لٹک گئی۔

ایلی نے اس احساس سے مخلصی پانے کی شدید کوشش کی مگر نا کام۔ وہ احساس اس شدت سے اس پر طاری ہوا۔ کہ اس دباؤ سے میں ایلی کی شخصیت بہہ گئی وہ جمال کے روبرو کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھ نہ سکتا تھا۔

پھر اس نے اپنا دل کڑا کر لیا۔ اور پتھر بن کر کھڑا ہو گیا اس ڈر کے مارے کہیں جمال کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے کے لئے منتیں کرنا شروع نہ کر دے۔

جمال ایلی کی طرف بڑھا" ایلی سب ٹھیک ہے نا؟"

ایلی نے اثبات میں سر ہلایا

"بخشی بخاری جی کیا حال ہے جاہ سے ملنے آئے تھے کیا" جمال نے ان سے بات کی

"ہاں" بخشی نے کہا اور پھر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

"ان کا حال سناؤ ایلی" اس نے اشارتاً پوچھا

"ٹھیک ہیں" ایلی نے کہا

"کوئی آیا تھا؟"

"نہیں"

"خط بھی نہیں؟"

"نہیں"

"پیغام؟"

"نہیں"

"تو بات ختم ہو گئی"

"ہاں"

جمال مایوس ہوگیا اور برساتی کے باہر کوٹھے پر ٹہلنے لگا

بخاری ایلی کے قریب تر ہوگیا ''یہ تمہارا ساتھی تھا؟''

''ہاں'' ایلی بولا

''ساتھی کو اپنے خلاف کر لینا دانشمندی نہیں''

ایلی خاموش رہا

''اسے بتا دینا چاہئے'' بخاری نے کہا

''لیکن میں میں کیسے بتاؤں''

''اس سے بات چھپی نہ رہ سکے گی'' بخاری بولا

''ہوں'' ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ جمال کے روبرو اقبال جرم کرے۔ کچھ دیر کے بعد جمال مڑا ''ایلی انہوں نے بلایا تو نہیں تھا؟''

''ہاں''

''بلایا تھا؟'' جمال نے دہرایا

''بلایا ہے'' ایلی نے جواب دیا

''کب؟''

''آج رات کے دو بجے''

''آج'' جمال کا چہرہ سرخ ہوگیا ''دو بجے'' حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا''

ہاں دو بجے۔''

''دفعتاً جمال نے محسوس کیا کہ وہ بخشی کے سامنے ہی باتیں کئے جا رہا ہے'' اوہ''

اس نے ان کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔''

''جمال بھئی'' بخاری نے پہلی مرتبہ جمال سے بات کی ''الیاس آج جا رہا ہے''

''جا رہا ہے کہاں؟''

"نہیں؟"

"تو پھر؟"

"ڈاک سے"

"اوہ ڈاک سے" جمال پھر مضطربانہ طور پر ٹہلنے لگا۔ پھر رکا "مگر مگر میں میں یعنی"

اس نے ملتجی نگاہوں سے لیلی کی طرف دیکھا۔

"ہاں" لیلی نے جواب دیا اور لفافے سمیت سادی کا خط جمال کی طرف بڑھا دیا۔

جمال نے جھپٹ کر وہ خط اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پتہ دیکھا پھر بے صبری سے رقعہ نکالا اور روشنی تلے کھڑا ہو کر اسے پڑھنے لگا۔

دیر تک وہ وہاں کھڑا رہا۔ نہ جانے کتنی مرتبہ خط پڑھا ہوگا۔ پھر گویا اس کے جسم کا تناؤ ٹوٹ گیا۔ بوجھ تلے گال ڈھلک گئے "حد ہو گئی" بالآخر اس نے مدھم آواز سے کہا "اچھا بھئی" وہ لیلی کے قریب آ گیا "تمہیں مبارک ہو" اس نے خط واپس دیتے ہوئے کہا۔

"جمال صاحب" بخاری نے کہا "آپ تو نہیں جانتے کیا وہ آئے گی؟"

"آئے گی؟" جمال نے دہرایا

"مطلب ہے کیا وہ بات کی پکی ہے۔" بخاری نے پوچھا

"مجھے نہیں معلوم" جمال بولا "لیلی کو معلوم ہے میں تو اسی کے سہارے" اس نے لیلی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ بخاری گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے بہت کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہو۔

"مجھے تو کچھ علم نہیں میں تو میں تو" جمال بولا "میں تو حیران ہوں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

بخاری بت بنا کھڑا تھا

لیلی کا دل ندامت سے بھیگا ہوا تھا۔

بخشی چپ چاپ خیمے سے جا رہا تھا۔

جمال کبھی سوچ میں پڑ جاتا کبھی سر لٹکا دیتا کبھی مسکرانے کی کوشش کرتا کبھی سر کھجاتا اور اپنے آپ سے کہتا ”حد ہو گئی“ پھر دفعتاً لیلی کی طرف دیکھ کر نہ جانے کیا ہوا بھاگ کر وہ لیلی سے لپٹ گیا۔

”لیلی تم کمال ہو۔ تمہارا جواب نہیں تم نے حد کر دی۔ تم ہمیشہ حد کرتے ہو۔ لیکن یار تم نے یہ کیسے کر دیا۔ مجھے بڑی خوشی ہے لیلی۔ بڑی خوشی ہے۔ مجھے تم پر یہی امید تھی“ جذبات کی شدت کی وجہ سے وہ رک گیا۔ لیلی کی گردن جھک گئی اس نے محسوس کیا جیسے وہ مجرم ہو۔

”آپ کو نہیں معلوم“ وہ بخشی بخاری سے مخاطب ہو کر کہنے لگا“ لیلی نے شیر مارا ہے۔ شیر ببر۔ آسمان کا تارہ توڑ لایا ہے۔ یہ جادوگر ہے جادوگر اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میں اس کے جادو سے واقف ہوں۔“

بخشی بخاری حیرت سے جمال کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”واہ“ جمال ہنسنے لگا“ وہ پیچھے ہٹنے والی نہیں وہ معمولی لڑکی نہیں“

”اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ کون ہے جو اسے روک سکے کون ہے جو اس کی طرف ہاتھ بڑھا سکے“ جمال ہنسنے لگا اس کی ہنسی میں ہسٹیریا کا عنصر تھا بخشی بخاری چپ چاپ کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

گھڑی نے بارہ بجائے۔

”اچھا تو“ جمال چلایا“ میرا دوست آج جا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا کیا کہتے ہیں وہ۔ ہاں سلامت روی۔ مجھے یاد نہیں رہا“ وہ بولا

”اچھا“ بخاری نے کہا“ وقت کم ہے۔ ہم ذرا موٹر والے کو دیکھیں جب تک تم تیاری کر لیں“

''تیاری'' یلی نے دہرایا ''میں کیا تیاری کروں گا؟''

''کوئی چیز وغیرہ''

''میرے پاس کچھ بھی نہیں''

''جمال صاحب آپ یلی کے ساتھ جائیں گے۔ میرا مطلب ہے صرف سے اڈے تک کے لیے''

بخاری نے کہا

''ہاں ہاں'' جمال چلانے لگا ''میں ساتھ جاؤں گا۔ میں اس کا ساتھی ہوں۔ اس نے میرا ساتھ دیا تھا۔ اب میں اس کا ساتھ دوں گا۔ میں تمہیں خود موٹر میں بٹھاؤں گا۔ کیوں یلی مجھے ساتھ لے چلو گے نا؟''

یلی ڈرتا تھا کہ کہیں بخاری کے جانے کے بعد وہ جمال کے ساتھ اکیلا نہ رہ جائے اس لئے وہ چپ ہو گیا۔

''میں ذرا جاجا وریال سے مل لوں'' وہ بولا

جاجا اپنی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ ایک ساعت کے لئے یلی ہچکچایا۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید پھر کبھی ملاقات نہ ہو۔

''جاجا جاجا'' یلی نے اسے جھنجوڑا

''جاجے نے کروٹ لی'' جاجا چلایا جاجے نے سر اٹھایا ''ہوں؟''

''میں جا رہا ہوں'' یلی بولا

''اچھا'' وہ نیند میں بولا اور پھر اپنا دایاں ہاتھ بڑھا دیا ''خدا حافظ''

یلی نے جاجے کا ہاتھ پکڑ لیا اور بے پناہ پیار سے اسے سہلانے لگا۔ لیکن جاجا پھر سو گیا تھا۔

پال بھی پورے طور پر نہیں سویا تھا ''کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا

''گھر جا رہا ہوں''

"تو جاؤ میں سمجھا شاید سات سمندر پار جا رہے ہو" پال بولا

"ہاں" علی نے کہا "سات سمندر پار جا رہا ہوں۔ وہیں گھر بناؤں گا" پال اٹھ بیٹھا اور پھر مذاق میں علی سے چمٹ گیا۔

"اس وقت کون سی گاڑی جائے گی؟" اس نے پوچھا

"جائے گی" علی نے جواب دیا

"کوئی اسپیشل ہی ہو سکتی ہے" اس نے کہا

"ہاں اسپیشل ہی ہے"

"اب یہ پوچھو گے کہ اسپیشل کے کون سے ڈبے میں بیٹھو گے؟" پال بولا

"اس سے پہلے تو کبھی علی یوں مل کر نہیں گیا" اس نے کہا

علی نے محسوس کیا کہ اگر کچھ دیر کے لئے وہاں رکا تو وہ سب جاگ پڑیں گے اور دعائیں شروع ہو گئیں تو ... "اچھا تو خدا حافظ" وہ اٹھا اس کی آواز گلوگیر تھی

ایلچی

عین پونے دو بجے جمال اور علی اس لڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ وہ دونوں چپ چاپ کھڑے تھے۔ گلی ویران تھی۔ قبرستان کے پرلے سرے پر کوئی فقیر گدڑی میں پڑا تھا۔ علی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ دیر تک وہ کھڑے رہے۔ وہ پندرہ منٹ پندرہ گھنٹوں سے زیادہ طویل ہو گئے تھے۔

قریب ہی کسی گھڑی نے دو بجائے۔ جمال بولا "کیا دو بج گئے، ٹھیک دو بج گئے۔

کیوں علی سنا تم نے۔"

"علی دو ہی بجے ہیں کیا؟" علی نے کوئی جواب نہ دیا

دیر تک وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے

پھر سفید منزل سے یوں آواز آئی جیسے کوئی ٹرنک گھسیٹ رہا ہو۔ وہ چوکنے ہو گئے۔

پھر خاموشی چھا گئی۔

سے چھوڑ کر انہوں نے جمال کو دبوچ لیا۔ سادی نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر
ادھر گر پڑی۔

یلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔ پیچھے گلی میں وہ جمال کو پیٹ رہے تھے اوپر کوئی رو رہی تھی، کوئی بین کر رہی تھی۔ بند کھڑکیاں کھل رہی تھیں۔ پھر یلی چلانے لگا

''میں ہوں میں میں ہوں میں، ادھر دیکھو ادھر دیکھو میں ادھر ہوں'' لیکن میں اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے باری باری اس نے ہر شخص کو شانے سے جھنجھوڑا ''یہ نہیں میں ہوں۔ اسے چھوڑ دو میں ہوں میں'' لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی وہ سب دیوانہ وار جمال سے کشتی لڑنے میں مصروف تھے۔

''کون ہے کون ہے۔ کیا ہوا'' وہ شخص یلی کی طرف لپکا

''میں ہوں میں'' وہ چلایا

''اچھا تو تم ہو'' ان دونوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔

پھر وہ دونوں یلی کو کسی تنگ جگہ میں ٹھونس رہے تھے۔

ہوا کے چند ایک جھونکے آئے تو یلی نے دیکھا کہ وہ موٹر پر سوار ہے اور اس کے پاس سنتری اور حوالدار بیٹھے ہیں۔

''نہیں نہیں'' وہ انہیں دیکھ کر چلایا ''مجھے جانے دو مجھے جانا ہے'' وہ چلاتا گیا لیکن گاڑی فراٹے بھرتی چلتی رہی۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو'' ''نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے جانا ہے۔ مجھے چھوڑ دو''

''روک دو، روک دو'' یلی چیختا رہا تھا دیر تک وہ چلاتا رہا پھر دفعتاً سنتری بولا ''گاڑی روک دو''

گاڑی رک گئی

"مجھے جانے بخاری جی مجھے جانا چاہیے مجھے جانا ہوگا" ایلی کے سر پر گویا جنون سوار تھا۔

"لیکن" بخشی بولا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں اگر میں نہ گیا تو زندگی بھر" وہ رک گیا

"زندگی بھر" اس نے پھر ناکام کوشش کی

"موڑو" بخاری نے ڈرائیور سے کہا

موٹر واپس جا رہی تھی۔ وہ تینوں خاموش تھے۔

ایلی کو کچھ احساس نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں واپس جا رہا ہے۔ وہ واپس جا کر اسے کیا کرنا ہے۔ اسے اس وقت یہ بھی خیال نہ آیا کہ سادی خطرے میں تھی۔ اسے یہ بھی احساس بھی نہ تھا کہ جس کو چھیڑنا اس کا اخلاقی فرض تھا۔ اس وقت فرض اور اخلاق ایلی کے لئے مہمل لفظ تھے۔ اسے صرف ایک خیال تھا کہ سادی کیا سمجھے گی کہ ایلی بھاگ گیا سفید منزل سے ادھر انہوں نے اسے موٹر سے اتار دیا۔

"اچھا بھئی" بخاری نے کہا "خدا حافظ"

ایلی نے اس کی بات نہ سنی اور دیوانہ وار سفید منزل کی طرف بھاگا۔

گلی میں کوئی نہ تھا لیکن سفید منزل کے اردگرد کے سبھی مکانات میں بتیاں جل رہی تھیں اور زیر لب تمسخر سنائی دے رہی تھیں۔

سفید منزل کا پھاٹک حسب معمول دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آ رہی تھیں کوئی کسی کو ڈانٹ رہا تھا۔ ایلی نے دونوں ہاتھوں سے پھاٹک بجانا شروع کر دیا۔

"دروازہ کھولو دروازہ کھولو" وہ رعب سے نہ جانے کسے ڈانٹ رہا تھا۔ جیسے کوئی سورما سردار فاتح کی حیثیت سے قلعے میں واپس آیا ہو۔

اس کی دستک کا کسی نے جواب نہ دیا۔

اس نے دروازے پر دو ہتھڑ مارنے شروع کر دیے۔ اندر بتیوں کا سلسلہ جوں کا توں جاری تھا۔

''میں ہوں میں'' اس نے پھر دستک دی۔ میں ہوں میں، میں ہوں بلی میں واپس آگیا ہوں۔ مجھ سے بات کرو دروازہ کھولو

اس وقت اسے معلوم نہ تھی کہ وہ کیا کر رہا ہے یا کہہ رہا ہے۔ اسے یہ بھی احساس نہ ہو کہ ارد گرد کے مکانات کے لوگ کھڑکیاں کھول کھول کر باہر جھانک رہے تھے۔ اندر سے کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔

''کون ہے؟'' ایک دبلے پتلے شخص نے پورا دروازہ کھولے بغیر اندر سے باہر جھانکا

''میں ہوں میں'' بلی بولا'' بلی جسے تم تلاش کر رہے ہو.... بلی''

''کون ہے؟'' اندر سے کسی اور شخص کی غصے بھری آواز آئی'' پکڑو اس بدمعاش کو'' وہ گرجا۔

دبلے پتلے آدمی نے بلی کا بازو پکڑ کر اسے یوں اندر گھسیٹ لیا جیسے تم کوئی بوری ہو'' بدمعاش'' وہ دہاڑتا چیخے گا اور پھر اسے ایک کمرے میں دھکا دے کر باہر سے کنڈی لگا دی۔

چوہدر

چند ہی ساعت میں کسی نے کنڈی کھولی ایک اجنبی نوجوان اندر داخل ہوتے ہوئے چلایا

کون ہے تو؟

میں اسپائس ہوں؟

کون اسپائس؟

جسے تم تلاش کر رہے ہو۔ میں واپس آگیا ہوں۔ وہ غلط آدمی ہے جسے تم نے پکڑ

ہوا ہے۔ مجھ سے کرو بات

نوجوان نے غصے میں ہاتھ اٹھایا۔ میں تمہاری ہڈی پسلی توڑ دوں گا۔

ایلی چپ چاپ کھڑا رہا "توڑ دیجیے" وہ بولا

"تم نے کوئی دھوکا فریب کیا تو یاد رکھو میرے سرہانے تک پستول پڑا ہے۔"

"میں کب کہتا ہوں کہ میں نے احسان کیا ہے آپ پر" ایلی نے غصے سے پھر کہا

"تو کس پر احسان کیا ہے" نوجوان چلایا

"کسی پر بھی نہیں"

"تم پہلے بھی آئے اس گھر میں؟"

"نہیں"

نوجوان خاموش ہو گیا اور ایک سگرٹ سلگا کر پینے لگا

ایلی غور سے اسے دیکھ رہا تھا

وہ ایک خوبصورت جوان تھا۔ درمیانہ قد، گھرا ہوا جسم، گدے سے ہاتھ پاؤں۔ سفید رنگ، فراخ ماتھے پر تیوری تھی۔ خمدار ہونٹوں میں مسکراہٹ دبی ہوئی تھی اس نے انگریزی طرز کا سلیپنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔

وہ کمرہ نہایت مختصر تھا۔ دیواروں پر ہلکا گلابی پینٹ کیا ہوا تھا۔ پلنگ پر جدید طرز کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ سرہانے کا غلاف ہم رنگ تھا۔ تپائی پر دو ایک کتابیں پڑی تھیں۔ پانی کے لئے ایک کانچ کی صراحی تھی۔ کارنس پر دو ایک چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

پلنگ پر بیٹھے ہوئے سگرٹ کے کش لگاتے ہوئے نوجوان کبھی کبھی آنکھ بچا کر ایلی کی طرف دیکھتا اور پھر یوں چھت کو گھورنے لگتا جیسے خوفناک ارادے قائم کرنے میں شدت سے مصروف ہو۔

دفعتاً اوپر سے چیخوں کی آواز سنائی دی کوئی چلا رہی تھی۔ کوئی ٹین کے ڈبے بج رہے

کوئی رو رہی تھی

پھر دفعتاً نوجوان پردوں سے نکل کر اندر داخل ہوا۔ ''آپ؟'' اس نے ایلی کی طرف دیکھ کر کہا اور رک گیا

''تم'' کچھ دیر کے بعد نوجوان نے غصے سے ایلی کی طرف دیکھا۔ تم نے میری زندگی حرام کر دی ہے اس نے زور سے دروازے پر لات ماری ''تم نے وہ جرم کیا ہے کہ میں اگر تمہیں قتل بھی کر دوں تو کم ہے۔''

''ہاں'' ایلی نے کہا ''میں نے چوری کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''چور نہیں'' نوجوان کی آنکھیں انگاروں کی طرح روشن ہو گئیں ''میں تمہاری ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دوں گا'' وہ جوش میں ایلی کی طرف لپکا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ ایلی چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ قریب آ کر نوجوان نے اپنی باہیں ایلی کے گرد حمائل کر دیں اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ نوجوان کی گریہ زاری کے بعد پھر خاموشی طاری ہوئی۔

پہلے تو ایلی حیران کھڑا رہا پھر اسے وہی خوشبو محسوس ہوئی جو سادی کے بالوں میں ہوتی تھی اور کمرے کی فضا میں رقص کرتی تھی۔ وہ نوجوان کے قریب تر ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس کا دامن پکڑ لے اور اسے اپنی آنکھوں پر ملے۔

دیر تک وہ دونوں بغل گیر رہے۔

خوش شکل جوان نے آنکھیں پونچھیں اپنا آپ قابو کرے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو پلنگ پر بیٹھ گیا۔

''مجھے ساری بات بتا دیجئے'' اس نے ایلی سے کہا اس کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔

''ساری بات؟'' ایلی نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا

''مجھ سے کوئی بات نہ چھپایئے'' نوجوان نے منت کی

''لیکن'' ایلی بولا ''میں تو چور ہوں چوری کے لئے آیا تھا۔''

نوجوان خاموش ہو گیا

"ایک بات پوچھوں" کچھ دیر کے بعد نوجوان نے بات کی

"فرمایئے"

"اگر ہم پولیس بلوا لیتے تو کیا آپ یہی بیان دیتے"

"بے شک" علی نے کہا

نوجوان پھر سوچ میں پڑ گیا

"آپ نے اغوا کا فیصلہ کیوں کیا" نوجوان نے پوچھا

علی خاموش رہا

"کیا یہ تجویز آپ کی طرف سے تھی" نوجوان رک گیا

"میری طرف سے" علی نے جواب دیا

"تو مجرم ہیں آپ" نوجوان نے پوچھا

"ہاں" علی بولا

آپ کا مقصد مجھے گمراہ کر کے خراب کرنا تھا۔

"یہ غلط ہے" علی نے غصے میں نوجوان کی طرف دیکھا

"تو کیا مقصد تھا" نوجوان نے پوچھا

"ظاہر ہے" علی نے جواب دیا

"ہمیں بلیک میل کرنا ہوں" نوجوان کو پھر سے غصہ آ گیا۔

"یہ غلط ہے" علی نے دانت پیسے

"وہ" نوجوان پھر جلال میں آ گیا "دور ہو جایئے میری نگاہوں سے میں آپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ ہماری زندگی میں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں جایئے جایئے

علی جوں کا توں بیٹھا رہا

"آپ نے ہمیں وہ دکھ پہنچایا ہے کہ" نوجوان کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ لیکن وہ

رکھے گر آپ نے پھر کسی قسم کا رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو جو

یلی پھر بھی بیٹھا رہا

کچھ دیر کے بعد نوجوان پھر لپک کر باہر گیا "محمد علی" اس نے کسی کو آواز دی "باہر نکال دو اسے"

پتلا دبلا شخص صدر دروازے سے لپک کر آیا اور یلی کا ہاتھ کھینچنے لگا۔ پھر اس نے صدر دروازہ کی بھاری چٹخنی کھولی اور یلی کو باہر دھکیل کر اندر سے کنڈی لگا دی۔

باہر صبح کی روشنی پھیلی ہوئی تھی

کھڑکیوں سے لوگ سر نکال کر دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کی طرف اشارے کر رہے تھے

"کون ہے؟"

"کدھر ہے؟"

یلی چپ چاپ سر جھکائے یوں چل رہا تھا جیسے وہ ماں کو جا رہے ہوں

"ہاں ہاں" منصور بولا۔ چلئے ذرا گھومیں پھریں گے

ایلی نے حیرت سے منصور کی طرف دیکھا۔

"کسی جگہ بیٹھ کر باتیں کریں گے" منصور نے جملہ بدلا"

منصور نے ایلی کو اپنے موٹر سائیکل کے پیچھے سوار کر لیا اور وہ دونوں چل پڑے۔

سٹفلز ہوٹل میں پہنچ کر منصور نے سرسری طور پر کہا

"میں نے سوچا آج شام اکٹھے بسر کریں۔ آپ تو سارا دن مطالعہ کرتے تھک جاتے ہوں گے شام کو ذرا سی تفریح ہی سہی"

ایلی سوچ رہا تھا کہ کہاں وہ باہر نکال دو اس بدمعاش کو۔ اور کہاں یہ اکٹھے شام بسر کرنے کی تجویز اور حیرت کی بات یہ تھی کہ دو گھنٹے اکٹھے رہنے کے بعد منصور نے شاذ ہی کسی ایسی بات کا ذکر کیا تھا جو گزشتہ واقعہ سے متعلق ہو۔ وہ نہایت بے تکلفی اور گرم جوشی سے ایسی باتیں کر رہا تھا۔ جیسے دونوں بہت پرانے دوست ہوں۔

غرض منصور کی شخصیت کو دیکھ کر ایلی بھونچکا رہ گیا۔ وہ ایک خوبصورت اور پیارا جوان تھا۔ اس کا لباس سادہ ہونے کے باوجود خوش نما تھا۔ جس میں رنگوں کا حسین امتزاج تھا۔ اس کی حرکات میں لے تھی۔ باتوں میں مزاح کی جھلک تھی۔ مزاج رنگین تھا اور شعر و سخن ادب اور آرٹ سے لگاؤ تھا اور اس کی علمی معلومات بہت وسیع تھیں۔

منصور نے جب ایلی کو واپس گھر کے دروازے پر موٹر سائیکل سے اتارا تو وہ کہنے لگا اگر اعتراض نہ ہو۔ میرا مطلب ہے اگر آپ کو کوئی پروگرام نہ ہو اور تعلیم کا حرج نہ ہو تو کل شام کو دفتر آ جائیے گا۔

اس کے بعد ایلی کا معمول ہو گیا کہ سارا دن وہ کتاب سامنے رکھ کر شام کے خواب دیکھتا اور شام کو منصور کے دفتر میں پہنچ جاتا اور پھر جب منصور کام سے فارغ ہوتا تو وہ

اس کے موٹر سائیکل پر یوں بیٹھتا جیسے شاہی تخت پر بیٹھا ہو۔ شاہ کا جلوس سڑکوں پر گھومتا۔ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے اور ادب سے صف آرا ہو جاتے کورنش بجا لاتے۔ جب وہ مستقل ہوٹل میں پہنچتے تو بیرے تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

اگرچہ منصور کی عادت تھی کہ وہ عامیانہ باتیں کرنے سے احتراز کرتا تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی بات چلتے چلتے منصور کے منہ سے نکل جاتی جسے ایلی یوں حفظ کر لیتا جیسے وہ قرآن کریم کی آیت ہو۔ عامیانہ بات چھوڑیے منصور کوئی بھی ایسی بات کرنے سے احتراز کرتا تھا۔ جس سے اس کی برتری ثابت ہو۔ یا جو ایلی کو احساس کمتری دلائے۔ عجیب بات تھی یہ کہ منصور نے کبھی ایلی کو اس حقیقت کا احساس نہ دلایا تھا کہ وہ سادی کا بھائی ہے یا اسے اس گھرانے سے کوئی تعلق ہے جہاں ایلی پر چوری کا الزام لگایا گیا تھا۔ منصور نے اس دوران میں البتہ اپنے گھر کے متعلق صرف ایک بات کی تھی اور وہ بھی سرسری طور پر کہنے لگا

''ایلیاس صاحب آپ عفیفہ منزل کی طرف کبھی نہ جائیے گا۔ ورنہ بڑی قباحتیں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی اور ممکن ہے'' وہ رک گیا اور پھر معنی خیز مسکراہٹ سے کہنے لگا ''مجھے یقین ہے کہ آپ ایسی حماقت نہیں کریں گے لہذا جملہ مکمل کرنے کی کیا ضرورت ہے'' اس کے علاوہ ایک روز ان جانے میں منصور کے منہ سے گھر کی بات نکل گئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سادی بیمار ہے اور کسی سپیشلسٹ کے زیر علاج ہے۔ اس پر ایلی چونکا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ منصور سے پوچھے کہ اسے کیا تکلیف ہے اور اب کیا حال ہے لیکن منصور نے موضوع بدل دیا تھا اور ایلی میں پوچھنے کی جرات نہ ہوئی تھی پھر کچھ دیر کے بعد وہ منصور میں اس حد تک جذب ہو کر رہ گیا تھا کہ وہ یہ بھول چکا تھا کہ سادی بیمار ہے۔

پھر شام گزارنے کے بعد رات کے گیارہ بجے جب منصور نے اسے اپنے موٹر

سائیکل سے اتارتا تو نانا گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دفعتاً ایلی کو یاد آیا تھا کہ سادی بیمار ہے۔ وہ تڑپ کر مڑا تھا کہ منصر سے پوچھے لیکن منصر جا چکا تھا۔ چند ایک روز کے بعد منصر نے خود نانا گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بھی موٹر پر آیا تھا۔ شام کے وقت وہ نانا گھر کے نیچے ہارن بجاتا اور ایلی فوراً نیچے اتر آتا۔ روز موٹر سائیکل کو نانا گھر آتے دیکھ کر بھاجاں اور پالی حیرانی سے ایلی کی طرف دیکھتے تھے اور جمال تو اسے دیکھ کر یوں کھل جاتا جیسے خربوزہ مٹھاس کی وجہ سے پھٹ جاتا ہے۔

"ایلی تم کمال ہو" وہ چلاتا "یار تم تو منزل تک پہنچ کر رہے۔ اب کیا ہے اب تو سب رام ہو گئے ہیں کیوں"

لیکن ایلی کو نہ جانے کیا ہوا تھا وہ جمال سے اجتناب کرنے لگا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جمال کے روبرو ایلی احساس جرم محسوس کرتا تھا۔ جیسے اس نے جمال کے سفید رنگ اور سنہرے بالوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا ہو جیسے اس نے شکار کرنے کے لئے سنہرے بالوں کا دانا پھینکا ہو۔ اسی وجہ سے وہ اس سے زیادہ بات نہ کرتا بلکہ کوشش کرتا کہ اس کی بات کاٹ دے۔

نیم چھتی سے نیچے تو ایلی جاتا ہی نہ تھا۔ اگر کبھی جاتا بھی تو کوشش کرتا کہ جمال سے دو چار نہ ہو لیکن کبھی کبھار جمال تک بات پہنچ ہی جاتی اور وہ منہ بنا کر کہتا

"ہاں بھئی آج کل ایلی صاحب اونچی ہواؤں میں اڑتے ہیں۔ ہم رینگنے والے لوگ ان کی نگاہوں میں کہاں آتے ہیں"

اور یہ ایک حقیقت تھی جب سے ایلی منصر سے واقف ہوا تھا اس کے دل میں جمال کے لئے وہ جذبہ احترام نہ رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ کتابی دنیا میں محصور ہو۔ وہ اس رنگینی سے بیگانہ ہو جو زندگی کی جان ہے اس کی شخصیت میں کتابی دنیا میں محصور ہو۔ وہ اس رنگینی سے بیگانہ ہو جو زندگی کی جان ہے اس کی شخصیت میں کتابی علم کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔

کبھی کبھار جب وہ منصور کے پاس ہوتا تو اسے خیال آتا کہ اگر میں بی اے نہ کر سکا تو کیا ہوگا۔ یہ لوگ کیا سمجھیں گے شاید وہ ایک انڈر گریجویٹ کو در خور اعتنا نہ سمجھیں۔ اس روز گھر آ کر سنجیدگی سے کتابیں کھول کر بیٹھ گیا۔ لیکن کتاب کے صفحات سے سادی جھانکتی "میں بیمار ہوں" منصور ہنستا "آپ مجھ سے بات کریں ایلی صاحب۔ یہ درست نہیں۔ ان سے بات نہ کرنے کا آپ نے وعدہ کیا ہے" سادی چلاتی "نہیں نہیں ان کا آپ سے تعلق صرف میری وجہ سے ہے۔ ان کی مہربانیاں میری وجہ سے ہیں۔ ان میں نہ کھو جائیے گا۔ یہ صرف آپ کی توجہ کو جذب کرنا چاہتے ہیں تاکہ عزم ٹوٹ جائے۔

ایلی کتاب بند کر دیتا۔ پھر اسے محسوس ہوتا کہ زینے میں شہزاد کھڑی حسرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ مسکراتی آنکھیں جھکاتی اور زیر لب کہتی "نہیں میں نے کچھ نہیں کہا" اور پھر سیڑھیاں اترنا شروع کر دیتی

امتحان

ایک روز جب منصور اور ایلی دونوں ہوٹل میں بیٹھے تھے تو منصور نے غیر معمولی بیرے کو آرڈر دیتے ہوئے کہا "دو چھوٹا" ایلی چونکا۔ دو چھوٹا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ اس سے پہلے تو منصور نے کبھی دو کا آرڈر نہ دیا تھا۔ شاید بے خبری میں لیکن منصور تو بے خبری میں بھی ہوشمندی کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ اس میں عقل اور جذبے کی عجیب آمیزش تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جذبہ حاوی رہتا تھا لیکن اظہار کرنا منصور کے نزدیک سستا پن تھا۔ اس کا وقار اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔

بیرے نے دونوں چھوٹے میز پر رکھ دیے۔ منصور نے سگرٹ جھٹکتے ہوئے تعجب سے میز کی طرف دیکھا "ارے کیا میں نے دو منگائے تھے" وہ ہنسنے لگا "تو چلئے پھر" دفعتاً اس نے بات بدلی

"چھوڑو کیا حرج ہے آپ کوئی مولانا تو ہیں نہیں۔ آپ میرے ساتھ شامل ہو

جائیے"

"میں نے آج تک" علی نے معذرت کے لیے منہ کھولا

"وہ نو وہ کے نہ مجبوریت سے بولا "خدا را اب مسائل بیان کرنے نہ شروع کر دینا"

"لیکن" علی نے پھر کوشش کی

"آخر یہ لیکن ایک نہ ایک روز تو لوٹ کے گاڑی چلے آنی ہی تھی" وہ مسکرایا "مجھے معلوم ہے کہ آپ نے کبھی بات یہاں اب کیا پردہ ہے۔

اب کیا پردہ ہے اب کیا پردہ ہے پر موڑ بھونکنے لگی۔ اب کیا پردہ ہے ہوٹل کے سازندے نے ... پر دو بابا بابا پاس بیٹھا ہوا ایک مور ... چیخنے لگا "سب پردے ہٹا دیتی ہے یہ چیز ہے۔"

دفعتاً علی کو خیال آیا کہ شاید منصور بھی سکیم کے مطابق ہی چل رہا ہے۔ پتا نہ چاہتا ہے تاکہ اس کا دل ڈوب گیا۔ شاید وہ علی سے ساری کی مدتوں کے متعلق تفصیلات جاننے کا خواہشمند ہے۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر اس نے انکار پر اصرار کیا تو منصور سمجھے گا کہ وہ پندار محفوظ رکھنے کے لیے انکار کر رہا ہے اس سے ثابت ہوگا کہ راز کا وجود ہے۔ علی نے اپنا آپ پتھر بنانے کی شدید کوشش کی۔ اس نے اپنے تمام تر عزم کو مددگار کہ کوئی بات زبان پر نہ آئے کوئی ایسی بات جس میں ساری پر حرف آئے۔ ساری کی عزت کا سوال ہے۔ پردہ جوں کا توں قائم رہے گا۔ یہ دو گھونٹ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے نہیں بگاڑ سکتے۔ علی نے چھوٹا اٹھایا اس کا ہاتھ ذرا نہ کانپا۔ اور وہ اسے یوں غٹ غٹ پی گیا جیسے چھوٹا نہیں بلکہ شربت کا گلاس ہو۔ ایک ساعت کے لیے منصور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر مسکرا کر چپ رہا۔ دو چھوٹا اور

چار چھوٹے نگلنے کے بعد علی نے محسوس کیا کہ اس کے اندر آگ لگی ہے۔ باہر ہوٹل پر ایک سرخ دھند کا چھانے جا رہا تھا۔ اور وہ پورے عزم سے اپنے آپ کو پتھر

بنانے میں مصروف تھا۔

"آپ کا امتحان کب ہو رہا ہے؟" منصر نے پوچھا

علی کا جی چاہتا تھا کہ کہہ دے امتحان تو ہو رہا ہے ممتحن سامنے بیٹھا ہے

پندرہ روز کے بعد ہوگا" وہ بولا "مشن کالج میں سنٹر بنا ہے۔

اس کے بعد منصر نے کئی ایک بار کہا کوئی بات کیجئے علی صاحب کچھ کہیے

پھر اس نے خود کچھ کہنا شروع کر دیا "آپ نے وہ شعر سنا ہے؟"

نہ پوچھ حال میں وہ چوب خشک صحرا ہوں

لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

کچھ دیر تک وہ اسے گنگناتا رہا۔ پھر بولا مجھے شعر بے حد پسند ہیں۔ اور میں محسوس کرتا ہوں جیسے مجھ میں سینکڑوں اشعار بے تاب ہوں اگرچہ میں آج تک اپنے خیالوں کو شعر کا جامہ نہیں پہنا سکا۔ ایک عظیم کیفیت کو چند الفاظ میں کہہ دینا بڑی بات ہے۔ ہم تو بہت سارے الفاظ میں بھی نہیں کہہ سکتے۔ آپ کو کونسا شعر پسند ہے؟ اس نے پوچھا

علی کو اس وقت کوئی شعر یاد نہ آ رہا تھا

پھر دفعتاً منصر نے بات کا رخ بدلا "ہاں تو الیاس صاحب اور اس واقعہ کی تفصیلات تو بتایے جو ہماری ملاقات کا موجب ہوا میں صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں" وہ بولا "کیونکہ میرے دل میں بے لاگ استفسار پیدا ہوتا ہے کسی خاص مقصد کے تحت نہیں پوچھ رہا ورنہ آپ کے بتانے پر کسی قسم کے نتائج پیدا ہوں گے"

علی نے شدت سے ابھرنے کی کوشش کی وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "دراصل بات وہی تھی جو میں نے آپ کو بتا دی تھی" علی نے کہا "میں نے کوئی تفصیل چھپائی نہیں"

"ہوں" منصر نے کہا "پھر بھی"

"آپ پوچھیے کوئی خصوصی تفصیل"

"کیا ادھر سے بند ہوئی تھی؟" منصور نے کہا "یا آپ کی طرف سے"

"ادھر سے نہیں" ایلی نے کہا

"تو آپ نے ہی تحریک شروع کی تھی"

"ہاں"

"اور ادھر سے کیا ردِعمل ہوا"

"اظہارِ نفرت" ایلی نے کہا

منصور ہنسنے لگا "آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں"

"مجھے کالے کلوٹے کا خطاب دیا گیا۔"

"ہوں تو کیا آخری واقعے سے متعلق وہ تجویز آپ کی ہی تھی؟"

"ہاں"

"اس سے آپ کا مقصد کیا تھا"

"جذبہ اور کیا میں نے سوچا نہیں" ایلی نے جواب دیا

"آپ نے یہ نہ سوچا کہ کسی کی زندگی تباہ ہو جائے گی"

"نہیں" ایلی نے کہا

"اور آپ کی تجویز منظور کیسے کر لی گئی؟"

میں نے خودکشی کی دھمکی دی تھی شاید اس لیے

منصور قہقہہ مار کر ہنسا

"اور وہ زیور کیا آپ کے کہنے پر لایا گیا تھا"

"نہیں بلکہ اگر وہ پیچھے نہ ہوتا تو ہم جا چکے ہوتے"

"کیسے"

"میں نے اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا"

"پھر آپ موقعے سے بھاگ کیوں گئے؟"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں" ایلی نے جواب دیا

"چلیے میں آپ کو ٹھیک کر دوں" منصور نے ایلی کو سائیکل پر بٹھا لیا۔ ایلی نے مضبوطی سے منصور کو پکڑ لیا۔ اور پھر ایلی کو اس وقت ہوش آیا جب سائیکل رک چکا تھا۔ اس نے سمجھا کہ نانا گھر آ گیا وہ بھونچکا رہ گیا۔ شاید نشے کی وجہ سے نانا گھر کا چھوٹا سا دروازہ پھاٹک دکھائی دے رہا تھا۔

"آئیے" منصور نے آ کر اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا

ارے" حیرت سے اس نے منصور کی طرف دیکھا وہ دونوں سفید منزل میں داخل ہو رہے تھے۔"

"ایک بات کہوں" منصور نے ہنس کر ایلی سے کہا "پہلے تو ہم نے آپ کی بات تسلیم کر لی تھی لیکن اگر اب آپ کہیں کہ آج پینے کا آپ کا پہلا موقعہ تھا" تو وہ رک گیا " بات قابل قبول نہیں"

"بیٹھیے" منصور نے کہا ایلی نے کمرے کی طرف دیکھا یہ وہی کمرہ تھا جہاں وہ چند روز پہلے چور کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور آج لیکن آج تو اسے اپنی حیثیت کا علم نہ تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ واقعات پر اسرار طور پر رخ بدل رہے تھے نہ جانے کیا ہونے والا ہے نہ جانے کیا ہوگا۔ ایلی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ منصور نے کئی بار سے تاکید کہا تھا" ایلی صاحب آپ کا ہمارے گھر جانا یا کسی قسم کا کوئی رابطہ پیدا کرنا ہمارے لیے تکلیف کا باعث ہوگا اور اب جب کہ ہمارے دوستانہ مراسم ہو چکے ہیں اگر آپ نے چوری چھپے کوئی بات کی یا کوئی بات مجھ سے چھپائی تو مجھے دکھ ہوگا۔

"آپ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ یہاں آپ کو کیوں لایا گیا ہے مجھے خدا خیال آیا کہ اس حالت میں آپ کو اپنے ہاں میں نہیں جانا چاہیے۔ ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ بچے سگرٹ پیتے ہو میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ آپ سگرٹ نہیں پیتے۔ لیکن اس میں میرا قصور نہیں کیونکہ اس عمر میں کم و بیش لوگ سگرٹ پینا شروع کر دی

دیتے ہیں"

سائیکل پر ہوا کھانے کے بعد لیلی کی حالت اور بھی خراب ہو چکی تھی۔ اس کے تمام جسم میں شدت سے جھٹکے لگ رہے تھے۔ منہ خشک ہو رہا تھا طبیعت مالش کر رہی تھی۔

"آپ کچھ دیر کے لیے یہاں آرام کیجیے۔ لیٹ جائیے" لیکن لیلی اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں ابھی آیا" کہہ کر منصور چلا گیا اور لیلی کمرے میں اکیلا رہ گیا۔

پھر دفعتاً اس کی طبیعت گھبرائی وہ باہر بھاگا۔ سامنے اس زینے کا دروازہ تھا جہاں وہ پہلے بھی ایک بار آ چکا تھا پیٹ پکڑ کر کنڈی کھولی اور اندر پہنچتے ہی شدت سے قے کرنا شروع کر دیا۔

قے کے بعد اس کی طبیعت ہلکی ہو گئی۔ اس نے اس کمرے کی طرف حسرت بھری نظر ڈالی۔ فرش پر ابھی تک سگرٹوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ یہ جیسوں پر ایک دلچسپ پڑی تھی۔ اسے ان ملاقاتوں کا خیال آ گیا۔ یہاں وہ بیٹھا کرتا تھا اور کوئی کہا کرتی تھی "آپ بیٹھ کیوں گئے اٹھیے نا۔"

"آپ نا" اس کی پشت پر منصور کھڑا تھا "یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں آپ"

اسی روز باتوں ہی باتوں میں منصور نے پردے کا موضوع چھیڑ دیا "پردے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔"

"میں نہیں سمجھا" لیلی نے کہا "میرا مطلب ہے" منصور نے کہا "جب تک اس گھر سے آپ کا تعلق ہے آپ کی حیثیت ایک اجنبی کی ہے ایک بیگانے کی۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ آپ سے خصوصی سلوک کیا جائے۔"

لیلی کو منصور کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

منصور کہنے لگا "اگر ہمارے لوگ آپ کے سامنے آئیں تو تخصیص کیوں کی جائے کیوں نہ وہ منظر عام پر آئیں سب کے سامنے"

"میں نہیں سمجھا" علی نے جواب دیا

"وقت تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں سمجھ رہا" منصور بولا "اگرچہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ اور میں نے آج تک اس مسئلے پر غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اب" وہ خاموش ہو گیا اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی کشمکش میں گرفتار ہے۔

"جی" علی نے کہا

"جی کیا" وہ بولا "کیا سمجھے آپ"

"کچھ بھی نہیں" علی نے کہا منصور نے ایک قہقہہ لگایا

"تعجب کی بات ہے" وہ بولا "ہم دونوں اس قدر قریب ہیں بہت قریب اتنے قریب کہ آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا اور پھر ہم دونوں بیک وقت اس قدر بیگانہ ہیں اس قدر دور کہ

منصور رک گیا "معاف کیجیئے" وہ "معاف تو آپ چاہتے ہی نہیں ہاں تو میں کہہ رہا تھا کیا کہہ رہا تھا میں" وہ ہنسنے لگا "ہاں آپ نے دستوفسکی کا ناول برادرز کیرامازوف پڑھا ہے؟"

"جی نہیں" علی نے کہا "میں نے صرف ہیملٹ اور کرائم اینڈ پنشمنٹ پڑھے ہیں۔"

"ضرور پڑھئے" وہ بولا "اسے پڑھے بغیر آپ ہم کو نہیں سمجھ پائیں گے"

"آپ کی کتنی ہمشیریں ہیں؟" منصور نے دفعتاً بات بدلی

"ایک" علی نے کہا

"بڑی ہیں یا چھوٹی"

"بڑی"

"تو آپ نہیں سمجھ سکتے کہ چھوٹی بہن کا مفہوم کیا ہے" منصور نے جوش اور جذبے

سے کہا

علی نے سوچا کہ شاید منصر نشے میں باتیں کیے جا رہا ہے۔ لیکن خصوصی طور پر آج کیوں؟ وہ یہ نہ سمجھ سکا۔ "مجھے اپنی ہمشیرگان سے بے حد محبت ہے" منصر بولا "آپ غلط نہیں کر سکتے ہیں۔ بہرحال پردے کا تو میں قائل نہیں ہوں میرا مطلب ظاہری پردے سے ہے۔ پردے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے" اس نے علی سے پوچھا

"میں تو ظاہری پردے کو فضول سمجھتا ہوں"

"ہاں" دفعتاً منصر نے پھر بات کا رخ بدلا۔ "آپ کو ٹینس سے دلچسپی ہے؟"

"جی ہاں کچھ کچھ ہوسٹل میں کھیلا کرتا تھا۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ پنجاب ٹینس چیمپئن شپ کا فائنل ہو رہا ہے"

"جی نہیں"

"تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کل شام کے چار بجے لارنس باغ کی گراؤنڈ میں یہ میچ ہوگا اور آپ ہمارے ساتھ وہاں جا رہے ہیں۔ آپ چار بجے وہاں خود پہنچ جائیے گا۔ وہاں ملاقات ہوگی۔"

منصر کی اس روز کی باتیں علی کو قطعی طور پر سمجھ میں نہ آئیں۔ نہ جانے وہ کہہ گیا، رہا کیا کچھ کہہ رہا تھا شاید گپ ہانک رہا ہو۔ لیکن ان کہی بات کرنے میں منصر کو کمال حاصل تھا اور اس حقیقت سے علی واقف تھا۔ پھر بھی اس روز کی باتیں تو نہ کہی تھیں نہ ان کہی۔

منظر ۴

اگلے روز جب علی ٹینس میچ کے میدان میں پہنچا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی منصر کے ہمراہ وہ سادی باجی اور ایک معمر خاتون تھیں۔ وہ تینوں بے نقاب تھیں۔ علی انہیں دیکھ کر ٹھہر گیا۔

"بیٹے یہ ہے منصر چوہدری" "یہ ہیں الیاس صاحب" اس نے خاتون کو مخاطب کر کے کہا "اور آپ والدہ صاحبہ ہیں اور انہیں" اس نے سادی ورباجی کی طرف دیکھ کر کہا "انہیں تو آپ جانتے ہیں" میں نے جھجک کر والدہ کو سلام کیا۔

میں نے شدید خواہش کے باوجود سادی ورباجی کی طرف نہ دیکھا اس میں ہمت نہ پڑی۔ مجھے منصر کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ کچھ تخصیص کیوں کی جائے۔ منصر نے سادی ورباجی کو مشترکہ نام پکارنے سے گریز نہ کیا تھا۔ میں نے حیرت بھرے احترام سے منصر کی طرف دیکھا۔ کس قدر پر وقار تھا وہ چھوٹا سا خوب صورت آدمی۔

کھانے کے دوران میں نے دو ایک بار چوری چوری سادی کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے وہ سادی نہیں بلکہ سکندر ہو جو دریائے جہلم کے کنارے کھڑا ہو۔

کھانے کے وقفے میں والدہ کے اشارے پر منصر نے بیرے کو آواز دی لیکن اس کی آواز کسی نے نہ سنی اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔

والدہ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"آپ کے مزاج اچھے ہیں" میں نے کچھ کہنے کے لیے کہا

وہ مسکرائیں اور پھر کہنے لگیں "کبھی مجھ سے ملو نا، مجھے تم سے بات کرنا ہے۔"

"جی" میں نے جواب دیا

"گھر پر آئیے کوئی بارہ بجے کے قریب" والدہ نے کہا

"بہت اچھا" میں نے جھکی جھکی نگاہوں سے جواب دیا

"گھڑی دو بجے نہیں" سادی چہک کر بولی

"جی" میں نے سادی کی طرف دیکھے بغیر کہا "کہیں دو بجے نہ آ جائیں" وہ بولی

"ضرور آئیے" والدہ نے یوں جواب دیا جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو

"جی" علی نے اس رسمی جملے پر شرمندگی سی محسوس کی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس معمر خاتون کو یوں آغوش میں لے جیسے وہ ایک ننھی سی بچی ہو مگر اس میں ہمت نہ پڑی تھی۔ وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے بجا۔

"تو ادھر اس کمرے میں آجاؤ اس بغلی کمرے میں آپ کے ابا کو پتہ چل گیا کہ تم اس گھر میں آئے ہو تو قیامت آجائے گی۔

"ابا؟" علی نے دہرایا

اب وہ ہمارا عزیز ہے لتدر کے بڑی کا منگیتر ہے۔ چھوٹی کی منگنی ابھی نہیں ہوئی مان بڑا جوشیلا ہے۔ پتہ نہیں کیا کر دے آؤ ادھر آجاؤ

جب وہ بغلی کمرے میں داخل ہوا تو قریب ہی سے ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ دونوں سادی اور روجی بیٹھی آپس میں کانا پھوسی کر رہی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا۔ اب تم سے کیا پردہ اب بیٹھ جاؤ"

علی سر جھکا کر ادب سے بیٹھ گیا۔

سادی نے روجی کے کان میں کہا "دوپٹہ اوڑھ لو نہیں روجی" اور اس نے جان بوجھ کر ایسی آواز میں کہا کہ علی سن لے۔

علی خاموش بیٹھا رہا اور والدہ سے ادھر کی باتیں کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔

"دیکھو تو" سادی پھر بولی جیسے منہ میں زبان نہ ہو

"اب میں کیا کہوں" علی نے والدہ کو مخاطب کر کے کہا

"کیا کہا تم نے میں نہیں سمجھی" وہ بولیں

"میں نے عرض کیا کہ" علی رک گیا

"جملہ مکمل کر دو روجی" سادی پھر بولی

"جملہ نہیں" وہ بولا "کہانی"

"وہ کیا میں پوری کروں گی" سادی قہقہہ مار کر ہنسی

سادی چمک کر بولی

"یہ کالا کلوٹا ہے" ایلی رک گیا

"خاموش" سادی نے ایلی کو ڈانٹا "ہائے باجی یہ تو ساری عمر معاف نہ کریں گے مجھے" وہ ہنسنے لگی

"وہ مشہری بلا خود ہی تو ہٹ گیا بچارا"

"ہٹ وقتی" باجی بولی

"دونوں طرف ہٹ گیا" ایلی نے کہا

"کچھ کہتے تھے وہ" سادی نے پوچھا

"کہتا تھا یہ لڑکیاں بھی کیا ہوتی ہیں کبھی کچھ بھی سمجھ میں ہی نہیں آتیں"

"آپ انہیں ساتھ کیوں لائے تھے جی ساتھ لا کر دکھا دیا" سادی نے پوچھا

"خود ضد کر رہے تھے" ایلی نے کہا

مجھے حیرانی ہے" سادی ہنسی "انہوں نے انہیں کیوں پڑھایا۔ آپ کو کیوں نہ پڑھا"

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے" ایلی بولا

"کیوں" باجی نے پوچھا

"مشہری رنگت والی گوری کیا تھے کالا نام ہی ہونا چاہئے نا"

"بس ان سے بات بھی نہ کرو باجی" سادی غصے میں تھی

"مجھے دیر ہو گئی" محمود نے داخل ہوتے ہوئے کہا لیکن مان نہیں ہے چھوٹو فکر تو دور

ہو۔

کیمرا موز وز

اس کے بعد ایلی کے شب و روز میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ دوسرے یا تیسرے دن وہ گھر بلایا جاتا۔ وہ چاروں چھوٹے کمرے میں بیٹھ جاتے سادی زیر لب بات چھیڑتی۔ ایلی محمود سے باتیں کرتا لیکن رہ رہ کے نگاہیں سادی کی طرف

ہوتا۔وہ دونوں نوک۔جھونک تیں اور لیلی کے جواب پر والدہ حیرانی سے کہتی میں نہیں سمجھتی

پھر والدہ امان کو دیکھنے کے لیے باہر چلی جاتیں اور وہ اکیلے رہ جاتے اور پھر وہ بچوں کی طرح لڑتے جھگڑتے حتیٰ کہ ہاتھاپائی کی نوبت آجاتی اور والدہ چپ آجاتی اور ان کا وہ شور شرابہ پھر سے دب کر اشارات کی شکل اختیار کر لیتا۔

شام کو لیلی منصور کے دفتر جا پہنچتا اور پھر اس موٹر کی سڑکوں پر شام کی سواری نکلتی اور لوگ بصد ادب و احترام راستہ روکے کھڑے ہو کر کورنش بجا لاتے اور پھر ہوٹل میں وہ اس عظیم شخصیت کے روبرو ادب و احترام کے جذبات کے لیے بیٹھ جاتا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھے جاتا۔ اسے منصور سے محبت ہو چلی تھی۔ والہانہ محبت

پھر ایک روز جب وہ چاروں چھوٹے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو دروازے پر کسی نے ٹھوکر ماری۔

"دروازہ کھولو" کوئی زور سے چلایا۔

والدہ صاحبہ نے "او" زنی چہرہ زرد پڑ گیا" "ہے" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بے تاب ہو گیا۔ امان کو پتہ چل گیا۔

"کون ہے" اماں نے پوچھا

"میں ہوں اماں" وہ چیخنے لگا دروازہ کھولو

"اے ہے" اماں بولیں اس وقت کیا ہے ہم کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی ہیں

مجھے معلوم ہے" وہ چلایا کمرے میں کیا ہو رہا ہے میں جانتا ہوں دروازہ کھولو"

اس نے دروازے پر مکے مارنے شروع کر دیے۔ کھول دو ورنہ میں اسے توڑ دوں گا۔

"کھولتی ہوں" اماں بولیں "ذرا ٹھہرو تو"

"ابھی کھولو ابھی میں اس کی گردن مروڑ دوں گا" وہ چلایا

"اس کی گردن مروڑ دو گے" ماں نے ہنس کر کہا

"مجھے معلوم ہے کس کی گردن مروڑنا ہے مجھ" وہ غرایا

"ان لڑکیوں نے بگاڑ دیا ہے تمہارا"

"بعد میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا میں"

"یہی دھمکی ہے تو نہیں کھولتے ہم تو دروازے کو" ماں بولی

"اچھا" اس نے دانت پیستے "کہاں ہے میری بندوق" وہ دیوانہ وار چیختے ہوئے چلانے لگا

"یا اللہ یا اللہ" ماں گھبرا کر دعائیں مانگنے لگیں

"میں جاتا ہوں" علی نے کہا

"وہ گولی چلا دے گا چلا دے گا" ماں نے کہا

"دیکھوں گی میں کیسے چلائیں گے" سادی جوش میں آ گئی اس نے علی کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے جانے دو سادی" علی نے کہا

"نہیں میں ساتھ جاؤں گی۔ میں آپ کو گھر چھوڑ کر آؤں گی" غصے میں سادی کی آنکھوں سے شرارے جھڑ رہے تھے۔

"سادی" اماں کی آنکھیں گویا ابل کر باہر نکل آئیں

"بیٹے مجھے کون مارے گی نہیں چلے" وہ علی سے بولی

"سادی یہ تمہاری عزت کا سوال ہے مجھے جانے دو" علی نے کہا

ماں سادی کے پاؤں پڑ گئی

علی بھاگا خوش قسمتی سے صدر دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ دروازے میں پہنچ کر وہ رک گیا۔ دیوار کے ساتھ لگ گیا تاکہ اوپر سے اسے کوئی دیکھ نہ سکے کافی دیر وہ کھڑا رہا۔ پھر جب شور سے معلوم ہوا کہ اماں زینہ اتر رہا ہے تو علی چپکے سے پڑوس

کے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو کر کونے میں دبک گیا۔ پھر امان گلی میں چلا رہا تھا

کہاں ہے وہ کہاں ہے

ایک اونچے لمبے تنومند مرد کو ہاتھ میں بندوق لیے دیکھ کر گلی کے تمام لوگ کھڑکیوں میں آ گئے۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''کہاں ہے وہ کہاں ہے وہ'' امان گلی میں یوں چکر کاٹ رہا تھا جیسے شیر پنجرے میں چکر کاٹتا ہے۔ پھر منصر آ گیا اور امان کو پکڑ کر اندر لے گیا۔

عین اس وقت کوئی اس ڈیوڑھی میں داخل ہوا جہاں ایلی چھپا ہوا تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ ایلی کو دیکھتا ایلی کونے سے نکل آیا اور معصومانہ انداز سے پوچھنے لگا۔ کیا یہ مولوی محمد علی کا گھر ہے۔

''محمد علی کون محمد علی'' نووارد نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا

جو اسلامیہ کالج میں پروفیسر ہیں۔ اس نے کہا

''نہیں'' نووارد بولا۔ یہ ان کا مکان نہیں

تکلیف معاف کیجئے کہہ کر وہ باہر نکلا اور گلی میں اس سمت کو چل پڑا جو امان کے گھر سے برعکس جاتی تھی اور پھر باغ میں پہنچ کر ایک پلاٹ میں وہ ڈھیر ہو کر پڑ گیا۔

ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر امان کون تھا اس سے ان کی دشمنی کیوں تھی وہ کس کی گردن مروڑنے کی بات کر رہا تھا۔ پھر وہ چیخ کیوں رہا تھا۔ بھلا بندوق کی کیا ضرورت تھی اور یوں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے اور محلے والوں کو اکٹھا کرنے میں کیا مصلحت تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کے روبرو منصر کھڑا مسکرا رہا تھا ''ایلی صاحب آپ نے دوستوفسکی کی برادرز کیرامازوف نہیں پڑھی (Brothers Karamozoves) ضرور پڑھئے۔''

ایک اور

شام کے قریب نیم چھتی میں لیٹے ہوئے ایلی کو یاد آ گیا کہ اسے منصر سے ملنے جانا

ہے چونکہ خصوصی طور پر منصور نے طے کر رکھا تھا کہ اس روز وہ دفتر میں نہیں گئے۔ لیکن ہمت نہ پڑی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھنا محال تھا۔ چونکہ ہی اس نے سوچا کوئی بہانہ بنا دوں گا۔ اور وہ پھر لیٹ گیا۔

دفعتاً اسے پھر خیال آیا۔ نہ گیا تو منصور سمجھے گا کوئی خصوصی بات ہے۔ اور دوپہر کا واقعہ اس کی نظر میں حقیقت کا روپ اختیار کر لے گا۔ اور وہ سمجھے گا کہ واقعی علی سفید منزل میں گیا تھا۔

''نہیں نہیں وہ اٹھ بیٹھا یہ نہیں ہو سکتا نہیں ہو سکتا'' منصور پر یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ میں وہاں جاتا ہوں۔

شام کے وقت جب وہ منصور کے دفتر میں پہنچا تو منصور کے تمام خلوص کے باوجود اس کے انداز سے تلخی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں فارغ ہو رہا ہوں تو ابھی چلتے ہیں'' منصور نے حسب معمول کہا

''آج پریشان معلوم ہوتا ہے شاید دوپہر کے واقعہ کے متعلق کبیدہ خاطر ہے۔ ضرور مجھ سے متنفر ہو گا نہیں میں کبھی تسلیم نہیں کروں گا'' علی سوچ رہا تھا اس میں اس کی عزت کا سوال ہے۔ ماں کتنی قابل تعظیم ہے لیکن ماں نے اس کا بھی خیال نہیں کیا نہ جانے کون ہے وہ ماں پھر وہ منصور کی طرف دیکھنے لگا۔ منصور اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہی حسین اور پر ذہانت چہرہ۔ وہی شان استغنے وہی وقار۔ لیکن اب اس پر پژمردگی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں جاذبیت کے باوجود شکستگی کی جھلک تھی جیسے پیمانے میں بال آ گیا ہو۔

علی نے شدت سے محسوس کیا کہ منصور دکھی تھا۔ اگرچہ وہ اپنے دکھ کو چھپانے کی کوشش میں شدت سے مصروف تھا۔

''پریشان سے دکھتے ہیں آپ'' اس نے منصور سے کہا

وہ چونکا ''ہوں'' اس نے ہنسنے کی کوشش کی ''آج کیا کام آن پڑا ہے کہ''

"تو دفتری پریشانی ہے" لیلی نے کہا

"اور کیا ہو سکتا ہے" وہ بولا

لیکن لیلی نے محسوس کیا کہ وہ بات ٹال رہا ہے۔ ظاہر تھا کہ اس کے احساس وقار پر ضرب پڑی ہے ورنہ دفتری معاملات کو اتنی اہمیت کون دیتا ہے اور پھر منصر ضرور یہ دوپہر کے واقعہ کا اثر ہے۔ ورنہ دفتری معاملات کو اتنی اہمیت کون دیتا ہے اور پھر منصر ضرور یہ دوپہر کے واقعہ کا اثر ہے۔ لیلی نے محسوس کیا کہ تمام تر ذمہ داری لیلی پر عائد ہوتی ہے وہی ان کی پریشانی اور دکھ کا باعث ہے۔ احساس گناہ سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

جب وہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے تو دفعتاً منصر نے کہا کیا اتفاق ہے آج آپ ہماری گلی سے تو نہیں گزرے تھے۔

لیلی چونکی اور سوچنے لگی منصر کا سوال اس کی خوش اخلاقی پر دلیل تھا

"میرا مطلب ہے" منصر نے کہا شاید آپ ادھر سے گزرے ہوں

لیلی کا جی چاہتا تھا کہ چیخ، چلا کر کہے نہیں نہیں یہ بہتان ہے دروغ بیانی ہے۔ لیکن منصر کے دکھ بھرے چہرے کو دیکھ کر نہ جانے اسے کیا ہوا اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو آپ ادھر گئے تھے؟"

"جی"

"گھر گئے تھے"

"جی ہاں"

وہ سوچ میں پڑ گیا

"خود سے گئے تھے" اس نے سر اٹھا کر پوچھا

"جی ہاں"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" وہ بولا "آپ مذاق کر رہے ہیں یا

"خود سے گیا تھا"

"پھر" وہ پھر ایک بڑ یہ جلدی ایک بڑا

تعارف

اس روز وہ چھٹی پر منصور علی کو اپنے گھر لے گیا۔ اسے کمرے میں بٹھا کر اس نے آوازیں دینا شروع کر دیا۔ امان صاحب ہوں تو انہیں ذرا بھیجئے بھی۔

امان ایک اونچے مبا جٹ نما شخص تھا۔ انداز میں وہ بات نہیں تھی۔ جو منصور اور سادگی میں بدرجہ اتم نظر آتی تھی "آیئے آپ کو اپنے دوست سے ملواؤں" منصور نے کہا

یہ ہیں علی صاحب

امان چونکا لیکن جلدی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا

"آپ میرے عزیز ہیں" منصور نے امان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بھائی ہی سمجھئے بس فرق صرف اتنا ہے کہ یہ زمیندار ہیں اور میں مزدور

امان نے کوئی استفسار نہ کیا بلکہ چپ چاپ بیٹھ کر علی کو بغور اور بے تکلف دیکھنا شروع کر دیا۔ خاص جو وہ علی کو جانچ رہا تھا۔ علی کو یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو دوپہر کے وقت شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا اور پھر بندوق لے کر اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

"امان صاحب کا گاؤں یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں اگر آپ کبھی ان کے ہمراہ گاؤں جائیں تو آپ کو معلوم ہو کہ زمیندار کس شے کا نام ہے" منصور ہنسنے لگا "اگر یہ جنگل میں ہوں تو میرا پرچہ ہو کانچ کا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگتا ہے اور ہاں" منصور نے کہا "آپ میرے دوسرے بھائیوں سے ملے ہی نہیں ان سے بھی تعارف ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ آج اتفاق سے آپ یہاں آئے ہیں تو ان سے بھی مل لیجئے۔ امان صاحب آپ ذرا جائیں تو فوراً محمد علی کو بھیج دیں شکریہ۔"

جان اٹھ بیٹھا اور جواب دیے بغیر چلا گیا۔

نور ایک شوخ نوجوان تھا جس کی آنکھیں بے حد جاذب تھیں اس کے خدوخال بہت موزوں تھے۔ ان دنوں وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ محمد علی کی آنکھیں دیکھنے والی تھیں نور کی طرح دکھنے والی نہیں۔ اس کے چہرے پر خوابوں کا ڈیرہ پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خوابوں کی بستی سے باہر نکل کر حقیقت کی دنیا کو دیکھنے سے گھبراتا ہو۔ وہ علم کا رسیا تھا اور اس کے انداز میں برما کے بیت کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔

'' بڑی رپورتا'' منصر کے تعارف کرانے کے بعد کہا'' وہ یہاں نہیں ہیں اور اس وقت اس سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

'' آپ شاید سوچ رہے ہیں کہ یہ تعارف کیوں کرائے جا رہے ہیں آپ سے۔ آپ سے یہ الفاظ خود ہی ادا ہوں تو کیا حرج ہے کہ ہم نے آپ کو اپنا لیا ہے علی صاحب''

'' ذرہ نوازی ہے'' علی نے کہا

'' نہیں اس میں ذرہ نوازی کی بات نہیں عام حالات میں شاید آپ کو در خور اعتنا نہ سمجھا جاتا۔ حالات کا تقاضا ہے کہ آپ کو اپنایا جائے اور اگر اپنایا جائے یعنی اگر اپنانا ہی ہے تو کیوں نہ فراخ دلی سے کام لیا جائے'' وہ خاموش ہو گیا۔

'' والد صاحب مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں'' کچھ دیر کے بعد اس نے پھر بات شروع کی '' درحقیقت یہ ہے کہ ہم سب ان کے تابع فرمان ہیں'' وہ ہنسنے لگا

'' دیکھیے'' وہ پھر جوش میں بولا'' اس سے یہ اندازہ نہ لگائیے گا کہ یہ ایک وعدہ ہے کسی قسم کا۔ صحیح یہ ہے کہ ہم وعدہ اس سلسلے میں کرنے کا میں مجاز نہیں ہوں کیونکہ اس معاملے میں میری کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ یہ ہمارے خلوص کا نشان ضرور ہے۔''

'' ہم سب مخلصانہ کوشش کریں گے کیونکہ آخری فیصلہ والد صاحب نے کرنا ہے جو

اس وقت یہاں نہیں اور نہ ہی ابھی تک حالات سے متعلق مطلع نہیں کیا گیا۔ نہ جانے انہیں کب مطلع کیا جا سکے گا۔ چونکہ دانشمندی کا تقاضہ ہے کہ یہ بات وہاب صاحب کی خدمت میں کسی احسن انداز سے پیش کی جائے خیر آپ سفید منزل میں آ سکتے ہیں مناسب ہو گا کہ آپ یہاں اس وقت تشریف لایا کریں جب میں یہاں موجود ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ اس چھوٹی سی تنسیں کو ہمت دیں گے۔"

اس روز یلی ناگھر پہنچا تو اس کی خیالات بے حد پریشان تھے۔

راست گو

اس روز کے واقعات کس قدر عجیب تھے۔ سفید منزل کے تمام افراد کس قدر انوکھے اور دلچسپ تھے اور ان کے کرداروں میں کس قدر تنوع تھا۔ خاموش غم زدہ وامجی۔ زندگی اور رنگینی سے بھرپور سادی، محبت اور خلوص بھری وسدہ رنگ اور رونق سے پر منصور اور سادہ اور پرجوش امان، ذہنی طور پر وہ سب ایک دوسرے سے دور تھے لیکن جذباتی طور پر وہ ایک ہاتھ کی انگلیوں کے مصداق تھے۔

مسلسل دو روز تک یلی ان بیتے واقعات کو ذہن میں دہراتا رہا۔ گذشتہ چند ایک ہفتوں میں کیا کیا واقعات بیت گئے تھے۔ اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ وہ واقعات اس پر بیتے ہیں اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایلی نہ ہو بلکہ کوئی اور ہو۔ اسے اپنی شخصیت کا دوہرا پن شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔

تیسرے روز ڈاک سے سادی کا خط موصول ہوا جس میں سادی نے اس کی راست گوئی کا مذاق اڑایا تھا۔

لکھا تھا

میرے راست گو! میں بناتی ہوں آپ بگاڑتے ہیں میں چنتی ہوں آپ بکھیرتے ہیں میں بنتی رہوں آپ کاٹنے میں مصروف رہئے دیکھئے کہیں آپ پر جھوٹ بولنے

کا فروجہ مندلگ جے۔ چاہے کچھ بھی ہو آپ اپنی راست گوئی قائم رکھیے۔

تو آپ کی اس روز کی راست گوئی کی وجہ سے کتنا ہنگامہ برپا ہو۔ اتنا ہنگامہ ہو کہ خان صاحب کی بندوق بھی بھول گئی۔ ایک راستہ نکالا تھا وہ بھی آپ نے مسدود کر دیا۔ کئی بار کہہ چکی ہوں کہ نہیں براہ راست آپ سے کوئی لگاؤ نہیں۔ ان کا بس چلے تو نہ جانے کیا ہو جائے۔ یہ لگاؤ محض میری وجہ سے ہے لیکن آپ ہیں کہ راستے سے الگ نکل رہے ہیں اور منزل کو بھولے جا رہے ہیں۔ اس طرح آپ کھو جائیں گے اور میری کوششیں بے اثر ہو جائیں گے۔

مگر آپ ایسا نہیں کریں گے۔ کہہ دو کہ ایسا نہیں کریں گے خدا کے لیے ایسا نہ کیجیے

سعدی کا خط پڑھ کر علی کو بے حد افسوس ہوا۔ ظاہر تھا کہ اب سعدی سے ملاقات نہ ہو گی ادھر منصور بھی ایک روز کے لیے باہر چلا گیا تھا لہذا اس سے ملاقات کی صورت بھی نہ رہی تھی۔

علی نے امتحان کی طرف توجہ مبذول کی لیکن اس کا دل مطالعہ سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ لہذا امتحان کی تیاری کرنے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ سارا دن وہ نیم چھتی میں کتاب کھولے پڑا رہتا۔ سوچتا اور پھر تھک کر پڑ جاتا۔ وقت اس کے لیے گویا تھم گیا تھا۔ کسی چیز میں دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ تانگہ کھیل کر جہاز بن گیا تھا۔ اور وہ جہاز کسی نامعلوم سمت میں بہہ رہا تھا بے مقصد بے صرف۔

منزل اور راہی

امتحان ختم ہونے کے بعد وہ سب اپنے گھر جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے جاہ بھوپال اور جمال جاہ کے لیے یہاں سے آنے میں قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی جاہ بھوپال اور جمال تینوں خوش تھے۔ وہ ہمیشہ کے لیے تانگہ چھوڑ رہے تھے۔

علی سوچتا رہا اور آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ علی پور جانے سے پہلے وہ سفید منزل جائے گا تاکہ منصور سے آخری ملاقات کر سکے۔ دل ہی دل میں وہ چاہتا تھا کہ جب

وہاں پہنچے تو منصر موجود نہ ہو اور صادق اسے جنگلے سے دیکھ لے اور وہ دونوں اس چھوٹے سے کمرے میں جا بیٹھیں اور صادق اس کی راست گوئی کا مذاق اڑائے "بیچے باجی" لگے ہمارے راست گو۔ جھوٹ صرف ہم سے بولتے ہیں۔ دوسروں سے نہیں، کیوں جی ٹھیک ہے نا۔"

لیکن جب وہ امتحان سے فارغ ہو کر غید منزل میں گیا تو وہاں نور محمد علی کے سوا کوئی نہ تھا۔ نور نے بتایا کہ وہ سب ہسپتال گئے ہوئے ہیں لیکن کوشش کے باوجود وہ یہ نہ معلوم کر سکا کہ آخر وہ ہسپتال کیوں گئے تھے۔

اس روز امتحان کے بعد منصر سے ملا تھا۔ امتحان کے دوران میں منصر سے قریب قریب روز ملتا رہا تھا۔ پہلے روز جب ایلی پرچہ دے کر ہال سے نکلا تھا تو اس نے دیکھا تھا کہ سامنے منصر اپنے موٹر سائیکل پر آ رہا ہے۔ اور منصر نے حسب عادت کہا تھا "کیا عجیب اتفاق ہے میں بھی ادھر سے گزر رہا تھا۔ آئیے آئیے آپ کو چھوڑ دوں کیسے پرچے کیسے ہوئے" اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا تھا کہ عین اس وقت منصر نہ جانے کدھر سے وہاں آ جاتا جب ایلی کے پرچے کا وقت ختم ہوتا اور سرسری طور پر اسے پوچھتا کیسے پرچے کیسے ہوئے۔ اس روز بھی وہ اس سے ملا تھا اور سرسری باتوں کے بعد اس نے کہا تھا "تو آج آپ جا رہے ہیں اور علی پور گھر کے دروازے پر اسے موٹر سائیکل سے اتار کر کہا تھا اچھا میاں صاحب خدا حافظ۔ خط تو آپ لکھا ہی کریں گے میرا مطلب ہے جب کوئی ضروری بات ہو اور آپ تو ہمارے ہی رہتے ہوں گے علی پور قریب ہی تو ہے انشاءاللہ جلد ملاقات ہوگی۔"

اس روز منصر نے تو ہسپتال کی بات نہ کی تھی۔

ایلی گھر واپس آ گیا۔ اس کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ سامان باندھے یا جانے کی تیاری کرے لیکن سب تیاریوں میں مصروف تھے اور وہ آج چھوڑ رہے تھے ناچار اسے بھی تیاری میں مصروف ہونا پڑا۔ لیکن اس کی تمام توجہ گلی کی طرف لگی ہوئی تھی۔

نہ جانے وہ لوگ کب ہسپتال سے واپس آجائیں لیکن گاڑی کا وقت ہو گیا۔ وہ گلی میں
سے موڑ پر تانگہ نظر آ رہا تھا۔ وہ جاوید اور ریحا کے ساتھ تانگے میں سوار ہو گیا۔ اس نے
نادر گھر اور سفید منزل پر آخری حسرت بھری نگاہ ڈالی اس وقت علی نے محسوس کیا
جیسے وہ منزل کو چھوڑ کر کہیں جا رہا ہو۔ منزل اس کے سامنے تھی لیکن وہ مخالف راستے
جانے پر مجبور تھا۔ کالی رات دوڑ رہی تھی۔ دوڑے جا رہی تھی گھوڑے کے سم یوں بج
رہے تھے جیسے کوئی چھوٹی پیٹ رہا ہو۔ ریل گاڑی کے پہیے اس پر ہنس رہے تھے۔
اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ لاہور سمٹ رہا تھا نیلا آسمان چاروں طرف سے یورش کر
رہا تھا چھوٹے جا رہا تھا مسلط ہوتا جا رہا تھا۔

بیگم

علی پور پہنچ کر وہ بنا سوچے سمجھے سیدھا محلے کی طرف چل پڑا۔ اس کا ذہن ایک خلا
میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے قطعی طور پر احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کیوں
جا رہا ہے۔ علی پور کے گلی کوچوں میں جا رہا ہے۔ اسے راستے میں کوئی نہ ملا۔ بڑی
حویلی سنسان پڑی تھی۔ لالٹین مدھم لو سے جل رہی تھی۔ میدان میں اندھیرا تھا۔
محلے کے مکان کے دروازے بند تھے چند ایک کھڑکیوں میں دھندلی روشنیاں ٹمٹما
رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے چل رہا تھا۔

جب وہ شہزادی کے چوبارے میں پہنچا تو اسے کھلا دیکھ کر وہ چونکا۔ اسے یاد آیا کہ وہ تو
باہر گئی ہوئی تھی۔ سیڑھی دروازے سب کھلے تھے اور وہیں اندر بیٹھ گیا۔

سامنے چارپائی پر شہزادی بیٹھی تھی۔ قریب ہی ایک گول مٹول بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ شہزادی نے
اس کی طرف دیکھا اور وہیں حیران بیٹھی رہ گئی جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہو۔ پھر بولنے
لگی۔

"تو یہ تو علی ہے۔"

"کون آیا ہے" قریب ہی سے ان جانی باوقار آواز سنائی دی۔ اور پھر بیگم اس کے

تھے یا دیکھ رہے لیکن تینوں ہی گیلری کی طرف دیکھ رہے تھے۔

شہزاد کے والد خادم علی بانکے رنگیلے شخص تھے۔ عورت ان کی واحد کمزوری تھی لیکن علی احمد کی طرح وہ عورتوں کو گھر لانے کے عادی نہ تھے۔ وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے کہ عورت کو بیوی بنا لینے سے شوق کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ عورت کو محسوس کرتے اور اس کے حصول کی کوشش کرتے ان کے نزدیک حصول وقتی ملاپ کے مترادف تھا اور اس کے بعد مزید کچھ کی چنداں ضرورت نہ تھی طبعاً وہ ایک بھنورا تھے۔ کلی کلی کا رس چوسنا ان کا شغل تھا۔ لیکن گھر میں پھولوں کے تختے لگانا انہیں پسند نہ تھا۔ گھر میں صرف ایک پھول تھا بیگم چونکہ خادم علی گھر کے معاملات میں دخل دینے کے قائل نہ تھے گھر پر بیگم کی حکومت تھی۔

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا بیگم طبعاً حاکم تھی یا برسوں کی حکومت کے بعد اس میں حکمرانی کا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔ بہر حال گھر کے معاملات میں وہ دخل اندازی گوارا نہیں کرتی تھی۔ اور چونکہ تھی بلا وہ اپنا حق سمجھتی تھی کہ کوئی بات اس کی رضامندی کے بغیر واقعہ نہ ہو۔ وہ نوکروں، کام کرنے والوں اور حتی کہ محلے والوں پر حکم چلاتی تھی۔ دراصل اسے کسی محلے میں رہنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا چونکہ اس کا خاوند محکمہ ریل میں ملازم تھا اس لیے ساری عمر بیگم نے ریلوے سٹیشنوں کے کوارٹروں میں بسر کی تھی۔ جہاں ارد گرد قلی خوانچے والے کارندے اور دیگر لوگ رہتے تھے جو سب خادم علی کے ماتحت کام کرتے تھے۔ لہذا بیگم ان سب کو اور ان کے متعلقین کو براہ راست اپنے ماتحت سمجھتی تھی۔ اس تفصیل کی وجہ سے اس کے انداز میں حکومت جاہ حشمت اور نوابیت کے سے عناصر پیدا ہو چکے تھے۔

بیگم کو خاوند کی کمزوری کا علم تھا۔ اسے صرف ایک دکھ تھا کہ خاوند اس کے حکم سے کیوں باہر تھا اس بات پر اکثر گھر میں فساد ہوتا تھا لیکن خادم علی اپنی رنگینی اور شوخ باتوں کے بل بوتے پر ٹال دیا کرتے۔

اس کے علاوہ چونکہ غلام علی کا جادو صرف ان عورتوں پر چلتا تھا جن کی سماجی طور پر کوئی حیثیت نہ ہوتی تھی۔ اس لیے بیگم ان کی خوش فعلیوں پر حقارت کا اظہار کرتیں اور خاوند کی ہر ایسی خوش فعلی پر بیگم کی اپنی حیثیت اور بھی بڑھ جاتی۔

بہت گھر کے ایک معاملے پر گھر میں غلام علی کی حکومت تھی۔ وہ مقوی اور لذیذ غذا کھانے کے عادی تھے چونکہ ان کا خیال تھا کہ اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے غذا بے حد اہم چیز ہے۔ لہذا گھر میں کھانے سے متعلقہ کوئی بات ان کی رضامندی اور خواہش کے بغیر عمل میں نہ آسکتی تھی۔ وہ بڑے اہتمام سے خصوصی غذائیں حاصل کرتے خصوصی اہتمام سے انہیں تیار کرواتے اور پھر جب وہ دسترخوان پر بیٹھتے تو اہل خانہ پر ہو کا عالم طاری ہو جاتا سب کی نگاہیں غلام علی کے چہرے پر جم جاتیں دل دھڑکتے ہاتھ کانپتے نہ جانے کیا ہو گا۔

پہلا نوالہ منہ میں رکھنے کے بعد یا تو غلام علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکتی اس پر سب کے دل قائم ہو جاتے ہاتھ رواں ہو جاتے اور چہروں پر مسرت بھرا فخر پھیل جاتا۔ ورنہ اگر غلام علی کے چہرے پر مسکراہٹ نہ آتی تو برتن دھم سے دیوار سے ٹکراتے "یہ کیا بنا ہے جاؤ" اور پھر گھر میں سناٹا چھا جاتا۔

غلام علی کے شوق کو بیگم روک نہ سکی تھی اس نے پیار محبت سے سمجھایا۔ آنسو بہائے دھمکیاں دیں کئی ایک عورتیں جنہوں نے غلام علی کے شوق کو پورا کیا تھا انہیں پیٹا بھی لیکن بات جوں کی توں قائم رہی۔ لہذا یہ بات بیگم کو گوارا کرنی ہی پڑی بہر حال بیگم ہی ہٹ کی پوری تھی۔ اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ غلام علی عورت کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا اور اکثر ایسے مواقع آتے تھے جب غلام علی کو یاد آتا کہ بیگم بھی عورت ہے اس وقت بیگم خاوند سے تلخ بخشی کے ذریعے انتقام لیتی تھی۔ حیوان تڑپتا اور بیگم کو اس کا تڑپنا دیکھ کر لذت حاصل ہوتی وہ دہاڑتا چیختا چلاتا اور پھر باہر نکل جاتا اور دیوانہ وار عورت کو تلاش کرتا۔

یک مرتبہ جب وہ ان حالات میں باہر نکلے تو پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی تھی۔ ور ڈبے سے ایک خاتون باہر نکل رہی تھی جو خود کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جس سے وہ بہت سا روپیہ بٹور سکتی ہو۔ وہ فیشن ایبل لباس میں ملبوس تھی ہاتھ میں ہینڈ بیگ ور ماتھے تھے، انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے پڑھی لکھی ہو فرفر انگریزی بولنے لگے گی۔ غلام علی بھانپنے میں بڑے تیز تھے فوراً تاڑ گئے کہ حالات سازگار ہیں اگرچہ پہلے کبھی اس نوعیت کی عورت سے سابقہ نہیں پڑا تھا پھر بھی آخر عورت ہی تھی۔

ان کا مقصد تو محض ملاپ تھا۔ لہٰذا وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے ور چلتے چلتے دونوں ڈائننگ روم میں پہنچ گئے۔

خاتون بڑی ہوشیار تھی اس کا مقصد ملاپ نہ تھا حصول زر کی خواہش بھی وقتی نہ تھی وہ دوام کی قائل تھی چونکہ ضرورت وقتی چیز نہیں۔ لہٰذا اس نے غلام بخشی کو کام کر غلام علی کی آنکھ میں تیل ڈال کر اسے بھڑکا دیا۔

بیگم کو علم ہو تو وہ تیخی چلاتی لیکن بیگم کو یہ علم نہ ہوا کہ غلام علی کے اس نئے تعلق میں دوام کا عنصر ہے لہٰذا وہ تیخ چلا کر خاموش ہوگئی۔

ادھر خاتون نے غلام علی کو پورے طور پر ہاتھ میں لے کر اسے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اس نے یہ تعلق صرف اس لیے گوارا کیا تھا کہ اسے پہلی ہی نظر میں غلام علی سے محبت ہوگئی تھی محبت کا لفظ سن کر غلام علی سکتے میں رہ گئے۔ آج تک کبھی کسی عورت نے ان سے محبت کا اظہار نہ کیا تھا۔ اور ان کی اپنی بیوی تو بے رخی کا انسپکٹر تھی۔ لہٰذا وہ خاتون کے گھر میں آگئے اور خاتون کے تحفظ سے متعلقہ تمام شرائط کو تسلیم کر کے انہوں نے خفیہ طور پر اس سے نکاح کر لیا۔ خاتون نے تحفظ کے طور پر بیگم کو طلاق دینے کا بھی مطالبہ کر دیا۔

جب بیگم کو معلوم ہوا تو وہ سناٹے میں آ گئی۔ اسے یقین نہ آتا تھا وہ سمجھتی تھی یہ محض دھمکی ہے یہ ایک ناخوش کن خواب ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دفعتاً اسے معزول کر دیا

جائے اور اس عمر میں تخت سے اتار دیا جائے جب کہ وہ چار جوان بچوں کی ماں تھی جن میں دو شادی شدہ تھے۔ لیکن جب طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں تھمایا گیا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

اور اب وہ ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی شہزاد کے پاس آ گئی تھی۔

بیگم نے لیلی کی طرف دیکھا گھورتے ہوئے کہا "یہ یہاں ٹھہرے گا کہاں"

شہزاد ہنسنے لگی "ارے اپنے ہی گھر ٹھہرتا ہے انسان"

بیگم نے حیرت سے شہزاد کی طرف دیکھا

لیلی نے محسوس کیا کہ ابھی بیگم اٹھ کر لیلی کے کان پکڑ لے گی۔

بیگم کے اس رویے کے بعد شہزاد نے اپنی تمام تر توجہ لیلی کی طرف مبذول کر دی۔ وہ اٹھی میز کو جھاڑا، نیا میز پوش نکالا اور پھر خود میز پوش پر لیلی کے سامنے لا رکھا۔

"اب چائے لاؤ جانو" وہ بولی

"میں یہ کام کیے دیتی ہوں" بیگم بولی "تم کیوں خود اٹھو تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں"

"اس کام سے ہی چین ہے" شہزاد جان بوجھ کر بیگم کو تپا رہی تھی

"مجھے تو سمجھ نہیں آتی تمہاری باتیں" بیگم نے بصد تحمل کہا

"آ جائے گی سمجھ" شہزاد بولی "آؤ لیلی تو اب چائے بھی پیے گا یا نہیں"

"ہوں" لیلی بولا اس نے ان دونوں کی باتیں سنی ہی نہ تھیں۔ نہ جانے وہ کہاں کھویا ہوا تھا۔ شہزاد ہنسی "اچھا تو یہ بات ہے اب یہاں پہنچ کر بھی کھوئے ہوئے ہو۔"

چند ہی روز میں بیگم اور لیلی ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے لیلی نے محسوس کیا کہ وہ پر رعب اور طمطراق بھری بیگم دراصل ایک دکھی ہوئی عورت ہے۔ اپنے گھر کی باتیں یاد کرتے ہوئے یا غلام علی کا کوئی قصہ سناتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو

جاتے ہیں نہیں رونے کی کوشش میں ضبط ٹوٹ جاتا ہے پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔

شہزاد کے گھر میں بیگم کی باتیں سننے والا کوئی نہ تھا۔ شہزاد کی دو بیٹیاں تھیں گود میں لگی رہتیں تیسری بچی بھی صرف دو ایک ماہ کی تھی۔ ان کے علاوہ جو نوکرانی تھی جو ہر وقت گھر کے کام میں لگی رہتی تھی محلے والیوں کے روبرو ایسی باتیں بیان کرنا بیگم کے وقار کے منافی تھا۔

شہزاد کی شادی کے بعد علی پور میں بیگم صرف دو تین مرتبہ آئی تھی۔ محلے پر وہ پھبتیاں اڑایا کرتی۔ ناک بھوں چڑھاتی "یہ تمہارے یہاں کیسے کیسے ہیں اور یہ یہاں کے لوگ کیسے ہیں" اس کے اندر میں نفرت کی جھلک نمایاں ہوتی وہ بہن تمہارے خاوند کیسے ہیں جو میرے گھر میں کیا مجال ہے جو نمک ذرا زیادہ یا کم ہو اگر گوشت زیادہ گل گیا ہے یا ذرا کم گلا ہے تو بھی ہم میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ اس اللہ کے بندے کے سامنے رکھیں۔ بس سمجھو اور زلزلہ آ جاتا ہے برتن دھم سے دیوار سے ٹکرا کر ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور پھر ان کی آواز گونجتی ہے شوکت کی ماں یہ کیا ہے لاحول ولا قوۃ توبہ ہے بہن خاوند کی بات سناتے ہوئے بیگم پر کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

بات بات پر اپنے گھر کی بات کرنا گھر میں اشیاء کی افراط کا تذکرہ کرنا اور پھر اپنے خاوند کے غصے اور دبدبے کا اظہار کرنا بیگم کی عادت تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ سمجھتی تھی کہ دوسروں کے لیے حقارت اور تضحیک کا اظہار نہ ہو تو اپنے گھر کی بات سنائی ہی نہیں جا سکتی۔ اب بھلا بیگم کس منہ سے ان محلے والیوں کو اپنی تضحیک کا قصہ سناتی کس طرح بتاتی کہ اس کی حکومت چھن چکی ہے۔ وہ معزول ہو چکی ہے۔ فی الحال یہ بات تو گھر کے چند ایک افراد کے درمیان سربستہ راز تھی اور محلے والیوں کے سامنے بیگم اسی انداز سے بات کرتی تھی جیسے اس کا گھر قائم ہو اور اس کے میاں بدستور اس کے میاں ہوں۔

ہند بیگم کے لیے محلے والیوں سے بات کرنا ممکن نہ تھا۔ شہزادی سے بات کرتی تو وہ قہقہہ مار کر ہنستی "ہاں پھر کیا ہوا اسے بھی کر لینے دو مزے چند ایک سال نئے فیشن کی بیوی کی ہے بابو کو" ہنستی۔

"ہائے لڑکی" بیگم حیرت سے شہزادی کی طرف دیکھتی

شہزادی پھر قہقہہ لگاتی "ہاں جو ہوا اب چھوڑو یہ قصہ تمہارے بال بچے ہیں۔ اپنے گھر تمہارے اپنے ہیں جس کے پاس جی چاہے رہو جو چاہے کھاؤ پیو۔ پھر رونا کس بات کا اور پھر ہاں تمہاری عمر بھی اب پینتالیس کے قریب ہو گی اس عمر میں خاوند سے جدائی ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

دو ایک دن میں بیگم نے محسوس کر لیا کہ ایلی وہاں صرف اس لیے موجود تھا کہ سارا دن اس کی باتیں سنے اور ظاہراً ہمدردی کرے۔ اس میں شک نہیں کہ ایلی کو بیگم سے بے حد ہمدردی تھی لیکن دقت یہ تھا کہ جب بیگم اسے کوئی قصہ سناتی تو سنتے سنتے کسی لفظ یا اشارے کی وجہ سے ایلی کا خیال نہ جانے کہاں جا پہنچتا اور وہ بیگم اور جانو کے پاس بیٹھ کر خالی سر ہلاتا رہتا۔

پھر بیگم کی آپ بیتیوں کے بعد ایک اور دور آیا اور بیگم اور ایلی مل کر عجیب و غریب مصروفیات میں کھو گئے۔ بیگم ایلی کو اشارہ کرتی کہ چلو میں آئی۔ وہ اوپر جا کے خالی چوبارے میں جا بیٹھتا کچھ دیر کے بعد بیگم آ جاتی اور سیاہ روئی کی تھیلی سے نکال کر کہتی "اس نے کہا ہے اس روئی کی سات بتیاں بنا لو کورے برتن میں موم کی پتلی بنا کر رکھ دو پھر اس بتی کو آگ لگا کر اس برتن میں ڈال دو لیکن اس طریق سے ڈالو کہ بتی بجھے نہیں۔ اور جب تک برتن سے دھواں نکلتا رہے ایک ٹانگ پر کھڑی ہو کر "آئی بلا کو ٹال تو" پڑھتی رہو۔

"یہ عمل مجھ پر بھی دکھاتا ہے یا نہیں" ایلی پوچھتا

"بڑا سیانا ہے" بیگم جواب دیتی "ہزاروں کے گھر آباد کر دیے اس نے"

"پھر تو بہت اچھا ہے" ایلی کہتا

"بس ایک ہی مشکل ہے"

"وہ کیا؟"

"میں ایک ڈھنگ پر ہی حاضری ہو سکوں گی اتنی دیر سے ہے"

"تو اس میں کیا ہے ہاتھ سے زمین کو تھامے رکھنا"

"ہاں" وہ مسکراتی "یہ ٹھیک ہے"

"کہو تو میں سہارا دیے رہوں" ایلی سے ہمدردی جتاتا

وہ غصے سے ایلی کی طرف دیکھتی۔ بیگم کو ایسی بات بری لگتی تھی جس سے قرب کا احساس ہو یا بے تکلفی کا اظہار ہو۔ اس کی دانست میں بے تکلفی جنسی تعلق کی دلیل تھی۔ اور جنسی تعلق کے لیے بیگم کے دل میں نفرت کے جذبات قائم ہو چکے تھے۔

بیگم دعا کے دیے ہوئے تعویذ لے آتی اور وہ دونوں بیٹھ کر انہیں پانی میں گھولتے رہتے۔

ان عملیات کے بعد وہ ان کے نتائج کا انتظار کرتے۔ ایلی کو تو خیر ان عملیات پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ وہ جادو سحر تعویذ یا اس قسم کی دوسری چیزوں کے اثر سے قطعی طور پر منکر تھا۔ البتہ بیگم کی تسلی کے لیے وہ کہا کرتا تھا "ہاں ان چیزوں کا اثر ہوتا ہے" لیکن شہزاد تو بے باکانہ ان باتوں کا مذاق اڑایا کرتی۔

دوپہر کے وقت دروازہ بجتا تو وہ جانو سے کہتی "جا میرے منے دیکھ شاید ڈاکیہ رجسٹری لایا ہے"

"رجسٹری" جانو حیرت سے پوچھتی

"کیا مطلب" ایلی دریافت کرتا

پھر وہ نہایت سنجیدگی سے جواب دیتی "اماں کا عمل جو ختم ہو گیا ہے اب ان کی طرف سے اطلاع تو آئے گی ہی کہ وہ قصہ ختم ہو گیا ہے اب گھر آجاؤ کیوں ہاں"

یہ جب بیگم اور ایلی بتی جلانے میں مصروف ہوتے تو وہ نہایت سنجیدگی سے پوچھتی ''اماں یہ موم کی پتلی تم ہو یا ہماری سوتیلی'' اس طرح وہ اکثر مذاق ہی مذاق میں اماں کے ان عملیات کا مضحکہ اڑایا کرتی۔ اکثر اس کی باتیں ذومعنی ہوتیں اور ایلی انہیں سن کر چونکتا۔

مثلاً پہلے روز ہی اس نے بیگم سے کہا تھا ''اماں چھوڑو ان عملیات کو بھلا بتیاں جلانے سے کیا ہوتا ہے، اگر یہ عمل پر اثر ہوتے تو میں تعویذ کے زور پر کسی کو اپنا نہ بنا لیتی'' شہزاد نے ایلی کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کے ماتھے کا تل بے حد شوخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں مایوسی اور حسرت بھری تمنا کی تھی۔

پھر ایک روز شہزاد کے ساتھ روئی پڑی دیکھ کر بیگم نے پوچھا تھا ''روئی کیا کرے گی تو'' اور اس نے جواب دیا تھا ''میں بھی بتیاں بناؤں گی'' ''کیوں تمہیں کیا ہے؟'' اماں نے پوچھا تھا اور اس نے جواب دیا تھا ''بہت کچھ ہے اماں پر تمہیں دکھتا شاید بتیاں جلانے سے میرا بھی ساتھی واپس آ جائے'' اور ساتھ ہی اس نے بڑی جرأت اور بے باکی سے ایلی کی طرف دیکھا تھا ''کیوں ایلی'' اس نے کہا تھا ''جانے والے واپس بھی آ سکتے ہیں کیا'' اور پھر یوں ہنسی تھی جیسے آبگینہ کسی ان جانے دباؤ سے چور چور ہو گیا ہو۔

شہزاد کو بیگم کے ان عملیات اور اس کے قصے کہانیوں کے خلاف سخت شکایت تھی چونکہ ان مصروفیت کی وجہ سے ایلی اس سے دور ہو گیا تھا۔ شہزاد کو ایلی کے قرب میں چنداں دلچسپی نہ تھی بلکہ عام طور پر وہ ایلی کے قرب سے گھبرا جاتی تھی لیکن اس کی خواہش تھی کہ ایلی کے دل میں شہزاد کی آرزو کم نہ ہو جائے۔ وہ اسے ملنے کی آرزو لیے بیٹھا رہے۔ تنہائی کے لمحات کی آرزو کرے عملی طور پر کوشش کرے تنہائی میں اس سے ملے اس کے لٹکتے بازو کو کسی طرح تھامے جیسے ڈوبتے کو تنکا ہو۔ اس کے پاؤں کو اپنی نگاہوں سے گھیرے رکھے۔ وہ رنجیدہ کر دیوانہ وار اس کی طرف دیکھتا

رہے۔

لیکن اب کی بار جب سے علی علی پور آیا تھا وہ ان سب باتوں سے یوں بے نیاز ہو چکا ہو جیسے وہ ۔۔۔۔ علی ہی نہ ہو۔ البتہ وہ چھوٹے سے چھوٹے موقع پر بیگم کو ساتھ لے کر رات کے چوبارے میں جا بیٹھتا اور بیگم کی باتوں میں مصروف ہو جاتا۔ یہ دیکھ کر شہزادی بار بار بہانے سے چوبارے میں آتی علی کے قریب تر کھڑی ہوتی چوری چوری اس کا منہ دیکھتی۔ چٹکیاں بھرتی اور باتوں ہی باتوں میں بہت کچھ کہہ جاتی۔

فیکسیشن

علی کی اس ظاہر بے نیازی نے شہزادی کے شوق کو بھڑکا دیا تھا۔ یہ شہزادی کی پرانی عادت تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے پھرو تو وہ آگے کی سمت بھاگتی تھی اس سے دور رہو تو وہ تقرب کرتی تھی حتیٰ کہ دور رہنے والا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا اور پھر وہ دفعتاً بے نیاز ہو جاتی۔

ایک روز جب بیگم کسی محلے کے ہاں گئی ہوئی تھی جانو نیچے باورچی خانے میں مصروف تھی اور علی چپ چاپ چوبارے میں بیٹھا ہوا تھا تو شہزادی نے پیچھے سے آ کر اس کی آنکھیں بند کر لیں اس سے پہلے ایسے حالات میں وہ کھلونے کی طرح بجنے لگتا اس کی نس نس میں گویا بھڑوں کا چھتہ بھنبھنانے لگتا اور وہ دیوانہ وار اس کے ہاتھوں کو چومنا شروع کر دیتا تھا لیکن اس روز وہ چپ چاپ بیٹھا رہا اور پھر کہنے لگا

"شہزادے"

اس پر شہزادی ہنسی ٹھٹھا مار کر کہنے لگی "چلو آخر ایک نہ ایک دن جانے والے نے جانا ہی تھا۔"

"کیا مطلب؟" وہ بولا۔

"میں پہلے ہی جانتی تھی" وہ ہنسی اس کی ہنسی میں شکست کی بو تھی

"کیا؟" علی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا

"نہیں بے پروا بے نیاز کو کون سزا دے سکتا ہے سزا تو صرف اسے دی جا سکتی ہے جو پروا کرتا ہو جسے ملال ہوتا ہو"

"تو مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کے قصور پر دوسرے کو سزا مل رہی ہے" وہ ہنسنے لگی۔

"بہرحال" وہ بولی "گاڑی فلیگ اسٹیشن سے نکل گئی" پھر اس نے زخمی بازو اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"مجھے کوئی شکایت نہیں" وہ ہنسنے لگی "ہونی ہو کر رہتی ہے۔ لیکن" وہ بولی "یہ سب باتیں جو تم سنا رہے ہو محض باتیں ہیں" وہ سنجیدہ ہو کر بولی "ایک روز میں نے تمہیں ایک کہانی سنائی تھی معلوم ہوتا ہے وہ کہانی اب ختم ہو رہی ہے۔" اس نے آہ بھری "اور یہ کہانیاں جو تم مجھے سنا رہے ہو محض قصے ہیں سنانے کے قصے تم ناراض اس لیے ہوتے تھے کہ تم مجھ پر شک کرتے تھے تم سمجھتے تھے کہ میں ہر کسی سے آنکھیں لڑاتی پھرتی ہوں۔ اس روز تم یہی لے چلے گئے۔ لیکن یہ تمہاری آنکھ کی نگاہ نہ تو اس شک کی وجہ سے ہے اور نہ خفگی کی وجہ سے یہ تو" وہ رک گئی

"یہ تو کیا؟"

"یہ تو گاڑی فلیگ اسٹیشن سے نکل گئی اور بس" وہ مسکرائی

"کیا مطلب" ایلی نے تڑپ کر شہزاد کی طرف دیکھا

شہزاد کے گالوں پر دو آنسو ڈھلک رہے تھے "اچھا کیا" وہ بولی "بہت اچھا ہو یہاں ٹھہر ہی گیا تھا۔ جو تمہاری بیعت کیا جاتا۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ زندگی میں تم سے ملنا ہوگا تو میں تمہاری بیعت کرنے کے لیے اپنا سب کچھ امانت رکھتی" اس نے آنسو پونچھے اور دفعتاً کہنے لگی "میرا ہاتھ تو تھام لو کم از کم چلو ہو کر ہی سہی۔ اب میں خود کو دھوکہ دے کر بھی دیکھ رہی ہوں اس میں میری مدد کرو۔"

شہزاد نے ایک عجیب سی نگاہ ایلی پر ڈالی۔ ایلی نے زبردست دھچکا سا محسوس کیا وہ

گزر رہا تھا گزر جا رہا تھا۔

علی کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ تھی کہ اس پر ہمیشہ شدید خوف غالب رہتا تھا کہ اسے بے وقوف نہ سمجھا جائے۔

ہوس یا محبت

علی احمد کے گھر میں پرورش پانے کی وجہ سے چند ایک باتیں اس کے دل میں گھر کر گئی تھیں اور اس قدر جڑ پکڑ چکی تھیں کہ انہیں دل سے نکالنا ناممکن ہو چکا تھا۔ وہ ان باتوں پر اس حد تک یقین رکھتا تھا کہ وہ اس کی شخصیت کی بنیاد بن چکی تھیں۔ یہ باتیں تجربے دلیل عقل یا شعور سے اخذ نہیں کی گئی تھیں۔ بلکہ اس کے دل کے گہرے ترین جذبات ان کا منبع تھے۔

علی سمجھتا تھا کہ محبت صرف ایک محبوب سے ہو سکتی ہے اور مقصود شادی نہ ہو تو وہ محبت نہیں ہوتی۔ اس کے ذہن میں کسی سے محبت لگا کر بے وفائی کرنا شدید ترین گناہ تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ عورت کو مکمل آزادی ہونی چاہیے اس سے ایسا سلوک روا نہیں رکھنا چاہیے جس میں تمیز کا عنصر ہو۔ اسے بھیڑ بکری یا غلام نہیں سمجھنا چاہیے۔

یہ سب خیالات اس نے علی احمد، بادہ اور اپنی زندگی سے اخذ کیے تھے۔

اس نے اپنے باپ کی جنسی بے راہ روی کی وجہ سے بہت دکھ سہا تھا۔ اپنی والدہ کی مظلومیت کی وجہ سے اس کا بچپن تباہ حالی میں گزرا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ اس محبت سے محروم رہا تھا جس کے بغیر بچے کی شخصیت پھل پھول نہیں سکتی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے شہزاد سے محبت ہے تو پھر سادی سے کیا ہے۔ اسے سادی سے تنہائی میں ملنے کے کئی ایک مواقع ملے تھے۔ گھنٹوں وہ اس کے پاس کھڑا رہا تھا لیکن اس نے کبھی کوئی خصوصی خواہش محسوس نہ کی تھی۔ اسے سادی سے مل کر ایک انجانی خوشی ہوتی تھی اس کا خط پڑھ کر وہ مسرت کی ایک لہر محسوس کرتا تھا۔

اگر اسے سادی سے محبت ہے تو پھر شہزادے کیا تھا۔ کیا اس روز جب وہ کہانی سنا رہی تھی۔ اور کیلی نے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے اس کا رواں رواں کاری پہنچی تھا۔ اس وقت اس کی نس نس میں گھنٹیاں سی کیوں بجی تھی جب وہ شہزادکا ہاتھ پکڑتا تھا تو اس کے جسم میں چیونٹیاں سی کیوں چلنے لگتی تھیں کیوں اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے قریب تر ہو جائے اور قریب اور قریب!! کیا یہ ہوس تھی یا جسمانی قرب کی خواہش ہوس ہوتی ہے۔

لیکن محبت میں آرزو تو ضرور ہوتی ہے۔ قرب کی آرزو نہ ہو تو کیا ہو سکتی ہے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا۔

یہ درست تھا کہ سادی کیساتھ اس نے جسمانی قرب کی خواہش محسوس نہ کی تھی سادی کی موجودگی میں ایک لطیف سا نشہ اس کی نس نس پر چھا جاتا تھا۔ لیکن شہزاد سے ملتے وہ تنہائی کی آرزو کرتا تھا اور تنہائی میسر ہوتی تو اس کا جی چاہتا اس کے قریب تر ہو جائے۔ اگر شہزاد ایسے موقعے پر بے پروا نہ ہو جایا کرتی تو نہ جانے اس قرب کا نتیجہ کیا نکلتا۔ بہر حال وہ نتیجہ سے قطعی طور پر گوارا نہ تھا۔ جو اس روز بند بیٹھک میں ہوا تھا اس کی کیلی نے آرزو نہ کی تھی بلکہ اس نے وہ قدم صرف اس لیے اٹھایا تھا کہ اس کو یقین تھا کہ اگر عورت سے منہ زبانی محبت کی جائے تو وہ اکتا جاتی ہے۔

بہر حال جہاں تک اس کے اپنے جذبات کا تعلق تھا وہ دل کی گہرائیوں میں سادی کی محبت کو بہتر سمجھتا تھا چونکہ اس میں گناہ کا عنصر شامل نہ تھا سادی کسی کی بیاہتا بیوی نہ تھی اس کے علاوہ اسے شہزاد پر اعتماد نہ تھا نہ جانے کیوں وہ سمجھتا تھا محلے کے تمام جوان اس کے عشق میں سرشار تھے اور شہزاد کو تو محبت بھری نگاہوں کے حرم سے خود کو محفوظ کرنے کی خواہش نہ تھی۔ چاہے وہ نگاہیں کسی کی بھی ہوں۔

شہزاد کا حسن اس کے دل میں احساس رقابت پیدا کرتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ ساری دنیا اس کی رقیب ہے اور وہ شہزاد کے نقاب کے ابھرے تاروں کو گنتا رہتا لیکن شاید

بھی محبت کا ثبوت ہو۔ بہر حال یہ احساس اس قدر اذیت دہ تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ اس سے نجات حاصل کرے۔

وہ چوری چوری دعائیں مانگتا تھا کہ سادی کی بات میں مشکلات حائل نہ ہو جائیں سادی اس کی ہو جائے اور اس کی زندگی سے وہ خوف، رقابت اور احساس گناہ خارج ہو جائے جو شہزادی کی محبت سے وابستہ تھا لیکن اس میں اس قدر جرأت نہ تھی کہ علانیہ اس آرزو کو اپنائے کیونکہ وہ ڈرتا تھا کہ اسے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ وہ شہزادی سے بے وفائی کر رہا ہے اور یہ بات اسے کسی صورت میں گوارا نہ تھی۔

جب سے علی لاہور سے آیا تھا اس نے شہزادی کی طرف سے خصوصی توجہ نہ دی تھی۔ اس نے اس کا شکستہ ہوا بازو پکڑنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس نے غور نہ کیا تھا کہ اس کے ماتھے کا تل کب سیاہ پڑ گیا اور کب سرخی مائل اس نے شہزادی کے جسم کی خوشبو کی اس شدت سے محسوس نہ کیا تھا۔ اپنی اس تبدیلی اس بے رخی کا جواز یہ پیدا کیا تھا کہ وہ شہزادی سے ناراض ہے چونکہ پچھلی مرتبہ جب وہ علی پور گیا تھا تو شہزادی نے اس سے بے پروائی کا سلوک کیا تھا۔

بہر حال اندرونی طور پر وہ ایک شدید کشمکش میں مبتلا تھا اس میں اس قدر جرأت نہ تھی کہ شعوری طور پر فیصلہ کرتا کہ آیا اسے سادی سے محبت تھی یا شہزادی سے یا بیک وقت دونوں سے

اگر شہزادی ایک عام عورت ہوتی تو وہ علی کو یوں بے پروا دیکھ کر بے زار ہو جاتی شہزادی کے لیے علی بدنامی کے ٹیکے کے سوا اور کیا تھا۔ علی کی وجہ سے محلے والیاں اسے طعنے دیا کرتی تھیں۔ ماجرہ اور فرحت سمجھتی تھیں کہ شہزادی نے جادو کے زور پر علی کو طوطا بنا کر اپنی انگلی پر بٹھا رکھا ہے حتیٰ کہ اس کا خاوند اس سے بدظن ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی اپنی والدہ شکوک سے بھری ہوئی تھی لیکن مجبور تھی۔ شہزادی کے تیور دیکھ کر خاموش

ہو رہی بلکہ خود ہی ہر روز شہزاد سے ایک نیا جھگڑا کھڑا کر دیتا تھا تم نے فلاں کی طرف کیوں دیکھا تھا۔ تم میرے پاس بیٹھنے سے گریز کیوں کرتی ہو۔ سارا دن ہی کے سامنے چڑھاوے چڑھتے رہتے۔ نئی نئی چیزیں پکا کر اس کے سامنے رکھی جاتیں جیسے گھر میں دیوتا بٹھا رکھا ہو۔

شہزاد کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ وہ دیوتا سامنے بیٹھا رہے۔ نہ تو اس کے آگے بھکشا کے لیے ہاتھ پھیلائے اور نہ ہی اٹھ کر کہیں جائے لیکن اس کی پریم مریدھریت بجتی رہے۔ دراصل شہزاد ذہنی طور پر ان چھوئی عورت تھی جسم سے الگ تھی اسے پیار محبت کا بالا قائم رکھنے کا جنون تھا وہ چاہت کی پیاسی تھی لیکن گگری بھرنے سے بچتی تھی۔ وہ جسمانی قرب کو صرف اسی صورت میں برداشت کرنے کے لیے تیار تھی جب پریم کے دیپ کو جلتا رکھنے کے لیے اس میں تیل ڈالنا ضروری ہو جائے۔

ایلی کی بے پروائی کو محسوس کر کے شہزاد یوں تڑپنے لگی جیسے مچھلی جل بن تڑپتی ہے۔ پریت کا دیپ بجھتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں، ہاتھوں، ہونٹوں اور انگ انگ سے تیل کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ دیوتا کو منانے کے لیے ناری بنی بھینٹ کے لیے کھڑی تھی۔

ایلی کو ابھی تک یہ علم نہ تھا کہ عشق میں ازلی طور پر خودکشی کا عنصر ہوتا ہے۔ عشق بذات خود عاشق کو محبوب کے وصال سے محروم کر دیتا ہے۔ اسے علم نہ تھا کہ محبت محبوب کا حصہ ہے عاشق کا نہیں اور اگر کسی کی محبت حاصل کرنا مقصود ہو تو اسے محبوب بننے کی کوشش کرنا چاہیے نہ کہ عاشق اور بے نیازی محبوب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ شادی کے خیال میں کھو کر وہ شہزاد کا محبوب بن گیا اور ناری کی تمام قوتیں اس بات پر تل گئی تھیں کہ ایلی کی محبت کا دیپ جلا رہے اسے وہی پرانی حیثیت بخش دی جائے اور پھر شہزاد شہزادی بن کر وہی پرانا بے نیازی کا روپ دھارے

ور پھو مد رو و پڑے رنگتلی ی دھر ادھر اڑتی پھرے۔

یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ بیگم اس وقت ملی پر آتی تھی جب شہزادو رملی نے اپنے رول بدل لیے تھے۔ ورملی کی حیثیت محبوب کی بن چکی تھی۔

گروہ پہلے آتی تو ممکن ہے وہ سمجھتی کہ ملی شہزادے کی طرف ہاتھ بڑھا رہی ہے ور شہزادے دھتکارتی نہیں بیٹھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ شہزادہ ہاتھ پھیلا رہی ہے ور ملی دیوتا سامنے بے نیاز بیٹھی ہے۔ لہذا اس نے محسوس کیا شہزادہ غلام ہے ور ملی ایک نچ عورت جو خریدی جا سکتی ہو نتیجہ یہ ہوا کہ بیگم کے دل میں شہزادے کے لیے وہی جذبات پیدا ہو گئے جو غلام سے وابستہ تھے۔ نفرت اور حقارت کا یہ طوفان چونکہ چل نہ سکتا تھا لہذا اس کے دل کی گہرائیوں میں اکٹھا ہوتا گیا اور اس کے کس ہونے کی وجہ سے شہزادو رملی کا مستقبل تاریک ہوتا گیا۔

سب سے پہلے بیگم نے اس کا اظہار جانو کے سامنے کیا۔

جانو نے اپنی تمام تر زندگی تیاگ کے تحت بسر کی تھی۔ وہ جوانی میں خوش شکل تھی ور جوانی ہی میں اس کا خاوند مر چکا تھا اور اس نے اپنی تمام تر زندگی دوسروں کے کام کاج کرنے اور اپنی عصمت کے تحفظ میں بسر کی تھی بیگم کی بات سن کر وہ جوش فشاں پھٹ گئی۔

"ہے ہے" جانو بولی "بیگم یہاں تو آئے دن یہی کچھ ہوتا ہے اب رانی سے کون کہے کہ بیٹا آپ سنبھال"

"آخر بیٹی کس کی ہے" بیگم کے دل میں غلام علی بسا ہوا تھا۔

"بیٹی تو تمہاری ہی ہے" جانو بولی

"ہائے میری ہوتی تو یہ چلن نہ ہوتے"

"اور وہ شریف میاں بدھو" جانو بولی "وہ سب کچھ دیکھ رہی کس سے مس نہیں ہوتا ویسے نام کو خاوند ہے۔"

شہزادی پھر ہنسی "تو اماں رنج یا پاٹ کے لیے روتی ہو تا میں سمجھتی تھی پتی بھتی کے لیے رو رہی ہو"

"جس پر بیتے وہی جانے ہے" بیگم نے کہا

"مجھ پر بیتے تو میں سمجھوں۔ خس کم جہاں پاک" شہزادی نے معنی خیز نگاہ ایلی پر ڈالی

"تیری نظر میں کوئی ہوگا" بیگم نے ایلی پر چلتی سی نگاہ ڈالی

شہزادی نے قہقہہ لگایا "ہاں ہے" وہ بولی "نہ بھی ہوتا جب بھی یہی سمجھتی"

جانو ابھی تک اس کے ہاتھ میں خط تھا

"دیکھنا میں نے کہا نہ تھا" شہزادی بولی

"تمہارا ہی محبت نامہ ہوگا" بیگم بولی

"مجھے کون لکھتا ہے جی اور پھر محبت نامہ" وہ قہقہہ مار کر ہنسی "محبت ناموں میں زیادہ سے زیادہ یہ لکھا ہوتا ہے کہ روٹی کی تکلیف ہے۔ ان کا تو صرف روٹی کا رشتہ ہے کسی اور سے انہیں مطلب نہیں۔ انہیں محبت سے کیا واسطہ"

"یہ تو میرا ہے" ایلی نے کہا

"شاید غلطی سے تمہارا نام لکھ دیا ہوگا تو" شہزادی بولی

ایلی نے اسے کھولا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ سادی کا خط تھا

جانو چلائی "یہ کیا خط ہے یہ تو اخبار معلوم ہوتا ہے"

"اور کیا محبت کی بات ختم ہوتی ہے کیا" شہزادی بولی

ایلی کا رنگ فق ہو گیا

"اور جس کا نام آیا ہے اس سے پوچھو تو کیا سادی رہ جاتا ہے" شہزادی مسکرا دی

ایلی نے محسوس کیا جیسے شہزادی سادی کے تمام قصے سے واقف ہو

"یہ تو کالج کے متعلق ہے" ایلی کہنے لگا

ضرور دیا جائے۔ اور اس پتہ پر دیا جائے اور اس کی راست گوئی کا مضحکہ اڑایا تھا۔
جس سے ظاہر تھا کہ مدعا کو راز رکھنا ضروری ہے۔

دیر تک ایلی بیٹھا رضا کے خط کو ذہن میں دہراتا رہا پھر وہ اس کا جواب سوچنے میں منہمک ہو گیا۔ دوسرے دن ایلی کو خیال آیا کہ کیوں نہ رضا سے مل لوں۔ وہ اپنی بے عقلی پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ رضا کی دوکان بند تھی اس لیے وہ اس کے گھر چلا گیا۔ ایلی کو گھر کے دروازے پر دیکھ کر رضا کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"تم یہاں" وہ چلایا "یار بڑے خوش نصیب ہو جو گھر آئے ورنہ آج ہی میں نے بڑا خطرناک فیصلہ کیا تھا"

"کیا؟" ایلی نے پوچھا

"اب بتانے کا کیا فائدہ۔ تم آ گئے ہو تو چلو معاف کر دیا" وہ ہنسنے لگا "آؤ بیٹھو اندر چلو تمہیں ایک خبر سناؤں"

"کیا" ایلی نے پوچھا

"شادی ہو رہی ہے"

"کس کی"

"اپنی اور کس کی"

"تمہاری" ایلی نے حیرت سے اس کی لنگڑی ٹانگ کی طرف دیکھا۔

"بھئی شادی کو لنگڑے پن سے کیا تعلق" رضا نے قہقہہ مار کر کہا "جبکہ لنگڑے کی چلتر تو مشہور ہے۔"

"تعجب کی بات ہے" ایلی بولا

"بھئی بفضل اللہ، لنگ سے آج تک بھی روزی پہنچتی رہی ہے اب مستقل صورت پیدا ہو جائے گی۔"

اس کے بعد ایلی کا معمول ہو گیا کہ وہ روز کسی نہ کسی وقت رضا کو ملنے چلا جاتا۔ اور

وہ دونوں یا تو دکان میں بیٹھے رہتے یا شیخ ہمدم کے ہاں چلے جاتے۔

شیخ ہمدم انہیں دیکھ کر شور مچا دیتا۔

"ارے بھئی اب تو چھوڑو یہ دیوتا، ہمارے مہمان آئے ہیں اب تو سو دو سو ہو گئے سارے دن لگنے پر بس ہوا تو یہاں صاحب آئے ہیں آئیے آئیے بھئی ہم سے بھی کچھ کھا پی لیا کرو۔ دال کا حال کھاؤ گے تو موٹے ہو جاؤ گے چلو ایک شطرنج کی بازی رہے۔ ور کے دینا ہمیں شطرنج۔"

ہمدم کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے علی سب کچھ بھول جاتا کہ وہ دیوتا بنا بیٹھا ہے۔ سامنے شہزادی زرقا پھول اٹھائے کھڑی ہے۔ اور محلے والے اس دیوتا کو شیطان سمجھتے ہیں۔ ادھر ادھر سے لوگ آ رہے ہیں اور اسے علی حمد کو اس بات پر رضا مند کرنا ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر پیغام لے کر جائے اور منصور سے ملے۔

علی بڑا ہو گیا تھا۔ اب کبھی حویلی یا محلے کے میدان میں کھڑا ہونا یا کھیلنا اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ کچی حویلی اور میدان میں نئی پود نے جگہ لے لی تھی۔ اب یہ ممکن نہ رہا تھا چونکہ یہ محلے کی روایات کے منافی تھا۔

علی کے تمام ساتھی اپنے اپنے کام پر چلے گئے تھے۔ رفیق یوسف اور جمیل اب ملازم تھے اور مختلف مقامات پر متعین تھے محلے میں صرف رضا کا بھائی ضیا تھا۔ رفیق کا بھائی صفدر اور چند ایک اور لڑکے تھے جن سے علی کے زیادہ تعلقات نہ تھے بہت صفدر اب بھی اپنی بیٹھک میں روایات کو ٹھے چھانٹنے میں مصروف رہتا تھا اس نے تنگ آ کر اشتہاری حکیم کا کام شروع کر رکھا تھا۔

صفدر علی کو دیکھ کر مسکراتا۔ اس کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ علی کے راز سے واقف ہو۔ علی کو دیکھ کر وہ اسے پکڑ لیتا "آؤ بھائی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو گھڑی دو گھڑی کے لیے ہم بھی تو تمہارے پیروں میں رہتے ہیں" علی اسے دیکھ کر گھبرا جاتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ صفدر ہمیشہ ایسے انداز سے بات کرتا کہ علی

"اے ہے پتہ نہیں ان لڑکوں کا کیا اعتبار۔ وہ تو بڑی بڑی مبارکیں دیتے تھے کہتے تھے وہ لوگ اچھے ہیں گھر بار اچھا ہے اور لڑکی کا بھائی جو آیا تھا وہ تو مشہور آدمی ہے۔ یہی کہتے تھے مجنوں اب تو بھی کچھ بولے گا" جانو نے ایلی کو جھنجھوڑ کر کہا

"وہ ہوں" بیگم بولی "یہ مجنوں کہاں بولے گا"

"تو کیا وہ بیٹے کا خط تھا جو اس روز آیا تھا" شہزاد مسکرائی

"ہائے وہ خبر؟" جانو نے کہا

"چھوڑو یہ بھی کچھ ہو" شہزاد بولی "اس کا گھر بھی بس گیا"

"بسے گا تو جانیں گے" بیگم نے کہا اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔

نخلستان

چار ایک دن کے بعد جب ایلی اکیلا بیٹھا ہوا تھا تو شہزاد پیچھے سے دبے پاؤں وارد ہو گئی۔ وہ ایلی سے کہنے لگی "آخر مجھ سے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کیوں خواہ مخواہ بھاگتے پھرتے ہو۔"

ایلی کہنے لگا "خطرناک لوگوں سے دور رہنا ہی اچھا ہوتا ہے" اس نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

"کب سے ہوئی ہوں خطرناک" وہ بولی

"شروع سے ہی تھی۔ مجھے احساس اب ہوا ہے"

"ایلی" وہ بولی "بات مذاق میں نہ ٹالو"

"ایمان سے مجھے تم سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ بے حد تمہیں ایک ساتھی مل گیا۔ مجھے بے حد خوشی ہے ایلی" وہ سنجیدہ ہو گئی "مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ تم نے مجھے غلط سمجھا" اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں، ماتھے کا تل سرخ پڑ گیا "مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ایلی۔ کوئی مقصد نہیں، میں راستے میں دیوار نہیں بننا چاہتی۔ میں تو بری طرح پھنسی ہوئی ہوں ورنہ مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ سب کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ چل

پڑوں۔لیکن یلی میرے پاس تمہیں دینے کے لیے اب کیا دھرا ہے۔کچھ بھی نہیں میں اس قابل نہیں کہ تمہاری زندگی کو روشن کر سکوں" وہ خاموش ہوگئی ور یلی کے پاس کھڑی ہو کر اس کے بالوں سے کھیلنے لگی۔"مجھ سے ڈرو نہیں گھبراؤ نہیں میں تمہاری وہی شہزادہ ہوں مجھ سے کیا پردہ رکھو گے لیکن تم میں مجھ پر اعتماد بھی ہو۔تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ہر راہ گیر سے آنکھیں لڑانے کی شوقین ہوں تم سمجھتے ہو جس طرح تم نے میرے ہاتھ پکڑے تھے اسی طرح ہر کوئی میرے ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور میں چپ رہتی ہوں"

بجلی کی کوند سی رہ گئی، یلی نے تڑپ کر پیچھے دیکھا۔لیکن شہزادہ نے منہ موڑ لیا تھا۔کچھ دیر تک وہ خاموش رہی پھر بولی "یہ ٹھیک ہے کہ تم میری زندگی میں نخلستان ہو۔اس عمر میں صرف ایک نخلستان ہے۔"

"جب میں نے پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تھا تو میں حقارت سے ہنس پڑی تھی۔جب سانوری نے مجھے بتایا تھا کہ اسے تم سے محبت ہے تو میں نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔میں نے کہا تھا تجھے کیا نظر آیا ہے یلی میں۔بڑا ہی مضحکہ اڑایا میں نے اس کا پھر اس روز جب میں تمہیں کہانی سنا رہی تھی اور تم نے میرے ہاتھ پکڑ لیے تھے نہ جانے اس وقت میں کیوں خاموش رہی۔ویسے مجھے تمہاری حرکت بہت بری لگی تھی۔پھر نہ جانے کیا ہو گیا تم نے بات کر کے مجھ پر کیا جادو کر دیا۔تیری نگاہوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔اور پھر مجھ میں سکت نہ رہی اور" شہزادہ نے ایک لمبی آہ بھری۔

"دیکھو شہزادہ" یلی بولا "میں"

شہزادہ نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

"مجھے کہہ لینے دو آج۔تم تو روز کہتے رہتے ہو۔آج میرا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ کہہ دوں جو شاید میں کبھی نہ کہتی وہ بھی جو دنوں میں کئی بار بیٹھی سوچا کرتی تھی مجھے کیا ہو گیا ہے۔میرا گھر ہے میرے بچے ہیں میرا خاوند ہے جو میری ہر بات ماننے کے

ہے بے چین ہے پھر مجھے کیا ہو گیا ہے میں کیا کر رہی ہوں۔ نجانے کیا ہوا وہ رک
گئی۔

"میں نے بہت ہی سوچا لیکن میں ہار گئی ہار گئی بیلی" اس کی ہچکی نکل گئی

"میں نے محسوس کیا کہ تم ہو تو زندگی میں سبھی کچھ ہے تم نہیں تو کچھ بھی نہیں نہ جانے کیوں جی چاہتا کہ تم میرے پاس رہو صرف یہی اور کچھ نہیں مجھے تم سے کوئی غرض نہیں کوئی مقصد نہیں" بیلی کے سر پر پانی کی اک بوند گری۔ اس نے سر اٹھایا شہزاد نے اس کے سر کو زبردستی موڑ دیا۔

"یونہی بیٹھے رہو میری بات نہ کاٹو" وہ بولی

"میں نے خوامخواہ ان سے بگاڑ کی صورت پیدا کر لی۔ معلوم نہیں کیوں لیکن انہیں دیکھ کر مجھے غصہ آتا ہے خوامخواہ میں ان کی ہر بات رد کر دیتی ہوں میں نے ان کو جیسے رد کر دیا ہے جیسے وہ میرے میاں ہی نہ ہوں۔ مجھے ان سے نفرت ہو چکی ہے نفرت"

سیڑھیوں میں سے جانو نے سر نکالا "تو تم یہاں ہو اور میں تمہیں وہاں ڈھونڈ رہی ہوں۔ وہ وہ" وہ بولی

"جانو تم جاؤ" شہزاد نے سرد مہری سے کہا

"کیوں" وہ بولی

"بس کہہ جو دیا"

"ارے ہے ہنڈیا چولہے پر چڑھی ہے" جانو نے کہا "اور تم"

"ہنڈیا کو چولہے میں ڈال دو" شہزاد نے اپنے ہاتھ بیلی کے سر سے ہٹائے بغیر کہا۔

"لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو" جانو نے پوچھا

"میں بیلی سے بات کر رہی ہوں"

"اے ہے تیری خاص بات ہے کیا؟"

"ہاں اس سے بھی زیادہ"

جگنو ہونٹوں پر انگلی رکھے، الٹے قدم چلتے ہوئے بولی "اے کوئی خدا کا خوف کرو اگر تمہاری ماں نے دیکھ لیا تو"

"اگر وہ آ گئے" شہزاد نے کہا "تو اسے بھی کہہ دینا کہ اوپر کمرے میں ایلی سے بات کر رہی ہوں" جگنو نے سینہ تھام لیا "توبہ ہے تمہارا تو جواب نہیں"

کچھ دیر کے لیے وہ خاموش کھڑی اس کے بالوں سے کھیلتی رہی پھر بولی "تم میرا ہاتھ تھامتے تھے تو میں اسے جھٹک دیتی تھی تاکہ بات کا رخ نہ بدل جائے۔ یہ بہشت دوزخ نہ بن جائے۔ اس لیے کہ میں اپنی نگاہ میں آپ نہ گر جاؤں اور چور نہ بن جاؤں اور پھر مجھ میں اتنی ہمت نہ رہے کہ سینہ تان کر لوگوں سے بات کر سکوں۔"

"مجھے بدنامی کی پروا نہیں، ایلی لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں لیکن اپنی نظر میں آپ گر جانے کی پروا ہے۔ اس لیے میں تمہارا ہاتھ جھٹکتی رہی تمہیں روکتی رہی مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اس کا برا مانو گے۔"

"تم سمجھتے رہے کہ مجھے تم سے صرف دکھانے کی دلچسپی ہے تم سمجھتے رہے کہ میں بے پروا ہوں بے حس ہوں ایلی" اس کی ہچکی نکل گئی۔

ایلی دیوانہ وار اٹھ بیٹھا۔ شہزاد نے اسے روکا "میری بات سن لو" لیکن شہزاد کی باتیں ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔

عین اس وقت بیگم نے زینے سے سر نکالا "تمہاری خاص بات ابھی ختم نہیں ہوئی کیا۔" اس کے انداز میں غصہ اور طعنہ تھا۔

"تمہارے دخل دینے سے کیا ختم ہو جائے گی، اماں" شہزاد نے جواب دیا

"تم تو اس گھر کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو" بیگم غصے میں چلائی

"یہ گھر والا جانے اماں تم کیوں فکر میں گھلی جا رہی ہو"

"وہ تو مجھے پتہ ہے کہ یہ گھر میرا نہیں" بیگم کی آنکھیں چھلک پڑیں

"تو کیا اس گھر کو بھی تباہ کرنے کا ارادہ ہے" شہزاد نے مسکرا کر کہا

بیگم دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی

"ایلی! شہزاد! دیکھو" "بیٹے چلا کر چلے گئے" یہ کہہ کر وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

ایلی بیگم کے پاس بیٹھ گیا۔ یوں بیگم کو چھوڑ کر چلے جانے کی اس میں جرات نہ تھی۔

دیر تک وہ بیگم کو بہلاتا رہا تسلی دیتا رہا اور بیگم چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔

گھر میں کوئی نہیں

امتحان کا نتیجہ نکلنے سے چار ایک روز پہلے ایلی لاہور روانہ ہو گیا۔ نتیجے کے متعلق کوئی دلچسپی نہ تھی چونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ پاس نہیں ہو سکتا۔ جس زمانے میں اس کے ہم جماعت صبح شام مطالعہ میں مصروف رہتے تھے، وہ کتاب کھول کر خیالات میں کھو جایا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پوری توجہ سے پڑھے تا کہ اس کا سال ضائع نہ ہو۔ پہلے ہی وہ تین سال ضائع کر چکا تھا اس کے علاوہ اسے معلوم تھا کہ منصر کی خواہش ہے کہ وہ اچھے نمبروں پر پاس ہو۔ منصر اسے ایک لائق لڑکا سمجھتا تھا اور ایلی چاہتا تھا کہ منصر کی توقعات پر پورا اترے لیکن جونہی وہ کتاب اٹھاتا کبھی کبھی ان میں کوئی نہ کوئی ایسا لفظ آ جاتا کہ اس کے خیالات کا رخ بدل جاتا اور وہ سوچ میں کھو جاتا اور کتاب جوں کی توں اس کے ہاتھوں میں دھری کی دھری رہ جاتی۔

ایلی کو پاس ہونے کی قطعی امید نہ تھی۔ نتیجے کے لیے لاہور جانے سے اس کا مقصد صرف سفید منزل کے افراد سے ملنا تھا۔

اپنا سوٹ کیس ایک ہوٹل میں رکھ کر وہ سیدھا سفید منزل میں پہنچا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سفید منزل کا نچلا حصہ ویران پڑا تھا۔ کچھ دیر وہ اس ہال نما ڈیوڑھی میں کھڑا رہا تا کہ کوئی آئے تو اس سے پوچھ سکے۔ پھر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہ پا کر نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ زینے پر چڑھ گیا۔ اور اس نے دوسری منزل کا دروازہ ج

کھٹکھٹایا۔ دیر تک کسی نے جواب نہ دیا پھر دور سے آواز آئی "کون ہے؟"

ایلی نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے خود سادی کھڑی تھی۔ ایلی کو دیکھ کر سادی نے چیخ ماری اور پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگی "باجی، باجی!!!"

"کیا ہے؟"

"آؤ آ جلدی ی ی ی ی" وہ ہنسنے لگی

"ارے کیا وقتی" دور سے باجی کی آواز سنائی دی

"ہٹے بھاگو وہ ڈر" سادی چیخ رہی تھی۔

پھر ایک طوفان بدتمیزی مچنے لگا۔ جس میں قہقہے چیخیں، آوازیں اور نہ جانے کیا کیا شامل تھے۔ ایلی گھبرا گیا۔ اور چھجے سے نیچے اتر آیا۔ نیچے صدر دروازے کے قریب وہ یوں معصوم انداز سے کھڑا ہو گیا جیسے ابھی ابھی داخل ہوا ہو اور اس شور شرابے سے متعلق اسے قطعی علم نہ ہو جو سفید منزل میں مچا ہوا تھا۔

پھر وہ مگ پر کھڑی ہوئیں اور سوراخوں سے نیچے جھانکنے لگیں۔

"بھاگ گئے کیا" باجی بولی

"میدان کے مرد ہیں" سادی ہنسی

"اب منہ بھی چھپ گئے"

"دوپٹہ پھینکوں"

"دیکھو شرماتے نہیں"

"ڈر بھی نہیں وہ بندوق والے چلے گئے"

وہ دونوں ایک ساتھ چلا رہی تھیں قہقہے لگا رہی تھیں۔

"قریب کیوں نہیں آتے"

"پتلون پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے اس لیے"

"بجے دو بجے ہو گئے ہیں"

"نہ بھادوں سوکھے نہ ساون ہرے"

اس پر وہ دونوں قہقہے لگانے لگیں پھر خاموشی چھا گئی

ایلی جوں کا توں کھڑا رہا۔

پھر زینے میں بڑے بڑے بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ ایلی چونکا

ایک زینے سے سادی اتری اس کے سر پر پانچ چھ دوپٹے یوں لپٹے ہوئے تھے۔

جیسے بہت بڑی پگڑی ہو۔ جسم پر کالا اچکن تھا اور پاؤں میں فوجی بوٹ تھے۔

وہ وہیں رک گئی "کون ہے؟" اس نے بھاری آواز بنا کر کہا "گھر میں کوئی نہیں"

وہ بولی

<u>اتنی سی چوری</u>

ایلی خاموش کھڑا رہا اوپر جنگلے کی سلاخوں سے باجی کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"آپ اس سے ملیں گے" وہ بولی

"آپ سے" ایلی اس کی طرف بڑھا

سادی نے شور مچا دیا۔ ایک بار پھر سارا گھر قہقہوں سے گونجنے لگا

ایلی سادی کے پیچھے بھاگا وہ آگے آگے قہقہے لگاتی دوڑ رہی تھی۔

ایلی کی کوشش تھی کہ اس کے سر سے ایک دوپٹہ اتارے

وہ دونوں اوپر جا پہنچے۔ ایلی زینے کے دروازے میں رک گیا۔

"بس" باجی چلائی

"آگے پر جلتے ہیں" سادی نے شور مچایا

"یہ دوپٹہ مجھے دے دو" ایلی نے کہا

"یہیں پگڑی بندھے گا دولہا"

"رومال بناؤں گا"

"ونہہ رومال یہ دوکان نہیں شریف زادیوں کا گھر ہے" ساوی ہنسی

بلی جدل میں آ گیا "ہوں سلگا ہوا سگرٹ یاد ہے" وہ بولا

"پھر" وہ چڑ گئی "جب خلیل فاختہ اڑایا کرتے تھے"

"اب بھی فاختہ اڑ سکتے ہیں خلیل" وہ بولا

"دن تو منگتوں کو دیتے ہیں" ساوی ہنسی "چھین کر لے جایئے"

"ہے ہمت" باجی بولی

"ونہوں" ساوی چڑ گئی "صرف دروازے تک"

"دروازے پر چھین لیا تو خانم" بلی بولا

"جو مانگو گے ملے گا" ساوی نے قہقہہ لگایا

"شرط یہ ہے کہ سر کا دوپٹہ نہ اترے" باجی بولی

"میں شور مچا کر محلے کو اکٹھا کراؤں گی سوچ لیجیے" ساوی ہنسنے لگی

"اور اگر کوئی آ گیا تو؟" باجی نے کہا

"تو یک نہ شد دو شد" ساوی نے قہقہہ لگایا

"تو تیار ہو جاؤ" بلی نے کہا "مابدولت تشریف لاتے ہیں"

"حرم میں تو صرف خواجہ سرا آتے ہیں مابدولت نہیں" ساوی ہنسنے لگی

"یہ تو قطعی دھمکی دے رہے ہیں" باجی نے ساوی کو مخاطب کر کے کہا

"یہ تو سمجھتے ہیں سورما ہوتے تو خطرہ بھی ہوتا" ساوی چلائی

"خاں صاحب چپکے ہیں میاں"

"وہ بھی رہ جاتی جبھی تو باجی یہاں آ نکلیں" ساوی بولی

بلی نے جست بھری اور ساوی کی طرف لپکا

سفید منزل میں ہڑبونگ مچ گیا۔ وہ آگے بھاگ رہی تھیں۔ چیخ رہی تھیں قہقہے لگا رہی

تھیں پیچھے تھا۔ اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ وہ سفید منزل میں آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ وہ بھول چکا تھا کہ گلی کے سب لوگوں دروازے کھول کر سفید منزل کی طرف حیرت سے دیکھ رہے ہیں وہ بھول چکا تھا کہ وہ منصر کا دوست ہے اس نے منصر سے وعدہ کیا ہے کہ یہ دوست ان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔ ور سے سفید منزل کے جغرافیے سے قطعی طور پر واقفیت تھی۔

دیر تک وہ بھاگتے رہے پھر علی نے ساوی کو پکڑ لیا۔ ساوی نے بازو زبند چادر ایک کھینچیں اور وہ پٹا اپنے گرد لپیٹ لیا۔

بصد مشکل علی نے دوپٹہ الگ کیا۔ ساوی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سے کاٹا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے منہ سرخ ہو رہا تھا۔

علی دوپٹہ لے کر بھاگا

جب وہ صحن میں پہنچا تو سامنے ایک ضعیف عورت کھڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند ایک ساعت کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے رہے پھر علی گھبرا گیا۔

ضعیف عورت نے چیخنا شروع کر دیا "چور چور"

علی گھبراہٹ میں اندر کی طرف بھاگا

نچلی منزل سے شور سنائی دیا

ساوی اور بجی دونوں سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگیں "کون چور؟ کہاں ہے چور دادی ماں؟" لیکن بڑھیا برابر چلائے جا رہی تھی چور چور دوڑو دوڑو

پھر صحن میں دو چار مردوں کی آوازیں سنائی دیں "کیا بات ہے کیا ہوا؟"

علی کا دل ڈوب گیا اب وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

اس وقت ساوی بھاگی بھاگی آئی اس نے علی کی بانہہ پکڑ کر سے گھسیٹا اور ایک زینے میں دھکیل دیا۔

کچھ دیر تک وہ یوں چپ بیٹھا رہا۔ باہر سے باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں "یہاں تو کوئی چور نہیں ہے" سادی کہہ رہی تھی "میں بھائی جان کے کپڑے پہن کر باجی کو ڈرا رہی تھی۔"

"ارے نہیں میں کیا پاگل ہوں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

دفعتاً ایلی کو خیال آیا۔ ارے وہ چونکا یہ تو وہی زینہ ہے جس کے نیچے ہم مدد کرتے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کاٹھ کباڑ سے بچتا ہوا نیچے اتر گیا۔

نیچے جا کر اس نے دروازے کو آزمایا جو باہر گلی میں کھلتا تھا لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ وہ مایوس ہو گیا۔ اوپر وہ مکان کا کونہ کونہ دیکھ رہے تھے۔

نہ جانے کب کوئی زینے سے آ جائے

ایلی نے اس دروازے کی درز میں سے دیکھا جو سفید منزل کے اندر کھلتا تھا۔ باہر ہال نما ڈیوڑھی میں چھ لوگ کھڑے تھے۔ بہر حال باہر نکلنا مشکل تھا۔

اس نے دروازے کی کنڈی کھول دی اور پھر آہستہ آہستہ پٹ کھولنے شروع کر دیئے۔ تاکہ دروازہ کھلا ہو تو انہیں وہاں دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو پھر وہ دروازے کے پٹ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

چند ساعت کے بعد ایک محلے دار داخل ہوا۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔

محلے دار سیدھا آگے نکل گیا۔ پھر وہ زینے میں جھانک کر بولا۔ "یہاں تو کوئی بھی نہیں" یہ کہہ کر وہ ایلی کی طرف مڑا۔ وہ ایلی کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "کیوں صاحب اس کونے میں ہے کوئی" ایلی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ اس کے انداز سے دوستانہ محبت ٹپک رہی تھی

"یہاں بھی نہیں نا" وہ بولا "میرا خیال ہے گھر والوں کو خواہ مخواہ وہم پڑ گیا ہے نا"

"جی ہاں" ایلی نے کہا

رہا ہے۔ اس نے آواز دی۔ منصور رک گیا۔

"ارے" وہ بولا "آپ یہاں؟"

"جی" علی نے کہا

"کب سے؟" منصور نے سرسری انداز سے پوچھا

"دوپہر کی گاڑی سے پہنچا تھا۔ ہوٹل میں سامان رکھ کر اب آپ کی طرف جا رہا تھا۔"

"کچھ دیر ٹھہرنے کا ارادہ ہے کیا؟" منصور نے پوچھا

"اب جو نتیجہ سننے کے لیے آیا ہوں تو"

"اوہ" منصور بولا "آج تو آپ کا نتیجہ نکلنے والا ہے"

"جی" علی نے کہا

"آپ تو شاید پاس ہیں" منصور نے سوچتے ہوئے کہا "یا شاید" وہ رک گیا۔

"دراصل" اس نے بات شروع کی "مجھے آپ کا رول نمبر یاد نہیں تھا کیا تھا؟"

علی نے اپنا رول نمبر بتایا

"ہاں" منصور بولا "شاید یہی تھا مجھے اچھی طرح یاد نہ تھا لیکن اپنے ایک جاننے والے کو پہلے ہی سے نتیجے کی ایک نقل مل گئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تو تھا اگرچہ اچھی طرح مجھے آپ کا نمبر یاد نہ تھا" وہ چونکا "شاید میں نے پرزے پر نقل بھی تو کیا تھا" اس نے جیب سے کاغذ کا ٹکڑا ڈھونڈ نکالا "ہاں یہی ہے" اس نے کہا "اتفاق کی بات ہے" وہ خاموش ہو گیا۔

پھر آپ ہی آپ کہنے لگا "تو سمجھئے کہ آپ پاس ہی ہیں۔ پاس ہی ہوئے نا وہ کیا ہوتا ہے ہاں شاید (Compartment) کمپارٹمنٹ کہتے ہیں اسے، آپ کمپارٹمنٹ میں ہیں۔ لیکن صاحب آپ نے کمال کر دکھایا۔ جن حالات میں آپ نے امتحان دیا تھا" وہ کہنے لگا "اس کے باوجود اگر کمپارٹمنٹ میں آ سکتے ہیں تو مجھے

ڈر ہے کہ کہیں آپ کی عزت کرنی پڑے گی" وہ ہنسنے لگا "آیئے چلیں"

لیلیٰ موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد شاہ کی سواری بڑی تزک و احتشام سے ایک مرتبہ پھر لاہور کے بازاروں میں چل پڑی۔ لوگ دو رویہ کھڑے ہو کر نعرے لگا رہے تھے لیکن ان نعروں میں کبھی کبھار چور چور کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

دفعتاً بھیڑ میں سے ایک شخص آگے بڑھا اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا

"آپ کا کوئی جاننے والا معلوم ہوتا ہے" منصور نے سائیکل روکتے ہوئے کہا "جب تک میں سامنے والی دکان سے سگرٹ خرید لوں"

وہ سائیکل سے اترا اس کے روبرو ایم کے کھڑا ہنس رہا تھا

"تم کب آئے؟" ایم کے نے پوچھا

"نتیجہ سننے آیا تھا"

"ارے نتیجہ تمہیں معلوم نہیں ہوا میرا تو خیال تھا کہ تمہیں آٹھ روز پہلے ہی پتہ چل گیا ہوگا"

"وہ کیسے" لیلیٰ نے پوچھا

"یار میرا بھائی یونیورسٹی میں ہے۔ ایک روز میں وہاں بیٹھا تھا تو منصور کا ٹیلیفون آیا تھا منصور نے اسے تمہارا رول نمبر لکھوایا تھا کہ نتیجہ مرتب ہو جائے تو اسے اطلاع دے۔ بھائی جان نے آج مجھے بتایا تھا کہ آٹھ روز ہوئے منصور کو اطلاع دے دی تھی"

"اچھا" لیلیٰ نے حیرانی سے کہا

"منصور نے تمہیں اطلاع نہیں دی؟"

"نہیں تو"

"تو پھر پوچھنے کا کیا فائدہ" ایم کے نے حیرانی سے چلایا۔

رنگین ہو۔

منصور کا کمرہ بھی اس کی بے پروائی، رنگینی، ذہانت اور عظمت کا مظہر تھا۔ کمرے میں رنگوں کی ہم آہنگی کس قدر دلنواز تھی۔ پلنگ کی چادر بھی اس کا ایک جزو محسوس ہو رہی تھی۔

قوال اور قریب آ گئے "ہمیں لندن دکھا دو ہمیں لندن دکھا دو"

"بچی اس سے مانگو بچی ماں سے مانگو" سارنگی تان بجاتے ہوئے گانے لگی۔

پلنگ کے پاس ہی سلیپر پڑے تھے۔ کیسے گدگدے پاؤں ہیں اور اس کی وہ تصویر جو کارنس پر پڑی تھی کس قدر جاذب نظر تھی۔

"ایلی صاحب" منصور نے داخل ہوتے ہوئے کہا "ماں کہتی ہیں کہ آپ یہیں کھانا کھائیں گے اگرچہ یہ دعوت رسمی نہیں۔ رسم کے ہم قائل نہیں ورنہ ہوتے بھی تو اس وقت کچھ بھی تیار نہیں ہو سکتا اور پھر چار ایک جنے کھانے والے ان کے لیے کوئی تیاری بھی کیا کرے۔ اب آپ بلا تکلف بتا دیجیے کہ آپ چاول کھائیں گے یا روٹی۔ میں تو ذاتی طور پر چاول کھانا پسند کرتا ہوں۔ لیکن دونوں چیزیں تیار ہیں اس لیے تکلف برطرف"

"جی میں تو روٹی کھاتا ہوں" ایلی نے کہا

"تو ٹھیک ہے" پھر اس نے اوپر کی طرف منہ کر کے آواز دی "بھئی ایلی صاحب روٹی کھائیں گے اور میں تو آپ جانتے ہیں چاولوں کے ہوتے ہوئے اور کچھ نہیں کھاتا"

"تو کیا بھجوا دیں کھانا؟" اوپر سے اماں کی آواز آئی

"کیوں ایلی صاحب کیا خیال ہے؟"

"جب آپ کا جی چاہے" ایلی نے کہا

وہ ہنس کر بولا "بھئی ہم تو جب مل جائے تب کھاتے ہیں جی کا کیا ہے وہ تو ہر وقت

چاہتا ہی رہتا ہے۔ یہ تو اصول ہے جب ملے کھاؤ بھی دیکھے ماں جان منظر نے
بڑا آہ زیبندہ کہا

"آپ تو شاید ہاتھ دھونا پسند کریں میں تو ویسے ہی کر جاتا ہوں" وہ علی سے کہنے لگا کھانے میں پلاؤ کے علاوہ تین قسم کے سالن تھے

"ارے" منظر کھانا دیکھ کر چلایا "آج تو بڑے خوش قسمت معلوم ہوتے ہیں"
"آج تو اتفاق سے پلاؤ ہے۔ پلاؤ کے ہوتے ہوئے آپ روٹی کھانا کیسے گوارا کریں گے۔ تعجب ہے صاحب اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو پلاؤ ہی لیتا" لیکن علی کے لیے سچی بات کہنا ممکن نہ تھا اس میں اتنی جرات نہ تھی

"اتفاق سے آج پلاؤ ہے" منظر کے منہ سے "اتفاق سے" سن کر علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

منظر نے کبھی بھول کر بھی ایسی بات نہ کی تھی جس سے ذاتی خاندانی یا گھرانے کی عظمت یا امارت ظاہر ہو۔ وہ کوئی ایسی بات نہ کرتا جس سے دوسرا کمتر محسوس کرے۔ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ ادنیٰ سی حیثیت اور حیثیت کا شخص ظاہر کرتا تھا۔

نمک بھری روٹی

علی نے پہلا ہی نوالہ منہ میں ڈالا تھا تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ روٹی میں کوٹ کوٹ کر نمک بھرا ہوا تھا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" منظر نے پوچھا

"کچھ نہیں" علی نے کہا "ذرا گرم ہے"

"او یہ بات ہے"

علی کو فوراً معلوم ہو گیا کہ یہ ساجدی کی شرارت ہے۔ وہ دل میں چاہتا تھا کہ منظر کو اس کا علم ہو۔ لیکن اس قدر نمک کھانا کچھ آسان نہ تھا۔ بہر حال وہ یوں روٹی کھاتا رہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"رے صاحب یہ کیا کھانے کا طریقہ ہے" منصر نے کہا "آپ تو یوں کھا رہے ہیں جیسے نمک چکھ رہے ہوں۔ شاید تہذیب کے خیال سے یہ کر رہے ہوں بہر صورت کھانے کے معاملے میں ہم لوگ پیٹ بھر کر بدتہذیب ہیں۔ جب تک تیز ور تہذیب کو بالائے طاق نہ رکھ دیں۔ ہم سے کھایا ہی نہیں جاتا۔ ور صاحب پانی دیکھ کر تہذیب سے یاد رہے گی۔ مرزا غالب نے آم کے متعلق کہا ہے نا کہ "آم میٹھے ہوں اور بہت ہوں" اگر میں شاعر ہوتا تو یہی بات پانی کے متعلق کہتا۔"

کچھ دیر تک منصر پانی کھانے میں منہمک رہا لیکن اس دوران میں اس نے چار یک بار سے ایلی کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا "الیاس صاحب ور یہ ساتھ والے کمرے سے کان مرچ کی بوتل تو لا دیجئے مجھے معاف کرنا بھائی کھاتے وقت ہم سے تو اٹھا نہیں جاتا"

"کہاں ہے؟" ایلی جھٹ اٹھ بیٹھا

"اس ملحقہ کمرے میں جائیے نا تو آپ کو بتاؤں"

ایلی ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا

منصر نے چلا کر کہا "پہلے تو بتی جلائیے نا، ئیں ہاتھ دروازے کے پیچھے سوئچ ہے مل گیا؟"

"جی" ایلی نے بتی جلاتے ہوئے کہا

"کارنس پر دیکھئے" منصر بولا

"یہاں تو نہیں" ایلی نے کہا

"تو دونوں الماریاں دیکھئے"

"چلئے نہیں ملتی تو چھوڑئیے" منصر نے چلا کر کہا

جونہی ایلی وہاں کمرے میں داخل ہوا تو منصر نے شور مچا دیا "ہو ہو ہو" منصر بے تحاشا ہنسے جا رہا تھا۔

"یہ دیکھیے میری پلاؤ کھانے کی گرم جوشی کا نتیجہ" اس نے گلاس کی طرف اشارہ
کیا جو یلی کی روٹی کی پلیٹ پر رکھا ہوا تھا "تمام روٹیاں تر ہوئی ہیں۔ ٹھہریے میں اور
منگواتا ہوں" "ماں" اس نے اوپر آواز دی "دو ایک روٹیاں اور بھیج دیجیے میرے لیے
میں سمجھتا ہوں یلی صاحب کے ساتھ روٹی کھانے میں بھی مجھے ساتھ دینا چاہیے
ذرا جلدی کیجیے" منصر کی بامعنی مسکراہٹ کو دیکھ کر یلی کے کان میں آواز آئی "اتفاق
ہے"

وہ سوچنے لگا کہ کہیں منصر کو روٹی کے نمک کا راز تو نہیں معلوم ہو گیا اس نے گلاس
گرنے کی آواز نہیں سنی تھی اس کے علاوہ پانی سے صرف روٹیاں بھیگی تھیں کسی اور
پلیٹ میں پانی کی بوند تک نہ گری تھی "اتفاق ہے" کوئی اس کے کان میں منہ ڈال کر
ہنس رہا تھا۔

جب منصر کھانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو یلی نے دیکھا کہ پلنگ کے نیچے روٹی
کا چھوٹا سا نوالہ گرا پڑا ہے۔ "اتفاق ہے اتفاق ہے" کمرے میں لگی ہوئی گھڑی
ٹک ٹک گا رہی تھی۔

یلی رخصت ہونے لگا تو منصر نے کہا "کب جا رہے ہیں آپ؟"

"کل" یلی نے جواب دیا

"جانے سے پہلے ملیں گے تو ضرور آپ" وہ مسکرانے لگا

"جی ہاں"

"ہاں وہ ایک بات تو میں بھول گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کے علاقے پورے
گیا ہوں۔ اتفاق تو وہاں جانا ہوا۔ تو پھر میں نے سوچا کہ چلیے آپ کے محلے کو بھی دیکھتا
چلوں" اس کے ہونٹوں پر ایک نہایت دلفریب مسکراہٹ تھی "اب مزید اتفاق سنیے
جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا اس کے عین مقابل میں آپ کے محلے کی ڈیوڑھی تھی"

"ارے صاحب" وہ کچھ وقفے کے بعد بولا "آپ تو مجھے خاصے تو رنجیدہ لگ

ماں سے بڑی محبت اور شفقت سے ملی۔ بات بات پر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے۔ وہ کمال محبت سے کہتی تم نہیں جانتے بیٹا مجھے اپنی بیٹی سے کتنی محبت ہے۔ وہ گھر کی لاڈلی بھی ہے اور تم بھی مجھے اتنے ہی پیارے ہو جتنی کہ وہ ہے لیکن وہ رک گئی۔

"تمہیں کیا معلوم کہ بیٹیوں کی بات کیا ہوتی ہے۔ اگر میری بیٹی کو تکلیف ہوئی تو میں تو جیتے جی مر جاؤں گی۔ میرا دل ڈوب جاتا ہے اس خیال پر۔ اس روز جب امت آگیا تھا تو پہلے چار روز میرا دل بیٹھا رہا۔ دل سے ہول نہ جاتا تھا اگر کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا۔"

عین اس وقت دروازے سے سادی آ گئی "اماں تو ویسے ہی غم کھاتی ہیں۔ جو کچھ بھی بیتے گا اماں ہم دونوں پر بیتے گا" سادی سامنے آ کر ہنسنے لگی "کیوں میاں صاحب" اماں اسے دیکھ کر ٹھہر گئی "نہ بیٹی تو نہ ڈرا۔ ویسے پر وہ ڈروں کی تو میں قائل نہیں لیکن سب بھائی بہن مانتے ہیں تو کیا فائدہ" وہ اٹھ کر سادی کی طرف بھاگی

"کچھ تو میاں صاحب کل رات بڑی چالاکی سے روٹی پر پانی کا گلاس انڈیل دیا۔ بڑے چالاک ہیں آپ" سادی قہقہہ مار کر ہنسنے لگی "اماں کل بی بی نے میاں صاحب کے لیے جو روٹی پکائی تھی نا اس میں دو بار نمک ٹھونس دیا تھا" وہ ہنسنے لگی

"تم بی بی کو دق کرتی ہو" ماں ہنسی

"کیوں نہ کریں" سادی قہقہہ مار کر ہنسنے لگی "یہ تو صرف آپ کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔"

وہ پھر سے بڑی چڑی "اماں میں نے نہیں ڈالا تھا روٹی میں نمک سادی نے خود ڈالا تھا۔"

سادی قہقہہ مار کر ہنس پڑی "میں نے سوچا کہ اگر میاں صاحب کھائیں گے تو کچھ بھی نہیں شرم کے مارے اگر میں نمک ڈال دوں تو کیا حرج ہے۔ شرماتے بہت ہیں

سے کھاتے ہیں ویسے نہیں۔ کیوں الیاس صاحب" سادی ہنسی

"کیا ہیں الیاس صاحب" باجی داخل ہو کر پوچھنے لگی

"اب کیا تو بھی آ گئی" ماں نے باجی سے کہا

"میرے آنے میں تو کوئی حرج نہیں" باجی نے کہا "البتہ سادی کو نہیں آنا چاہیے کیوں الیاس صاحب"

"کیوں مجھے کیوں نہیں آنا چاہیے" سادی نے پوچھا

"اماں جان سے پوچھو" باجی بولی

"دراصل اس سارے فساد کی جڑ یہ الیاس صاحب ہیں ویسے دیکھو تو یوں خاموش بیٹھے ہیں جیسے منہ میں زبان نہ ہو" سادی نے کہا

"کوے بولا نہیں کرتے" ایلی نے دبی زبان سے کہا "یہ مینا کا کام ہے"

"خوب وہ باجی تم سے کہہ رہی ہیں" سادی ہنسنے لگی "اگرچہ مثال غلط دی ہے انہوں نے مجھ سے کوئی پوچھے تو میں بولوں میری پیاری باجی تو جل پری ہے۔ ہائے کتنی پیاری ہے میری باجی کہ میرا دم نکلتا ہے البتہ کبھی کبھار زکام پڑ کر بے ہوش ہو جاتی ہے اور سب میں میت کر دیتی ہے" یہ کہہ کر سادی قہقہہ لگاتی ہوئی اوپر کی طرف بھاگی۔

سادی کے جانے کے بعد ماں کو خدا حافظ کہہ کر ایلی چلا آیا۔

دل کی بات

جب ایلی علی پور پہنچا تو ہاجرہ اور فرحت کابل سے واپس آ چکی تھیں۔ ان کی آمد کی وجہ سے گھر میں شور مچا ہوا تھا۔ عورتیں آ جا رہی تھیں۔ فرحت اور ہاجرہ دونوں افغانستان کے متعلق یوں باتیں کر رہی تھیں جیسے ولایت سے ہو کر آئی ہوں ہر بات پر انگلیاں ہونٹوں پر رکھی جاتیں۔ سینے تھام لیے جاتے "ہائے میں مر گئی بہن"

"ہاں بہن اور تو کچھ بھی نہیں"

ان کے وہاں آنے کے بعد ایلی کا شہزاد کی طرف رہنے کا کوئی جواز نہ رہا تھا۔ اس بات پر بیگم بے حد مسرور تھی۔ لیکن شہزاد کو اس کی مطلق پروا نہ تھی اس کے لیے گویا کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ تاہم دن میں چار ایک مرتبہ اس طرف دروازے کی چوب پر ناچتی ہوئی آتی "کیوں گھر والو کیا ہو رہا ہے۔ بدھو میاں کہاں ہے صبح سے آیا کیوں نہیں؟"

اب تو فرحت بھی طعنے دے دے کر تھک چکی تھی۔ البتہ محلے والیاں ہاجرہ اور فرحت کے سامنے شہزاد کے متعلق اشاروں میں باتیں کرتی رہتیں

چار ایک دن کے بعد ہاجرہ اور فرحت ایلی کے روبرو کھڑی ہو گئیں

ہاجرہ بولی "ایلی ایک بات پوچھوں سچ سچ بتاؤ گے"

"کیا ہے" ایلی نے کہا

"جالندھر سے کچھ لوگ یہاں تمہارے متعلق تحقیق کرنے آئے تھے"

ایلی کی زبان سے سادی کے خاندان کی بات سن کر فرحت اور ہاجرہ کے خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ "کیا یہ سچ ہے کیا تم چاہتے ہو کہ وہاں بات طے ہو جائے" کیونکہ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ایلی شہزاد کے چنگل سے آزاد ہو سکتا ہے۔

ہاجرہ اور فرحت دونوں شہزاد کو غلط سمجھتی تھیں ان کا خیال تھا کہ شہزاد نے جان بوجھ کر ایلی پر جادو کر رکھا ہے تاکہ وہ اس کے ہاتھ کا پنچھی بنا رہے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ایلی کو پنچھی بنانے میں شہزاد کا کوئی خاص مقصد ہے اگرچہ انہیں کبھی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ خصوصی مقصد کیا ہو سکتا ہے۔

ایلی کی بات ہی نہیں شہزاد کے متعلق محلے میں عام خیال تھا کہ اسے نوجوانوں کی نگاہوں پر چڑھنے کا شوق ہے ان کا خیال تھا کہ شہزاد کو دیکھ کر محلے کے مرد اپنے ہوش وحواس کھو دیتے ہیں اور ان کے حواس کھونے کی تمام تر ذمہ داری شہزاد پر ہے۔

فرحت نے سب سے پہلے اس بات کا تذکرہ شہزاد سے کیا۔ غالباً اس کا مقصد یہ تو

شہزاد کو دکھ پہنچا تھا۔ وہ یہ جتانا کہ لیلی اب اس کے خرچے سے آزاد ہو چکا ہے۔

"میں نے کہا شہزاد" وہ بولی "سنا ہے یہاں لوگ لیلی کے متعلق تحقیق کرنے آئے تھے"

"ہاں" شہزاد نے بے پروائی سے جواب دیا "جانو نے بتایا تھا مجھے"

"کیا یہ سچ ہے؟" وہ شہزاد کے قریب تر ہو کر بولی

"پوچھو لیلی سے مجھے کیا خبر" شہزاد نے کہا

"میرا مطلب ہے" فرحت نے کہا "لیلی دل کی بات کب بتاتا ہے"

وہ ہنسی "مجھے دل کی بات بتائے گا کیا؟"

"بالکل" فرحت بولی

"مجھے بتائے گا؟ ہے کیا؟" اس نے پوچھا

"ہم تو یہی سمجھتے ہیں" فرحت نے کہا

"تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے" شہزاد ہنسی

"کیوں؟"

"پھر یہ خبر غلط ہے یہ نہیں ہو سکتا بس نہیں ہو سکتا" وہ قہقہہ مار کر ہنسی

فرحت کا رنگ فق ہو گیا

"دو ہی صورتیں ہیں" شہزاد ہنستے ہوئے بولی "اگر لیلی کو مجھ سے لگاؤ ہے تو مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں اور اگر نہیں ہے تو مجھے وہ کیوں بتانے لگا"

"کیوں لیلی" وہ لیلی سے مخاطب ہو کر بولی جو ملحقہ کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا "یہ سنا تم نے" فرحت نے ہاتھ جوڑ دیے "خدا کے لیے اسے نہ بتانا"

"بتاتی تو نہیں پوچھتی ہوں" وہ ہنسی "کیوں لیلی؟" وہ بولی "وہ ہو رہی جو ہے کیسی ہے وہ؟"

"کیا مطلب؟" لیلی نے پوچھا

"جس کے عزیز یہاں تحقیق کرنے آئے تھے تھانیدار کے گھر کیسی ہے وہ؟"

"بہت خوبصورت ہے" یلی نے کہا

"مجھ سے بھی زیادہ" وہ فرحت کی طرف دیکھ کر بامعنی انداز سے بولی

"کوئی مقابلہ ہی نہیں" یلی بولا

"یہی تمہارا مطلب ہے مجھ سے وہ مقابلہ نہیں کر سکتی" شہزاد نے شرارت سے کہا

"تم تو ہندو ہو" یلی بولا "تمہارے ماتھے پر بندی ہے"

"اور وہ مسلمان ہے"

"ہاں ہاں"

"مسلمان تو خوبصورتی میں ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیوں فرحت" شہزاد نے کہا

"توبہ" فرحت بولی "تو تو بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں یلی وہ لوگ ہیں کون؟"

"بڑے اچھے لوگ ہیں"

"خاندان کیسا ہے" فرحت نے پوچھا

"خاندان کا تو پتہ نہیں" یلی نے کہا "لیکن شاہ صاحب ان کے باپ کسی ریاست میں وزیر ہیں"

"ارے" شہزاد نے منہ بنایا "وزیر"

"بھائی وہ ہیں ایک بیرسٹر ہیں اور وہاں بڑے عہدے پر ہیں"

"ارے" شہزاد نے پھر منہ بنایا

"تو پھر ہمیں خاطر میں کیوں لانے لگے وہ" فرحت بولی

"خاطر میں نہ لاتے تو پوچھ گچھ کیوں ہوتی" شہزاد نے کہا

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے" فرحت بولی

"یہ میں نے محنت کی ہو گی اس کا پھل ہے" شہزاد نے کہا "کیوں ایلی؟"

"میری محنت کو کون خاطر میں لاتا ہے" اس نے معنی خیز نگاہ سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ "کوئی مائل بہ کرم ہونا چاہیے تو پھر یاد آ گئی ہے" ایلی ہنسنے لگا

شہزاد نے کہا "ہم مائل بہ کرم ہوں بھی تو کچھ نہیں کر سکتے"

"ڈگری تو بہت پہلے ہی مل گئی ہو گی" فرحت نے فوراً بات کا رخ بدلا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن فارسی دان ہے" ایلی نے کہا

"پھر تو وہی معاملہ ہو گا" شہزاد ہنسی "آب آب کر مر گئے بچے فارسی گھر گئے"

"کچھ بھی ہو" شہزاد بولی "فارسی دانوں سے تمہارا گزارہ مشکل ہی ہو گا"

"تم پنجابی بات کرو" فرحت طنز پر آ گئی

"میرا کیا ہے میں تو پانی ہوں چاہے آبخورے میں ڈال دو چاہے گلاس میں"

"جبھی بیل لگی ہوئی ہے" فرحت چلائی

"لیکن ان دونوں سے فوقیت کیسے ہوئی" فرحت نے ایلی کو مخاطب کر کے پوچھا

"بس ہو گئی" شہزاد نے کہا "اب زیادہ نہیں بتائے گا"

"تو تم پوچھو نا" فرحت نے کہا

"نہ میں نہیں پوچھتی"

"کیوں؟"

"جو میں نے پوچھا تو اسے بتانا پڑے گا" شہزاد ہنسی

"بڑا ظلم ہے" فرحت نے کہا

"ہے" شہزاد بولی "کیوں ایلی درست ہے نا"

"ہاں ہاں" ایلی ہنسا اور پھر فرحت سے کہنے لگا "فرحت تو شہزاد سے بات میں پوری نہیں اتر سکتی۔"

"کسی بات میں نہیں اتر سکتی" فرحت نے جل کر کہا

"کسی میں بھی نہیں یہ تو بات کی دھنی ہے" ایلی بولا

"غلط" شہزاد بولی "جہاں بات کرنا چاہوں وہاں ہو نہیں پاتی۔ میں تو نہ بات کی دھنی نہ کام کی بے مصرف باتوں میں البتہ ہوں"

ڈیپارٹمنٹ کے ضمنی امتحان میں ایلی کامیاب ہو گیا۔ اب کی بار منصر نے تار کے ذریعے سے نتیجے سے آگاہ کر دیا۔ اس لیے لاہور جانے کا اسے موقعہ نہ ملا۔

اس دوران میں ہاجرہ اور فرحت ایک بار لاہور جا کر سادی کی والدہ سے مل چکی تھیں۔ ہاجرہ ان لوگوں سے مل کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ "ماں وہ تو بہت ہی اچھے لوگ ہیں" اس نے ایلی سے کہا تھا "امیر کبیر ہوتے ہوئے بھی سادہ اور منکسر ہیں وہ" "مجھے تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ بات بن جائے گی بس لڑکی کے باپ سے بات کرنی باقی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ان کی منظوری لینے کے بعد وہ ہمیں بتائیں گے پھر اگر ایلی کے باپ نے بات نہ مانی تو کیا ہوگا۔

ہاجرہ نے لاہور جا کر سادی کی والدہ کے سامنے اپنے تمام حالات صاف صاف بیان کر دیے تھے جیسے کہ اس کی عادت تھی۔ اس نے کہا تھا "بہن ہم تو غریب لوگ ہیں یہ تو آپ کی مہربانی ہے جو ہم پر نظر عنایت کی ہے۔ ورنہ ہماری کیا حیثیت ہے نہ اپنا گھر ہے نہ در ہے ساری زندگی سوتنوں کی خدمت میں گزری بس صرف ہے دے کر ایک ایلی ہے۔ یہی میری امارت ہے۔ اسی پر ساری امیدیں ہیں لیکن بہن آج کل کی اولاد کب امیدوں پر اترتی ہے اپنے اپنے نصیب ہیں نصیب کا کسی سے کیا گلہ باقی رہے ہم تو ہمارا فکر نہ کیجیے ہم تو جیسے ایلی کے خادم ہیں ویسے ہی سادی کے سمجھ لیجیے"

"ہمارے سر آنکھوں پر رہے گی لیکن ہم اس قابل نہیں کہ چاؤ چوچلے رکھیں ہم تو خالی خدمت گزاری کر سکتے ہیں"

جب وہ دونوں لاہور سے واپس آئی تھیں تو شہزاد اور بیگم ان کے گلے کے ہار بن

گئی تھیں ان دونوں کے سوالات ختم ہونے ہی میں نہ آتے تھے "لڑکی کیسی ہے کتنے بہن بھائی ہیں ان کے ابا کیا کرتے ہیں" شہزاد کے انداز سے دلچسپی جھلکتی تھی لیکن ایلی کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ان تفصیلات کو جاننے پر اسے دکھ ہو رہا ہو۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شادی کے متعلق بیگم کا رویہ ایسا کیوں تھا اسے تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ ایلی اس کی بیٹی کے گھر سے نکل جائے گا اور بیگم کے خیال کے مطابق اگر وہ شہزاد کے گھر کی تباہی کا باعث تھا تو اس تباہی سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔ لیکن اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے بات پر غصہ آ رہا ہو کہ شہزاد سے عہد و پیمان کرنے کے بعد اب وہ یوں بیاہ رچا رہا ہے اس کی اتنی جرأت!

اگلے روز انہیں ایک خط موصول ہوا یہ خط منصر کی والدہ کی طرف سے تھا۔ جس میں رسمی طور پر انہیں منصر کے بڑے بھائی رضا کی شادی پر بلایا تھا۔

جب وہ رضا کی شادی پر جانے کے لیے تیار ہوئے تو شہزاد کہنے لگی "ابا مجھے بھی ساتھ لے چلو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ لڑکی کو دیکھوں"

"تو آ جاؤ" "یہ تو اور بھی اچھا ہے کم از کم ان سے بات تو کرو گی"

"مجھے تو کبھی اس قسم کی بات کرنا نہیں آتی مشکل میں پڑ جاتی ہوں"

"اماں تو جہاں بھی جاتی ہے تو وہاں دلہن بن کر بیٹھ رہتی ہے" ایلی نے ہنستے ہوئے کہا "ہر بات میں جی ماں اور جہاں بیٹھ جائے وہاں سے اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے"

اس روز پہلا موقعہ تھا جب شہزاد نے اپنی طبعی بے نیازی چھوڑ کر اس قسم کی درخواست کی تھی۔ ایلی اس کی بات سن کر حیران ہوا تھا اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ شادی کو ملنے کے لیے کس قدر مشتاق تھی۔ شہزاد کو دیکھ کر بیگم بھی نہ رہ سکی۔ وہ بھی ساتھ تیار ہو گئی۔

جب وہ جانے لگے تو بیگم ان کے ساتھ چل پڑی

''ماں تم یا ساتھ چلوگی' شہزادے نے پوچھا

''میں کیوں نہ چلوں'' بیگم بولی

''پیچھے گھر میں کون رہے گا' شہزادے نے پوچھا

''میں یا گھر کی ذمہ دار ہوں جس کا گھر وہ ہی جانے''

''لیکن ماں تیرا وہاں یا کام' شہزادے نے پوچھا

''مجھے وہ یک کام ہیں لاہور میں سالوں کی کب سے بلا رہی ہے تب سے بھی تو ماں

ہے''

ور جب وہ تانگے میں سوار ہوئے تو ایلی نے بیگم کی شکل دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ

بڑے غصے میں تھی۔ لیکن اس وقت ایلی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس کے تیور کیا ہو

گئے؟

رنا میں گرچہ منصری کی خصوصیات نہ تھیں لیکن پہلی مرتبہ ہی ملے ایلی نے

محسوس کیا کہ وہ یک منفرد اور بے تکلف شخص ہے۔

''چھ تو آپ ہیں یلی'' وہ سے دیکھ کر بولا ''ایلی سے میں سمجھا تھا کہ کوئی تیتی قسم

کی چیز ہو گی لیکن آپ تو بڑے معقول آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ور جناب کو معلوم

ہونا چاہئے کہ میں وہ ہماییں ہوں جس کے دم قدم سے یہ رونق ہو رہی ہے'' وہ ہنسنے

لگا

وہ یک بھرپور جسم کا آدمی تھا۔ پُر رعب چہرا مشرقی جسم لیکن اس کے چہرے پر وہ

بات نہ تھی جو منصری کی خصوصیت تھی۔

شادی کی وجہ سے سفید منزل میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھمسان کا رن پڑا ہو۔ ہر

کوئی مصروف تھا سب بیک وقت بات کرتے تھے۔ جسے شاید کوئی نہ سنتا تھا۔ ور اس

کے علاوہ بہت سے لوگ آجا رہے تھے وہ شاید غالباً اس کے رشتے دار تھے۔

یلی حیران تھا کہ یکدم اتنے رشتے دار کہاں سے آگئے۔ یلی کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ

مکان کرنے کا نہیں بلکہ ان کا اپنا ہے۔ لیکن اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ منصر کہاں کے رہنے والے تھے کہ وہ لاہور کے رہنے والے تھے تو پھر گھر میں سبھی لوگ اردو کیوں بولتے تھے اور پھر ان کا لہجہ اہل زبان کا سا تھا اور زبان نہایت مہذب اور شستہ تھی۔

ان حالات میں ظاہر تھا کہ ساوی کو دیکھنے یا ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ایلی کی خواہش تھی کہ ساوی سے ملے، اسے یاد دلائے کہ وہ پٹہ چھیننے کی شرط جیتنے کی وجہ سے اس کی حیثیت فاتح کی ہے اور جو حکم وہ دے گا ساوی کو اسے ماننا پڑے گا۔ ساوی نے خود ہی کہا تھا جو مانگو گے ملے گا۔ کئی ایک دن وہ سوچتا رہا کہ کیا مانگوں وہ پٹہ تو لے چکا اب قمیص لینے کا فائدہ؟ ایلی نے کئی بار ساوی کا وہ پٹہ سونگھا تھا لیکن اس میں ساوی کے جسم کی بو نہ تھی۔ اس میں سینٹ کی بو آتی تھی۔ حالانکہ وہ کئی ایک بار ساوی سے ملا تھا لیکن اس نے کبھی ساوی کے جسم کو محسوس نہ کیا تھی۔ شہزاد کے جسم کی بو کو محسوس کرکے نہ جانے ایلی کو کیا ہو جاتا تھا اس کی آنکھیں مل جاتی تھیں۔

نہیں نہیں قمیص مانگنا بے کار ہے تو پھر کیا مانگوں؟ اس نے بہت سوچا تھا کئی ایک دن کے بعد دفعتاً اسے خیال آیا تھا۔ ہاں وہ خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ ساوی سے کہوں گا کہ مجھ سے ملنے کیلئے گھر سے باہر مقبرے یا شالیمار میں اور کم از کم دو گھنٹے میرے ساتھ رہے۔

ہاجرہ، فرحت، رجو، شہزاد اور جمیل کو کوٹھے پر جاتے ہوئے اس نے حسرت سے دیکھا تھا کاش کہ وہ بھی اوپر جا سکتا۔ شاید اماں اسے بلائیں۔ لیکن اتنے رشتہ داروں کی موجودگی میں وہ اسے کس طرح بلا سکتی تھیں۔ اماں کو تو شاید یہ ہوش بھی نہ تھا چونکہ وہ انتظامات میں مصروف تھیں۔ ادھر منصر کو اتنی فرصت نہ تھی کہ ایلی کے پاس بیٹھے اب کی بار وہ بالکل ہی محروم رہا تھا۔

رنا واحد شخص تھا جو مصروف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ اس کی طبعی خصوصیت تھی۔ انتظامات میں تو شاید بڑھ چڑھ کا حصہ لے رہا تھا لیکن اس کے رویے سے یوں معلوم ہوتا

تھا جیسے فارغ ہو۔ بے کار ہو، جیسے ازل سے ہی اسے کوئی کام نہ ہو۔ دراصل اس کی طبیعت میں گھبراہٹ اور پریشانی کا عنصر نہ تھا لہٰذا وہ کام میں مصروف ہونے کے باوجود مطمئن اور فارغ دکھائی دیتا تھا۔

ماں بھی ان کے ساتھ انتظامات میں مصروف تھا۔ اب کی بار ماں نے لیلی کو دیکھ کر وہ پرانا انداز نہیں اپنایا تھا بلکہ جیسے اس نے لیلی کو برداشت کر لیا ہو جیسے اس کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد اب اسے لیلی سے کوئی شکایت نہ ہو۔

منتظموں میں وہ معصوم نہیں روئی والی کو دیکھ کر لیلی ٹھٹکا "ارے" وہ چونکا "ان صاحب کو تو میں نے کہیں دیکھا ہے" وہ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اسے یاد آیا۔ آخاہ یہی صاحب تو اس روز پھل کا ٹوکرا لائے تھے۔ اب بھی روئی ٹوپی کا وہی پراسرار انداز تھا جیسے کہیں سے پھل کا ٹوکرا لائے ہوں اور انہیں وہ ہوس نہ جانے کے دیتا ہو۔

منصور کے باقی بھائیوں میں صرف نور لیلی کے لیے باعث دلچسپی تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت شرارت، ذہانت اور تبسم کی چوری پڑی تھی۔ اب تو لیلی کو علم ہو چکا تھا کہ نوری نے سر پر وہ چادر لے کر سفید منزل کے چوبارے سے جس کو اشارے کیے تھے وہ اس طرح نالہ گھر اور سفید منزل کے باہمی رابطے کا ذریعہ ثابت ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں سفید منزل کے اوپر زینے میں بیٹوں کے جنگلے بند کر دیے گئے تھے۔ نور جب بھی لیلی کے قریب آتا تو اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔

شکریہ شکریہ

شادی سے ایک دن پہلے رنا لیلی کے پاس آ بیٹھا۔ کہنے لگا "بھیا صاحب کل برات میں کیا آپ شہ بالا بنیں گے؟"

"شہ بالا" لیلی نے رنا کی طرف استفسار بھری نگاہ سے دیکھا

"شہ بالا کا مطلب "بیسٹ مین" ہے" وہ بولا

"آپ کا مطلب ہے" ایلی ہنسنے لگا "کہ سہرے لگا کر میرا کارٹون بنایا جائے۔"

"نہیں تو" رضا نے کہا "ہمارے ہاں نہ سہرے ہوتے ہیں ورنہ گھوڑے پر سواری"

"تو پھر" ایلی نے پوچھا

"برات سفید منزل سے چلے گی اور موتی محلہ پر جا کر رکے گی جہاں ہماری ہونے والی بیگم رہتی ہیں۔ برات کے آگے بینڈ باجا ہوگا۔ بینڈ کے پیچھے دولہا اور شہ بالا ہوں گے اور ان کے پیچھے براتی نہ کوئی ہار ہوگا نہ سہرا اور سبھی لوگ پیدل ہوں گے"

"اچھا" ایلی سوچنے لگا

"یہ تو آپ کی مرضی پر موقوف ہے کہ شہ بالا بنیں یا نہ بنیں میں نے تو بھئی تمہارے بھلے کی کہی ہے اگر تمہیں منظور نہیں تو نہ سہی"

"میرے بھلے کی؟" ایلی نے حیرت سے پوچھا

"ہاں ہاں"

"وہ کیسے؟"

"ایک سنہرا موقعہ ہے اگر فائدہ اٹھانا چاہو تو" رضا نے شرارت بھری مسکراہٹ سے جملہ مکمل کر دیا

"میں نہیں سمجھا" ایلی نے کہا

"ویسے بات معمولی سی ہے لیکن صاحب ذوق کے لیے بڑی بات ہے" وہ کہنے لگا دیکھو نا راستے میں جتنی کھڑکیاں اور جھروکے ہیں برات گزرے گی تو وہ سب کھلیں گی جو کھڑکی کبھی نہیں کھلی۔ وہ بھی کھل جائے گی اس وقت اور جو کبھی کھڑکی میں نہیں آئی وہ بھی کھڑکی میں آ کھڑی ہوگی اور دولہا اور شہ بالا کو دیکھے گی رنگ رنگ کی آنکھیں طرح طرح کی نگاہیں دولہا اور شہ بالا پر مرکوز ہو جائیں گی۔ صرف یہی نہیں۔ ہر کوئی کوشش کرے گی کہ ان کو صرف دیکھے ہی نہیں بلکہ اپنا آپ دکھائے بھی

اور وہ جب خود اپنا آپ دکھاتی ہیں تو کیا کیا پوز بنتے ہیں کیا کیا پوز رنا بنے گا" بے خوبصورت ترین حصہ دکھاتی ہیں خوبصورت ترین انداز۔ اگر شہ بالا بن کر ہمارے ساتھ چلو گے تو لاہور کی ساری پدمنیاں اور نہ جانے کون کون تمہاری نگاہوں کے سامنے ستودہ ہوں گی اور تمہیں اندازہ ہوگا کہ یہاں کیا کیا چیز چھپی پڑی ہے۔ ارے صاحب اُف اُف" رنا نے اس ڈرامائی انداز سے جھرجھری لی کہ ایلی کے جسم میں بھی ایک لہر دوڑ گئی۔

"اگر تم صاحب ذوق ہو تو شاید تمہارے لیے کوئی دروازہ مستقل طور پر کھل جائے اللہ بڑا کارساز ہے اور اگر ذوق نہیں تو علمی دلچسپی ہی سہی۔ پنڈت کوکا کی کتاب کی تفسیر لکھ سکیں گے آپ۔"

یہ کہہ کر رنا یوں کسی کام میں مصروف ہو گیا جیسے ایلی کے فیصلے سے خاص دلچسپی ہو۔

وہ ہر ایک مصروفیت سے ایک ساعت کے لیے فارغ ہوتا اور پھر ایلی سے سرسری طور پر پوچھتا۔

"کیوں الیاس صاحب کیا فیصلہ کیا آپ نے؟" اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر ادھر ادھر چلا جاتا اور وہاں سے فارغ ہو کر ادھر آتے ہوئے ایلی کو کہنی مار کر پوچھتا "کیا فیصلہ کیا؟"

نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے روز برات کے جلوس میں ایلی رنا کے ساتھ ساتھ شہ بالا کی حیثیت سے چل رہا تھا۔ اور قدم قدم پر رنا اسے دبی آواز میں کہہ رہا تھا "ادھر بھی ادھر دیکھ رہی تھیں وہ ... کیا چیز تھی۔ سبحان اللہ تم نے موقعہ کھو دیا۔ جئے جئے حد ہی تھی ذرا چوکس رہو بھائی"

"بھئی وہ ادھر تو چاند چڑھا ہوا ہے بڑی بات ہے وقت تنگ است و کار ہائے بسیار وہ ہو تم تو بھئی اپنے آپ میں کھوئے ہوئے ہو"

ایلی کے روبرو کھڑکیاں کھل رہی تھیں چقیں سرک رہی تھیں کلیاں بڑھ رہی تھیں سیاہ نشیلی آنکھیں طلوع ہو رہی تھیں۔ تبسم ابھر رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ساری چل رہی تھی وہ مسکرائے جا رہی تھی ہنس کر جھوم رہی تھی۔ دیکھ سکتے ہیں تو دیکھ لیجئے اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے دیکھنے کی قوت سلب ہو چکی ہو۔ دیکھنے کے باوجود اسے دکھتا نہیں تھا۔ چاروں طرف ساری ہی ساری نظر آ رہی تھی۔ سارے ماحول پر مسلط تھی۔

جب وہ موتی محلے کی گلی میں پہنچے تو سفید بازوؤں لہرتی انگلیوں متبسم چہروں اور شوخ نگاہوں کا گویا ایک طوفان امڈ آیا۔

بینڈ رک گیا جلوس تھم گیا رانا کی نگاہیں پھلجھڑیاں چلا رہی تھیں۔ ایلی میں نہ جانے کیوں گھبراہٹ سی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔

سامنے کی ایک کھڑکی میں ساری کی جھلک دکھائی دی وہ مسکرا رہی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ پھیکی اور بے جان سی تھی جیسے کوئی کھوئی ہوئی ہو ساری تو یہی نہ تھی۔ ایلی نے کوشش کی کہ وہ جلوس سے نکل کر سامنے کمرے میں جا بیٹھے لیکن رانا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"واہ" وہ بولا "یہی تو نقطہ عروج ہے اور نقطہ عروج کو چھوڑ کر جا رہے ہو صاحب" رانا نے مضبوطی سے اسے پکڑے رکھا اور آنکھوں سے اوپر کی کھڑکیوں کی طرف آتش بازی چھوڑتا رہا۔

"یہاں تو قیامتیں چھپی ہوئی ہیں۔ طوفان ہیں فتنے ہیں" رانا مسکراتے ہوئے بولا۔

پھر بینڈ نے سلامی کی آخری سریں فضا میں پھیلا کر باجے ہونٹوں سے الگ کر دیے اور وہ جمگھٹ ٹوٹ گیا۔ اس پر سب کمروں کی طرف بڑھے اور رانا اور ایلی کا ساتھ چھوٹ گیا۔

جب وہ کھانا کھا رہے تھے تو رانا نے ایک لڑکے کو بھیج کر ایلی کو بلا بھیجا۔ ایلی

نے سمجھ کر شاید رسم کے مطابق اسے دولہا کے پاس بیٹھنا چاہیے اس لیے وہ بادل
نخواستہ وہاں چلا گیا گرچہ مزید نگاہوں پر چڑھنے سے وہ گھبرا رہا تھا۔

"یار صاحب" رضا اس کی طرف جھک کر بولا "شکریہ شکریہ یار صاحب"

"کیوں" علی نے پوچھا

"آج بھی تم نے مجھ پر ایک بڑا احسان کیا ہے جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا"

"احسان کیا شہ بالا بننے کی بات کر رہے ہیں آپ" علی نے پوچھا

"ہاں ہاں"

"لیکن اس میں احسان کی کیا بات تھی؟"

"تھی" رضا مسکرایا

"آپ تو کہتے تھے اس میں میرا فائدہ ہے"

"اور کیا کہتے بھائی" رضا نے شرارت بھری نظر علی پر ڈالی

"میں نہیں سمجھتا" علی جھلا گیا

"بات یہ ہے بھئی کہ تم شہ بالا نہ بنتے تو ظاہر ہے کہ میرے کسی بھائی کو بنا دیا جاتا
اور میرے بھائی تم جانتے ہو کبھی خوبصورت ہیں کم از کم مجھ سے زیادہ خوبصورت
ہیں۔ اور جب ان میں سے کوئی برات میں میرے ساتھ ساتھ ہوتا۔ اور دیکھنے
والے اسے دیکھتے تو ظاہر ہے کہ اپنی حیثیت تو ختم ہو جاتی لوگ کہتے" اسے تو دولہا
تو بس اللہ کا فضل ہی سمجھ لو

"لیکن تم ساتھ تھے تو اپنی وہ حیثیت پیدا ہوئی جو شاید کبھی نہ ہو سکتی کبھی نہ ہو سکے
تمہارے ساتھ ہونے نے مجھے خوبصورت بنا دیا۔ آج وہ بھی مجھی سے بچی کہ حد ہے
اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا" رضا ہنسنے لگا

"کالا کلوٹا" ساوی سامنے کھڑی ہنس رہی تھی

"اور میں سانوری سے کہتی تھی نہ تجھے اپنی میں کیا دکھائی دیا جو تو اس پر ریجھ گئی"

کسی کو خبر نہ تھی کہ اتنی سی سرسری بات نے بیگم کے حالات کا دھارا ہی بدل دیا تھا۔ اس کی زندگی کا رخ ایک ایسے موڑ کی طرف بدل گیا تھا جس طرف بدنامی، رسوائی اور بے عزتی کی مہیب چٹانیں نظر آتی تھیں۔

دراصل بیگم کی اپنی زندگی تباہ ہو چلی تھی اور اس کی تباہی کا باعث اس کی اپنی جنسی سرد مہری تھی۔ اس وجہ سے جنس سے اسے نفرت تھی بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر جنسی تعلق کو توڑنے میں دراصل وہ خوشی محسوس کرتی تھی۔

علی پور میں جاتے ہوئے بیگم ایک سکندر تھی اور پہلی ورثہ و شریف اور سادگی تہہ و تاراج شدہ ریاستیں تھیں جو اس کے قدموں میں پھیلی ہوئی تھیں اس کا دل فخر سے دھڑک رہا تھا۔ گئے وہ دن گئے کیا یاد کرو گے۔ گاڑی سبک رفتاری سے علی پور کو چلی جا رہی تھی۔

ہاجرہ کے چہرے پر مسکراہٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ بار بار اپنی ناک کی طرف دیکھتی اور مسکراتی اور پھر ناک کی طرف دیکھنے لگتی۔ فرحت مسرور تھی لیکن اس کی مسرت میں پریشانی اور فکر کا عنصر نمایاں تھا نا جانے وہ سوچ رہی تھی کہ بیگم اور رابعہ خود اپنے دکھ میں گم تھی۔ ابھی صرف ایک روز اس کی اپنی شادی ہوئی تھی۔ اس کا خاوند محلے میں سب سے زیادہ خوبصورت اور لائق تھا لیکن وہ عیسائی ہو چکا تھا اور اب وہیں لاہور میں ایک میم کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا اور رابعہ کی گود میں اس کا اکلوتا بیٹا علی تھا جس کے پیدا ہوتے ہی رابعہ کے سہاگ کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ محبت بھرے جذبات سے علی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا نام علی تھا اسے گھر میں پیار سے سب علی کہتے تھے۔ کب علی بڑا ہوگا۔ دلہن بیاہ کر لائے گا اور رابعہ کی زندگی کا اندھیرا دور ہوگا۔ کبھی کبھی رابعہ سر اٹھا کر ہاجرہ کی طرف دیکھتی تو معاً اسے یاد آتا کہ وہ کہاں ہے اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور اس کا حسین چہرہ سرخی سے جھلکنے لگتا اور وہ کہتی "بے چارے کتنے اچھے لوگ تھے کتنے سادہ اور پیار کرنے

والے اور بڑی تو بہت ہی پیاری ہے کہ خود بخود اسے اپنانے کو جی چاہتا ہے" شہزادی اس روز مغموم سی تھی اور خلاف معمول سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔

فرحت نے کہا "ارے آج سوچ میں کیوں پڑ گئی" لیکن شہزادی اس کی بات کا جواب دینا نہ چاہتی تھی۔ وہ پہلا دن تھا جب شہزادی خاموش بیٹھی تھی جواب تو خیر وہ بیسیوں دے سکتی تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ خاموش تھی۔ سر ہلاتی اور کھسیانی مسکراہٹ کے بعد پھر سر جھکا کر سوچنے لگی۔

دراصل بیگم کا انداز دیکھ کر اسے شک پڑ گیا تھا کہ بیگم چھوڑ کر جا رہی ہے۔ وہ اپنی ماں کی طبیعت سے واقف تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر بیگم نے کچھ کہہ دیا اور بات بگڑ گئی تو وہ سب کس قدر پریشان کریں گے۔

علی اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے بڑی شدت سے کوشش کی تھی کہ سادی کو پیغام بھیجے اور آخری روز وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ کسی مہمان کا بچہ جو علی سے خاصا مانوس ہو گیا تھا اس کے ہاتھ اس نے یہ پیغام بھیجا تھا۔ یاد ہے تم شرط ہار گئی تھی اور جواب میں سادی بنگلے کے قریب کھڑی ہوئی با آواز بلند چلائی تھی "جاؤ ان سے کہہ دو ہمیں یاد ہے اور ہمیں اور کچھ نہیں" سادی کی آواز تو وہی تھی لیکن بات کا انداز بدلا بدلا سا تھا۔ علی سوچ رہا تھا نہ جانے کیا بات ہے کہ اس دن کھڑکی میں بھی وہ غمگین کھڑی تھی اور اس وقت بھی اس کی آواز میں وہ مسرت نہ تھی جس کے نغمے بہا کرتے تھے سادی کی ہر بات میں ہر حرکت میں

علی کو خبر نہ تھی کہ سادی کی اداسی کا راز اس وقت بیگم کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کی صورت میں ظاہر تھا۔ گاڑی کے پہیوں میں گونج رہا تھا "کیا یاد کرو گے کیا یاد کرو گے" دور سبز کھیتوں سے پرے کانگڑے کی سانولی چٹانیں کھڑی تھیں۔ اور گاڑی علی کو اس مہیب اور خطرناک موڑ کی طرف لیے جا رہی تھی جس کی طرف سب حالات سے دھکیلے جا رہے تھے بیگم کی وہ فاتحانہ مسکراہٹ بھی تو حالات کا ایک جزو تھی

بے حد اہم جزو۔ اور ایلی اس سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ سمجھتا تھا کسی نہ کسی صورت وہ منصر کے گھرانے سے منسلک ہو جائے گا اور اس طرح زندگی کا ایک نیا ورق شروع ہو جائے گا۔

ہی ہی ہی ہی ہی!

علی پور پہنچ کر ایلی نے دو خط سادی کو لکھے اور غیر متوقع طور پر دونوں سے ایک کا جواب بھی موصول نہ ہوا۔ اس کے باوجود یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی کہ یہ وجہ سے متعلقہ مصروفیت کے علاوہ بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ ان دونوں خطوط میں اس نے مطالبہ کیا تھا کہ عہد و پیمان کے مطابق شہر چھٹی کی وجہ سے سادی سے ملے اور مقبرہ یا شالامار میں چند ایک گھنٹے اس کے ساتھ رہے۔

وہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ خط سادی تک نہ پہنچے ہوں شاید اس لڑکی نے جس کی معرفت وہ خط بھیجتا تھا خطوں کا راز فاش کر دیا ہو۔ شاید وہ لوگ کہیں چلے گئے ہوں شاید اسے کوئی ایک خیال آتے لیکن یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ شاید بیگم نے سادی کو ایلی سے قطع کر دیا ہو۔ نہ جانے کیوں اسے سادی پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ اپنی نسبت شک کرتا تھا لیکن سادی وہ محبوب جس عظیم کردار کا سادی نے مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی وجہ سے ایلی کو کبھی شک نہیں پڑ سکتا تھا کہ کوئی سادی کو ورغلا سکتا ہے۔

پھر سادی کا خط دیکھ کر ایلی حیران رہ گیا۔ مضمون پڑھ کر اسے یقین نہ رہا تھا کہ وہ خط سادی نے لکھا تھا۔ پہلے چند ایک جملے نہایت سنجیدہ اور خشک انداز میں تحریر کیے گئے تھے۔ اس کے نیچے پانچ چھ سطریں لکھ کر انہیں کاٹ دیا گیا تھا اور اس قدر احتیاط سے ایک ایک لفظ کاٹا گیا تھا کہ یہ اندازہ لگانا ممکن نہ تھا کہ کٹا ہوا حصہ کس بات کے متعلق ہے۔ کٹے ہوئے مضمون کے تحت لکھا تھا "خیر چھوڑیے اس بات کو"

اوپر لکھا ہوا تھا

مورخہ 4 جولائی کو اس بات کا امکان ہو گا کہ میں آپ سے مل سکوں۔ اس روز

شام کے تین بجے سے پانچ بجے تک آپ بوڑھے دریا کے پل پر میرا انتظار کریں
امید تو ہے کہ میں ضرور آؤں گی لیکن پانچ بجے تک نہ آئی تو سمجھ لینا کہ مجبوری کی وجہ
سے نہ آ سکی۔ اس صورت میں پھر اطلاع دوں گی۔

بیلی حیرت سے یہ خط تو ساوی نے کبھی نہ لکھا تھا۔ مضمون کا انداز ہی نیا تھا۔ اس
کے علاوہ ساوی نے تو کبھی اپنے خط کا ایک لفظ بھی نہ کاٹا تھا۔ وہ بے تکلف اور بے
تکان لکھا کرتی تھی اور اس کے خطوط اتنے لمبے ہوتے تھے کہ دیکھنے میں اخبار معلوم
ہوتے تھے، آخر یہ بات کیا تھی جو اس نے لکھ کر کاٹ دی تھی۔ بیلی دیر تک سوچتا رہا لیکن
کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ پھر شاید، اس نے سوچا کہ ملاقات پر ساری بات معلوم ہو
جائے گی اس لیے وہ تیاری میں مصروف ہو گیا۔

لاہور جا کر اس نے سوچا کہ شاید اسے دیر تک پل پر انتظار کرنا پڑے اس لیے اس
نے اپنے ایک عزیز کا سائیکل مستعار لے لیا اور پل پر جا پہنچا۔

بوڑھے دریا کے پل پر چند منٹ انتظار کے بعد ساوی کا تانگا اس کے قریب آ
کھڑا ہوتا تانگے میں وہ اکیلی تھی۔

ساوی کا چہرہ انبساط کی وجہ سے گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ بیلی کو دیکھتے
ہی وہ چلانے لگی

"ارے آپ تو پہلے ہی سے موجود ہیں اور میں سمجھی میں پہلے پہنچوں گی"

"پہلے پہنچ جاتی تو کیا کرتی تم" بیلی نے کہا

"انتظار کرتی"

"انتظار کرنے کا بہت شوق ہے کیا" بیلی بولا

"شوق کیا کرتی ہوں۔ انتظار نہ جانے کب تک کرنا ہوگا۔ اب تو عادت سی ہو
گئی ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے تانگے والے کو پیسے دیے اور تانگے سے نیچے اتر
آئی

"رہے" ایلی چپ رہا "تانگہ کیوں چھوڑ دیا"

"بس نہیں" وہ بولی "مجھے خیال ہی نہیں آیا"

"ورنہ سوچ سمجھ کر یہ چکا دیا" ایلی نے پوچھا

"آپ کو بھی تو یاد نہیں آیا جو چپکے سے ٹھہرے رہے" وہ ہنسی

"میں تو خیر مصروف تھا"

"مصروف"

"ہاں شدت سے"

"تو میں بھی مصروف ہی ہوں گی" وہ جھینپ گئی

"اب کیا کریں گے ہم نہ جانے کب کوئی خالی تانگہ آئے ادھر"

سائیکل جو ہے وہ بولی "مجھے آگے بٹھا لیجیے"

"ہائیں" ایلی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا

اس زمانے میں لاہور میں عورتیں خیمہ نما نقاب کے بغیر دکھائی نہیں دیتی تھیں بے نقاب عورتیں اول تو نظر نہیں آتی تھیں اور آتی بھی تو میمیں اینگلو انڈین یا ہندو عورتیں۔ پردے کے رواج کی پابندی سختی سے کی جاتی تھی اس حد تک کہ نقاب اٹھا کر چلنا بھی معیوب سمجھا جاتا۔

اس دور کے لاہور میں زیادہ تر رونق شہر کی فصیل کے اندر والے علاقوں میں پائی جاتی تھی ٹکسالی دروازہ موتی بازار میں شوقین مزاج لوگ شام کے وقت جمع ہو جاتے چونکہ عورت کی بے پردگی کسی وجہ ممکن نہ تھا ویسے تو شہر سے باہر انارکلی میں خاصی رونق ہوتی تھی لیکن وہاں پر فقط گاہک یا خرید و فروخت کرنے والے صرف مرد ہوتے تھے۔ عورتوں کے لیے اندرون شہر کے بازار اور اس کے ملحقہ علاقوں میں زیورات و پارچہ جات کے چند ایک بازار مخصوص تھے۔ انارکلی سے باہر کے علاقے آباد تھے۔ مال روڈ پر سارا دن الو بولتا تھا شام کو چند ایک گاڑیاں آتی جاتی دکھائی دیتیں یہ

علاقے صرف گوروں، اینگلو انڈین اور صاحبوں کے لیے مخصوص تھے۔

اس زمانے میں کسی لڑکی کو سائیکل پر بٹھا کر چلنا آسان کام نہ تھا۔ سائیکل پر آگے بٹھانے کی بات چھوڑیے۔ ان دنوں تو اگر کوئی اینگلو انڈین لڑکی سائیکل پر سوار دکھائی دیتی تو لوگ آوازے کستے نعرے لگاتے

سادی کی بات سن کر ایلی چونکا لیکن سادی ہنس رہی تھی ہنسے جا رہی تھی۔

"بس ڈر گئے؟" وہ چلائی

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے" ایلی نے کہا

"میں بتاتی ہوں" وہ بولی" اور پھر پھدک کر ایلی کے سائیکل کے آگے بیٹھ گئی"

دیکھو یوں ہوتا ہے اب آپ چلایئے

"لیکن اگر گر گئی تو؟"

"تو اٹھ بیٹھوں گی اور پھر سے سوار ہو جاؤں گی۔ دونوں اکٹھے ہی گریں گے نا"

ایلی حیرت سے سادی کی طرف دیکھ رہا تھا

راہگیر انہیں دیکھ کر رک گئے تھے ان کے گرد بھیڑ لگی جا رہی تھی "ہی ہی ہی ہی"

وہ ہنس رہے تھے لیکن سادی راہگیروں کی نگاہوں سے گویا بے خبر تھی بے نیاز تھی۔

"چلیے بابوجی میں پہنچا دوں" ایک تانگے والا رک کر بولا

ایلی نے ملتجی نگاہوں سے سادی کی طرف دیکھا

"نہیں" سادی نے بارعب آواز سے کہا "ہم سائیکل پر جائیں گے"

راہگیروں نے قہقہہ لگایا ہی ہی کی آواز گونجنے لگی دور کھڑے پولیس مین نے انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ایلی گھبرا گیا اس بھیڑ میں خصوصاً سپاہی سے بچنے کے لیے اس کی سائیکل ڈول رہی تھی سادی ایک ساتھ چیخیں مار رہی تھی قہقہے لگا رہی تھی۔ سڑک پر آتے جاتے لوگ ان کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی ہنس رہا تھا "ہی ہی ہی ہی" کوئی فقرے کس رہا تھا "چج کے یار" لیکن سائیکل ڈولتی ہوئی

چلے جا رہی تھی

ایلی کو اس وقت قطعی طور پر احساس نہیں تھا کہ سادی کا جسم گویا اس کی آغوش میں تھا۔ اس کے بازو سادی کے گرد حمائل تھے۔ سادی کی پیٹھ اس کی چھاتی سے چھو رہی تھی۔ اور سادی سے سینٹ کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ ایلی کی تمام تر توجہ راہگیروں پر مرکوز تھی۔ اسے اتنی فرصت نہ تھی کہ سادی کے جسمانی لمس کو محسوس کرے۔ سادی کو بھی یہ احساس نہ تھا کہ اس کا جسم ایلی سے مس ہو رہا ہے۔ اور وہ اس کی آغوش میں بیٹھی ہے۔ اسے صرف اس قرب کا احساس تھا اور وہ اس احساس میں اس حد تک کھوئی ہوئی تھی کہ اسے راہگیروں کا خیال ہی نہ تھا۔ اسے قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ لوگ ان کی طرف حیرت سے دیکھ رہے ہیں یا تمسخر سے ہنس رہے ہیں۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے وہ بچے ایک انوکھا کھیل کھیل رہے ہوں ایک نئے کھلونے کو آزما رہے ہوں۔ وہ مسرت سے چھلک رہی تھی، اچھل رہی تھی۔ چلا رہی تھی قہقہے لگا رہی تھی۔

ان دنوں وکالت کا فائنل امتحان تھا اور تمام باغ وکالت کے طالب علموں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر جگہ ہر پلاٹ میں ہر بنچ پر بڑے بڑے طالب علم قانون کی موٹی موٹی کتابیں کھولے مطالعے میں مصروف تھے۔ ان کی آنکھیں پڑھ پڑھ کر چندھیائی ہوئی تھیں۔ چہرے بے خوابی کی وجہ سے سوجے سوجے دکھائی دے رہے تھے۔ جبینیں فکر کی وجہ سے پرشکن تھیں۔ قانونی نکات پر بحثیں کرتے کرتے ان کی آوازیں بیٹھ چکی تھیں۔

لیکن سادی اور ایلی کو ان کے وجود کا احساس نہ تھا۔ جب وہ باغ میں داخل ہوئے تو ایلی نے غور سے چاروں طرف دیکھا۔ دو چار ایک پلاٹوں میں چند ایک لڑکے دکھائی دیتے۔ ایلی نے اطمینان کا سانس لیا اور سڑک کے ہجوم سے نکل کر یوں محسوس کیا جیسے باغ صرف سادی اور ایلی کے لیے مخصوص ہو۔ ان چند ایک لڑکوں کا کیا تھا جو اپنی کتابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ ایلی کو یہ معلوم نہ ہو کہ قریب کے پلاٹوں

جھاڑیوں اور پھولوں کے تختوں کی اوٹ میں جگہ جگہ استفسار بھری آنکھیں انہیں دیکھ رہی ہیں۔

باغ کے ایک ویران کونے میں پہنچ کر ایلی نے ٹہلیوں سے لدی ہوئی چنبیلی کی جھاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ تم ہو سادی"

سادی نے حسب عادت قہقہہ لگایا "کیوں" وہ بولی "میں یہ جھاڑی ہوں"

"چنبیلی پھولوں میں چنت پری ہے" ایلی نے کہا "اور تم عورتوں میں"

"لیکن دوپٹے کا ہاتھ پکڑتی ہے یہ تو" سادی مسکرائی

"اور تم پگڑی چھوتی ہو" ایلی نے کہا

سادی نے قہقہہ لگایا "جبھی آپ نخرے کر رہے ہیں" وہ خوشی سے تالی بجانے لگی۔

چنبیلی کی جھاڑی میں حرکت ہوئی۔ اور ٹہنیوں سے ایک سر باہر نکل آیا۔ ایک لمبا لکڑی نما چہرہ اور چار ایک سفید دانت۔

ایلی گھبرا گیا

"ارے" سادی نے قہقہہ لگایا "سبحان اللہ" وہ چلائی "ذرا کیمرہ تو لانا ہے" سر نے غوطہ لگایا اور سبز ٹہنیوں میں گم ہو گیا۔

"کون تھا یہ" ایلی نے گھبرا کر پوچھا

مدو

"کیا معلوم" وہ ہنسے جا رہی تھی

"ارے" وہ پھر چلائی

ایلی نے مڑ کر دیکھا۔ ان کی پشت کی طرف آنکھوں کے چار جوڑے ان کی طرف گھور رہے تھے۔ "یہ تو مجھے جھاڑی معلوم ہوتی ہے" وہ ہنسی ایلی نے اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔

"تم مجھے پکڑو گی" وہ بولی

"کیا مزہ رہے گا" وہ ہنسی

"تماشہ دیکھتی ہو"

"دیکھتی ہوں کرتی نہیں"

"لیکن وہ تو تمہیں تماشہ سمجھتے ہیں"

"بڑے سمجھیں ان سے کیا ہوتا ہے"

"سادی" میں نے سنجیدگی سے پوچھا "تم ان کی نگاہوں سے گھبراتی نہیں"

"نہیں تو" وہ بولی "گنوار پن سے کیوں گھبراؤں"

"مجھے تو ڈر لگتا ہے" ایلی نے کہا

"آپ کا کیا ہے" وہ ہنسی "آپ تو یوں ہیں جیسے گھبراہٹ میں جان پڑ گئی ہو۔ لیکن ہم سے نہیں گھبراتے آپ"

"تو کیا تم سے بھی گھبراؤں"

"کیوں نہیں" وہ بولی "گوری چٹی لڑکی کو دیکھ کر لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔"

"مضبوط ان کی بات نہ کیجئے" "کیوں" ایلی نے پوچھا

"نہیں" وہ ہنسی "جنس کی کوئی بات نہیں اخلاق مانع ہے"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہ بھی ہوتا ہے" سمجھ لیجئے مجھے کوفت ہوتی ہے۔

"ویسے ان کی گنوار نگاہوں سے کوفت نہیں ہوتی"

"اوہو ہوں" وہ ہنسنے لگی

"یہ تو یوں دیکھتے ہیں جیسے تم اندھے ہو"

"ہوں؟" وہ ہنسی

"ہاں ہوں" وہ بولا

"تو ہاتھ کیوں نہیں بڑھاتے آپ"

"وہ یوں مجھے حلوہ سے دلچسپی نہیں"

"جھوٹ" وہ چلائی "سفید جھوٹ"

"کیوں" میں نے پوچھا "وہ کیسے"

"آپ کے منہ سے تو کسی اور حلوے کی بو آتی ہے"

"کیا مطلب؟" وہ بوکھلا گیا

"ہر بات کا مطلب نہیں بتایا کرتے"

"کیوں؟"

"بس سمجھ جائیے خود بخود"

"بتا تو دو" اس نے منت کی۔

"نہیں بتاؤں گی نہیں بتاؤں گی" وہ بولی

"بھاڑ میں جاؤ بھاڑ میں جاؤ" وہ بولا

"بھاڑ میں گئے تو کئی دن ہو گئے"

"اور جلے نہیں" اس نے پوچھا

"پر جل نہیں گیا" وہ بولی

"نہ جانے کیا کہہ رہی ہو"

"جاگتے کو کون جگائے"

دفعتاً علی نے محسوس کیا کہ وہ سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔ لیکن علی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہزاد کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اسے یہ بات کیسے سمجھ میں آ سکتی تھی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آ سکتا کہ بیگم ماں ہو کر اپنی بیٹی کے خلاف بات کر سکتی ہے۔

دفعتاً ان کے قریب ہی سے چار ایک آدمی مل کر گانے لگے۔

"ہمیں حلوہ کھلاؤ، ہمیں حلوہ کھلاؤ"

"وہ سب مل کر یوں گا رہے تھے جیسے قوال گاتے ہیں۔ ان کی آوازوں میں تمسخر تھا لیکن تمسخر کی حیثیت ایسی تھی جیسے آرزو کے تھال پر ریشم کے پتے چھڑکے ہوئے ہوں۔"

"ارے" سادی حسب عادت قہقہہ مار کر بولی "ہم تو قوالوں میں آ گئے"

ایلی نے ادھر ادھر دیکھا سادی کے پیچھے پودوں کے جھنڈ میں بیٹھے ہوئے پانچ سات لڑکوں کی ٹولی سادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ایلی صاحب آپ بھی گائیے نا" سادی ہنسی

ایلی گھبرا گیا

"خدا کے لئے نہ بولو" اس نے اشارہ کیا

"کیوں نہ بولوں"

"چلو یہاں سے چلیں"

"ان بزرگوں کے درشن تو کر لوں" وہ ہنستے ہوئے بولی

قوال قریب تر آ گئے "ہمیں منہ دکھا دو۔ ہمیں منہ دکھا دو"

"ارے" وہ مڑی

قوال اور قریب آ گئے "ہمیں منہ دکھا دو۔ ہمیں منہ دکھا دو"

"پنجی داس سے انگوٹھی مانگو" سادی تالی بجاتے ہوئے گانے لگی۔

ایلی گھبرا کر چل پڑا۔

ابھی وہ چار ایک قدم ہی چلا تھا کہ قوالوں کی آوازیں بند ہو گئیں

"ایلی صاحب ایلی صاحب" سادی کی آواز سنائی دی "یہاں آئیے"

جب ایلی قریب پہنچا تو وہ ہنسنے لگی "یہ بھائی صاحب آم دے رہے ہیں تحفہ کھائیں گے آپ۔"

"آم دے رہے ہیں"

"مذہب تنگ سے بات شروع ہوئی تھی آم کھانے پر ختم ہو رہی ہے۔ جیسے رہتا"

وہ ہنسی۔

"معاف کیجیے وہ تو ایسے مذاق تھا" ایک نوجوان جھینپتے ہوئے بولا۔

"کہیں یہ ساری بات بھی مذاق نہ ہو" ساوی نے کہا

وہ سب ہنسنے لگے

حور اور لنگور

پھر وہ دونوں آم چوستے ہوئے باغ میں یوں گھومنے لگے جیسے میلے پر آئے ہوئے ہوں۔ اور بالآخر ایک بڑے سے پلاٹ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ساوی بات بات پر ہنستی قہقہہ لگاتی تالی بجا بجا کر ہنستی۔ وہ اپنے آپ میں اس قدر گم تھے کہ انہیں گرد و پیش کا احساس ہی نہیں تھا۔ انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ دور دور سے طلبا اس پلاٹ کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ وہ چھپ کے پودوں کی اوٹ میں بیٹھ جاتے اور پھر دور بیٹھے ہوئے ساتھیوں کو اشارے سے بلاتے۔ حتیٰ کہ ان کی تعداد بیس پچیس تک پہنچ گئی۔ پھر وہ چھپے سے پودوں کی اوٹ سے نکل کر آئے اور انہوں نے ساوی اور علی کے گرد چاروں طرف حلقہ بنا لیا اور گانے لگے

"پہلو سے حور میں لنگور خدا کی قدرت"

علی نے گھبرا کر ادھر دیکھا اس کا دل ڈوب گیا۔

وہ جھوم جھوم کر گا رہے تھے۔ تالی پیٹ رہے تھے ٹھمکیں منا رہے تھے۔

"ارے" ساوی نے مسکرا کر علی کی طرف دیکھا

"یہ کیا بدتمیزی ہے" علی نے زیرلب کہا

"وہ تو ہے" ساوی نے کہا "لیکن کیسے اچھے ہیں"

لڑکے ساوی کی بات سن کر تالیاں پیٹنے لگے "ہیر ہیر"

پھر ساوی نے دونوں بازو اوپر کر دیے۔ "دیکھئے بھائی صاحب" وہ یوں چلائے

لگی جیسے بس میں مٹھائی فروش بات شروع کرنے سے پہلے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چلاتا ہے۔''

''سنیے بھائی صاحب'' اس نے دہرایا اور پھر رک گئی۔

''یہ بتائیے'' وہ بولی ''کہ جوکر کون ہے اور لنگور کون؟''

لڑکوں نے دلچسپی اور تعجب سے سادی کی طرف دیکھا اور قہقہے مارنے لگے۔

''اپنے ان سے پوچھیے'' ایک شوخ نوجوان ایلی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

''کیوں میرے ان صاحب'' سادی ایلی سے مخاطب ہو کر بولی ''آپ کے لیے نام تو اچھا تجویز کیا ہے ان لوگوں نے''

''لنگور، لنگور، لنگور'' چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ ایلی نے محسوس کیا کہ سادی کے مقابل میں وہ واقعی لنگور تھا۔ اس کی ٹانگوں میں دم سمٹنے لگی۔

''لیکن لنگور ہے کون'' سادی نے پوچھا

لڑکوں نے دایاں ہاتھ اٹھایا جس طرف سادی کھڑی تھی اور چلائے ''جوکر، جوکر'' پھر بائیں اوپر اٹھایا اور چلانے لگے لنگور لنگور پھر وہ ایک ساتھ بار بار اپنے ہاتھ اٹھا کر چلاتے ''لنگور'' دیر تک وہ شور مچاتے رہے۔ اور سادی قہقہے لگاتی رہی۔

پھر سادی ان کے ساتھ شامل ہو گئی ان کے حلقے سے ذرا ہٹ کر ایلی کی طرف اشارہ کر کے گانے لگی

''پھولے جوڑ میں لنگور خدا کی قدرت''

لڑکے جوش میں اس کے ساتھ چلانے لگے۔ ایلی چپ چاپ گھاس پر بیٹھا ہوا دانتوں میں تنکا چبائے جا رہا تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کے تیور دیکھ کر لڑکوں نے حلقہ اور بھی تنگ کر دیا تھا۔ اس لیے بیٹھے رہنے کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ کار نہ تھا۔

کچھ دیر کے بعد جب سادی رخصت ہو رہی تھی وہ بھول گئے تھے کہ سادی ایک

ڑی تھی نوجوان اور خوبصورت لڑکی۔ ان کی آنکھیں پرنم تھیں۔

"تو آپ جا رہے" کیف نے حسرت بھری نگاہ ڈال کر کہا

"ہاں دونوں خود اور لنگور"

وہ چلنے لگے "خدا حافظ" ساوی نے کہا

چٹن نے جواب میں سیٹی ماری اور تانگہ چل پڑا۔ لنگور پائیدان پر رکھے ہوئے سائیکل سے چمٹا ہوا تھا۔

اور وہ

تانگے میں وہ دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر ان میں ٹھوڑی ٹیک رکھی تھی اور سڑک پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔

"کس سوچ میں پڑی ہو؟" ایلی نے پوچھا

"کچھ نہیں" اس نے مسکرانے کی کوشش کی

"آخر کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں"

"ڈرتی ہوں کہ بھائی جان کو پتہ نہ چل جائے"

وہ ہنسی "کیا فرق پڑتا ہے"

"پھر سوچ کیسی؟"

"سوچ کے سوا اب ہے ہی کیا" وہ بولی

"کیوں؟"

"خود کردہ را علاجے نیست"

"پشیمانی ہو رہی ہے"

"نہیں پریشان ہوں"

"کیوں؟"

"بس یوں" وہ ہنسی

"تم تو بہت ہمدرد بن رہی تھی" ایلی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا

"نہ جانے وہ بات حائل ہو جاتے تو" اس نے حسرت بھری نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا۔ "نہ حائل ہونے دو" ایلی بولا

"اگر آپ نے حائل کر رکھی ہو تو"

"میں نے" ایلی کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔

ایلی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے دفعتاً وہ اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گئی تھی۔ ایسی تو اس کی عادت نہ تھی وہ تو ایک جسم طرب کا اظہار تھی جو کبھی رکتا نہ تھا۔

"ضرور کوئی بات ہوئی ہے" ایلی نے کہا

"ہوئی تو نہیں" وہ بولی "پہلے ہی سے تھی چلو چھوڑو" دفعتاً وہ ہنسی "جو معاف کیا"

"ارے تو کیا یہ مذاق تھا"

"ہاں" وہ ہنسی لیکن اس کی ہنسی میں خوشی کا عنصر نہ تھا

"آپ نے چچا محمد صاحب سے بات کی؟" سادی نے پوچھا

"نہیں تو" ایلی نے جواب دیا

"کیا وہ مان جائیں گے؟"

"پتہ نہیں" وہ بولا "مجھے ڈر آتا ہے"

"اچھا" سادی نے آہ بھری

"کیا یہ ضروری ہے" ایلی نے پوچھا

"ہاں" وہ بولی "ان کی طرف سے رسمی پیام کا آنا ضروری ہے"

"کیوں؟"

"بڑے خاندانوں کے بڑے بکھیڑے ہوتے ہیں اس بات پر لوگ بضد ہیں"

"اچھا" بیلی نے کہا "اور"

ساوی نے اس کی بات کاٹ کر کہا "میں نے غلطی کی"

"کیا؟"

"میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ اس معاملے میں تمہیں مجبور نہ کروں گی"

"کیا دیواریں کھڑی ہوتی جائیں گی؟"

"نہیں یہ تو دیواریں نہیں" وہ ہنسی "دیوار تو" وہ رک گئی

"کہو نا"

"زبردستی ہے کیا"

"ہاں" بیلی جلال میں آ گیا

ساوی نے قہقہہ لگایا

"تمہیں بتانا پڑے گا" وہ غرایا

"نہیں بتاؤں گی نہیں بتاؤں گی" ساوی نے قہقہہ لگایا

"تو جملہ ہی مکمل کر دو"

"نہیں"

"تمہیں میری قسم" بیلی نے منت کی "کیا کوئی دیوار ہے"

"ہاں" وہ ہنسی "آپ کی جانب سے"

"میری جانب سے؟"

"ہاں"

"جھوٹ بکو اس کوئی دیوار نہیں"

"وہ وہ" ساوی نے قہقہہ لگایا

"وہ" بیلی سوچنے لگا "وہ کون؟ بتاؤ" جوش میں وہ بھول گیا کہ اس نے دونوں ہاتھوں میں سائیکل تھام رکھا تھا۔ اس نے ساوی کا بازو پکڑنے کے لیے ہاتھ

بڑھا دیے۔ دھڑام سے سائیکل تانگے سے ٹکرا گئی۔ علی تانگے سے اتر گیا۔"

سادی نے ایک اور قہقہہ لگایا اور پھر چلا کر بولی "خدا حافظ" اور تانگہ چل پڑا۔ علی نے سائیکل سنبھالی اور تانگے کو جا لینے کے خیال سے اس پر سوار ہو گیا لیکن ٹکرانے کی وجہ سے پیڈل خراب ہو گیا تھا اور زنجیر جام ہو چکی تھی۔ وہ سائیکل سے اتر گیا اور پیدل چلتے ہوئے سادی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھی "خدا حافظ خدا حافظ" اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

تنکا تنکا

علی پور جاتے ہوئے گاڑی میں علی مسلسل سوچتا رہا لیکن اسے سمجھ میں نہ آیا کہ کونسی دیوار اس کی اپنی جانب سے حائل تھی "وہ" سے سادی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ وہی ایک دیوار تھی جو سادی اور علی کے درمیان حائل تھی لیکن نہ جانے کیوں اس جذباتی تعلق کے باوجود وہ شہزاد کے متعلق محسوس کرتا تھا وہ اسے دیوار نہیں سمجھتا تھا۔ اگر وہ اس موضوع پر غور سے سوچتا تو محسوس کرتا کہ الٹا سادی تو بذات خود شہزاد اور علی کے درمیان ایک دیوار بن چکی تھی۔ ایک ایسی دیوار جو راستے کی مشکل نہیں تھی بلکہ علی کے تحفظ سکون اطمینان اور خوشی کی دیوار تھی۔ یہ سچ تھا کہ علی کو شہزاد سے بے حد وابستگی تھی لیکن علی محسوس کرنے لگا تھا کہ شہزاد کے شادی شدہ ہونے کی وجہ سے ان کے تعلقات صحت مند نہیں رہ سکتے تھے۔

بہر حال وہ سادی کے اس اشارے کو نہ سمجھ سکا۔ اسے خیال بھی نہ آیا کہ کسی نے سادی سے شہزاد کی بات کہہ دی تھی۔ اور پھر بیگم نے یہ خیال اس کے دل میں نہ آیا اگر وہ سادی کے اس اشارے کو سمجھ پاتا تو یقیناً وہ سادی سے مل کر اپنے تمام روئیداد سنا دیتا اور سادی اپنی خلوص پسندی اور سادگی کی وجہ سے اس پھانس کو اپنے دل سے نکال دیتی جو بیگم نے انتقام کے جذبے کی وجہ سے اس کے دل میں پیدا کر دی تھی۔

لیکن حالات کا تقاضا کچھ اور تھا۔ مستقبل کے بطن کے تعلقات کا رخ کسی اور

جناب متعین تھا۔ ہونے والے واقعات مستقبل کے بطن میں پل رہے تھے یعنی نمو کے لیے پھل رہے تھے۔

علی پور پہنچ کر جب ایلی شہزاد کے چوبارے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ صفدر اور شہزاد ایک جگہ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ شادی کی باتوں کی وجہ سے اس قدر پریشان تھا کہ اسے خیال ہی نہ آیا تھا۔ اس نے صفدر کی آنکھ میں ابھرنے والی چمک کی طرف توجہ نہ دی اور اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ شہزاد اس کی آمد پر گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی ہے۔

ایلی کو دیکھ کر بیگم قریب آگئی "تو آ بھی گیا" وہ بولی

"ہاں" ایلی نے جواب دیا

"وہ ایک روز بھی باہر نہ رہ سکا" بیگم کی مسکراہٹ میں طنز کی دھار تھی۔

ایلی نے غصے سے بیگم کی طرف دیکھا

صفدر کے چہرے پر چمک ابھری

شہزاد جوں کی توں خاموش بیٹھی رہی۔

ایلی بیگم کی بات کا جواب دیے بغیر فرحت کی طرف چل پڑا۔

علی پور آنے کے بعد ایلی پر صرف ایک دھن سوار تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ علی احمد سے رضامندی حاصل کر لے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس معاملے میں ضد نہیں کریں گے۔ اسے معلوم تھا کہ علی احمد ہر اس بات کے خلاف ہیں جس میں روپیہ خرچ ہوتا ہے اس لحاظ سے ایلی کی شادی کی بات ان کے لیے ایک مصیبت تھی زبانی بات چیت بھی ناگوار تھی۔ لیکن اخراجات سے ہٹ کر انہیں قطعی طور پر اس بات میں کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ایلی کی شادی کہاں ہوتی ہے یا وہ خاندان کیسا ہے یا لڑکی کی ناک اونچی ہے یا چپٹی ہوئی۔

اگر ایلی علی احمد سے کہتا ابا جان میری شادی کر دیجئے تو علی احمد اس بات پر ذرا بھی

چیں بہ جبیں نہ ہوتے۔ وہ ان بزرگوں کی طرح نہ تھے جو کسی بات پر مشتعل ہو
جاتے ہیں اور کھنکار کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ یا انھیں ٹکا سا کر کہتے ہیں "شرم کرو
بیٹا اپنے منہ سے ایسی بات کہتے ہوئے تمھیں شرم آنی چاہیئے"

ایسے وقت ان کا رویہ ایک تماشبین سا ہو جاتا۔

"بہت اچھا" "بہت اچھا" وہ نہایت خوش اخلاقی سے کہتے اور پھر اپنی بیوی کو
مخاطب کر کے کہتے "سو بھئی راجو شمیم سنا تم نے ایلی کہتا ہے میری شادی کرو۔ بی بی
بی بی سن لیا تم نے" وہ قہقہہ مار کر کہتے۔ اس قہقہے میں تمسخر کا عنصر نہیں ہوتا۔ پھر
دفعتاً وہ سنجیدہ ہو جاتے "لیکن راجو بھئی کہتا ٹھیک ہے۔ اب اس کی شادی کی فکر کرنا
ہی چاہئے۔ اب تو جوان ہو گیا ہے۔ وہ ایلی سے پوچھو تو شادی کیا ہے ایک روگ ہے۔
راجو سن رہی ہے تو کیا کہہ رہا ہوں میں۔ لیکن تیرے سننے نہ سننے سے کیا فرق پڑتا
ہے سن بھی لے تو کیا سمجھے گی میری بات! بی بی بی" وہ ہنستے۔ "لیکن وہ وہ کیا
روگ ہے ہزار روگ سے بچانے والا ہزاروں آفتوں سے محفوظ رکھنے والا۔ بس
ایک روگ لگا لو ہزار مصیبتوں سے محفوظ ہو جاؤ۔ سن رہی ہو راجو شمیم، تمہارا روگ لگا
کر میں ہزار مصیبتوں سے بچا ہوا ہوں۔ بی بی بی بی" وہ ہنستے "ہاں بھئی" وہ ایلی
سے مخاطب ہو کر کہتے "ٹھیک کہتے ہو تم تمہاری شادی فوراً ہو جانی چاہئے۔ سو بھئی
راجو شمیم کر دو شروع تیاری ہم بھی کوئی مناسب لڑکی دیکھتے ہیں بی بی بی بی" وہ
ہنستے "راجو اب میں کوئی اپنے جوڑ کے دیکھتا ہوں اب تو مجبوراً ایلی کے لیے
لڑکیوں کو دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ بی بی بی بی اور دیکھو ایلی شادی کوئی کھیل نہیں کہ
آج تم ہو اور کل ہو جائے بھئی یہ تو بہت بڑا بکھیڑا ہے۔ پہلے تنکا تنکا اکٹھا کریں۔
تب میرا تو یہ ہے نہیں کہ ایک دم سب کچھ تیار ہیں۔ کوئی زمانہ آیا ہے۔ اب روٹی
نہیں چلتی۔ بس تنکا تنکا اکٹھا ہو گا پھر تمہارا آشیانہ بنے گا اور پھر کوئی فاختہ آ بیٹھے گی
اللہ اللہ خیر سلا۔ سو بھئی راجو تو شروع کر دو آج ہی سے تنکا تنکا جمع کرنا۔ بی بی بی بی"

وہ ہنستے اور بات حلق پر دھری کی دھری رہ جاتی۔

ایلی سوچ رہا تھا کہ اب سے اس انداز سے بات کی جائے کہ انہیں واضح طور پر محسوس ہو کہ اخراجات کا انتظام ہو چکا ہے۔ تنکا تنکا اکٹھا ہو چکا ہے۔ فاختہ بھی موجود ہے اور ان سے صرف یہ توقع کی جا رہی ہے کہ رسم کے مطابق فاختہ کو ٹہنی ٹہنی پر بٹھا کر لے آئیں اور بنے بنائے گھونسلے میں بٹھا دیں۔ اس صورت میں شاید وہ اعتراض نہ کریں۔

ایلی نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ اخراجات کون پورے کرے گا، پیسہ کہاں سے آئے گا، رسومات کیسے ادا ہوں گی۔ رکھ رکھاؤ کیسے قائم رہے گا۔ یہ باتیں بے حد تکلیف دہ تھیں اور بڑی ناخوشگوار اور تکلیف دہ باتوں پر سوچنا ایلی کو ناپسند تھا۔ طبعی طور پر وہ ذہنی فرار کا قائل تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے ابا سے رضامندی حاصل کرے اور وہ ایک بار سادی کے اقرباء سے مل کر رسمی طور پر پیغام پیش کر دیں۔ پھر جب جو کچھ ہونا ہو۔ پھر اس کے متعلق سوچنے سے ایلی گریز کرتا تھا۔ غالباً وہ سمجھتا تھا کہ اس دوران میں سادی کا تبادلہ مل جائے گا اور جملہ ضروریات پوری ہو جائیں گی یا پیسہ نہ ہو گا تو شاید منصر سے ان رسمی اخراجات سے گریز کر سکے یا شاید ماں اس کی مدد کرے۔ آخر اس نے ایلی کی منگنی بھی تو کی تھی اور کی بھی بڑی دھوم دھام سے تھی۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ بشرطیکہ ابا رضامندی دے دیں۔

ماں کے متعلق ایلی نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اس کی دانست میں ماں تو اس بات پر بے حد مسرور تھی۔ وہ تو خوش تھی کہ اس کا بیٹا ایک بیاہتا عورت کے دام سے نکل رہا ہے۔ ورنہ ماں تو سادی کے ہاں دو تین مرتبہ ہو آئی تھی اگر وہ اس بات پر خوش نہ ہوتی تو بھلا وہاں جاتی ہی کیوں۔ لہذا یہ بات تو طے شدہ تھی کہ ماں اس امر میں اس کا ساتھ دے گی۔

لیکن جب ایلی نے ماں سے بات کی تو وہ حیران رہ گیا۔

"نہ بھی" وہ بولی "میں اس معاملے میں نہیں آؤں گی"

"کیا مطلب" لیلیٰ نے حیرت سے پوچھا

"مجھے بڑی خوشی ہے کہ تیری شادی ہو لیکن میں اس معاملے میں کیسے آسکتی ہوں"

"کیوں" وہ غصے میں غرایا

"دیکھو ناں میں نے کتنے چاؤ سے تمہاری منگنی کی تھی۔ اب اگر اس رشتے کو چھوڑ کر میں دوسری جگہ جا ناطہ جوڑوں تو لوگ کیا کہیں گے۔ میرے عزیز کیا سمجھیں گے" پھر وہ رونے لگی "ہائے لیلیٰ تو نے تو میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کتنے چاؤ سے میں نے تجھے نامزد کیا تھا۔ اور پھر بالا بالا ہی نہیں تجھے پوچھ کر میں نے بات پکی کی تھی۔ یاد ہے تجھے تو نے کس خوشی سے ہاں کہا تھا لیکن اب" وہ خاموش ہو گئی اس کے گالوں پر آنسو یوں بہنے لگے جیسے جھڑی لگی ہو۔

"تو کیوں جی برا کرتی ہے اماں" فرحت بولی

"جی برا" وہ رونے لگی "میرا دل تو اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کب اس کی امید لگائے بیٹھی تھی۔ اس کو دیکھ دیکھ کر جیتی رہی۔ خاوند کی بے رخی برداشت کی سوتنوں کی خدمت میں لگی رہی۔ زندگی بھر محنت مزدوری کرتے رہے پر" ہاجرہ کی ہچکی بندھ گئی۔

لیلیٰ نے محسوس کیا جیسے ہاجرہ کے آنسو اس کے آشیاں کے تنکے ہوں جو بکھرے جا رہے ہوں۔

گھبرا کر وہ اٹھی اور اپنا غصہ اور اضطراب چھپانے کے لیے سوچے سمجھے بغیر زینہ چڑھنے لگا۔

شہزاد کے چوبارے میں پہنچ کر وہ ٹھٹھکا شہزاد کھڑکی میں تھی جس کے قریب ہی صفدر کے چوبارے کی کھڑکی تھی۔ اور وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ چپ چاپ وہ کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔

دفعتاً صفدر کی نگاہ ایلی پر پڑی۔ "آپ آپ" وہ چلایا "ایلی صاحب آ گئے ہیں"

شہزاد نے مڑ کر ایلی کی طرف دیکھا اور پھر منہ موڑ کر صفدر سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی۔

"نہ" وہ بولی "مجھے ان ڈیزائن کے بندے پسند نہیں مجھے تو کوئی نئے فیشن کا نمونہ دکھاؤ۔ اتنے روپے بھی خرچوں اور پھر وہی دقیانوسی چیز۔ کام کرنا ہے تو ڈھنگ سے کرو ورنہ کیا فائدہ" وہ ہنسنے لگی۔

"بہت اچھا" صفدر نے دونوں بازو اٹھا کر یوں کہا جیسے حافظ خدا تمہارا گاتے ہوئے سٹیج سے باہر جا رہا ہو اور وہ چلا گیا۔

شہزاد فارغ ہو کر چوبارے میں ادھر ادھر گھومنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو دودھ پتی بجلی پر رکھ دی۔ کارنس پر پڑی سرمے دانی کو ایک طرف دھکیل صندوق کھول کر تکیے کا غلاف نکالا۔ اسے سرہانے پر چڑھایا اور پھر تیل کی کپی اٹھا کر مشین کو تیل دینے لگی۔

ایلی چپ چاپ سے دیکھتا رہا دیکھتا رہا اور پھر مایوس ہو کر نیچے اتر گیا۔

مسٹر گپتا

جن دنوں ایلی نے بی اے پاس کیا تھا وہ مالی بحران کے دن تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے سانپ کو گزرے سالہا سال گزر چکے تھے۔ لیکن لکیریں اب ابھر رہی تھیں۔ ہر محکمے میں تخفیف کا کلہاڑا چل رہا تھا نوکری حاصل کرنا ناممکن تھا۔

مجبوری میں ایلی نے ایک شارٹ ہینڈ کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہ کالج علی پور کے لاہوری دروازے کے قریب ایک چوبارے میں واقع تھا جس کے ملحقہ مکان میں مسٹر گپتا کالج کے مالک اور واحد انسٹرکٹر کی رہائش تھی مسٹر گپتا پرانی وضع کے بڑے عزت دار آدمی تھے۔

وہ صبح سویرے جاگتے اور چھڑی لے کر باہر چہل قدمی کے لیے نکل جاتے۔ مسٹر

گپتا چھتری ہوا کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے۔ان کی چال اس قدر چست اور تیز تھی کہ چھتری معاون ثابت ہونے کی بجائے الٹا رکاوٹ معلوم ہوتی۔لیکن مسٹر گپتا چھتری یا چھتری کے بغیر باہر نکلنے کے قائل نہ تھے۔وہ ایک پرانے باعزت خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے آباء اجداد میں کسی شخص نے چھتری یا چھتری کے بغیر باہر نکلنے کی حماقت نہ کی تھی۔یہ کرنے کے بعد وہ مندر سے ہوتے ہوئے سیدھے اپنے کالج میں پہنچتے۔اپنے شاگردوں کو دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے اور پھر انہیں پڑھانے میں مصروف ہو جاتے۔

مسٹر گپتا اس بات پر بے حد ناز کرتے تھے کہ ہندوستان میں صوتی شارٹ ہینڈ کو چلانے کے لیے انہوں نے ساری عمر جدوجہد کی تھی۔

جب کوئی نیا لڑکا کالج میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آتا تو مسٹر گپتا اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر اس کے پاس بہ کمال شفقت بیٹھتے اور اسے سمجھاتے کہ شارٹ ہینڈ کا مروجہ سسٹم جسے پٹ مین کہا جاتا تھا بالکل بے کار ہے اور ان کے نئے سسٹم کا مقابلہ نہیں کرسکتا چونکہ ان کا سسٹم جابت وال سسٹم ہے۔

مسٹر گپتا بڑی محنت سے نئے لڑکوں کو سمجھاتے کہ جابت وال سسٹم کا کیا مطلب ہے اور فونیٹک سسٹم سے کیا مراد ہے اور پھر جب لڑکا داخل ہو جاتا تو پھر بات بات پر اسے تاکید کرتے کہ لکھتے وقت وہ سپیلنگ کا خیال رکھے۔

یلمن کی اس بات پر بے حد محظوظ ہوتا اور بڑی سنجیدگی سے پوچھتا

"کیوں مسٹر گپتا یہ سسٹم صوتی ہے نا یعنی اس میں صرف آواز کا خیال رکھا جاتا ہے"

"بالکل بالکل یوں صاحب بس اس نکتہ کو آپ ہی نے سمجھا ہے لڑکے توجہ سے بات نہیں سنتے۔"

"درست" یلمن کہتا "لیکن ہمیں سپیلنگ کا خیال رکھنا چاہیے" وہ ہنس کر کہتا

"بالکل" وہ خوشی سے چلاتے "بس یہی ایک نکتہ ہے" اور پھر وہ فوراً مثال دیتے "صحیح جو آپ نے جے وغیرہ لکھا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے لفظ کے سپیلنگ کی طرف خیال نہ کیا آپ کو یہ خیال نہ رہا تھا کہ یہ لفظ جے سے لکھا جاتا ہے۔ آپ نے یوں لکھا جیسے یہ لفظ جے سے لکھا جاتا ہو۔

مسٹر گپتا سے باتیں کرنے میں ایلی کو بہت لطف آتا تھا ہر چند وہ کم مسٹر گپتا کے پاس جا بیٹھتا ہر چند سبق پڑھتے ہوئے بھی وہ مسٹر گپتا سے گپ بازی کیا کرتا۔ کالج میں ایلی واحد صاحب علم تھا جس سے مسٹر گپتا نے دوستانہ مراسم پیدا کر رکھے تھے اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ایلی بی اے تھا اور مسٹر گپتا کے کالج میں تمام طلبا میٹرک پاس تھے۔

دفعتاً محلے میں شور مچا کہ ایلی کی منگیتر شہزاد کی شادی ہو رہی ہے۔ ہاجرہ یہ سن کر حیران رہ گئی وہ بھاگی گئی پوچھ گچھ کی بات کی تصدیق ہوئی تو ٹھنڈی ہو کر بستر پر پڑ گئی۔

اس پر ایلی ماں کے پاس آ بیٹھا بولا ماں اب تو تمہارا یہ اعتراض بھی دور ہو گیا۔ چلو اب میرے ساتھ چلو کہ مظفر آباد میں ابا سے ملیں شاید وہ مان جائیں۔

ہاجرہ نے جب ایلی کی بات سنی تو پہلے تو وہ ادھر ادھر کے بہانے بناتی رہی لیکن ایلی نے بار بار ماں کی منتیں کیں حتیٰ کہ ایک روز ماں ایلی کے ساتھ مظفر آباد کے لیے مان گئیں۔

ماں اور بیٹا ملتان پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ سیلاب کی وجہ سے مظفر آباد کی سڑک ٹوٹی ہوئی ہے اور وہ آگے نہیں جا سکتے۔ مجبوراً وہ ملتان ایک رشتہ دار کے ہاں ٹھہر گئے اور انتظار کرنے لگے کہ کب رستہ صاف ہو اور وہ منزل مقصود پر پہنچیں۔ ملتان کے قیام کے دوران میں ایلی روز ماں کو باہر لے جاتا اور کسی باغ یا میدان میں پہنچ کر وہ دونوں کسی ویران کونے میں بیٹھ جاتے اور ایلی ماں کو سمجھاتا کہ علی محمد سے کس طرح

بات کی جائے۔

"دیکھو اماں" وہ کہتا "اگر ابا نے محسوس کیا کہ شادی پر بہت خرچ اٹھے گا تو وہ کسی نہ کسی بہانے یہ رشتہ نامنظور کر دیں گے اور اگر یہ موقعہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر شاید کبھی یہ موقعہ نہ ملے اور اماں شادی ایک ایسی ناؤ ہے جو مجھے اس بھنور سے باہر نکال سکتی ہے جس میں میں غوطے کھا رہا ہوں اور اگر یہ ناؤ بھی نہ ملی تو پھر پھر تم جانتی ہو" علی وضاحت سے ہاجرہ کو سمجھا رہا تھا کہ اگر وہ ناکام رہا تو پھر وہ اپنے آپ کو زمانوں بھنور کے حوالے کر دے گا جس میں وہ عرصہ دراز سے ڈبکیاں کھا رہا تھا۔

اس روز پہلی مرتبہ علی نے اپنے منہ سے یہ تسلیم کیا تھا کہ شہزادی ایک بھنور تھی اور وہ اس بھنور میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ درحقیقت وہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر رہا تھا بلکہ اسے استعمال کر رہا تھا اور دھمکی کے طور پر بوڑھی ماں کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

لیکن ہاجرہ بار بار کہتی "اگر تمہارے ابا نے شادی پر خرچ نہ کیا تو کرے گا کون اور بات کیسے بنے گی۔

"تم اس بات کی پروا نہ کرو اماں یہ بعد کی بات ہے فی الحال ضروری بات یہ ہے کہ ابا جان چاہیں اور انہیں ان کی صرف اس قدر امداد حاصل ہو جائے کہ وہ شادی کے بدلے اگر پیغام پیش کر دیں۔ اس لیے بات اس انداز سے کرنا چاہیے کہ وہ سمجھیں خرچ وغیرہ کا مسئلہ نہ ہوگا۔"

"لیکن پھر شادی کیسے ہوگی کیا وہ تمہیں خانہ داماد بنائیں گے"

"نہیں اماں!"

"ایسی بات ہے تو میں جیتے جی مر جاؤں گی" ہاجرہ چلاتی اور بات جوں کی توں ادھوری رہ جاتی۔

چار ایک روز کے بعد بصد مشکل تھکے تھکے پاؤں سے گزر کر وہ مظفر آباد میں علی احمد کے مکان تک پہنچے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر علی احمد کے گھر میں شور مچ گیا۔ جو

اور شمیم ہونٹوں پر انگلیاں رکھے حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ شمیم کی دونوں بیٹیاں اور رجو کے پہلے خاوند کا بیٹا سب شور مچانے لگے۔

”ہے آپ ہیں۔ یہ میری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے۔“

”خیر تو ہے۔“ رجو بولی۔

”تو یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری۔“ شمیم نے علی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اے سن آپ نے۔“ رجو نے علی احمد کو مخاطب کر کے کہا۔ ”سنتے ہیں کیا کہہ رہی ہوں میں ہے آگ لگے اس حساب کے رجسٹر کو ہر وقت اسی میں کھوئے رہتے ہیں آپ۔ نہ آئے کا پتہ نہ گئے کا ہوش۔ میں نے کہا آپ سے کہہ رہی ہوں۔“

”مجھ سے کہہ رہی ہو چھوڑ رجو۔“ اندر سے علی احمد کی آواز سنائی دی۔

”شکر ہے سن لیا آپ نے۔“ وہ بولی۔

”ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسے۔ ”وہ دیکھو راجو یا تو بیوی گونگی ہو اور یا خاوند بہرہ ہو تبھی نبھتی ہے ورنہ نہیں۔ تم تو طوطے کی طرح ٹیں ٹیں کرتی رہتی ہو اب میں بھی بہرہ نہ ہوں تو نبھے کیسے۔ ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگے ”کیا کہتی ہے۔“

”میں کہتی ہوں۔“ رجو چلائی۔ ”ذرا باہر تو دیکھو کون آیا ہے۔“

”کوئی آیا ہے کیا؟“ وہ بولے۔

”ہاں ہاں کہہ جو رہی ہوں۔“

علی احمد نے جلدی سے ٹنگی ہوئی قمیض کو اتارا اور اسے پہننے لگے ان کی عادت تھی کہ ہمیشہ قمیض اتار کر بیٹھا کرتے اور جب کوئی آتا تو فوراً قمیض پہن لیتے۔

انہیں قمیض پہنتے دیکھ کر رجو ہنسی۔ ”اے ہے کوئی باہر سے تو نہیں آئی کہ قمیض پہننے لگے ہو۔ بہو آئی ہے۔“

”علی کی ماں ——“ انہوں نے حیرت سے کہا۔

”ساتھ علی بھی ہے۔ اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا جو آ گئے۔ بھئی رجو انہیں ٹھنڈا

کوئی چائے وائے پاؤ بسکٹ وغیرہ منگواؤ کالے کی دوکان سے لیکن بھئی تم نے کچھ اطلاع نہ دی۔

اور یہ سیلاب! کیسے پہنچے تم۔ سنا ہے ریل کی لائن ٹوٹی ہوئی ہے اور سارا شہر تو پانی میں ڈوبا ہوا ہے دو دو فٹ پانی کھڑا ہے پہلے اطلاع دیتے تو ہم کوئی انتظام کر دیتے ____ خیر خیر چھوڑو یار تم جو آ گئے۔ راجو ادھر آؤ ____ یہ دیکھا تم نے لیلی کی ماں کو۔ ذرا غور سے دیکھو۔ اب تو بالکل بوڑھی ہو گئی ہے۔ اور جو تمہیں معلوم ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ ایک مرتبہ ہماری بڑی بہن نے کیا کہا تھا"۔ وہ ہنسنے لگے۔ لیلی کی ماں سے اللہ رکھے کل کتنے لڑکے ہیں تمہارے۔ اور یہ چوتھی کا ہے۔ ہی ہی ہی ہی" وہ ہنسنے لگے۔ پھر میری طرف اشارہ کر کے بولی اللہ رکھے۔ "کیوں لیلی کی ماں یاد ہے تجھے۔ ہی ہی ہی حد ہو گئی سنا تم نے راجو۔ ہی ہی ہی۔"

جب علی احمد کو معلوم ہوا کہ وہ ان سے ایک اہم بات کرنے آئے ہیں تو دفعتاً وہ سنجیدہ ہو گئے۔ یہ علی احمد کی پرانی عادت تھی۔ اگر انہیں کسی بات میں خاص اہمیت دی جاتی تو وہ اس بات کو خاص اہمیت دینا شروع کر دیتے اور خود اپنے آپ کو اہمیت دیتے تھے۔ اور اس کے برعکس کسی مسئلے میں انہیں نظر انداز کر دیا جاتا تو وہ اس مسئلے کو قطعی طور پر اہمیت نہ دیتے اور اس نظر اندازی کو درخور اعتنا نہ سمجھتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

علی احمد نے سوچا کہ یہ لوگ اتنی دور سے چل کر آئے ہیں۔ تاکہ مجھ سے بات کریں ظاہر ہے کہ مجھ سے بات کرنے کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے تو بات اتنی آسانی سے طے نہیں ہو جانی چاہئے۔

"ہاں ہاں ہاں۔" وہ ہنسنے لگے "بھئی اب جو تم یہاں آ پہنچے ہو تو اب باتیں ہی ہوں گی نا باتیں کرنے کو۔ اور کیا ہوتا ہے اپنوں کے درمیان۔ ہی ہی ہی۔ اب دیکھو اور جو ہے تو سارا دن راجو سے باتیں کرتے ہیں ہم۔ کیوں راجو ٹھیک ہے نا ہی ہی

بی بی۔ یہ عورت ہے کہ ہر جو کبھی جواب نہیں دے سکی لیکن ماں یہ ہے کہ اس کا جواب بھی نہیں ہوتی۔ کیوں راجو بی بی۔"

"آپ میری بات چھوڑیں۔" راجو بولی۔ "ان سے بات کریں کتنی دور سے آئے ہیں یہ بات کرنے کے لیے۔"

"ان سے بھی کریں گے ان سے بھی کریں گے۔ لیکن ابھی یہ لوگ سفر کر کے آئے ہیں اور پھر کتنی تکلیف جھیلی ہے۔ انہیں چار ایک دن آرام کرنا چاہیے۔ آرام کرو کھاؤ پیو پھر بات بھی ہو جائے گی ____ کیوں راجو تم نے چائے بنائی اور یہ کالے سے سست منگو سے پھر کوئی خاطر تواضع کرو ان کی تمہارے مہمان آئے ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے پٹی صندوقچی سے ایک چھوٹی تھیلی راجو کو دیتے ہوئے بولے۔ "منگو دست۔ ذرا جلدی کرنا۔ ابھی ایلی کی ماں بیٹھ جاؤ نا۔ پوچھ تو سہی پور کا کیا حال ہے۔"

مسلسل چار روز بوجوہ ایلی نے متعدد بار کوشش کی کہ علی احمد سے بات کی جائے لیکن وہ بات کی اہمیت سے اس حد تک واقف ہو چکے تھے کہ انہوں نے کسی نہ کسی بہانے بات ٹال دی۔ ایلی بات شروع کرتا تو علی احمد کہتے اوہو۔ میں بھول ہی گیا۔ دیکھو نا کتنے جھمیلے ہیں کہ میں بھول جاتا ہوں۔ بی بی بی۔ سب سے بڑا جھمیلا تو یہ راجو ہی ہے۔ کیوں راجو سنا تم نے کیا کہہ رہا ہوں میں۔ ہو نا تم جھمیلا۔ جھمیلے دو قسم ہوتے ہیں۔ اور درد دل والے جھمیلے کا تجربہ نہیں ایلی۔ بڑا عظیم جھمیلا ہوتا ہے یہ۔ توبہ ____ اچھا نہ اچھا نہ ابھی یہ درد دل والا جھمیلا نہ ہی ہو بھی ساری عمر پڑی ہے۔ کچھ دن اور کھٹے گزر جائیں تو تمہاری خوش نصیبی ہوگی۔ یہ بیکاری کچھ اور دیر تک رہے تو بہتر ہے۔ کیوں راجو سنا تم نے بی بی بی۔"

اس طرح وہ مسلسل باتیں کیے جاتے اور ایلی کی بات پس پشت پڑ جاتی۔ کسی وقت وہ جواب دیتے۔ "ہاں ہاں بھئی آج تو بات ضروری کرنی چاہیے

اتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں آئے ہوئے لیکن ابھی میں تو جا رہا ہوں ڈپٹی صاحب کو ملنے کے لیے۔ انہوں نے بلایا ہے۔ بے چارے بڑا خیال رکھتے ہیں بات بات پر مشورہ کرتے ہیں۔ ان سے مل آؤں میں پھر اطمینان سے بات کریں گے۔"

اس کے بعد دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ وہ ڈپٹی صاحب کی طرف جاتے ہی نہ تھے اس لیے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اور اگر علی انہیں یاد دلاتا کہ آپ تو جا رہے تھے ڈپٹی صاحب کی طرف تو وہ ہنس کر کہتے ہاں ہاں ابھی جا رہا ہوں۔ اور پھر بیٹھ رہتے۔ اس طرح علی اور ماجدہ کو وہاں رہتے آٹھ روز ہو گئے۔ اور ان آٹھ روز میں علی کا صبر و سکون ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا۔ علی طبعی طور پر مزاح اور مزاحیہ صورت حال کو محسوس کرنے سے کورا تھا۔ وہ علی احمد کی رنگین شخصیت، ان کے انوکھے انداز اور پرکیف انداز گفتگو سے محظوظ نہیں ہوتا تھا۔ وہ انہیں بیٹے کی حیثیت سے دیکھتا اور اپنے مقاصد کے رو سے ان کی باتوں پر غور کرتا اس لیے یہ تمام رنگینیاں اس کی نگاہ میں دنیاداری مکر و فریب چالاکی کے مترادف نظر آتیں۔ اسے ان کی ہر بات پر غصہ آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ باپ بیٹے کی لڑائی ہو جاتی تھی۔

مظفر آباد میں علی نے مسلسل طور پر کوشش کی کہ جھگڑا نہ ہو اس لیے وہ بڑے صبر و تحمل سے کام لیتا رہا۔ علی احمد علی کی اس خصوصیت سے واقف تھے اور اکثر جان بوجھ کر ایسی باتیں کیا کرتے تھے کہ انہیں سن کر وہ تاؤ آ جائے اور جھگڑا کر بیٹھے تاکہ انہیں بات سے مخلصی حاصل ہو جائے لیکن ایسے حالات علی احمد ایسے وقت پیدا کرتے تھے جب انہیں بات کی نوعیت کا علم ہوتا اور بات کے متعلق بگڑنے کا امکان کا یقین نہ ہوتا اس طرح بات کے ٹوٹنے کی تمام تر ذمہ داری علی پر عائد ہو جاتی اور علی احمد پر کوئی حرف نہ آتا۔

ان دنوں مظفر آباد میں بھی وہ اسی بات سے ڈرتا تھا اسی وجہ سے اس نے ماجدہ کو بار بار تاکید کی تھی کہ وہ جویا شمیم سے بات نہ کرے کیونکہ اکثر مرتبہ ایسے حالات میں

وہ راجو اور شمیم کو بہکا کرتے تھے۔ بھئی کیا معاملہ ہے مجھے پتہ تو لگاؤ یہ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ اور بات کی نوعیت سمجھ کر وہ یوں ظاہر کرتے جیسے انہیں کچھ علم ہی نہ ہو اور پھر معاملے کی نوعیت کے مطابق عمل کرتے۔ بہرحال ایک روز بصد مشکل بات شروع ہوئی۔

حق و انصاف

"ہوں۔" علی احمد بولے "تو علی شادی کرنا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔ بی اے کر چکا ہے۔ دال روٹی کما سکتا ہے۔ لہذا ضرور کرنی چاہیے شادی۔ اور علی کی ماں سنا تھا تم نے تو علی کی منگنی کر رکھی تھی۔ وہ کیا ہوئی۔ بھئی ہم نے تو سنا تھا۔ شاید غلط ہو لیکن سنا ضرور تھا۔ اچھا تو کیا سچ تھا۔" انہوں نے ہاجرہ کے جواب میں سر ہلانے کے بعد کہا۔ "بہر صورت بہت اچھا کیا تھا تم نے۔ اور اگر تم اب شادی کرنا چاہتی ہو علی کی تو ضرور کرو۔ فوراً کر دو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بھئی جیسے میرا بیٹا ہے ویسے ہی تمہارا بیٹا ہے میں شادی کروں یا تم کرو باپ کرے یا ماں کرے کیا فرق پڑتا ہے۔ تو اتنی سی بات کے لیے تم دونوں اتنا لمبا سا غور کرتے ہوئے ہو گیا۔ میں سمجھا نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ آسمان ٹوٹ پڑا ہے یا زمین غائب ہو گئی ہے حد ہو گئی۔ کیوں بی بی کیوں راجو۔"

"نہیں نہیں۔" ہاجرہ بولی "علی میاں شادی کرنا نہیں چاہتا"۔

"وہ نہیں کرنا چاہتا۔ کیوں؟" کچھ دیر تک وہ علی کی طرف دیکھتے رہے پھر خود بولے۔ "خیر خیر یہ تو اپنی طبیعت کی بات ہے لیکن اس سے نہیں تو کسی اور سے سہی محلے میں تو اتنی ساری لڑکیاں ہیں آخر ان کا کرنا کیا ہے اچار ڈالنا ہے کیا۔ وقت پر کام نہ آئیں تو فائدہ کیا ہوا۔ کیوں بی بی کیوں راجو۔ ہے نا ٹھیک بات۔"

"آپ مجھے کیوں درمیان میں گھسیٹ لیتے ہیں۔" راجو غصے میں بولی۔

"تو" وہ مسکرائے۔ "خواہ مخواہ بگڑ رہی ہے لگتی تو میری بیوی جو ہوئی۔"

"وہ بھی تو بیوی ہی ہے نا۔" رجو نے شمیم کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ہاں بالکل ہے بے شک وہ بھی بیوی ہے۔ لیکن درمیان میں گھسیٹنے والی تھیں وہ صرف تم ہوئی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے۔

رجو کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ "ہاں بھئی تو میں کہہ رہا تھا یلی کی ماں تم تو لڑکیاں تجویز کی ہیں محلے میں کسی ایک کو پکڑ لو اور یہ کار خیر سر انجام دو۔ اے وہ اللہ اللہ خیر سلا ہمیں بھی اطلاع کر دینا۔ ایسا نہ کرنا جیسے منگنی پر کیا تھا ہمیں خبر ہی نہ بھیجی۔ اور ہمیں اطلاع کرو گی یلی کی ماں تو اگر چھٹی ملی تو وقت نکال کر ضرور پہنچوں گا ورنہ دونوں کو تو چاہیے آ جائیں گی سے جو۔" انہوں نے رجو اور شمیم کی طرف اشارہ کیا۔

"اے ہے۔" رجو بولی۔ "محلے میں کوئی لڑکی ہے کام کی۔"

"تو" علی احمد بولے۔ "یہ سمجھتی ہے بس یہی ایک کام کی تھی اور اس کے چلے آنے کے بعد دولت پور میں کوئی کام کی لڑکی باقی نہیں رہی۔"

"آپ میری بات نہ کیا کریں۔" رجو غصے میں بولی۔

"اچھا" علی احمد بولے۔ "سوچ لو۔ شمیم بھی یہی کہا کرتی تھی۔ اور میں نے شمیم کی بات مان لی تو اب خود ہی ناراض بیٹھی ہے۔ کہتی ہے مجھ سے بات نہیں کرتے۔"

"بس میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکے کوئی۔" شمیم بولی۔

"اے ہے آپ خواہ مخواہ دوسری بات چھیڑ بیٹھے۔" رجو نے کہا "یہ یلی کی بات تو ختم کرو۔ میں کہتی ہوں محلے میں کوئی کام کی لڑکی ہو بھی۔"

"اوہو" علی احمد بولے۔ "بابا سب کام کی ہوتی ہیں۔ چاہے ناک اونچی ہو یا پھیپھی ہو، رنگ گندمی ہو یا سانولا۔ آنکھ موٹی ہو یا چھوٹی۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"ہوں فرق نہیں پڑتا۔" شمیم چلائی۔ "فرق نہیں پڑتا تو خود تین شادیاں کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ہاں نہیں۔" وہ ایک ساعت کے لیے رکے۔ پھر ہنسنے لگے "بھئی تین شادیاں نادر

تا تو اس نکتے کا پتہ کیسے چلتا۔ تین شادیاں کرنے کے بعد تو یہ تجربہ ہو۔ ہی ہی ہی ہی۔ علی کو تو اس بات کا تجربہ نہیں جبھی اسے بتا رہا ہوں۔ ہی ہی ہی ہی ______"

"لیکن۔" ہاجرہ بولی۔ "علی محلے میں کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔"

"ہائیں۔" دفعتاً علی احمد خاموش ہو گئے۔ "محلے میں نہیں کرے گا تو باہر سے کون لڑکی دے گا۔"

"کیوں اسے کیا ہے۔" راجو بولی۔

"بھئی آخر باہر والے کسی بات پر لڑکی دیتے ہیں۔ یا دولت ہو یا عہدہ ہو یا پھر ______ خیر خیر۔ نہ میاں دولت ہے نہ عہدہ۔"

"وہ تو دینے کو تیار ہیں۔" ہاجرہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہ ______" علی احمد بولے "کون ہیں وہ؟"

"بڑے اونچے کھاتے پیتے ہیں باعزت خاندان سے ہیں۔ باپ ریاست میں وزیر ہے بھائی بڑے عہدوں پر فائز ہیں لڑکی کو ہم دیکھ آئے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔"

"وہ ______" علی احمد بھونچکے رہ گئے۔

"بس آپ کی رضامندی اور صرف آشیرباد کی ضرورت ہے۔" علی بولا۔

"ہوں ______" علی احمد دفعتاً سنجیدہ ہو گئے۔ "تو یہ بات ہے۔"

"آپ کے شامل ہوئے بغیر ______" علی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"دیکھو نہ علی کی ماں" علی احمد نہایت سنجیدگی سے بولے۔ "علی کی شادی کا براہ راست دو پارٹیوں سے تعلق ہے۔ ایک تو علی خود ہے جس نے شادی کرنی ہے اور دوسرے ہم سب تم، علی کی ماں۔ راجو، شمیم اور میں جنہوں نے لڑکی کے ساتھ رہنا ہے تو علی کی شادی دونوں پارٹیوں کے باہمی مشورے سے ہونی چاہیئے۔"

"ٹھیک ہے۔" ہاجرہ نے کہا۔

"کیوں رجو یہ بات حق و انصاف کی ہے یا نہیں۔"

"ہاں ہے تو مناسب" رجو نے جواب دیا۔

"تو اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے۔" علی احمد نے کہا "یا تو ہم لڑکی کا چناؤ کریں اور لیلیٰ اسے پسند کرے اور یا پھر لیلیٰ چناؤ کرے اور ہم اسے پسند کریں۔ کیوں رجو۔ ہے نا حق و انصاف کی بات۔"

"اور اگر آپ چناؤ ہی نہ کریں تو ____" راجو بولی۔

"ابھی ہمیں موقع ہی دیا نا۔ آج بات کی ہے لیلیٰ کی ماں نے۔ ہمیں چھ مہینے کی مہلت دی جائے چھ مہینے میں ہم لڑکی کا چناؤ کریں گے۔ اسے آزمائیں گے۔"

"اور اگر وہ لیلیٰ کو پسند نہ آئی تو۔" شمیم نے کہا۔

"تو پھر موقع دیا جائے تاکہ کوئی اور پسند کریں۔ انصاف کی بات ہے نا۔"

"بس آپ پسند کرتے رہیں ____ حتیٰ کہ لیلیٰ بوڑھا ہو جائے۔" رجو بولی۔ "اچھا تو ایک اور صورت ہے۔" علی احمد بولے "لیلیٰ ہمیں چار پانچ لڑکیوں کے نام دے دے جن سے وہ شادی کرنے کے لیے تیار ہے ان میں سے ہم ایک چن لیں گے۔"

"لیلیٰ ہنسنے لگا چار پانچ نام ____" وہ بولا۔ "آپ بھی مذاق کرتے ہیں۔"

"اچھی لڑکی تو بڑی مشکل سے ملتی ہے۔" راجو بولی۔

"یہ ایک لڑکی ہے جو بڑی مشکل سے تلاش کی ہے۔" ہاجرہ نے کہا۔ "ایسی لڑکیاں کہاں ملتی ہیں آج کل۔"

"علی احمد خاموش ہو گئے۔"

"آپ جواب کیوں نہیں دیتے۔" راجو نے کہا۔

"ہاں" ہاجرہ بولی "یہ رشتہ جو ہم نے چنا ہے۔"

"یہ رشتہ ____" علی احمد رک گئے۔

بیٹھی تھی۔ میں کھڑکی سے باہر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

"دور دور" سادی یہ کہتے ہوئے بھاگی جا رہی تھی۔ "نہیں میں وعدہ کر چکی ہوں اس معاملے میں میں مجبور ہوں۔ میں مجبور ہوں میں مجبور ہوں۔" ________

چاروں طرف ٹھہرا ہوا پانی بھر رہا تھا۔ پانی ہی پانی ہی پانی۔ ساری بستی زیر آب ڈوب چکا تھا۔ کہیں کہیں اس کے ٹکڑے ٹکڑے دکھائی دے رہے تھے۔

دفعتاً وہ چیخنے لگا۔ "گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔"

---------- ختم ---- حصہ سوئم --------

وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان سب کو اس کی شکست کا علم تھا۔ وہ اس کے منہ کے گھاس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کی شکست پر خوش تھے۔ لیکن وہ سکندر کون تھا جس کے روبرو پیش ہونے میں جا رہا تھا۔ نہ جانے کون تھا۔ بہر حال وہ سکندر تھا۔ وہ فاتح تھا وہ اس کا منتظر تھا۔

چوگان میں انہیں ماں دیکھ کر رک گئی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

"ہائے تم ہاجرہ۔" وہ چلائی "جوجی کی ماں لوٹ آئے۔"

"کون آ گئے۔" ایک کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔

"کیا کہا ماں۔" دوسری چلائی۔

"ہائے ہاجرہ تم ہو کیا۔"

"اب گیا وہ بیٹا یا گل کھلا کرتے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں بہن اپنے بندھنوں کا بھی خیال کر لیا کرو۔ کب تک آگے دوڑ اور پیچھے چھوڑ پر عمل کرو گی۔"

"تو تو ہاجرہ لڑکے کے پیچھے دیوانی ہو گئی۔"

ہاجرہ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کی تعداد ہر ساعت بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی گلی سے نکل کر رک جاتی کوئی کھڑکی سے سر نکالتی۔ کوئی چھت سے جھانکتی چند ساعت تو ایلی حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر وہ بھاگا اندھا دھند بھاگا۔ اس نے محسوس کیا جیسے قبرستان میں ڈائنوں نے اسے گھیر لیا ہو۔

"ہائے تم۔" ہاجرہ نے ایلی کو دیکھ کر سینہ تھام لیا۔ اس کی آنکھیں جل آئیں اور وہ حیرت سے بت بنی دیکھتی رہی۔

ایلی ڈر گیا ______ نہ جانے کیا بات۔

"تو تم آ گئے" ______ جانو اسے دیکھ کر ٹھٹھکی اور اس نے چیخ سی ماری شہزاد کے ہاتھ سے پیالی گر پڑی اور فرش پر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اس کے قریب ہی

صفدر حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ چند قدم پرے بیگم اسے گھور رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے مر جانے کے بعد بدروح کی شکل میں یہاں آیا ہو اور وہ سب ڈر اور حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے ہوں۔

دیر تک بات کئے بغیر وہ اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اتنی دیر میں ساجدہ بھی آ پہنچی۔ سب سے پہلے رجو بولی۔ "بس ایک گھنٹہ پہلے آ جاتے تو ______"

"اتنے دن تمہاری ڈھونڈ ہوتی رہی۔"

"ہم انتظار میں راہ تکتے رہے۔"

"ہائے کتنا ظلم کیا تم نے۔"

"اتنی دیر لگا دی تم نے۔"

"اتنا عرصہ ملتان میں کیوں رکے رہے۔"

وہ سب باری باری بول رہے تھے۔ ایلی کو ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ نہ جانے وہ کس بات پر اظہار افسوس کر رہے تھے۔

پھر رجو نے طلسم توڑا۔ "ہائے اتنی پیاری بہو کر لایا ہے۔ اتنی رونق لگا رکھی تھی اس نے۔ وہ تو یوں گھل مل گئی جیسے بچپن سے ہو۔ اتنی اچھی طبیعت مزاج نہیں ہوتیں خوش خوش طبیعت۔ شکر ہے تم تو اتنے خوش قسمت ہو۔" وہ ایلی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"یہ تو سکندر کا نصیب لے کر آیا ہے۔" شہزاد بولی۔

"اب جلدی جلدی کر جلدی نیک کام میں دیر نہ کرو۔"

"وہ اپنے منہ پھٹ ہوتا بھی گیا۔" بیگم نے جل بھن کر کہا۔

ایلی نے غور سے بیگم کی طرف دیکھا۔

"ادھر کیا دیکھتا ہے" شہزاد بولی۔ "ماں اور کیا کہے گی۔" وہ ہنسی۔

"اور بہن اتنی خوبصورت اور پھر اتنی اچھی۔"

"یہ تو ساری مرضی ہے اس پر" شہزاد ہنسی۔

بھر ہوئی تھی۔ وہ رنجیدہ سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ دھند کئی ایک روز جوں کا توں قائم رہا۔

دھند بڑھتی گئی ــــــ پھر مایوسی کے اس تاریک آسمان پر دفعتاً امید کا ایک تارا ٹوٹا۔ ایک ساعت کے لیے روشنی کی لکیر جھلملائی۔

نہیں نہیں سادی ضرور کچھ کرے گی۔ وہ گھر والوں پر اثر ڈال سکتی ہے اس کی والدہ اس کا ساتھ دے گی۔ اور پھر سارے کے سارے ناموزوں غصے میں غرانے کے بعد رو پڑیں گے منصور جوش میں بہن کی اس بیہودہ دلیری پر اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا اور پھر اسی ہاتھ سے اپنے آپ کو پیٹنے لگے گا اور بالآخر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گا اور جوش محبت سے سادی سے بغلگیر ہو جائے گا اور پھر جب وہ علی سے ملے گا تو کہے گا۔ "علی صاحب اتفاق سے ــــــ"

لیکن جلد ہی ٹوٹتے تارے کے وہ روشن ذرات بکھر گئے روشنی بجھ گئی اور وہی تاریکی چھا گئی۔

"نہیں نہیں اس معاملے میں میں مجبور ہوں۔ میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں کہ اس بارے میں ضد نہیں کروں گی۔" سادی چلاتی۔ "خاندانی عزت" وہ علی سے کہتی "ان کی مجبوریاں بھی آخر تسلیم کرنی پڑتی ہیں۔ ہاں اس معاملے میں مجبور ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ دور ہٹتے چلی جاتی اور دور اور دور ہوتی کہ ــــــ جوں جوں وہ دور ہوتی جاتی تاریکی چاروں طرف سے یورش کرتی۔

مظفر آباد سے آنے کے بعد وہی پندرہ روز کے لیے تو علی بے حد پریشان رہا اس کے دل میں کئی مرتبہ خیال پیدا ہوا کہ سادی کو ساری بات لکھ دے تاکہ وہ حالات سے واقف رہے لیکن پھر اسے خیال آتا کہ یہ بات خط میں لکھنے والی نہیں۔ بلکہ زبانی کرنے والی ہے۔ وہ سوچتا رہا کہ کیسے بات کرے ملنے کی کوئی صورت بھی تو نہ تھی۔

آخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ شاید صورت پیدا ہو جائے آخر کوئی نہ کوئی صورت تو پیدا ہو گی ہی۔ لیکن اس کا لاہور جانا ضروری تھا۔ علی پور میں بیٹھے تو صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ وہ سادی کے خط کے انتظار میں تھا۔ خط سے حالات کا کچھ تو علم ہو گا۔ وہ علی پور کیسے آئے تھے۔ کیا چوری آئے تھے یا سب کو علم تھا یا ممکن ہے صرف ماں سے بات کی ہو اور پھر علی پور آنے کے بعد ان کے تاثرات کیا تھے لیکن سادی کا کوئی خط موصول نہ ہو رہا تھا۔ ہر روز یہی امید لگا کر بیٹھا رہتا۔ ڈاکیہ کی آمد کے وقت ہر آہٹ پر اس کے کان بجتے لیکن سادی کا خط موصول نہ ہوا۔ اب مزید انتظار کرنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اس نے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

گاڑی میں وہ مختلف قسم کے منصوبے بناتا رہا۔

لاہور پہنچتے ہی اسی وقت سفید منزل جاؤں جبکہ گھر کوئی نہ ہو۔ منصور دفتر دفتر گیا ہو۔ نوکر کاش میں ہو ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی صورت نہ نکلے۔ ممکن ہے مہمان آیا ہوا ہو۔

فرض کیجیے گھر کوئی نہ ہو پھر بھی والدہ تو ہوں گی۔ اور اب شاید وہ سادی کو اس کے سامنے بلانا پسند نہ کریں۔ باجی ہیں تو وہ ان کے سامنے یہ بات کیسے کہے گا۔ بات کی نوعیت ایسی ہے کہ کسی کے روبرو نہیں ہو سکتی۔ باجی کے روبرو بھی نہیں تو پھر ______ اگر وہ ایک مرتبہ سفید منزل میں چلا گیا تو پھر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ لاہور آیا ہوا ہے۔ اس کے بعد سادی سے خفیہ ملاقات کی صورت نہ رہے گی اور اگر سفید منزل نہ جائے تو پھر سادی کو خفیہ پیغام بھیجنا ممکن نہیں۔

ابھی اسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ گاڑی لاہور کے اسٹیشن میں داخل ہو گئی یلی ہو گئی یلی گاڑی سے اتر۔

ہوٹل میں سامان رکھ کر وہ سیدھا سفید منزل پہنچا۔ صدر دروازہ بند تھا۔ اس نے دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے پھر دستک دی۔

جب علی نے تیسری مرتبہ دستک دی تو بوڑھا حقہ جو گلی سے گزر رہا تھا ہنس کر بولا "میاں دستک تو دے رہے ہو پر دروازے پر تو تالا پڑا ہے۔"

"لیکن" وہ چونکا "یہ لوگ کہاں ہیں۔"

"کہیں گئے ہوں گے۔" حقے نے کہا۔

دیر تک علی وہیں کھڑا رہا کہ کسی سے پوچھے لیکن کوئی ادھر سے نہ گزرا۔ ساتھ والے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھنے کی اس میں جرأت نہ تھی

شام کو وہ منصور کے دفتر میں پہنچا لیکن وہاں بھی تالا لگا ہوا تھا۔ "ارے" وہ حیرانی سے چونکا "یہاں بھی تالا!" سامنے دوکان پر جا کر اس نے پنواڑی سے پوچھا۔

"کیوں بھئی یہ دفتر نہیں کھلے گا آج۔؟"

"یہ دفتر" پنواڑی بولا۔ "یہ دفتر تو بند ہو گیا بابوجی۔"

"بند ہو گیا۔"

"جی کچھ روز ہوئے بند ہوئے اسے۔"

"بند ہو گیا۔"

"جی کچھ روز ہوئے بند ہوئے اسے۔"

"کیا کسی اور جگہ چلا گیا۔"

"یہ تو علم نہیں بابو۔"

دوکاندار کی بات سن کر علی نے محسوس کیا جیسے اس کے روبرو ایک آہنی دیوار آ کھڑی ہو۔

ہوٹل میں پہنچ کر ساری رات وہ سوچتا رہا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس سے دریافت کرے۔ منصور کے دوستوں سے وہ واقف نہ تھا۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ موتی دروازے کے ایک محلے میں ان کے رشتہ دار رہتے تھے جہاں رانا کی شادی پر وہ گیا تھا۔ اسے وہ راستہ اچھی طرح یاد تھا۔ لیکن آخر وہاں جا کر وہ کس کا دروازہ کھٹکھٹائے

کس سے پوچھے ورنہ انہوں نے پوچھا میاں تم کون ہو تو وہ کیا جواب دے گا۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا ______ ڈاکٹر، وہی ڈاکٹر جس نے دوپٹے کی چوری کے موقع پر اسے تسلی دی تھی۔ "مجھے سب معلوم ہے ٹھہرو نہیں۔"

صبح سویرے ہی ڈاکٹر کے مکان پر جا پہنچا۔

"معاف کیجئے۔" وہ بولا۔ "آپ کو تکلیف دی۔"

ڈاکٹر اسے دیکھ کر ہنسنے لگا "کیوں کیا پھر دوپٹہ چرانے کا ارادہ ہے۔"

"جی نہیں" ایلی مسکرایا۔

"لیکن اب تو دوپٹہ چرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ لوگ تو چلے گئے۔"

"چلے گئے۔" ایلی نے حیرت سے پوچھا "کیوں؟"

"انہوں نے یہ مکان بیچ دیا۔ منصر صاحب نے دفتر میں استعفا دے دیا اور وہ ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے گئے ہیں ______"

"ہمیشہ کیلئے۔؟" ایلی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"منصر صاحب کے والد کسی ریاست میں اونچے عہدے پر فائز ہیں۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا "سنا ہے انہوں نے سب کو وہیں بلا لیا ہے۔"

"لیکن ______" ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

ڈاکٹر نے اسے تھپکنا شروع کر دیا "میرے نوجوان دوست زندگی میں ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں انسان دکھ محسوس کرتا ہے یہ طبعی بات ہے پھر آہستہ آہستہ ______" وہ مسکرایا "وہ سب ٹھیک ہو جائے گا وقت لا جواب مرہم ہے۔ چائے پئیں گے آپ۔"

"شکریہ۔" ایلی گنگنایا اور گردن لٹکا کر چل پڑا۔ اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے سلام علیکم کئے بغیر شکریہ ادا کئے بغیر چل پڑا تھا۔ اس کے روبرو ایک خوفناک دھند کا چھایا ہوا تھا تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ مناظر بے مفہوم ہو

کے باوجود یہ منصر کا ہو چکا تھا۔ وہ منصر کی ہدایات پر عمل تو نہیں کرتا تھا لیکن ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے تکلیف محسوس ہوتی تھی۔

"نہیں نہیں" وہ آپ ہی چلایا "منصر ایسا نہیں کر سکتا۔ منصر مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ ضرور مجبور پیش آگئی ہو گی کہ انہیں لاہور کو خیر باد کہنا پڑا ورنہ منصر ـــــ اگر محض تعلق ہی مقصود ہوتا تو وہ واضح کہہ دیتا۔" علی صاحب اگر آپ سعدی کے راستے سے ہٹ جائیں تو میں بے حد ممنون ہوں گا۔ پھر کسی چپقلش کا فائدہ۔ نہیں نہیں منصر یہ نہیں کر سکتا۔"

کئی ایک روز یلی اس سلسلے پر سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ مگر زیادہ سوچنے سے بات اور بھی پیچیدہ ہو گئی حتیٰ کہ وہ اکتا کر رہ گیا۔

پھر سعدی کا خط موصول ہوا۔ لکھا ہوا تھا "بھائی جان کی وجہ سے میں مجبور ہو گئی ـــــ بھائی جان کے لئے اس کے سوا اور چارہ کار نہ تھا کہ لاہور چھوڑ کر یہاں ریاست کے دور دراز گاؤں میں آ جائیں مجھے بھائی جان سے محبت ہے۔ آپ جانتے ہیں تو پڑے جائیں۔ میں بھائی جان کیلئے سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہوں چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

لیکن گھبرائیے نہیں ہمارے یہاں آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ اپنے والد صاحب سے بات کر کے ان کے ہاتھ پیغام بھیجنے میں سستی نہ کریں چونکہ میرے والد صاحب بڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں اور بڑوں کے سامنے پیش نہیں گلتی لہٰذا یہ کام تو آپ کو کرنا ہی ہوگا۔

"یہاں کب آئیں گے آپ کے منتظر رہوں گی۔ منتظر ہوں۔"

سعدی کا خط پڑھ کر یلی کو خوشی کی بجائے الٹا غم ہوا اور وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔

"والد صاحب" وہ زیر لب بولا "بڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں۔ والد ـــــ والہٰ" اس کا جی چاہتا تھا کہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے مگر وہ ضبط کر رہا تھا ـــــ

"والد صاحب ہاہاہاہاہا"

"والد صاحب۔ والد صاحب بڑے رکھ رکھاؤ کے والد ہیں۔ ہاہاہاہا۔"

"والد صاحب۔ والد صاحب کے سامنے ہماری دال نہیں گلتی۔ ہی ہی ہی۔"

"والد صاحب سے کون بات کرے۔ اور کی بھی جائے تو کسی حسن طریق سے کی جائے۔ والد صاحب کی رضامندی ضروری ہے۔ انہیں خود پیغام آنا چاہئے۔"

"نہیں مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ______ میں چاہتا ہوں کہ بچوں کا رشتہ ایسے گھرانوں میں ہو جہاں میری حیثیت ہو۔ میری عزت ہو۔ میری آؤ بھگت ہو۔ میری عزت ______ ہاہاہاہا ______ والد صاحب۔"

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ دیوانہ وار باہر نکل جائے اور لوگوں کو یہ پیغام سنائے "تمہارے یہاں والد صاحب ہیں کوئی۔ ان سے بچو۔ والد صاحب سے بچ کر رہو۔ ان سے دور رہو۔ والد ایک جیتی جاگتی لعنت ہیں۔ بدقسمتی ہیں۔ ان کا رکھ رکھاؤ جھوٹ ہے ان کی خاندانی عظمت فریب ہے۔ والد صاحب ایک بہروپیہ ہیں جو فریب سے گھر کی گدی پر بیٹھتے ہیں۔ والد محترم نے اگر انہیں سر چڑھا رکھا ہے تو کسی ذاتی غرض کی وجہ سے ______ والد محترم نے اپنی آسانی کے لئے انہیں بت بنا رکھا ہے توڑ دو ان بتوں کو توڑ دو۔"

بچپن ہی سے ایلی کو اپنے باپ سے بیر تھا۔ اسے علی احمد کو دیکھتے ہی غصہ آ جاتا تھا۔ باپ کی وجہ سے ہی وہ والدین کی محبت سے محروم رہا تھا۔ باپ کی وجہ سے وہ نوکرانی کا بیٹا تھا باپ کی وجہ سے اسے سستی اور کمینی عورتوں کے لئے چلچلاتی دھوپ میں بوتل میں رہٹ سے پانی بھرنا پڑا تھا۔ باپ کی وجہ سے محلے والیاں کہا کرتی تھیں "بہن آخر بیٹا کس کا ہے اپنے باپ کے قدموں پہ چلے گا اور یہ وہ بھی گودی میں پلا تھا۔ یہ بھی گودی میں پل رہا ہے۔"

اور والد صاحب ہی کی وجہ سے آج ایلی کے ہاتھ سے سکون اور اطمینان سے

''میری شکل ـــــ'' وہ ہنسی ''میری شکل دیکھ کر پہلے تم کب خوش ہوا کرتی تھیں صرف ایک پلی تھا اور اب اسے اپنی سدھ بدھ نہیں رہی ـــــ کیوں پلی'' وہ چہکی۔

''اپنی سدھ بدھ پہلے کب تھی۔'' پلی نے اسے چھیڑا۔

''چھو'' اس نے منہ پھلا کر کے جواب دیا ''میں بھی پہلے تھی۔''

''اگر سمجھتی تو بات نہ بگڑتی۔'' پلی نے کہا۔

''ہت ہت ـــــ تم نے ہی سمجھا دیا ہوتا'' وہ ہنسی ''چل تجھے چوٹے پڑا دوں۔ یہاں کیا بیٹھ رہتا ہے فضول چل۔'' شہزاد نے اسے پکڑ لیا۔

ایک ساعت کے لئے پلی نے شدت سے محسوس کیا کہ سب کے روبرو شہزاد کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لے اور اس کا بند بند چومنا شروع کر دے اور پھر چلا کر کہے ''چل اگر یہی ہے تو یہی سہی۔''

اس نے شہزاد پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور اس کی طرف بڑھا۔

شہزاد بھانپ گئی اور پھدک کر پیچھے ہٹی اور پھر بھاگی۔ ''آؤ نا پھر'' وہ چلائی۔ ''جلدی آؤ۔'' پلی بھاگا۔

اس وقت نہ جانے پلی کو کیا ہو گیا تھا۔ اس وقت گویا وہ اپنے آپ میں نہ تھا۔ جیسے کوئی اور روح اس کے جسم میں حلول کر گئی تھی۔ وہ بھول چکا تھا کہ باجرہ اور فرحت کھڑی دیکھ رہی ہیں وہ بھول چکا تھا کہ شہزاد شریف کی بیاہتا بیوی ہے وہ بھول چکا تھا کہ اسے سادی سے محبت ہے وہ اپنا آپ بھول چکا تھا۔ اس وقت اسے کسی فرد یا اصول کا لحاظ نہ تھا۔ وہ ننگا تھا۔ شرم و حیاء سے قطعی طور پر بیگانہ۔ اسے صرف ایک خواہش تھی۔ کہ علانیہ اپنے آپ کو کنوئیں میں پھینک دے اور پھر بھینس کی غلاظت میں ست پت ہو جائے۔ اس کا شدت سے جی چاہتا تھا کہ سب کے روبرو اپنی تذلیل کرے۔ سب کے روبرو کسی کی تذلیل کرے۔

شہزاد نے مڑ کر لیلی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خوف سے بھیانک ہو رہا تھا۔ یا شاید لیلی کی وہ خواہش شہزاد پر بھی اثر کر چکی تھی۔ اور اس کا چہرہ نہیں بلکہ کسی اور جذبے سے بھیانک ہو رہا تھا۔ ممکن ہے دونوں ہی باتیں درست ہوں اور لیلی کے قرب سے خائف تھی اور اس کی آرزو کر رہی تھی۔

مگر اس وقت سیڑھیوں میں لیلی کا پاؤں نہ پھسلتا اور وہ دھڑام سے نہ گرتا تو اس کی زندگی میں واقعات کا دھارا کسی اور رخ پر چل پڑتا اور حالات نئی کروٹ لیتے۔ لیکن گرتے ہی اس کی توجہ چوٹ کی طرف مبذول ہو گئی اور اس کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ شہزاد اس پر جھکی ہوئی ہے اور اسے کس بے پناہ نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔

کچھ دیر کے بعد لیلی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ اسے خیال آیا کہ اس وقت اسے کیا ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ عجیب سی وحشت تھی عجیب سی۔ اس وقت اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے شہزاد شدید کا جذبہ ہوا اور وہ خود کچھ کتنے خطرناک عزائم لے وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور شہزاد نے جب مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہ میں کس قدر خوف تھا ــــــ لیکن اس خوف میں لذت کی جھلک تھی وحشت بھری لذت اور پھر وہ نگاہ جو شہزاد نے اس پر ڈالی تھی جب وہ گر پڑا تھا۔ کیا شہزاد خواہش کے کھلم کھلا اظہار کو پسند کرتی تھی لیکن وہ تخلیے میں بھی خواہش کے اظہار سے گھبراتی تھی وہ تو آرزو کی ہلکی پھلکی سی دلدادہ تھی۔ معمولی اشارہ، چھیڑ کو وہ کیسے پسند کر سکتی تھی۔ لیکن اس وقت ــــــ لیلی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

کیا کبھی عورتیں ایسی ہوتی ہیں آرزو کے ملنے سے اظہار کو ناپسند کرتی ہیں۔ بھاگتی ہیں۔ لیکن مجنونانہ وحشت بھری خواہش کے اعلانیہ اظہار کے روبرو ان کا رکھ رکھاؤ احتیاط ضبط سب پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی نگاہ میں فخر بھری انبساط جھلکتی ہے اور ایک ساعت کے لئے وہ تمام دنیا اور پابندیوں سے آزاد ہو جاتی ہیں۔

ایلی نے کئی ایک مرتبہ دیکھا تھا کہ وہ شہزاد جو خواہش کے عملی اظہار سے ڈرتی تھی۔ وہ تخلیے میں بھی اس سے بچنے کی کوشش کیا کرتی وحشت بھرے عملی اظہار پر اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی جیسے سانپ کو دیکھ کر چوہیا مبہوت ہو کر بے حس ہو جاتی ہے اور پھر اس عالم میں شہزاد کو بھول جاتا تھا اور وہ بے پروا بے خوف ہو کر میدان میں آ کھڑی ہوتی دعوت دیتی کہ وہ وحشت طوفان بن کر چھا جائے لیکن ایسے موقع پر ایلی ٹھہر جاتا تھا۔ وہ قدم پیچھے ہٹا لیتا تھا۔ یہ دیکھ کر شہزاد کے انداز میں ہلکی سی تحقیر جھلکتی جیسے ہار رہی ہو۔ بس اتنی سی جرات تھی۔ سادی نے ایلی کو صرف اس سے پسند کیا تھا کہ اس نے دو تین مرتبہ جرات کا اظہار کیا تھا۔ مثلاً جب اس نے ضد سے سادی کا سلگا ہوا سگرٹ حاصل کیا تھا۔ وہ پڑ چھینا تھا اور اس رات جب وہ بھاگنے کے بعد سفید منزل میں لوٹ آیا تھا۔ سادی کتنی عظیم شخصیت تھی اس کی وہ بے نیازی وہ ہنسی وہ رنگینی ____ ایلی نے آہ بھری ____ نہ جانے کیوں رات کے اندھیرے میں تن تنہا سادی کے اس قدر قریب ہونے کے باوجود اس نے کبھی خواہش محسوس نہ کی تھی وحشت اور مجذوبانہ اظہار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ____ سادی کے متعلق سوچتا تو ایلی کا دل بیٹھ جاتا۔ اسے دکھ ہوتا اور اس کی توجہ پھر وہ مد صاحب کی طرف مبذول کرے اور یوں اپنے آپ کو محفوظ کر لے۔ لیکن اس کی توجہ مبذول نہ ہوتی اور وہی دیوانہ پن اس پر مسلط ہو جاتا۔ وہ اس کا جی چاہتا کہ ساری دنیا سے انتقام لے۔ اپنے آپ تباہ کر دے۔ کسی اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دے اور بھینس کی طرح غلاظت میں لت پت ہو جائے ____ اس وقت شہزاد مڑ کر ایلی کی طرف دیکھتی اس کی آنکھوں میں وحشت بھرا خوف جھلکتا جو دفعتاً وحشت بھری لذت میں بدل جاتا ____ اور وہ مسکراتے ہوئے ایلی کی طرف بڑھتی ____ اس کے کپڑے تار تار ہو جاتے۔ دھجیاں ہوا میں اڑتیں۔ شہزاد کے گورے جسم سے گلابی شعاعیں نکلتیں اور قریب اور قریب۔ اور قریب پھر شعلے اور رنگ

کی ایک بوچھاڑ پڑتی وہ دولت مند ہو جاتا۔

ایلی کے دل میں ایک پوشیدہ خوفناک عزم پیدا ہو رہا تھا۔ جس کی نوعیت سے وہ خود بھی واقف نہ تھا۔

جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ایک روز سوچے سمجھے بغیر وہ ہاجرہ سے کہنے لگا۔

"اماں میں امرتسر جاؤں گا۔"

"امرتسر ــــــ" ہاجرہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "امرتسر کون ہے۔" وہ بولی "کس کے پاس جاؤ گے۔؟"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایک نوکری ہے۔"

"نوکری" ہاجرہ نے سینہ تھام لیا اس کی باچھیں کھل گئیں۔ "اب تجھے نوکری مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ تیرا خیال بٹ جائے۔ شغل میں لگ جائے اور پیسے چار پیسے مل جائیں۔ اتنا قرض ہو گیا ہے سر پر۔"

"نوکری۔" فرحت مسکرائی۔ "نوکری گھر بیٹھے تو نہیں ملتی ایلی۔ ڈھونڈنے سے تلاش کرتا ہے جوتے چٹخاتا ہے تو ملتی ہے۔ لیکن یہ تو اور باتوں میں کھویا بیٹھا ہے۔"

"اب تو چھوڑ اس بات کو۔" ہاجرہ بولی "اللہ کرے امرتسر نوکری مل جائے۔"

"لیکن دور ہے تو اچھا ہے" فرحت نے کہا "امرتسر سے تو روز ہی آ جائے گا۔ یہ نوکری مل بھی گئی تو اچھے گی نہیں۔

ایلی نے امرتسر جانے کی تجویز نہ سوچی تھی۔ اسے خیال نہ تھا کہ وہ امرتسر جائے گا۔ اور نوکری کی بات تو ایلی نے ویسے ہی چلا دی تھی۔ ساری بات ہی عجیب تھی۔ اسے ابھی تک معلوم نہ تھا کہ امرتسر جا کر کرے گا کیا۔ کہاں ٹھہرے گا۔ کدھر جائے گا بات اس کے منہ سے یوں ہی نکل گئی تھی جیسے میز پر پڑا پتا آپ ہی آپ چل جائے۔ اور حیرت کی بات تھی کہ اسے اس بات پر تعجب محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ آخر امر

ایک تپتی ہوئی تھی۔ ایک مریل سی لڑکی، پچکی لمبی زرد رو لڑکی اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی ''سنبھالو اپنی بچی کو۔'' وہ بولی ـــــ اس نے تیم کی گٹھڑی اس کی طرف دھکیلی۔ ریشمی خوبصورت کے اوپر ایک یہاں سے وہاں تک لمبی چوٹی لٹک رہی تھی۔

''چھوڑ بھی شادی'' تیم نے چلا کر کہا۔

''سائیں'' ـــــ علی نے سائیں کی طرف دیکھتے ہوئے زیر لب کہا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ خود بھی ایک سائیں ہو سائیں۔ اب بمشکل اپنا آپ سمیٹ رہا تھا۔ اس کی ناک اور مانگ سے خون بہہ رہا تھا اس کی نگاہیں شادی کے چوبارے پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر وہ گھسیٹتا ہوا شادی کے چوبارے کے زینے کی طرف بڑھا اور زینے کے ساتھ باہر میں تختے پر سر رکھ کر بیٹھ گیا۔ دفعتاً علی کو خیال آیا۔ یہ شادی عورت نہیں کیا وہ شخص جانتا ہے کہ اسے سائیں کی حالت پر ترس نہیں آتا۔ کیا کمرے کی وہ تمام حسین و جمیل پتلیاں سب جانتی ہیں ـــــ ''نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ عورتیں ہیں ان سب میں کہیں نہ کہیں عورت چھپی بیٹھی ہے۔ وہ ادھ کھلی جن کی موٹریں چوبارے تلے کھڑی ہیں اور وہ تماشبین جو کمرے میں آتے ہیں وہ تو خاوند کے پاس آتے ہیں گھر کی عورتیں چھوڑ کر آتے ہیں۔ عورت سے فرار ہو کر آتے ہیں ـــــ ہوں تبھی خاوند عورت کو چھپا لیتی ہے اور خاوند کا روپ دھار لیتی ہے لیکن ان کی اپنی تسکین تو اس چھپی ہوئی عورت میں مضمر ہے۔

دفعتاً علی کے دل میں ایک شدید خواہش پیدا ہوئی ـــــ کہ وہ جا کر شادی سے مل کر اس سے پوچھے کہ تمہاری عورت کہاں ہے اور تمہیں اپنی حیثیت کو پا لینے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے اور تم کتنی دکھی ہو اور تمہاری زندگی کتنا بڑا المیہ ہے تو پھر تم خاوند کیوں ہو ـــــ؟''

اور اگر اس نے علی کو سائیں کی طرح سیڑھیوں سے لڑھکا دیا تو ـــــ اگر وہ چھپی ہوئی عورت کو پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو فضول تھا۔ علی مسکرا دیا۔ اس

قدموں میں پڑی رہوں"

دفعتاً ماں کا چہرہ بدل گیا اور ایک اتنی بڑی تھی ماں لڑکی اس کی جگہ آ کھڑی ہوئی اس نے آہ بھری۔

"شادی بن کر جینا میرے نصیب کہاں۔ تم دیکھتے کیا ہو" وہ بولی "شادی گھر ہی ہے۔ بابل کی طبیعت اچھی نہیں ______"

پھر وہ شادی کے چوبارے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا جیسے واقعی شادی نے بلایا ہو۔ کمرے میں ایک موٹے سے میراثی کو دیکھ کر وہ گھبرا کر رک گیا۔

پیغام ۲

"کون ہے" میراثی نے فرعون بن کر پوچھا۔ ایلی چپکے دبکا کھڑا رہا۔ پھر میراثی مڑ کر زینے کی طرف گیا۔ "کون ہے" وہ چلایا۔

"میں ہوں۔"

"میں کون؟"

ایلی خاموش رہا۔ میراثی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

ایلی کا جی چاہا کہ وہ فوراً وہاں زینے سے اتر جائے لیکن اب واپسی کی بھی ہمت نہ تھی۔

"مجھے" وہ بولا "مجھے شادی کو پیغام ______ میں پیغام لایا ہوں۔"

"کون ہے" اندر سے بڑھیا کی آواز آئی۔

"لڑکا کہتا ہے پیغام لایا ہوں۔" میراثی بولا۔

"کس کی طرف سے ہے۔" بڑھیا بولی۔

"آنے دو۔" ایک نوجوان لڑکی کی آواز آئی۔

میراثی چلا گیا۔ ایلی چپکے سے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میراثی رک گیا۔

شادی پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی ـــــ "آجاؤ" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

میراثی چلا گیا۔ ابھی ایلی بات کرنے کے لئے منہ کھول رہا تھا کہ بڑھیا آگئی۔

"کہاں سے آئے ہو۔" وہ تحکمانہ انداز میں بولی۔

"ریاست سے آیا ہوں" ایلی نے جواب دیا۔

"ریاست سے" بڑھیا چلائی۔

ایلی نے سر ہلا دیا۔

"کسی نے بھیجا ہے کیا۔"

"ہاں۔"

"کس نے۔"

"پیغام لایا ہوں۔"

"کس کا۔"

"اے بیٹھ مرو اور دم تو لینے دو اسے" شادی نے کہا "تم جاؤ اماں۔"

بڑھیا ایک ساعت کے لئے کھڑی رہی پھر میراثی کے بلانے پر چلی گئی۔

"بیٹھ جا" شادی نے کہا۔

پلنگ کے قریب بڑے صوفے میں ایلی بیٹھ گیا۔

اس کے روبرو ایک میر حسین عورت لیٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ قمیض ڈھیلی تھی۔ آنکھیں خمار آلود تھیں۔

"نہیں نہیں یہ وہ شادی نہیں۔" ایلی نے سوچا "وہ تو جوان شادی چار سال میں وہ ایسے ہو جائے ـــــ نہیں نہیں یہ کوئی اور شادی ہے۔"

"پیغام لائے ہو" شادی نے ایلی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"نہیں" ایلی نے جواب دیا۔

"نہیں۔" شادی چونک کر اٹھ بیٹھی۔

"اور تم تو کہتے تھے پیغام لایا ہوں۔"

"جھوٹ بول رہا تھا۔"

"ہاں نہیں۔" اس نے آنکھیں گھمائیں۔ "سچ"

علی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جھوٹ کیوں بولا۔"

"نہ بولتا تو مجھے آنے نہ دیتے۔"

"کیا آنا اتنا ضروری تھا۔"

"اس سے بھی زیادہ۔"

"اوہ ____ سچ" وہ قریب تر ہو گئی۔

علی نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر باہر کی طرف اشارہ کیا۔

دو بجے

شادی نے آنکھوں سے اثبات کا اظہار کیا۔ اس وقت بڑی یوں مسکرا رہی تھی۔ جیسے دو بچے اکٹھے مل کر شرارت سوچ رہے ہوں۔

"چار سال پہلے" علی نے کہا "تو مجھ سے ملی تھی۔"

"جی۔"

"ہاں تب بڑی تھی تیرے ناک میں ____ ڈلی پڑی تھی تو۔"

"ڈلی پڑی تھی۔"

"تو نے ایک ریشمی گٹھڑی مجھے دی تھی۔"

"گٹھڑی۔"

"ہاں۔"

"میں نے تو کبھی کپڑے نہیں بیچے۔" وہ ہنسی۔

"گٹھڑی بزازی کی نہیں تھی۔ اس پر اتنی لمبی چونچ تھی۔ تو نے وہ گٹھڑی میری

طرف دیکھی تھی اور تیرے ساتھ بہت سی لڑکیاں بھی تھیں۔ اس چوبارے کی پچھلی منزل میں چاروں طرف دالان تھے اور ان کے درمیان میری سائیکل تھی۔"

"ہائے اللہ" وہ چونکی "اچھا وہ تسنیم کے گھر مجھے یاد آیا۔"

"تمہاری شادی ہوگئی۔"

"ہاں۔"

"جھوٹ۔"

"کیوں۔"

"نہیں ____ کہاں وہ زردروسی لڑکی اور کہاں تم۔" ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں کیا ہے مجھے۔" وہ نخرے سے بولی۔

"پتہ نہیں" ایلی نے کہا۔ "لیکن محلے میں لوگ کہا کرتے تھے سارا شہر پاگل ہو رہا ہے تمہارے پیچھے۔"

"ہونہہ" اس نے ہونٹ ہٹو بنائے۔ "سب اپنے مطلب کے لیے ہیں کوئی بھی پاگل نہیں ہوتا۔"

"کبھی دیکھنے تو میں آیا تھا۔ میں نے کہا میں بھی ایک نظر دیکھ آؤں۔"

"تو پھر کیا دیکھا۔"

ایلی نے اثبات میں اشارہ کیا۔ "سب کچھ دیکھا۔"

شاری نے جنون سے پوچھا "کیا۔"

"پاگل ہو جاتا ہے۔"

"کون۔"

"دیکھنے والا۔"

"وہ ہنسی ____ "جھوٹ! کوئی نہیں ہوتا۔"

"جو بلی کے پاس آتے۔ جو شادی کے پاس آتے ہیں وہ ہو جاتے ہیں۔"

"تم ہو گئے ہو۔" وہ ہنسی۔

"ہو گیا ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ اور پھر اٹھ بیٹھا۔

"بیٹھو۔" وہ بولی۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں۔"

"زیادہ پاگل ہونے کا ڈر؟"

وہ ہنسی۔ "تمہاری باتیں الٹی ہیں۔"

"الٹی نہیں سچی ہیں۔"

"کیسے؟"

"تم کون سچی باتیں کرتا ہے یہاں کوئی نہیں۔"

"یہ سچ ہے۔" وہ بولی۔

"ابھی سچ نہیں۔"

"سچ ہے میں نے تمہاری خوشامد نہیں کی۔"

"وہ بولا۔ "شادی سے ملا دیا اس سے بڑھ کر اور کیا خوشامد ہو سکتی ہے۔"

وہ چل پڑا۔ پھر کچھ سوچ کر شادی نے سلیپر پہن لیے اور ساتھ چل پڑی۔

"تیرا نام کیا ہے؟"

"بلی۔"

وہ ہنسی۔ "کیا نام ہے۔ کوئی مجھے تلی ہو۔"

"ٹھیک سمجھے۔" وہ بولا "میں تلی ہوں تو عطر ہے۔"

شادی نے گویا اس کی بات نہ سنی۔

"پھر آؤ گے۔" اس نے پوچھا۔

"کون آنے دے گا۔"

"ریاست کے مہاراجہ کا پیغام لے آتا۔" وہ ہنسی۔

"اچھا مہارانی۔" یلی نے جھک کر سلام کیا۔

جب وہ نیچے کمرے میں اترا تو لوگ اوپر کی طرف دیکھ رہے تھے اس نے وہ ویکن بنگلے میں شادی ہوتی مسکرا رہی تھی۔ دہلیز پر سامعین کے کھلے ہونٹوں سے رعب ٹپک رہا تھا۔

تاریخ ۶۰ء

گزرہ زمین میں سے گزرتے ہوئے یلی غور سے ہر بالی کی طرف دیکھ رہا تھا جو چوبارے کے بنگلوں اچھت کی سہ نشینوں اور جدید طرز کے مکانات کی بالکونیوں میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے بے سنورے خد و خال اور سنگار کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہر بالی میں سے شادی دکھائی دے رہی تھی۔ دبی ہوئی چھپی ہوئی عورت محروم دکھائی دیتی ہے کس قدر پریشان حال ہوتی ہے وہ سوچ رہا تھا۔

کمرے سے نکل کر وہ فضا سے خیال آیا اب مجھے کیا کرنا ہے۔ وہ چونک پڑا۔ سوچنے لگا۔ "تو میں یہاں آیا ہی کیوں تھا ____ بیٹے کی مرے سے۔ کیا شادی سے ملنے ____ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے تو شادی کا علم بھی نہ تھا پھر ____ سے کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس نے اپنا قدم و تیز کر دیا۔

"ارے ارے۔" ایک راہگیر اس کی طرف جھپٹا اس نے یلی کو بازوؤں میں تھام لیا۔ "ارے بابو کیا جوہڑ میں گرو گے۔"

اس وقت وہ جوہڑ کے عین کنارے پر کھڑا تھا۔

"جوہڑ میں گرو گے جوہڑ میں گرو گے!!" چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

"غفلت میں لت پت ہونے کا شوق ہے کیا۔" کوئی ہنسا۔

''کنوئیں میں گرو گے۔'' کوئی چلائی۔

''جاؤ جاؤ۔ میں یہاں ہوں۔'' آرام باغ کے ایک چوبارے سے ایک بدشکل سی نے کھڑکی سے سر نکال کر زور سے آواز دی۔

''ہی ہی ہی ہی۔'' چیچک کے داغوں بھرا ہونٹوں سے پھولا ہوا چہرہ اس کے روبرو آگیا۔ ''یہ کیا لت پت ہوگا' لت پت ہونا تو مردوں کا کام ہے۔''

''بند کمرے کی بات بھول گیا۔'' ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی ہوئی آئی۔

''آجاؤ آجاؤ۔ اس کی بات نہ سنو۔'' ایک نے کہا۔

چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں آرام باغ کے چوباروں میں بیٹھی ہر کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ رک گیا۔ مزدور نے شان سے دانت بھینچ کر بولا۔

''ہاں میں لت پت ہوں گا۔ کیوں میری مرضی ______ مجھے کون روک سکتا ہے۔ اگر پیچھے کی طرف جانے کے لیے وہ کاٹھ کی کھڑکی بند کر دی گئی ہے تو میں کنوئیں میں کود جاؤں گا۔ لت پت ہوں گا۔ لت پت ہوں گا۔'' وہ علانیہ کسبیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا کہا بابو؟'' ایک مزدور رک گیا۔ ''کیا ہو گئے تم؟''

''ہیں؟'' علی چونکا۔

''کہہ تو رہے ہو چھوٹے'' مزدور بولا۔ ''میں سمجھا شاید مجھ سے کہہ رہے تھے۔''

''تم سے نہیں کہہ رہا۔'' علی نے جواب دیا۔ اور وہ دونوں کھڑے ہو کر سامنے کی کھڑکی میں کھڑی پٹھانی کی طرف دیکھنے لگے۔

''دیکھو بابو۔'' مزدور قریب تر ہو گیا۔ ''یہ جو پٹھانی ہے نا یہ سامنے چوبارے والی ہے تو پتا خود وہ طریقے آتے ہیں کہ بس سمجھو تو آنکھیں روشن ہو جائیں پر سے بیماری ہے۔

ہوں۔ دوکان دار، راہ گیر، تماش بین اور بیسیاں۔ یہ محسوس کر کے وہ ٹھہر جاتا اور آگے چلنا شروع کر دیا۔

اس نے کئی مرتبہ ان میں سے ایک کا تعاقب کیا۔ کئی مرتبہ سوچا "یہ ٹھیک ہے یہ اندر ویسی آئے گا تو سیدھا اوپر چڑھ جاؤں گا۔" لیکن جب وہ آتا تو وقت پر زینہ پہنچ نہ پاتا اور پھر آگے نکل جاتا اور پھر جب وہ آگے نکل جاتا تو اسے خیال آتا "نہیں یہ تو کچھ نہیں۔ اس کی نگاہیں تو بے باک ہیں، ننگی نگاہیں دیکھو تو کیسے چھاتیوں پر آگے کو بڑھ جاتی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔"

بیلی تھک کر چور ہو گیا۔ لیکن ابھی تک وہ آرام باغ میں گھوم رہا تھا۔ دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ چوباروں کے گرد ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا لوگ اوپر دیکھ رہے تھے شور کر رہے تھے انگلیوں سے وہ نام پکار رہے تھے بیسیاں مسکرا رہی تھیں دعوت دہندہ نگاہیں دے رہی تھیں۔ نئے نئے اشارات کر رہی تھیں۔

بیلی کے دل میں نفرت کا ایک طوفان پیدا ہو چکا تھا۔ ساڑھے دس بج چکے تھے کسی چوبارے پر چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چونکہ چوبارے کی دوکان پر کھڑے تماش بینوں سے آنکھ بچا کر اوپر چڑھنا قریباً ناممکن تھا۔ وہ سب ایک دوسرے پر آوازے کس رہے تھے پھبتیاں اڑا رہے تھے۔ اس کے باوجود بیلی وہیں ایک تاریک کونے میں کھڑا تھا۔ وہ اس گھات میں تھا کہ کب کوئی دروازہ دکھائی دے جو لوگوں کی نگاہوں سے دور ہو اور وہ آنکھیں بند کر کے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر سیڑھیاں چڑھ جائے اس کا عزم اور بھی مضبوط ہو رہا تھا۔ اس عزم کی وجہ حصول لذت و عیش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت بیلی خوف اور نفرت سے کئی بار جھرجھری لی تھی اور اب وہ نفرت اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ اسے کوڑے مار رہی تھی۔ اور مظلوم حبشی کی طرح کوڑے کھا کھا کر وہ خود کو مشتعل کیے جا رہا تھا۔

وہ سبھی درحقیقت اس وقت ایلی کی نگاہ میں وہ رنڈیاں نہ تھیں بلکہ اس ہائی کورٹ کی جج تھیں جہاں وہ آخری اپیل پیش کرنے جا رہا تھا۔

"مجھ میں لت پت ہونے کی ہمت ہے۔"

اس وقت وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے دارو پی رکھی ہو۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں ستارے نظر آ رہے تھے غلیظ جسموں سے گندگی کی بوچھاڑیں اڑ رہی تھیں کٹے ہوئے سر۔ ڈھیر ہوئے جا رہے تھے۔ خون بہتا ہوا خون۔ بازو کٹے ہوئے تھے۔ ہاتھ ٹٹول رہے تھے۔ جنتیوں کی سونڈیں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں تاکہ اسے گرفت میں لے لیں۔

پھر دفعتاً ایک چیخ سی سنائی دی کسی کٹے ہوئے دھڑ کی چیخ۔ تمام فضا سرخ ہو گئی۔ وہ کوٹھے سے یوں باہر نکل آیا جیسے اسے کوئی بھی نہ دیکھ رہا ہو۔ جیسے کسی کے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

زینہ چڑھتے ہوئے اس نے نیچے شور و غل کی آواز سنی وہ رک گیا اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور نعرہ لگایا "لت پت زندہ باد۔"

ایلی کی نگاہ اوپر کی طرف اٹھی اوپر دروازے پر بھدا بدنما چہرہ اس کی طرف گھور رہا تھا چاروں طرف سے چیچک کے داغوں کی بوچھاڑ پڑ رہی تھی۔

پھر وہ بدنما بھدا بدنما چہرہ پھیلنے لگا۔ گویا چیچک کے داغوں کا ابھرا تھال کسی نے انڈیل دیا ہو پھیلے ہوئے گوشت کی گٹھڑی ہو۔ سر کٹ کر نہ جانے کہاں گر گیا لاش۔ ٹھنڈے گوشت کی عظیم بدنما لاش۔

معصوم حبشی نے کوڑوں کی ایک بوچھاڑ محسوس کی ____ باز کا ایک ریلا آیا۔ جوش اور غصے میں اس نے آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی۔ تعفن کی وجہ سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ چھینٹے اڑ رہے تھے۔ اور پھر ایک ہوائی ____

زن ____

اور پھر وہ ننھے تمیز کی طرح کیچڑ میں لت پت تھا۔ شرم سے اس کی گردن لٹک گئی تھی۔ اسے اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔

گوشت کا بدنما سمندر پٹ رہا تھا۔ ایک کریہہ مشتبہ چہرہ ابھر رہا تھا۔ بدنما دانت۔ رینگتی ہوئی منحوس آنکھیں۔

پھر کوئی اسے تسلی دے رہا تھا۔ اپنا گھر ہو اپنی عورت ہو۔ اپنی بوتل ہو اپنا گلاس ہو۔ یہ چیز چسکیاں بھرنے کی ہے۔ غٹاغٹ کی نہیں۔

"یہ محبت کا کھیل ہے۔ سودے کا نہیں۔ محبت کا۔"

"پہلے پہل یہی ہوتا ہے۔ پھر ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"پہلے پہل اچھی مارنے کا شوق ہوتا ہے۔ ابھی تو ٹیک ٹیک کر دھری جاتی ہے۔"

ایلی کو اپنے آپ سے بو آ رہی تھی۔ اس کمرے سے وحشت ہو رہی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سر اٹھا کر دیکھتا کہ کون اسے تسلیاں دے رہا ہے۔ اس کی باتیں سننے کی اسے فرصت نہ تھی۔ چسکیاں بھرنا۔ ٹیک ٹیک کر چلنا یہ سب اس کے لئے بے معنی تھا۔ ایلی یوں محسوس کر رہا تھا جیسے گندم کا دانہ کھانے کے بعد وہ ننگا ہو۔ احساس گناہ اور احساس پستی چاروں طرف سے یورش کر رہے تھے۔

اپنی بوتل اپنا جام

پھر وہ سٹیشن کی طرف بھاگ رہا تھا۔ نو بجے جانے والی گاڑی کو پکڑنے کے لئے بیتاب تھا۔

گاڑی میں لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے اوپر چادریں پڑی تھیں۔ مگر پیٹ وہ سب ننگی تھیں بڑے بڑے ڈھکے ہوئے تھال جن میں سے پیپ کے دریا نکل کر چاروں طرف ڈھیر ہونے کے لئے بیتاب تھے۔ وہ لیٹ گیا۔ یوں لیٹ گیا جیسے خود ایک لاش ہو گلے ہوئے سر کی لاش تعفن اور بدبو سے بھری گلی سڑی لاش۔

جب وہ محلے میں پہنچا تو تین بجے تھے۔ فرحت کی ڈیوڑھی بند تھی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ تھک کر بیٹھ گیا۔

شاید شہزاد کا دروازہ کھلا ہو۔ اسے دو ایک مرتبہ خیال آیا۔ لیکن وہ شہزاد کی طرف جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس سے بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ اور وہ اب اس قابل نہیں کہ شہزاد کی طرف جائے۔ ایک گرائے ہوئے مظلوم حبشی کا شہزادی میں ملکہ کے روبرو جانے سے کیا مطلب۔

دیر تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سوچا۔ دیکھوں تو سہی ــــــ چاہے اندر نہ جاؤں۔ پر دیکھوں تو سہی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

شہزاد کا دروازہ بند تھا۔ اس نے آہستہ سے اسے دبایا شاید کھل جائے۔

''کون ہے۔'' اندر سے رابعہ کی آواز آئی۔ وہ خاموش رہا۔

''کون۔'' رابعہ کی آواز آئی۔ وہ خاموش رہا۔

''کون۔'' رابعہ پھر چلائی۔

''میں ہوں ایلی۔''

''تو ہے ایلی۔'' وہ بولی ''ٹھہر ذرا۔''

دروازہ کھل گیا۔ وہ چپکے سے اوپر چڑھ گیا چوبارے کے سامنے صحن میں صرف دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر رابعہ پڑی تھی۔ دوسری پر شہزاد تھی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ ایلی نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن بیگم کی چارپائی کہیں دکھائی نہ دی۔ پھر وہ چوبارے کے اندر گیا دوسرے چوبارے میں۔ اور بالآخر چھت پر چڑھ گیا لیکن بیگم کا کہیں نشان نہ تھا۔

واپس آکر وہ شہزاد کے قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ یوں پڑی تھی جیسے جھوٹ موٹ آنکھیں موند رکھی ہوں اور ویسے جاگتی ہو۔ اس کی پیشانی کا تل چمک رہا تھا۔ بازو چھاتی پر رکھے ہوئے تھے۔ قمیص کے بٹن کھلے تھے کتنا روشن جسم تھا۔ جیسے پھول

سے بنا ہو۔ عجیب سی باس آ رہی تھی۔

"یہ تو محبت کا کھیل ہے" ___ کوئی آہستہ سے بولی۔

"اپنی بوتل ہو اپنا گلاس ہو۔"

شہزاد کا جسم یوں دکھائی دے رہا تھا ___ جیسے بوتل ہو۔

جو منہ کے بل الٹی ہوئی تھی۔

"غٹ غٹ نہیں۔" کسی نے اس کے کان میں کہا "یہ تو چسکیاں لینے کی چیز ہے۔"

شہزاد نے گردن اور ہاتھ سینے سے اٹھائے۔

ایلی کی نگاہ کھلے منہ پر پڑی ___ حیرت اور خوشی سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

ایلی بھول گیا کہ اس سے تعفن بھری بو آتی تھی۔ وہ بھول گیا کہ اس کے جسم سے چیچک کے داغ ابھی تک چپکے ہوئے تھے۔ وہ قریب تر ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہونہوں" کسی نے اس کے کان میں کہا "انکھیں تو ٹیک ٹیک کر رکھنے کے لئے ہوتی ہیں۔"

ایلی نے آنکھیں بند کر لیں اور ٹیک ٹیک کر انگلی رکھنے لگا قریب اور قریب اور قریب ___ خوشبو کا ایک ریلا آیا۔ نرم نرم لمس ___ ایک جھرجھری۔

بازو ڈھیلے اور اس کے اعضا نڈھال ہو گئے۔

بلغم

اگلے روز ابھی وہ سویا ہوا تھا کہ علی احمد کا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ چونکہ ملازمت ملنا مشکل ہو رہا ہے۔ اور گورنمنٹ نے آدمی بھرتی کرنے کی بجائے تخفیف کی سکیمیں بنا رہی ہے۔ لہٰذا ایلی کو چاہیے کہ وقت ضائع نہ کرے اور سنٹرل ٹریننگ کالج میں داخلہ لینے کی کوشش کرے تاکہ اسے ٹیکنیکل تعلیم حاصل ہو

جائے اور ملازمت ملنے میں آسانیاں پیدا ہوں۔

سٹینوگرافی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایلی کے دل میں بڑی امیدیں تھیں۔ اس زمانے میں سٹینوگرافر بہت کم یاب تھے اور پھر بی اے سٹینوگرافر کا ملنا تو قطعی طور پر مشکل تھا۔ ایلی کا خیال تھا کہ اسے ملازمت مل جائے گی۔

ایلی نے کئی ایک محکموں میں درخواستیں دے رکھی تھیں۔ دو ایک جگہ سے انٹرویو کا خط بھی آیا تھا مگر یہ خط اسے انٹرویو کے دن کے بعد موصول ہوئے تھے ظاہر تھا کہ دفتر والوں نے اسے محروم رکھنے کیلئے وہ خط دیر سے حوالہ ڈاک کئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمان تھا اور دفتروں پر ہندوؤں کا راج تھا۔ وہ شاید دفتر والے اپنے آدمیوں کے لئے موقع پیدا کرنا چاہتے تھے ایک جگہ وہ وقت پر انٹرویو میں پہنچ گیا تھا لیکن جب کا سب انسپکٹر انہیں ڈکٹیشن دے رہا تھا تو ایلی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس زبان میں بول رہا ہے اس کی زبان انگریزی۔ پشتو اور پنجابی کا مرکب معلوم ہو رہی تھی۔ بالآخر اس نے کورا پرچہ رکھ دیا تھا اور پھر خود ایک منٹ کے بیٹھ وں میں جا کر تماشہ دیکھنے لگا۔ محکمہ ریلوے کے ایک انٹرویو میں اسے ایک لڑکی سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

یہ بڑے صاحب کی آرام کرسی کے ایک بازو پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور بڑے صاحب ہنس کر ایلی سے پوچھ رہا تھا۔ "تم اس سے مقابلہ کر سکو گے۔" ایلی نے جواب دیا تھا صاحب خطوط کی گولائیوں میں تو نہیں البتہ سپیڈ میں کوشش کروں گا اور بڑے صاحب نے قہقہہ لگا کر لڑکی سے کہا تھا۔ "سنا تم نے یہ کیا کہہ رہا ہے یہ۔" اور وہ مسکرا دی تھی اور پھر اس نے ایلی پر ایک پیار بھری نگاہ ڈالی تھی ایسی نگاہ کہ ایلی کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر صاحب سے کہہ دے "حضور میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس مقابلے میں امیدوار تصور نہ کیا جائے۔" اس کا نام روزی تھا۔ اور اس کے کپڑوں سے دہریت روزی کی خوشبو آ رہی تھی۔ پھر صاحب قہقہہ مار کر ہنسے تھے۔ "ہمیں تم پسند

گئے ہو کیا نام ہے تمہارا۔ اگر اب کوئی جگہ خالی ہوئی تو ہم تمہیں بلا لیں گے۔ اپنا پتہ دفتر میں چھوڑ جانا۔" پھر وہ رمزی سے مخاطب ہوئے تھے "مس رمزی اب کل سے ہاتھ تو مدد ہو۔" اور علی یوں باہر نکلا تھا جیسے اسے نوکری کے لیے چن لیا گیا ہو۔ اس روز وہ اتنا خوش تھا کہ غم غلط کرنے کے لیے اس شہر کے سینما ہاؤس میں جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔

کتنی بار کوشش کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اب تو علی وقتی مایوس ہو جاتا رہا تھا۔ اگرچہ نوکری پر جانے کی اس میں حقیقی طور پر کوئی خواہش نہ تھی ______ بس اگر ساوی ہوتی ______ اگر ابا انکار نہ کرتے اگر منصر سے تعلق قائم رہتا تو۔

لیکن اب ______ خصوصاً جب سے اپنی بوتل اور پیگ جام سے واقفیت ہو چکی تھی۔ جب وہ چسکیاں لینا سیکھ رہا تھا۔ جب وہ ٹکی ٹکی کر چلنے سے واقف ہو رہا تھا۔ اب نوکری کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن ماں اور بہن شدت سے مصر تھیں کہ وہ دو خصے لے۔ خصوصاً وہ ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی۔ "دو گھنٹے کا تو وقفہ ہے۔ صرف دو گھنٹے کا خرچ تو دو۔ کیوں رونی شکل بنا رکھی ہے تم نہ سوگے تو میں جو ہوں۔ میرے پاؤں میں مہندی لگی ہے کیا۔ اب تو ہاتھوں کی بھی رنگی۔ جب تجھے ہی چھٹے نہیں لیتے تو پھر کیوں رنگوں میں اپنے ہاتھ۔"

"سنٹرل ٹریننگ کالج میں جب وہ ایڈمیشن بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو اس کے کوائف پڑھ کر سب ہنسنے لگے۔

"ہاں تو آپ کا نام علی حقی ہے۔"

"جی۔" علی نے جواب دیا۔

"اور کیا ہم جان سکتے ہیں کہ آپ یہاں کیوں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔"

"میں استاد بننا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

"آخر کیوں؟"

"یہ ایک نوبل پروفیشن ہے۔" علی نے جواب دیا۔

"یہ آپ کب جانا کہ ٹیچنگ نوبل پروفیشن ہے۔"

"جی جی ______" وہ رک گیا۔ "یہ تو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ دراصل میرا مطلب ہے میرے تمام بزرگ درس و تدریس میں ______"

"استاد بننے کی خواہش کب سے آپ نے محسوس کی۔" ایک اور صاحب نے وضاحت کی۔

"یہ تو میری پرانی خواہش ہے۔" علی نے کہا۔

"تو پھر آپ نے پچھلے سال ٹیچنگ کیوں نہ سیکھی؟"

"جی۔ جی۔ میرا مطلب ہے۔" علی کھسیانا ہو کر رہ گیا۔

"نوجوان۔" ایک اور صاحب بولے "آپ سیکنڈ ڈویژن بی۔ اے ہیں۔ آپ کو معقول نوکری مل سکتی ہے لہٰذا یہاں داخلہ لینا بے کار ہے۔"

ایک اور صاحب بولے "ایسے کیس پر غور کرنا سراسر غلطی ہوگی۔ اس نوجوان نے بی۔ اے اکنامکس اور فلسفہ میں کیا ہے اور یہ دونوں مضامین سکولوں کے مضامین نہیں۔ یہاں ٹریننگ میں آپ کون سے مضامین لیں گے؟" وہ علی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"جی میں سائنس لے سکتا ہوں۔ میں نے دسویں سائنس ڈرائنگ میں پاس کی تھی۔" علی نے جواب دیا۔

"جنٹلمین" کونے میں بیٹھا ہوا انگریز پروفیسر بولا۔ "تمہارا سائنس کا مبلغ علم۔" اس نے چٹکی بھر کر کہا۔ "سمجھو اس سے بھی کم ہے۔"

علی کو علم نہ تھا کہ وہ آرمسٹرانگ تھا اور سائنسی تحقیق میں بین الاقوامی حیثیت رکھتا تھا۔

تھیں یک تھیں پوری چ رسب بے کا گئیں تو کیسی ترکیب لڑائے گا۔"

"رجو میری بات مانو تو سمجھو بات پکی ہے۔" گامے نے دانت نکالے۔

"کیا" میں نے ۔

"بس یہاں سے جاؤ نہیں بیٹھے رہو۔ آرام سے بیٹھے رہو باؤ جی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یعنی خو مخو ہ بیٹھا رہوں۔ لوگ کیا کہیں گے۔"

"کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ کسی کو معلوم ہی نہ ہوگا۔" گامے نے کہا۔

"ور اگر سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔"

"تو کہہ ویٹنگ لسٹ پہ ہوں۔ ل"

"ویٹنگ لسٹ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ کیا کہتے ہیں سے جن کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا۔" گامے نے وضاحت کی۔

"چھا" میں نے ۔ "ویٹنگ لسٹ۔"

"جی" گاما دانت نکالے۔ "بات پکی سمجھو باؤ جی مجھ پر یقین کرو۔"

"کتنے دن رہنا پڑے گا یہاں۔"

"بس یہی تھوڑے دن۔"

س روز تو میں رک گیا لیکن اگلے روز اسے خیال آیا کہ یک جاہل نوکر کی بات یوں اس جگہ تھوڑے روز پڑے رہنا مناسب نہیں۔ اس نے پھر سامان باندھنا شروع کر دیا۔ لیکن گامے کے اصرار پر پھر رک گیا۔ پھر اسے خیال آیا چلو جانے کی جلدی کیا ہے۔ ویٹنگ لسٹ تو یہی تھوڑے روز سینما ہی دیکھو۔

روز باقاعدہ ۰۰۰ کالج میں جاتا۔ بی ٹی کی کلاس میں تو بہت کم لڑکے تھے لیکن بیس۔ اے وہ۔ میں گویا گھمسان کا رن پڑا رہتا تھا۔ اس سے وہ بیس سے وی میں جا گھستا۔ ور پچھلی سیٹوں پر بیٹھ کر شریر لڑکوں کے ساتھ خوب بجاتا۔ ______ بوٹ

زمین پر گھستا۔ اور منہ بند کر کے گلے سے شی شی کی آوازیں پیدا کرتا۔

وہاں ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ کلاس میں گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی ——— وہ گھبراہٹ جو پہلے اسے تنگ وہ محسوس کرتا رہا تھا۔ وہ اپنا احساس کمتری شدت کھو بیٹھا تھا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بیٹن لشٹ پر ہونے کی وجہ سے وہ اسے محض تفریح سمجھ رہا تھا۔

کلاس میں جب ہنگامہ ہوتا تو پروفیسر غصے میں آکر حاضری کا رجسٹر منگوا لیتا اور پھر ان لڑکوں سے پوچھتا جن کے نام رجسٹر میں درج نہیں تھے کہ وہ جماعت میں کیوں بیٹھے ہیں۔ اس پر باری باری لڑکے اٹھ کر اپنی شان نزول کی وجہ بیان کرتے۔

"صاحب میرے کیس کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔"

"میرا کیس بھی زیر غور ہے۔"

"جی میرا نام تو چڑھ چکا ہے ابھی رجسٹر میں اندراج نہیں ہوا۔"

پہلی مرتبہ جب ایلی سے پوچھا گیا اس نے جواب میں کہا۔ "جناب میں بیٹن لشٹ پہ ہوں۔"

"بیٹن لشٹ۔" پروفیسر نے دہرایا لڑکوں نے قہقہہ لگایا۔

"تمہیں کس نے بتایا کہ تم ویٹنگ لسٹ پر ہو۔" پروفیسر نے پوچھا۔

"جناب مجھے گاما نے بتایا ہے۔" ایلی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"گاما ———" پروفیسر بھگت سنگھ گھبرا گیا۔ "گاما کون۔"

"ہمارا اردلی جی۔"

اس پر جماعت نے بڑے قہقہے مار کر ہنسے۔ ڈیسکیں بجنے لگیں۔ سیٹیوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور پروفیسر بھگت سنگھ غصے سے احتجاجاً کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی شور مچا رہے تھے۔ "ارے وہ بیٹن لشٹ کونسا ہے۔" وہ سب محبت اور احترام بھری نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ایلی نے پہلی مرتبہ

محسوس کیا کہ کلاس میں ڈکٹیٹروں کا سرغنہ بننے میں کتنی لذت ہے۔

لیکن یہ سب کچھ محض تصنع تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ایلی کا وہ حجاب کھو گیا تھا لیکن بنیادی طور پر وہ ابھی تک وہی ایلی تھا۔ احساس کمتری کا مارا ہوا ڈر اور خوف کے جذبات کا شکار ایلی۔

کچھ روز کے بعد کالج پندرہ دن کے لئے بند ہو گیا۔ پھر دفعتاً ایلی کو خیال آیا کہ وہ تو ابھی ویٹنگ لسٹ پر ہی تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ کہ ایک نوکر کے کہنے پر وہ اپنے آپ کو احمق بنائے ہوئے تھا۔

"صرف ایک روز کے لئے بابو جی۔" گاما اس کی منتیں کر رہا تھا۔ "جب کالج پھر کھلے تو صرف ایک روز کے لئے یہاں آ جائیں صرف ایک روز کے لئے۔ جہاں اتنے روز گزارے ہیں وہاں صرف ایک روز اور۔ آتے ہی بات نہ بنی تو چاہے دیں پر جو بن گئی تو ٹھوک بجا کر انعام لوں گا۔"

"لیکن یہ ہو گا کیسے۔" ایلی نے پوچھا۔

"بس یہ نہ پوچھئے۔" گامے نے جواب دیا۔

<u>یا ہو</u>

علی پور پہنچنے کے بعد دوسرے چوتھے روز ہی شہزاد نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا اسے پلنگ پر بٹھا دیا اور خود پاس کھڑی ہو کر سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"ایلی یہ تمہیں کیا ہو گیا۔"

"کیا ہو گیا ہے۔" اس نے حیرت سے۔

"یہ تم کیا کرتے ہو؟"

"کیا کر رہا ہوں ____ بیٹھا ہوں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"بات کو مذاق میں نہ ٹالو" وہ بولی۔ "جب تم امرتسر سے آئے ہو تمہارا انداز ہی بدل گیا ہے۔ نگاہ بدل گئی ہے ____ تم نے مجھے کیا سمجھا ہے ایلی

______"

شہزادی تو جذبات سے کانپ رہی تھی۔

"میں سمجھتی تھی تمہیں مجھ سے محبت ہے۔" اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ "چلو محبت نہ سہی۔ مجھ سے محبت کون کرتا ہے۔ اور۔ اور میرے پاس سب ہے کیا جو میرے ساتھ محبت کی جائے۔ لیکن لیکن پھر بھی میرا خیال تھا کہ تمہارے دل میں میری عزت ضرور ہے۔ لیکن۔" شہزادی کی ہچکی نکل گئی۔

"عزت کیا ہے۔" ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔

"عزت۔" وہ غصے میں بولی۔ "تم تو مجھ سے یوں سلوک کرنے لگے ہو جیسے میں بازار میں بیٹھی ہوں جیسے۔" ______ وہ رک گئی۔ "بازار میں بیٹھی ہوئی بھی یہ برداشت نہ کر سکے گی۔"

"راہ چلتے ہوئے چھیڑتے ہو۔ خط لکھتے ہو۔ باتیں کرتے ہو۔ سب کے سامنے علانیہ ______" وہ رک گئی۔

ایلی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ "مگر یہ خیال تھا کہ تم میں جرأت ہے۔" اس نے سوچ کر کہا۔

"جرأت۔" وہ ہنسی۔ "جرأت کی بات کرتے ہو مجھ میں وہ جرأت ہے کہ تم سب منہ میں انگلیاں ڈال لو۔ جرأت چھوٹی اور گری ہوئی باتوں میں نہیں ہوتی۔ تم نے ہمارے تعلق کو چھوٹی گری ہوئی بات بنا دیا ہے۔ کیا ہوں کہ سے جرأت پیدا کروں۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"روتی کیوں ہو۔" ایلی پوچھنے کے لیے بولا۔

"روؤں نہ تو کیا کروں۔" وہ بولی۔ "میں سمجھتی تھی کچھ پتہ ہے سب معلوم ہو کہ کھو دیا ہے ______ پتہ نہیں۔"

''تم سمجھتے ہو میں تمہاری طرف اس لئے بڑھی تھی کہ مجھے ہوس پوری کرنے کا شوق تھا یا جسم کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی ہوس تھی ____ لٹ میں نے تو ہوس پوری کرنے کے ذریعے سب توڑ دیے۔ میں نے اپنے خاوند سے تعلق توڑ دیا۔ میں نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ منہ لگانا چھوڑ دیا۔ اور تم سمجھتے ہو کہ میں ہوس پوری کرنے کے لئے تمہاری طرف بڑھی تھی۔'' وہ رک گئی کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ میں چپ چاپ بیٹھا تھا۔

''میں بھی احمق ہوں ____ '' وہ بولی ''جو یہ سمجھ بیٹھی کہ میں تمہاری نگاہ میں بہت کچھ ہوں۔ مجھے کسی کی نگاہ میں بہت کچھ ہونے کی ہوس تھی۔ میں نے سمجھا مجھے وہ جوہر کی حرارت مل گئی۔ میں نے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہونا گوارا کیا میں نے لوگوں کے طعنے سننا گوارا کیا میں نے اپنی ماں کی زبان سے وہ الفاظ سنے جو کوئی سن کر برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہاری ماں بہن کے نکلے طعنے اور جگتی رہی۔ میں نے تمہارے طعنے سنے تم یہ سمجھتے رہے اور سمجھتے ہو کہ میں بڑھتے جاتے کو مسکرا مسکرا کر اپنے دام میں پھنساتی ہوں۔ تاکہ اپنی آگ کو ٹھنڈا کر سکوں۔ میں نے تمہارا جلاپا بھی برداشت کیا اور یہ سب کس لئے۔ کیا صلہ ملا مجھے۔ کہ اب تم مجھے ____ تم ____ اپنی ہوس کا شکار بنا رہے ہو تمہاری نگاہ میری کوئی وقعت نہیں تمہارے حق میں ایک دل بہلاوا ہوں۔ ہوس پوری کرنے کا ذریعہ ہوں۔''

وہ رونے لگی۔

میں چپ چاپ بیٹھا تھا۔

''یہ میری اپنی بدقسمتی ہے۔ خاوند ملا جو پہلے ہی کسی کی محبت میں پاگل تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ جب بھی وہ میرے پاس آیا تو اس کی نگاہ میں میں نہیں نور ہوتی تھی۔ گویا وہ نور تو تمہیں تھی ہی نہیں۔ اکیلا ساتھی کے بغیر۔ نور سے

ملنے کے لئے مجھے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور اب تم ہو ________ تم سادی کو
بھولنے کے لئے تم ________ مجھے استعمال کر رہے ہو۔" یہ کہہ کر وہ مڑی اور
کمرے سے باہر نکل گئی۔ ایلی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا۔

اس کے ذہن میں ایک خلا پھیل رہا تھا۔ ایک دھند کا۔

شہزاد سچ کہتی تھی۔ مگر سادی سے دوستی کے بعد ایلی کا گویا نقطۂ نظر ہی بدل گیا تھا۔
اس کے لئے شہزاد اب ایک خوبصورت عورت تھی۔ وہ اس کی طرف یوں دیکھتا تھا
جیسے بچہ مٹھائی کی ٹوکری کی طرف دیکھتا ہے۔ ایلی کی نگاہ میں شہزاد کے ماتھے کی بندی
معدوم ہو چکی تھی۔ اس کی دیوی نما آنکھیں ایلی کی نگاہ سے گویا اوجھل ہو گئی تھیں۔
ان کی بجائے شہزاد کے جسم کی گولائیاں ابھر آئی تھیں۔ اس کے کولہے مٹکنے لگے
تھے۔ اس کی کمر ریشمی جھولے کی طرح جھولنے لگی تھی۔ اس کی
سڈول پنڈلیاں برہنہ ہو گئی تھیں۔ اس کی نگاہ میں شہزاد دیوی نہیں رہی تھی۔ شہزاد کو
دیکھ کر اب اس کی جبیں میں سجدے بیتاب نہ ہوتے تھے۔

لیکن ایلی اس واضح تبدیلی سے بے خبر تھا۔ اور اس سے بے خبر رہنے کے لئے
اس نے کئی ایک جواب اور دلائل پیدا کر لئے تھے۔

ایلی خود ہوس کار نہ تھا۔ اور ہوس کاری سے اس قدر بیگانہ تھا کہ محبت کا بہانہ
بنائے بغیر وہ ہوس کاری کا کھیل نہیں کھیل سکتا تھا۔ اس کی ہوس کاری درحقیقت
جذبۂ کمتری سے بچنے کا ذریعہ تھی۔ شہزاد پر جھک کر نگاہیں ڈال کر وہ ثابت کرنا چاہتا تھا
کہ وہ مرد ہے اور اس قابل ہے کہ کسی سے محبت کر سکے۔ درحقیقت وہ اپنی اہمیت کا
سرٹیفکیٹ پیش کر رہا تھا۔

یا شاید اس کی وجہ سادی سے محرومی ہو۔

ماتھے کا تل

ایلی وہاں بیٹھا رہا حتی کہ سائے ڈھل گئے۔ شام پڑ گئی۔ پھر دیے جل گئے

اور لوگ چلے گئے۔ چچا لیٹ گئے لیکن وہ جوں کا توں بیٹھا رہا۔

پھر بیگم نے شور مچا دیا۔ "یہ کیوں بیٹھا ہے۔ اٹھ باہر۔ یہاں کیا کر رہا ہے تو۔" یہی کوشش دیکھ کر اس نے شہزاد کو آوازیں دیں۔ "دیکھو تو اسے کیا ہے۔ یہ کیوں سادھو بنا بیٹھا ہے۔" "کیا ہے۔" شہزاد مسکراتی ہوئی آ کر بولی۔

نو بجے کے قریب بیگم آ کر بولی۔ "یہ یہ بدھ مہاراج یہاں آ کر پالتی مارے بیٹھے ہیں۔"

پھر باجرہ اور فرحت آ گئیں ____ وہ دونوں چیختی چلاتی رہیں۔ لیکن ایلی جوں کا توں بیٹھا رہا گیارہ بجے کے قریب شہزاد آئی۔

"اب کیوں مجھے ذلیل کر رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "خدا کے لئے مجھے معاف کر دو نہ جانے غصے میں کیا کیا بک گئی ہوں۔"

"نہیں تم نے تو کچھ نہیں کہا۔" ایلی نے جواب دیا۔ "تو پھر تم اس طرح کیوں بیٹھے ہو۔" وہ بولی۔

"کس طرح بیٹھوں۔"

"جس طرح روز بیٹھتے ہو۔ ہنسو کھیلو۔"

"کیسے کھیلوں کیسے ہنسوں کب تک ڈھیٹ بن کر ہنستا رہوں۔"

"چلو اب اٹھ بیٹھو۔" شہزاد نے پیار سے اپنا ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیا۔

"شہزاد" وہ بولا۔

"جی"

"میری ایک بات مانو گی۔" "کیا۔"

"چلو کہیں چلے جائیں۔"

"چلے جائیں۔"

"ہاں کہیں بھاگ جائیں۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔" وہ ہنسی۔ "میرے ساتھ بھاگ کر اپنی زندگی تباہ کرو گے کیا۔"

"ویسے بھی تو تباہ ہی ہے۔" وہ بولا۔

"ایسی باتیں کیا کرتے۔" وہ اس کے قریب تر ہو گئی۔

"مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا۔ میں پاگل ہو جا رہا ہوں۔"

"ایسی باتیں نہ کرو۔" وہ بولی "مجھے اکساؤ نہیں۔ اگر ایک مرتبہ میں نے پر توڑے تو ایک ایسا طوفان بن جاؤں گی کہ تمہیں اپنے آپ کو اور ان سب کو تباہ کر دوں گی۔ مجھے نہ اکساؤ پلیز۔ اس حجاب کو نہ توڑو۔ اس طوفان کو رکا رہنے دو۔ بس میرے لئے یہی بہت ہے کہ تم میرے پاس ہو۔ تمہیں پا لیا تو زندگی۔ تمہیں کھو کر میری موت ہے اور جو میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں تو میں تمہیں پاؤں نہیں۔ کھو دوں گی۔"

"مجھے پناہ تو دے دو۔" لیلیٰ نے شہزاد سے کہا۔

"میرا تو بس چلے تو میں اسے کاٹ کر تمہیں دے دوں۔" وہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

لیلیٰ نے شہزاد کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہونہہ۔" بیگم اندر آ گئی۔ "یہاں تو کچھ اور ہی ہو رہا ہے۔" وہ غصے سے بولی۔

شہزاد نے بیگم کو دیکھ کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ دوسرا ہاتھ بھی لیلیٰ کو دے دیا۔

"توبہ بے حیائی کی کوئی حد ہوتی ہے۔" بیگم چلائی۔

"نہیں ماں۔" شہزاد نے ہنس کر کہا۔ "بے حیائی کی حد نہیں ہوتی حیا کی ہوتی ہے۔"

"توبہ ہے لڑکی" وہ چلائی۔ "تو نے تو یہ گھر رنڈی کا چوبارہ بنا رکھا ہے۔"

"ہاں جی ـــــــ چوبارہ۔" وہ ہنسی۔

''شرمندہ نہیں ہوتی'' بیگم روتی ہوئی باہر نکل گئے۔

اس کے جاتے ہی شہزاد کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

''تمہیں پانے کے لئے علی مجھے نہ جانے کیا کیا دینا پڑے گا۔ لیکن میں سب کچھ دے دوں گی۔ سب کچھ۔ خوشی سے لیکن تم میرے ساتھ یہ سلوک نہ کرو۔ سب مجھے رنڈی سمجھتے ہیں۔ برے سمجھیں۔ لیکن تم مجھے رنڈی نہ سمجھو۔'' اس کی ہچکی نکل گئی۔

علی کی نگاہ میں اس کے جسم ______ کی گولیاں سمٹ کر معدوم ہو گئیں ______ شہزاد کا چہرہ پھر سے طلوع ہو گیا۔ دیوی لوٹ آئی۔ اس کے ماتھے کا تل روشن ہو گیا۔

اس روز شہزاد کی باتوں نے علی کو چونکا دیا۔ وہ ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔

علی پور میں پندرہ روز اس نے سوچنے میں گزار دیئے۔ کیا مجھے سادی سے محبت ہے یا شہزاد سے۔ اس روز جب میں نے پہلی مرتبہ شہزاد کا ننگا لیدہ دیکھا تھا، تو کیا اس سے متاثر ہوا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہو چلی تھی یا اس لئے کہ وہ ایک ایسی عورت تھی جسے آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کیا مجھے سادی سے محبت ہے۔ کیا میں نے محسوس کرنے کے بعد اس سے محبت جتائی تھی کیا یہ غلط ہے کہ کالے کلوٹے کی خفت مٹانے کے لئے میں نے اسے جیتنے کی کوشش کی تھی۔ اور اپنی انا کو تسکین دینے کے خیال سے اسے جیت لیا تھا۔ تو کیا مجھے سادی اور شہزاد دونوں سے محبت نہیں۔ نیم سے بھی تو مجھے محبت نہ تھی میں نے اپنے باپ سے انتقام لینے کے لئے اس سے محبت رچائی تھی۔ تو محبت کیا ہے کیا مجھے کسی سے بھی محبت نہیں ہے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

اس کے باوجود علی کے دل میں شہزاد کا احترام تھا اس کی آرزو تھی لیکن سادی کے لئے اس کے دل میں ایک جذبہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے پالے اور پھر اس کے

ساتھ ہی اس کے دل میں چھپی ہوئی آرزو تھی کہ وہ شہزادو کے سحر سے نکل کر نارمل زندگی بسر کرے ساری کی ساری بات ہی ایک الجھاؤ تھی۔ اور اس الجھاؤ سے نکلنا ناممکن تھا۔ سوچ سوچ کر وہ تھک گیا اور پھر اس نے اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر پھینک دیا چلو دیکھیں تو کنارے لگوں گا۔

لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ قسمت پر ایک طوفان اکٹھا ہو رہا ہے۔

ایس۔ اے۔ وی

پندرہ روز کی چھٹی گزارنے کے بعد واپس ٹریننگ سنٹرل کالج لاہور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک معمولی نوکری کی بات کا یقین کر لیا۔ کتنی مضحکہ خیز بات تھی۔ اگر اس روز شہزادو علی سے بات نہ کرتی اگر وہ علی سے حجاب نہ کرتی۔ اگر علی کی نگاہ میں شہزادو کا جسم چھپائے رہتا اور اس کا ماتھے کا تل طلوع نہ ہوتا اور وہ سوچ میں نہ کھو جاتا تو وہ غالباً لاہور نہ جاتا۔ اور اس کی زندگی کا دھارا کسی اور طرف بہہ جاتا۔ لیکن اس ایک چھوٹی سی تفصیل نے حالات کا رخ بدل دیا۔

علی کو گاؤں کی بات کا چنداں یقین نہ تھا۔ صرف اس خیال سے لاہور جا رہا تھا کہ چلو چند روز کے لئے سینما دیکھیں گے۔ شاید کسی نوکری کا پتہ چل جائے۔ شادی کے متعلق کوئی خبر ملے۔ نہیں تو سیر ہی سہی۔

"تم اس قدر خاموش کیوں ہو؟" وہ بولی "میں کیا کروں اگر تمہارا ہاتھ نہ روکوں تو میں اپنی نگاہ میں آپ گر جاتی ہوں اور روک دوں تو مجھے ڈر ہوتا ہے چونکہ تم برف کی طرح جم جاتے ہو۔ کیا کروں میں۔"

وہ ہنس پڑی۔ "جو جی چاہے کرو۔ تمہارے بس میں ہوں۔"

شہزادو کی آنکھوں میں محبت بھری چمک لہرائی۔ "میں آؤں گی" وہ بولی "میں خود تم سے ملنے آؤں گی میں لاہور آؤں گی۔"

"تم" وہ بولا "لاہور آؤ گی۔"

''تم مجھے کہتے تھے میں سات سمندر پار جا سکتی ہوں یہ تو ہو رہا ہے۔''

لاہور بورڈنگ پہنچتے ہی گاما دوڑا دوڑا علی کے پاس آیا۔ ''آ گئے بابو جی بڑا اچھا کیا میرا نام ساتھ لائے ہیں نا۔''

علی نے حیرت سے گامے کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی اسے اپنی بات پر اس قدر یقین تھا۔ بہرحال اسے سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ معجزہ کیسے رونما ہو گا۔

اگلے روز جب علی کلاس میں پہنچا تو ایک نہیں چھ لڑکے غیر حاضر تھے وہ لڑکے جن کو چن لیا گیا تھا اور جن کے نام رجسٹر میں درج تھے۔ دفعتاً علی کی نگاہ سے گویا پردہ ہٹ گیا۔

گاما کہنے لگا۔ ''بابو جی ہر بار ایسا ہوتا ہے کسی کو نوکری مل جاتی ہے کوئی کسی دوسری لائن میں چلا جاتا ہے۔ کوئی ویسے ہی نہیں آتا۔ ہر سال دس ایک بڑی چھٹیوں کے بعد نہیں لوٹتے۔ بس پھر جو موجود ہوں ان کا نام رجسٹر پر آ جاتا ہے۔ ہاں بابو جی تو خطرہ کی حد ختم ہو گا۔ نہ جانے کتنے اس میں کٹ جائیں گے۔''

چوتھے روز ہی علی نے جماعت میں شور مچایا۔ ''جی میرا نام آپ بولتی ہی نہیں میں ویٹنگ لسٹ والا ہوں میرا نام رجسٹر میں نہ ہو گا تو حاضریاں کیسے پوری ہوں گی۔'' ______ علی کا نام رجسٹر میں درج کر لیا گیا۔

سنٹرل ٹریننگ کالج کی عمارت بھاٹی دروازے کے قریب ایک وسیع پنڈال میں واقع تھی۔ ایک طرف کالج کی عمارت تھی جس کے شرقی اور غربی پہلو میں بڑے بڑے لان تھے۔ شمال میں بورڈنگ کی عمارت ایک وسیع دائرے میں بنی ہوئی تھی۔ صدر دروازے کے اندر دو رویہ کمرے تھے جن کے اوپر چوبارے بنے ہوئے تھے اوپر کی منزل میں بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ لالہ جی مقیم تھے نیچے کمروں میں صدر دفتر کا کمرہ۔ کامن روم اور دیگر کمرے تھے۔ ان کمروں سے گزرنے کے بعد بورڈنگ کا وسیع صحن تھا جس میں لان بنے ہوئے تھے ایک باغیچہ تھا۔ ان کے اختتام پر ایک

اونچی دیوار تھی جس میں سات دروازے کھلتے تھے۔ ہر دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑا صحن۔ جس کے ساتھ ساتھ ایک برآمدہ اور ایک بہت لمبا کمرہ بنا تھا۔ یہ لمبا کمرہ ڈرمیٹری کہلاتا تھا۔ اس ساخت کی کل چھ ڈرمیٹریاں تھیں ہر ڈرمیٹری میں ۲۵ لڑکوں کے رہائش کی جگہ تھی۔ ساتویں ڈرمیٹری میں کچن نوکروں کے رہنے کی جگہ اور ڈائننگ ہال تھے۔

چند ایک ڈرمیٹریوں میں برآمدے کے بعد ایک چھوٹی سی پارٹیشن کی گئی تھی۔ یہ ڈرمیٹریاں بی اے کے طلبا کے لئے مخصوص تھیں۔ پارٹیشن کے بغیر جتنی ڈرمیٹریاں تھیں وہ سب ایف ایس سی کے طلباء کے لئے تھیں۔ بورڈنگ میں داخل ہونے کے لئے صدر دروازے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ ڈرمیٹریوں کے گرد اونچی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ باہر کھلنے والی کھڑکیوں پر لوہے کی مضبوط جالی لگی ہوئی تھی۔

یہ بورڈنگ دوسرے کالجوں کے عام بورڈنگ کی طرح نہیں تھا۔ یہاں بہت سی قیود اور پابندیاں تھیں۔ باہر کا مہمان بورڈنگ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مہمان کو ملنے کے لئے لڑکے کو باہر ملاقاتی کمرے میں جانا پڑتا۔ رات کو نو بجے صدر دروازہ بند کر دیا جاتا اس کے بعد کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی رجسٹر میں حاضری لگاتے اور غیر حاضر طلبا کی رپورٹ کی جاتی اور عادی طور پر غیر حاضر رہنے والے کو کالج سے نکال دیا جاتا۔ ایلی کو وہاں پورے آٹھ مہینے گزارنے تھے۔

اس روز نہ جانے کیوں وہ چلتے چلتے ملاقاتی کمرے میں رک گیا خاصہ کمرہ ہے اس نے سوچا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور پھر سوچتے سوچتے نہ جانے کہاں جا پہنچا۔

اگر منصور ملنے آئے تو وہ یہاں آئے گا اور پھر ______''

''ارے تم۔'' کوئی اندر جھانکتے ہوئے چلایا۔

ایلی چونکا۔

''تم یہاں ______ کس سے ملنے آئے ہو۔ کیا مجھ سے؟''

"تم جی کے تم یہاں۔" ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تمہیں کیسے معلوم ہوگیا کہ میں یہاں ہوں"

"تم یہاں ہو۔" جی کے تعجب سے بولا۔

"تم کس سے ملنے آئے ہو"

"کسی سے بھی نہیں۔"

"تو پھر۔"

"بھائی میں یہاں ہوں۔"

"یہاں تو ہو لیکن کس طرح آئے ہو۔" جی کے بولا۔

"بھائی میں اس کالج میں ہوں۔"

"کیا کہا۔"

"کیا تم بھی یہاں داخل ہوئے ہو۔"

"بالکل ______ لیکن یار یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنے دن سے ہم دونوں یہاں ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں۔"

"تم تو پی ٹی میں ہو گے۔"

"ہاں ہاں۔"

"میں تو ایس اے وی میں ہوں۔"

"پھر بھی رہتے تو اسی بورڈنگ میں ہو نا۔"

جی کے نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا اسے ملاقاتی کمرے سے دوسرے گیا۔ وہ ناچ رہا تھا۔ چیخ رہا تھا تالیاں بجا رہا تھا۔ "یار یہ تو بہت اچھا ہو۔ بہت اچھے بہت اچھے دونوں اکٹھے رہیں ادھر آؤ ادھر۔" وہ اسے پی ڈیوڑھی سے ملحقہ ایک کمرے کی طرف لے گیا۔

"یہ کدھر لئے جا رہے ہو۔" ایلی نے پوچھا۔

ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ کر اس نے ایلی کو کرسی پر بٹھا دیا۔ ''اب آرام سے بات کرو۔ وہ چپڑے پلاؤں گا تمہیں کہ ماں گھر بھول جاؤ گے۔''

''لیکن یہ کمرہ کس کا ہے۔'' ایلی نے پوچھا۔

''میرا اپنا کمرہ ہے۔'' پال نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔

''لیکن یہاں تو ڈورمیٹریوں میں رہتے ہیں سب۔''

''پڑے رہیں۔ میں تو ان خچر یاتری اسطبلوں میں نہیں رہ سکا۔ اور اب تم بھی یہیں رہو گے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ابھی اپنا سامان یہاں منگوا لو۔ ویسے تو چار سیٹوں کے لئے ہے لیکن ہم اسے ڈبل سیٹر بنا لیں گے۔''

''لیکن یہ سپرنٹنڈنٹ۔''

''ارے جی۔'' وہ چلایا ''ابا جی میری ہر بات مانتے ہیں۔ ان کی فکر نہ کرو۔''

ایلی کا سامان اسی روز جی کے کمرے میں آ گیا اور وہ دونوں وہاں اکٹھے رہنے لگے۔

چھوکریاں

سنٹرل ٹریننگ کالج میں زندگی ایک محور کے گرد گھومتی تھی۔ اور یہ محور چھوکریاں تھیں۔ یہ لڑکیاں بی ٹی کلاس کی طالبات تھیں۔ دن بھر کالج کے بیشتر بی ٹی کے طلبا شدت سے محسوس کرتے کہ وہ کلاس میں بیٹھی ہیں۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سن رہی ہیں ان کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہی ہیں۔ صرف لڑکے ہی نہیں۔ بیشتر پروفیسر بھی ان کی موجودگی کا شدید احساس رکھتے تھے۔

ایس اے وی کے طلبا کو یہ احساس ہوتا کہ ساتھ والے کمرے میں لڑکیاں ہیں ایک نہیں چھ۔ ورنہ ان کے اپنے کمرے میں کوئی بھی نہیں۔ اور ابھی جب وہ حساب کا

پیریڈ ختم کرکے برآمدے سے گزر کر جغرافیہ پڑھنے کے لیے جائیں گے تو راستے میں گزرتے ہوئے انہیں دیکھیں گے۔ وہ نیچی نگاہ کئے بیٹھی ہوں گی۔ یوں کام میں منہمک ہوں گی۔ جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو مگر اس کے باوجود انہیں سب خبر ہوگی۔ ہر لڑکا یہ سوچتا کہ وہ اس کی چال دیکھیں گی۔ یہ دیکھیں گی۔ کہ اس نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں ٹائی کس رنگ کی ہے۔ بال کیسے بناتا ہے۔ اور اس کا انداز کس قدر رومانٹک ہے کالج سے فارغ ہوکر جب وہ بورڈنگ میں آتے تو آپس میں ان کے متعلق بحثیں کرتے۔

"بھئی مس روحو بڑی چالاک ہے۔ بن دیکھے بات تاڑ جاتی ہے۔"

"یار آج مس مینا نے حد کر دی۔ خدا ایسی نگاہ ڈالی کہ اپنے ہوش گم ہوگئے۔"

"آج مس روحا شام کے ساتھ بک شاپ میں گئی تھی۔"

"اور دیکھا تھا تم نے مس مینا نے کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہ ہے کلر سنس

ہے سے۔"

وہ لڑکیاں چنداں خوب صورت نہ تھیں نہ ہی ان میں زندگی کی خصوصی چمک تھی وہ سب سنجیدہ اور خاموش تھیں اس کے باوجود ان کا توجہ کا مرکز ہونا۔ وجہ فقط یہ تھی کہ اس زمانے میں کالج میں مخلوط تعلیم رائج نہ تھی۔ سنٹرل ٹریننگ کالج واحد کالج تھا جس میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پاتی تھیں۔ اسی وجہ سے گورنمنٹ اور مشن کالج کے طلبہ بھی بہانے بہانے سنٹرل ٹریننگ کالج آیا کرتے تھے تاکہ ایک نظر انہیں دیکھ سکیں اور اگر ممکن ہو تو ______ شاید کوئی راستہ نکل آئے۔

بی ٹی کے پانچ چھ لڑکے تو ہر وقت ان کے گلے کا ہار بنے رہتے تھے۔ وہ جیب میں زائد پنسل اور قلم رکھتے اس بات کے منتظر رہتے کہ کب ان میں سے کسی کے قلم کی سیاہی ختم ہو یا پنسل کا سکہ ٹوٹ جائے تاکہ انہیں پنسل یا قلم پیش کر سکیں۔

وہ بڑی محبت سے کلاس کے لیکچروں کے نوٹ لکھتے اور بورڈنگ آ کر بنا سنوار کر

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ لڑکے لڑکیوں سے کتابوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔

''آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے کیا۔''

''فلاں مصنف نے تعلیم کے متعلق ایک انوکھی تھیوری پیش کی ہے۔''

''نفسیات میں دلچسپی ہو تو فلاں مصنف کا مطالعہ کرو۔''

ایلی کالج کے اوقات میں کتابیں لانے کا خاص پروگرام بنایا کرتا تھا۔ اگرچہ راستہ کافی لمبا چکر کا پڑتا لیکن لائبریری سے آتے ہوئے وہ یہ راستہ اختیار کرتا۔ کیونکہ اسی راستے کالج کے برآمدے سے گزرنا پڑے اور وہ کتابوں کے انبار کو یوں اٹھائے برآمدے سے گزرتا جیسے اسے خبر ہی نہ ہو کہ وہاں بی ٹی کلاس میں لڑکیاں بیٹھی ہیں اور وہ اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی ہیں۔ جب وہ کتابیں اٹھائے ہوئے ہوتا اس وقت اس کے لئے ضروری ہو جاتا کہ وہ لڑکیوں کی طرف قطعی طور پر نہ دیکھے لیکن وہ اس انداز سے اٹھاتا کہ ان کی پشتیں واضح طور پر دکھائی دیں۔

جاہ کی صحبت کی بدولت ایلی چند ایک مشہور مصنفوں کی کچھ کتابیں پڑھ چکا تھا اس مطالعہ کی ابتدا برٹرنڈ رسل سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے ہکسلے ہلڈین شوپن ہار ستایونا کی چند ایک کتابیں پڑھی تھیں۔ پھر الف ر منصر سے متاثر ہو کر اس نے دستوفسکی اور انگریزی نظموں کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے مطالعہ سے براہ راست خاص دلچسپی نہ تھی۔ جب کبھی سادی کی یاد اسے ستاتی تو وہ اپنی توجہ منعطف کرنے کے لئے نطشے یا برگستاں کی کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتا یا جب کبھی شہزاد کے رویے سے وہ محسوس کرتا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہو رہی ہے تو وہ احتجاجاً کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور بصد مشکل اس کے چار ایک صفحات پڑھتا لیکن پھر اسے نفس مضمون سے دلچسپی محسوس ہونے لگتی اور اس طرح اس کا مطالعہ وقتی حیثیت چھوڑ کر ثباتی حیثیت اختیار کر لیتا بہرحال مطالعہ اس کے لئے محض فرار تھا۔

سنٹرل ٹریننگ کالج میں بھی اسے زیادہ تر دلچسپی کتابیں لانے اور ان کی نمائش کرنے سے تھی۔ کتابیں جو وہ لاتا تھا۔ تمام فلسفے سے متعلق ہوتی تھیں۔ یا فزکس کے ایسے مسائل کے متعلق جن میں فلسفے کا رنگ حاوی تھا۔ ناول پڑھنے سے اسے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ چونکہ ناول میں عشق محبت کی داستانیں ہوتی تھیں اور پڑھتے ہوئے اسے شہزاد کا کمرہ یاد آ جاتا یا سادی کے مکان کی وہ سیڑھیاں جہاں وہ رات کے اندھیرے میں ملا کرتے تھے اس طرح مطالعے کا مقصد فوت ہو جاتا۔ اس سنجیدہ قسم کے مطالعے سے اس کے جذبات کی چھلکن تو دور نہ ہو سکی البتہ اس کے چہرے پر عجیب قسم کی کرختگی سی پیدا ہو گئی۔ جیسے زیادہ ابلے ہوئے انڈے پر ہوتی ہے اس کا چہرہ بھاری ہو جاتا تھا ٹھوڑی نکلتی آ رہی تھی۔ اور پیشانی پر گہری تیوری قائم ہوئی جا رہی تھی۔

شاید ان فلسفی کتابوں کو بھی نہ پڑھتا ایلی جی کے کے طعنوں نے اسے مجبور کر دیا ان طعنوں سے مخلصی پانے کیلئے چارہ نہ پا کر اسے روزانہ وہ کتابیں کھول کر بیٹھنا پڑتا۔

جی کے

جی کے ایک نہیں چند مزاج تھے۔ وہ بیک وقت بے حد خوش مزاج اور بہت دکھی آدمی تھا۔ ان دو مزاجوں کی کھینچا تانی جی کے کی زندگی کا حاصل تھی۔ جب وہ چپ ہوتا تو بالکل ہی چپ ہو جاتا۔ اس کی خوشنما خمدار ناک کی دیوار پر بدمزگی کا ڈھیر لگ جاتا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں دہکتے شرارے ٹپکنے شروع ہو جاتے۔ جب وہ بات کرنے کے موڈ میں ہوتا تو وہ باتیں کئے جاتا۔ شور مچاتا۔ مذاق کرتا۔ شوخی بگھارتا۔ اس وقت اس کی کیفیت یوں ہوتی جیسے سوڈے کی بوتل کھل گئی ہو۔ چھینٹے اڑتے بلبلے اٹھتے اور سب کو بھگو دیتے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ جی کے کا اصلی مزاج کونسا تھا اور نقلی کونسا۔

بہر صورت ایلی کے نزدیک جی کے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی انا پسندی تھی۔ وہ اپنے خیالات کو درست سمجھتا تھا اپنی بات کو حق تصور کرتا اپنے جذبات کو خارجی حالات کا مناسب ردعمل سمجھتا تھا۔

جی کے ذہنی طور پر "آقا طبیعت" کا مالک تھا۔ اس کا برتاؤ محبت رعونت رنگینی خود اعتمادی اور ذہانت کا مجموعہ تھا۔ وہ اپنے حلقے کا از خود سردار بن جاتا اور پھر سر پر سوار ہو جاتا۔ اس بات پر ایلی کو بے حد غصہ آتا تھا۔ ایلی میں سردار بننے کی نہ تو ہوس تھی اور نہ ہمت۔ وہ طبعاً کسی کے پیچھے چلنے پر مجبور تھا لیکن جب پیچھے چلتا تو محسوس کرتا کہ اسے پیچھے چلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اور یہ زیادتی ہے۔ لہٰذا اسے غصہ آنا شروع ہو جاتا در اصل ذہنی طور پر ایلی میں شدت کی انفرادیت موجود تھی ذہنی طور پر ایلی مضبوط تھا لیکن طبعی طور پر بے حد کمزور اور بودا تھا اس لیے جی کے کی انا پرستی سے بے حد نالاں تھا۔

مثلاً ایلی کتابوں کو دیکھ کر جی کے طنز اچھالتا۔

"ارے یہ کتابیں پڑھے گا ناں۔"

"پڑھوں نہ پڑھوں تو دیکھ لوں گا۔" ایلی جواب دیتا۔

"کیوں ان میں تصویریں ہیں کیا۔" جی کے کی طنز شدت اختیار کر لیتی۔

"نہیں تو۔"

"تو پھر دیکھنے کا کیا مطلب؟"

"مطلب ہے پڑھوں نہ پڑھوں گا۔"

"یہ فرائیڈ۔ ولسن۔ ایلس۔ جیمز۔ ورڈزورتھ۔ انہیں پڑھو گے تو تم۔ لیکن سمجھے گا کون؟"

"تم جو ہو تمہاری مدد سے کچھ پتہ چل ہی جائے گا۔" ایلی طنز کرتا۔

"نہیں۔ بھئی ہم تو حساب دان ہیں۔ حساب کا کوئی مسئلہ ہے تو

لیکن یہ فلسفہ و نفسیات و جنسیات یہ میرے بس کا روگ نہیں۔"

ایجی کی ان باتوں کی وجہ سے ایلی کو لازماً ہر روز کسی ایک کتاب کو کھول کر بیٹھنا پڑتا ____ پھر وہ بھول جاتا کہ اسے صرف کتاب کھول کر بیٹھنا ہے پڑھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پڑھنے کی جگہ وہ سادی کی خوش گپیوں کے متعلق سوچ سکتا ہے شہزاد کے حسین جسم کا تصور کرسکتا ہے پہلو بدلتے ہوئے میں نگور کے واقعہ پر غور کرسکتا ہے لیکن اس واقعہ پر غور کرنا تو ایلی کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا۔ اب تو یہ صورت پیدا ہو چلی جا رہی تھی کہ سادی کا خیال آتا تو اسے ٹھیس لگتی اور وہ شدت سے محسوس کرتا کہ سادی ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔ نہ جانے کہاں چلی گئی۔ اور وہ رہتی کہاں ہیں۔ لاہور میں رہتی تو وہ مدرسہ حسب کا انکار بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی۔

ایلی کو کاٹ کی ان چھیڑیوں سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔

"لاحول ولاقوۃ" وہ چلاتا۔

"یہ لڑکیاں سب کے اعصاب پر سوار ہیں۔ اور پھر لڑکیاں کہاں وہ تو بیشتر عورتیں ہیں ادھیڑ قسم کی عورتیں۔ کیوں ایلی کیا تمہیں ادھیڑ قسم کی عورت دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

ایجی کے سوال سن کر ایلی کا دل دھک سے رہ جاتا۔ اس کے روبرو صفیہ آ کھڑی ہوتی اور اپنے نرم لیدا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی۔ خانم گورے گدے سے ہاتھوں سے اس کے گال سہلاتی۔ ایلی کو ادھیڑ قسم کی عورت سے دلچسپی نہیں بلکہ عشق تھا۔ عورت درحقیقت اس کے ذہن میں بھرے بھرے جسم کی ایک گود تھی جس کے پہلوؤں پر بازو اور ہاتھ لٹکتے تھے جو سہلاتے اور تھپکنے کے لئے بے قرار رہتے لیکن ایلی نے کھلے طور پر اس شدید جذبے کو کبھی اپنایا نہ تھا۔

"لاحول ولاقوۃ" وہ گویا شدت جذبات کا اظہار کرتا۔ نہ جانے کیوں یہ سب پاگل ہو رہے ہیں۔ کیوں پاگل ہو رہے ہیں۔ بتاؤ نا۔ بول۔" ایجی کے ترنگ میں

چیخ اٹھتا "جواب دو۔"

"یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔" ایلی کو جی کے پر غصہ آنے لگتا۔

"کیا مطلب" وہ چلاتا "نوجوان والدہ قسم کی عورتوں کو پسند کریں۔ عجیب بات نہیں کیا۔"

"نوجوان نہ کریں تو کیا بوڑھے کریں گے۔" ایلی جواب دیتا۔

"تم بھی بے وقوف ہو۔" جی کے جوش میں آجاتا۔

"ہم دونوں ہی بے وقوف ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمہیں اپنی حماقتوں کا احساس نہیں۔"

"بالکل غلط۔" وہ چلاتا "تم ہوگے ہم تو نہیں۔ ہم تو دانش ور ہیں۔ دراصل یہ فرائیڈ پڑھ پڑھ کر تم نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے۔ تم سے بات کرنا بے کار ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔"

جی کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ وہ خاموش ہو جاتا۔ اس کی ناک پر بدمزگی کے ڈھیر لگ جاتے آنکھوں سے دکھ جھانکتا۔ مظلومیت کی پھوار پڑتی۔

جی کے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے آپ کو بے حد مظلوم سمجھتا تھا۔ اسے یہ خیال تھا کہ وہ قربانی کا بکرا ہے۔ دوسروں کے مفاد کے لئے وہ اپنے خیالات یا مفاد کی قربانی نہیں دیتا تھا سمجھتا تھا کہ دے رہا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا تھا ایلی ______ اس قسم کے خیالات سے اسے مستفید کرتا تھا لیکن اس کے باوجود ایلی سمجھتا تھا ایلی ______ اس قسم کے خیالات سے مستفید کرتا تھا لیکن اس کے باوجود ایلی سمجھتا تھا کہ وہ خیالات غلط ہیں۔ ایک دوست کا سے یوں جھنجھلانا ______ اور پھر دوست بھی ایسا جس کے لئے اس نے کیا نہ کیا ہو۔

چپ ہو جانے سے پہلے جی کے ایلی کی طرف ایک نگاہ ڈالتا بالکل وہی "یو ٹو بروٹس" والی نگاہ۔ وہ پھر سیزر کی طرح آرام کرسی میں گر جاتا اور ایلی کے متوقع خنجر

کے دور کا انتظار کرتا ___ پھر اسے غصہ آتا کہ متوقع دور میں تاخیر کیوں کی جا رہی ہے۔ تاخیر کا مقصد یہ ہے کہ جی کے رعب میں اضافہ کیا جائے۔

ایلی کو یہ سب باتیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ اسے صرف جی کی پھولی ہوئی ناک نظر آتی تھی جس پر بدمزگی کے انبار لگے ہوتے۔

پھر ان کے دوستوں میں سے کوئی آ جاتا۔ مثلاً بابا شام پریم رائے یا جین۔

"ارے تم دونوں اندر بیٹھے ہو۔" شام چلاتا "ہائیں یہ یہاں اتنی موٹی کتاب پڑھ رہا ہے۔"

"یہاں تو بڑی بڑی کتابیں پڑھی جاتی ہیں اس کمرے میں۔" جی بڑے رعب سے جواب دیتا۔

"کیا ہے یہ۔" شام پوچھتا۔

"تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی پوچھنے کا فائدہ۔"

ایلی کو اس بات پر اور بھی غصہ آتا۔ لو ابھی ان موٹی کتابوں پر تمسخر کر رہا تھا اور اب فخر کا اظہار کر رہا ہے اور وہ بھی ایسے انداز میں جیسے وہ کتابیں اس کی اپنی ہوں اور اس نے ایلی کو پڑھنے کے لئے مستعار دی ہوں اور ساتھ ہی نفس مضمون کو سمجھنے میں ایلی کی مدد کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہو۔

جی کے سامنے ایلی پر بھی فخر کا اظہار کیا کرتا تھا۔ لیکن اس اظہار میں ایلی کی عظمت کی نسبت نہ ہوتا بلکہ ایلی کی عظمت کا پہلو نکلتا۔ مثلاً دوسروں کے روبرو وہ ایلی کی دوستی پر فخر کا اظہار کرتا تو ایسے محسوس ہوتا جیسے کہہ رہا ہو۔ دیکھا ہم وہ ہیں جس کے ایسے دوست ہیں۔

٭٭

لڑکیوں کے متعلق کئی ایک مختلف زاویہ نظر رائج تھے۔ بابا کا نقطۂ نظر بہت دلچسپ تھا۔ بابا کا نام عزت تھا اس کی عمر چالیس برس کی تھی چہرہ ڈھلک چکا تھا۔ جسم میں بل کی

ہی بے حسی تھی۔ صرف آنکھوں میں شرارت چمکتی اور وہ بھی مخصوص اوقات پر۔ اس
کے گال تو پچکے تھے۔ بہت سی بیٹیاں اور تھوڑے سے بیٹے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ
کب سے بچے پڑھانے کا کام کر رہا ہے۔ پوچھو تو کہتا ”بس سمجھو جب سے آدم نے
پھل کھایا ہے تبھی سے پڑھانے کی نوکری کر رہا ہوں۔ شاید اس سے بھی پہلے سے۔
اور اب صاحب نے مجھے ریفریشر کورس کے لیے یہاں بھیج دیا ہے۔“

اس عمر کے باوجود وہ بنیادی طور پر محبوب واقع ہوا تھا۔ لڑکیوں کی بات چھڑ جاتی
تو ہنس کر کہتا ”یہ تم کونسی لڑکیوں کی بات کر رہے ہو۔ سارا دن آپ ہی لوگ لڑکیوں کا رونا
روتے ہیں۔ ہم نے تو کوئی لڑکی نہیں دیکھی یہاں۔“

”دادا“ لیلی چلائی۔ ”ایک نہیں چھ ہیں چھ۔“

”ہوں گی بھائی۔“ وہ بے پروائی سے کہتا ”لیکن ہم نہیں مانتے اگر وہ لڑکیاں
ہیں تو بھائی خودبخود ہمارے پاس کھنچی چلی آئیں گی۔ آج تک تو ایسا کبھی نہیں ہوا اور
خودبخود ہماری طرف نہ کھنچی چلی آئے۔“

”دیکھا تو کرتی ہیں تمہاری طرف۔“ لیلی نے اسے چھیڑا۔

”دادا“ جی کے چیختا ”وہ تو واہیات قسم کی ہیں تمہارے جوڑ کی ہیں۔“

”بے تجھے کیا پتا“ بابا ہنسا۔ تو وہ اور وہ چار کے سوا کیا جانتی ہے جو واحد قسم کی
ہوتی ہیں۔ وہ تو شاید گود بھری رکھنے کے لیے لونڈے تلاش کرتی ہیں۔ ہاں اگر
لڑکی ہو تو وہ بھی“ وہ اپنے منہ پر ہاتھ پھیر کر کہتا ”مرد ڈھونڈے گی۔ دیکھ لینا ایک نا
ایک دن ہمارے پہلو میں پہنچ کر رہے گی اگر ان میں کوئی لڑکی ہے تو۔ ورنہ نہیں تو
ہٹاؤ سب کی سب تمہیں نشئیں۔“ وہ شام سے کہتا ”ہم گود میں بیٹھنے کے قابل نہیں
بٹھانے کے ہیں۔“

دادا کی شخصیت میں ایک عجیب سی مٹھاس تھی اس کے انداز میں جذباتی گرمی
منعکس ہوتی تھی۔ ایک عجیب سا گداز۔ اس سے چاہے بات کرو نہ کرو ایسے محسوس

"کس کو بتاؤں؟"

"باری باری سب کو بتاؤ، ممکن ہے کسی کا دل پسیج جائے۔" شام سنجیدگی سے کہتا۔

شام کی باتوں سے یہ محسوس نہ ہوتا تھا کہ وہ دکھاوے کی بات کر رہا ہے یا رنگین گفتگو کی نمائش کر رہا ہے۔ اس کے انداز میں ایک عجیب قسم کا عجز اور خلوص تھا جو ایلی کو بے حد پیارا لگتا تھا۔

ایلی کو پڑھتے دیکھ کر شام جی کی طرح طنز نہیں کرتا تھا اس کے برعکس وہ حیرت سے دیکھتا اور کہتا۔

"یار تم تو بڑی بڑی کتابیں پڑھتے جا رہے ہو اور یار لوگ اس پاکٹ بک میں کھوئے ہوئے ہیں۔"

"کون سی پاکٹ بک۔" ایلی پوچھتا۔

"وہی لڑکیاں اور کون۔"

"کون سی لڑکی۔"

"کوئی سی۔ آج ایک نے رحم کھا کر کھانے کے لئے کوٹ دے دیا مجھے جب سے نشہ سا طاری ہے ____ طبیعت اتنی خوش ہے کہ جو مانگو گے ملے گا۔ جو جو منظور ہو تو ٹک شاپ سے کیک کھلا دوں۔" وہ اپنی جیب ٹٹولتا۔ "ڈیڑھ سو روپیہ ہے، جو کھانا ہے آج ورنہ پچھتاؤ گے۔ ایسے سنہرے موقعے روز نہیں ملتے۔"

وہ عمدہ قسم کی لڑکیوں کے متعلق بھی شام سے پوچھتا۔ "یار تمہیں ان سے گھن نہیں آتی۔"

شام مسکرا کر جواب دیتا۔ "بے حد" اس کے انداز سے سخت نفرت کا اظہار ہوتا "نفرت تو آتی ہے اور جب وہ لڑکیوں کی طرح چونچلے کرتی ہیں تو جی چاہتا ہے کہ منہ پر تھپڑ دوں۔" شام جوش میں آ کر چلاتا ____"

"ہوں ——— یہ"

"اچھا۔" جی کر کہتا۔

"بالکل" شام جواب دیتا۔ "میرا تو اور بھی جی چاہتا ہے۔"

"کیا؟"

"یہ چھوڑ دوں۔" شام پھر بازو ہوا میں زور سے گھماتا۔ "پھر دفعتاً اپنی اس حرکت پر اس قدر ندامت محسوس کروں کہ اس کے قدموں میں گر جاؤں اور پھر وہ مجھے اٹھا کر گود میں بٹھا لے اور پھر لوری دے کر سلا دے۔ یار مجھے زندگی میں کبھی کسی نے لوری دے کر نہیں سلایا۔ ماتا جی تو بالپن میں ہی چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔"

شام کا بات کرنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اس کی بات پر نکتہ چینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ سچ کہہ دیتا تھا۔ حالانکہ سچ کی نوعیت اس قسم کی ہوتی تھی کہ اسے کہہ دینے میں بے حد جرات کی ضرورت ہوتی۔ ایلی بھی چاہتا تھا کہ وہ سچی بات کہہ دے لیکن اس میں کبھی جرات پیدا نہ ہوئی۔ وہ ڈرتا تھا کہ لوگ کیا سمجھیں گے۔ وہ ڈرتا تھا کہ لوگ اسے اخلاق سے گرا ہوا سمجھیں گے۔ لیکن شام جب بھی اس قسم کی بات کرتا تو اس طرح سے کرتا جیسے اس میں ڈرنے یا لوگوں کے دلوں میں نفرت، احتجاج یا کچھ اور پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایلی چاہتا تھا کہ وہ شام کی طرح باتیں کر سکے۔ سچی باتیں جن میں رنگینی اس قدر غالب ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں کوئی اور ردعمل پیدا نہیں ہونے دیتی۔ لیکن ایلی کی یہ خواہش خواہش ہی رہی اور اس میں اتنی جرات نہ پیدا ہو سکی کہ اس پر عمل کر سکے۔

رائے

شام کے علاوہ اور لڑکے بھی تھے مثلاً جان تھا۔ لیکن وہ تو گونگا تھا۔ بات سن کر ہنس دینے کے علاوہ اس نے کبھی کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ ان سب میں بیٹھ جاتا بیٹھا رہتا۔ ان کی باتیں سنتا رہتا اور مسکراتا رہتا۔ اس نے کبھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا

تھا۔

پھر رے تھا یک جذباتی لڑکا تھا ئی ایک باتوں میں تو وہ جمال سے بہت ملتا
جلتا تھا مثلاً پنی محبتوں ور محبوبوں کی باتیں سنانے کے لیے سے یک رازداں کی
شدید ضرورت تھی ضروری نہ تھا کہ رازداں قابل اعتماد ہو یا اچھا مشورہ دے سکے یا کچھ
ور جہاں تک رے کا تعلق تھا رازداں کے چناؤ کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ چونکہ
سے صرف یک یسے فرد کی ضرورت تھی جو اس کی باتیں سنتا رہے۔ نوکے نہیں یہ
مشورہ نہ دے جو سے قابل قبول نہ ہو۔ جب وہ حماقت کرنے پر تلا بیٹھا ہو تو عقل کی
بات بتا کر سے روکنے کی کوشش نہ کرے بلکہ حماقتوں میں سے شہ دے۔ اس لڑکی کو
جسے وہ حسین سمجھتا تھا معمولی لڑکی نہ سمجھے بلکہ اسے اہمیت دے ور س میں وہ خوبیاں
دیکھے جو بظاہر بالکل دکھائی نہیں دیتی ہوں۔ غرضیکہ سے یک سامع رازداں کی
ضرورت تھی۔ ور س رول کے لیے ایلی بے حد موزوں تھا س لیے رے سے
پنے تازہ ترین کارنامے سناتا رہتا تھا۔

ایلی نے کبھی غور سے رے کی بات نہ سنی تھی گرچہ وہ یوں نداز سے سنتا تھا جیسے
وقعی بڑے غور ور نہماک سے سن رہا ہو۔

بہر حال رے کے قصے ایلی نے کبھی نہ سنے تھا س کے باوجود سے ن کے
متعلق چند یک باتوں کا دھندلا احساس تھا مثلاً رے کی یک محبوبہ گاؤں میں رہتی
تھی ور وہ سے ملنے کے لیے شدت سے بے قرار تھی۔ ور ہر پندرھویں روز سے
گاؤں بلا بھیجتی ور گرچہ سے والدین کو اس کا رات سے منقطعی طور پر ناگوار تھا
تاہم وہ رے کے خط سے اس قدر پابند تھی کہ سے پنے گھر ٹھہراتی ور پھر رات
کے ندھیرے میں چھپکے سے ملتی۔ اس پر بوڑھی ماں شدت غم سے پھوٹ پڑتی۔ باپ
حتجاج کے طور پر بار بار کھانستا لیکن وہ بڑی باہمت لڑکی تھی ور س کی اس باہمت کی
وجہ سے رے کو اس سے وبہانہ محبت تھی رے کی دوسری محبوبہ شہر میں رہتی تھی۔ مشن

سکول میں پڑھاتی تھی اور اتنی قبول صورت اور ذہین تھی کہ کبھی کے پیچھے نوجوان جو گرد و نواح میں رہتے تھے اس پر ہزار جان سے عاشق تھے اسے راہ چلتے چھیڑتے تھے لیکن رانی کے سوا اسے کوئی پسند نہ تھا چونکہ اسے رانی سے محبت تھی۔

رانی کی تیسری محبوبہ لاہور ہی میں تھی۔ وہ بے حد معصوم اور خوبصورت تھی۔ اتنی معصوم تھی کہ ان دنوں ایک بدمعاش لڑکے نے اسے قابو میں کر رکھا تھا۔ وہ وہ بیچاری انجانے سیدھی راہ سے بھٹک گئی تھی بہر صورت رانی جانتا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب وہ سمجھ جائے گی کہ وہ بدمعاش نوجوان محض اپنا مطلب پورا کر رہا ہے اور پھر وہ ایک نئے شوق و ولولہ عزم سے رانی کی طرف لوٹے گی اور اس کا رومان پھر سے تازہ ہو جائے گا۔ ان دنوں رانی کی سب سے بڑی خواہش یہ نہ تھی کہ گاؤں والی محبوبہ سے بیاہ رچائے یا شہر والی محبوبہ کو نوجوان بدقماش چھوڑ دیں یا لاہور والی محبوبہ کی آنکھیں کھل جائیں۔

ان دنوں تو اس کی صرف یہ خواہش تھی کہ کاش کی ان چھٹیوں میں اسے کسی ایک کے ساتھ اس کا رومان چل پڑے اور اسے ہر ماہ بار بار اتنی دور گاؤں تک سفر نہ کرنا پڑے۔

اس سلسلے میں وہ اکثر ایلی سے مشورہ طلب کیا کرتا تھا۔

”ایلی کوئی ایسی تجویز بتاؤ کہ اپنی بات بن جائے۔“

اور اکثر ایلی جواب دیتا۔ ”لو۔ اس میں کیا ہے جا کر کسی کا ہاتھ پکڑ لو۔“

”اور اس نے تھپڑ مار دیا تو۔“

”تھپڑ مار دیا تو سمجھ لو بات پکی ہو گئی۔“ ایلی کہتا۔ ”یہ پریکٹس کا ہی فیصلہ ہے۔“

”کیسے؟“

”سیدھی بات ہے اگر ہاتھ چھوڑ دیا تو سمجھو بات ٹوٹ گئی۔ پکڑے رکھا تو تعلقات قائم ہو گئے اور اگر جرات کر کے اس وقت آغوش میں لے لو تو ہمیشہ کے

سے اس کے دل میں دماغ پر مسلط ہو جاؤ گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" راجے جواب دیتا۔ "لیکن کبھی یار کیفے میں کوئی بات تو بات بنے۔ اس کوشش میں لگا تھا کہ کبھی اکیلے میں کوئی مل جائے۔"

ویسے بیسیوں مرتبہ وہ اکیلے میں ملی تھیں لیکن ایلی نے کبھی بات تھامنے کی کوشش نہ کی تھی۔ بات تھامنا چھوڑ ______ اس وقت نہ جانے کیا ہو جاتا تھا۔ دور سے کوئی کیسی جیسی آتی دکھائی دیتی تو ایلی کا دل دھک سے رہ جاتا جیسے بڑی بڑی میں جگادڑ کو آ رہا ہو۔ اس کا جی چاہتا کہ کوئی لڑکا آ جائے تاکہ اسے حوصلہ ہو۔ اس کا جی چاہتا کہ مڑ کر بھاگ جائے۔ نہیں نہیں وہ سوچتا یہ ٹھیک نہیں کیا کہے گی وہ۔ مجھے تو یوں گزر جانا چاہئے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ آخر بات کیا ہے ایک لڑکی گزر رہی ہے اور کیا وہ لڑکی بھی وہ جو مجھے قطعی پسند نہیں۔ پھر گھبراہٹ کیسی۔ وہ گردن اٹھا کر یوں چلنے لگتا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ لیکن جب وہ لڑکی کے قریب پہنچتا تو اس کی گردن جھک جاتی۔ نگاہیں کونے تلاش کرنے لگتیں اور دل بیٹھ جاتا پسینے چھوٹ جاتے۔

لیکن ایلی کی بات چھوڑئیے، اسے تو ان چڑیلوں میں چنداں دلچسپی نہ تھی اور ایسی لڑکیوں سے رومان کیسے قائم کیا جا سکتا ہے بھلا۔ جنہیں انسان جب جی چاہے جا کر مل سکے۔ ان حالات میں محبت کا پیدا ہونا ایلی کی دانست میں ناممکن تھا۔

ایلی کی دانست میں محبت کے لئے ضروری تھا کہ بندشیں ہوں قیود ہوں۔ پردے اور دیواریں حائل ہوں۔ برقعہ ہو گھونگھٹ ہو۔ نگاہ ترچھی۔ مسکراہٹ زیر لبی ہو۔ دور سے اشارے ہوں۔ ساتھ سے گزرنے کے بہانے سلام کیا جائے ولیٹر لکھے جائیں۔ ورنہ کیا ہو ہیلو مس مینا کہئے مزاج کیسے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

لڑکیوں کے بارے میں ایلی کو شام کا طرز عمل بے حد پسند تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی روز کسی لڑکی سے اکیلے میں ملے اور کہے جسٹ اے منٹ مس یہ تو بتائیے کہ بھلا آپ کو دیکھ کر دل میں کچھ کچھ یوں ہونے لگتا ہے۔ گردن کیوں ٹک جاتی

ہے۔ نگاہیں کونے کیوں تلاش کرتی ہیں ____ اور اگر وہ جواب میں تھپڑ مار دے تو اس کا ہاتھ پکڑنے کی بجائے جھٹ جیب سے خنجر اور روئی نکالے اور کہے آپ ایک تکلیف اور کیجیے اور چوٹ پر خنجر لگا دیجیے مجھے جلدی کچھ نہیں۔

صفدر

شام سے دلچسپی کی ایک وجہ اور بھی تھی دونوں کو صفدر یار سے شغف تھا۔ صفدر نہایت خلیق محبتی منکسر اور ذہین لڑکا تھا۔ وہ کسی مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا اور ریفریشر کورس کے لیے بی ٹی کلاس میں داخل ہوا تھا۔ وہ راہ چلتے لڑکے کو روک لیتا۔ ''کہاں جا رہے ہو بھائی کب وقت ایسے گزرتا ہے۔'' اور اس کے قریب تر ہو جاتا اور قریب حتیٰ کہ آپ محسوس کرتے کہ ابھی وہ آپ سے بغل گیر ہو کر آپ کا منہ چوم لے گا۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لئے آپ کا دوست بن جائے گا۔

وہ ہمارے علیم ہمدرد جی کے کمرے میں آ پہنچتا۔ ''بھائی تم ملتے ہی نہیں کئی مرتبہ آ چکا ہوں نہ جانے کہاں گم رہتے ہو تم دونوں۔ یار وہ ایک مشکل آن پڑی تھی۔ میں نے کہا کسی حسابی سے جا کر پوچھوں آپ کو تو حساب میں کوئی دلچسپی نہیں۔ یہاں سے بی کورس والے تو صاف گم ہوتا۔''

شام کی ڈارمٹری میں جا کر وہ شام سے پوچھتا۔ ابھی وہ چیپٹر آف ہسٹری نہیں آئی کوئی تو پتہ دو یار بتاؤ۔ پھر تم بھی پڑھنا نہیں پڑھتے کوئی نہیں چاہتا۔ ایک زمانے کے بعد پھر پڑھنے کے چکر میں پڑ گئے ہو گے اب عادت بنتے بنتے بنے گی۔''

صفدر ہر ایک سے ملتا تھا۔ بڑے پیار سے ملتا تھا۔ پیار کا اظہار کرتا تھا۔ اپنی ذہنی کم مائیگی کا اظہار بھی کرتا تھا محبت بھری نگاہیں بھی ڈالتا۔ قریب تر ہو کر اپنا بازو آپ کے شانے پر رکھ دیتا۔ یا آپ کا بازو اپنی بغل میں ڈال لیتا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں کسی اصول کے تحت اسے لوگ پورا سمجھتے تھے۔ پورا کا لفظ تو خیر اس زمانے میں رائج نہ تھا لیکن ہم سب اس سے کنی کتراتے تھے۔ اس کی مٹھاس کثیف محسوس ہوتی

اس کا قرب خلق ایسے محسوس ہوتا جیسے ایک نرم نرم لیس دار چیز آپ سے چپکی جا رہی ہو۔

نہ جانے قدرت نے کس قانون کے تحت اسفند کے آتے ہی دفعتاً یاد دلا دیا کہ آپ کو ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ اسے دیکھ کر آپ اپنا پروگرام بدل دیتے کسی اور سمت کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیتے۔

شاید اس کی مجبوریاں ہوں؟

اسفند سب سے بڑا گوٹ بڑا ور تھا۔ وہ ہر وقت لڑکیوں کے جھرمٹ میں رہتا ہر وقت ان کا طواف کرتا۔ چاہے وہ واضح طور پر اس امر کا اظہار کرتیں۔ معاف کیجیے آپ جائیے۔ چاہے ان کا ساتھ منہ موڑ لیتا یا پوچھ لیتا "کیوں اسفند صاحب آپ لائبریری کو جا رہے ہیں نا۔" لیکن اسفند اپنی جگہ سے نہ ہلتا اور بڑے ظرف کے باوجود اس کے ہونٹوں پر وہ لیس دار مسکراہٹ چپکی رہتی۔ اس کی تیکھی مسکان جوں کی توں قائم رہتی خلق بدستور خوشگوار رہتا اس کی باتیں جاری اور ساری رنجشیں جاتی رہتیں باقی لوگ وضاحت سے اس امر کا اظہار کر چکے ہوتے کہ محفل میں گنجائش نہیں لیکن اسفند کا رویہ یہ ظاہر کرتا کہ وہ اپنے پیارے دوستوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا وہ بے وفا نہیں۔ چاہے اس کا اپنا حرج ہی کیوں نہ ہو وہ آداب محفل کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اگر کوئی لڑکا لڑکیوں کو آئس کریم کھانے کی دعوت دیتا تو اکثر وہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا کہ اسفند تو آئس کریم کھاتا ہی نہیں۔

مگر اسفند فوراً بولتا "کھاتا تو نہیں لیکن تمہارے جیسا پیارا دوست کہے تو انکار نہیں کروں گا۔"

دعوت سے زبردستی چپکے رہنے کی خصوصیت چھوڑیے اس سلسلے میں تو اسفند اس حد تک فراخ دل تھا کہ خود لوگوں کو دعوت دیتا۔ ٹک شاپ پر میزبان بن کر سب کو

کھڑا تا اور پھر چپکے سے ٹک شاپ والے سے بدل دیتا۔

"میں یہ بل شرما صاحب ادا کرے گا۔" یہ کسی دوسرے کی دعوت میں بھی
اسفند کا رویہ کچھ ایسا ہوتا اور وہ انہماک اور شوق سے لوگوں کو کھلاتا تا کہ ہر کسی کے
دل میں احساس پیدا ہو جاتا تا کہ دعوت اسفند کی طرف سے تھی۔

ان کی باتوں کی وجہ سے لوگ اسفند سے گھبراتے تھے لیکن ان باتوں کی وجہ سے
تو صرف ان لڑکوں کو گھبرانا چاہئے تھا جو لڑکیوں کے حلقے میں رہتے تھے۔ وہ لڑکے
جنہیں لڑکیوں کے حلقے سے دور کا تعلق بھی نہ تھا انہیں گھبرانے کی کیا ضرورت تھی۔
لیکن اسفند کے متعلق ان کے جذبات بھی اس قسم کے تھے اور یہ وبا اس قدر عام ہو
چکی تھی کہ ایک روز ہنگامہ ہو گیا۔ ہوسٹل کے صدر دروازے سے باہر برگد کے
درخت کے نیچے سے میدان میں شور شرابے کی آوازیں آنے لگیں۔ تمام لڑکے بورڈنگ
سے باہر نکل آئے ادھر کالج سے بھی لڑکے آموجود ہوئے۔ برگد کے نیچے دو لڑکے
آپس میں لڑ رہے تھے۔ لڑائی نے باقاعدہ ہاتھا پائی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دونوں بڑے
غصے سے چیخ رہے تھے۔

"بے ہٹ بے بڑا آیا نہیں ہے۔ میرے روبرو تیری دال نہیں گل سکتی۔ تو
میری منگنی سے واقف نہیں۔ شکل و صورت تو دیکھ اپنی جگنوؤں کی سو گند جیسے چھپکلی ہو۔"

"بے جا۔ وہاں گھسنا چھوڑ دے آ کے۔"

اس طرح دیر تک وہ چلاتے رہے۔

"بات کیا ہے بات کیا ہے۔" لڑکوں نے چاروں طرف سے شور مچا دیا۔

بورڈنگ اور کالج میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ لڑکے بھاگے بھاگے آ پہنچے۔

چاروں طرف خبر مشہور ہو گئی کہ برگد تلے جھگڑا ہو رہا ہے۔ ایک لڑکا کہتا ہے میں
کمینہ ہوں دوسرا کہتا ہے کہ تیری کیا حیثیت ہے اپنے سامنے۔ میں بہت بڑا کمینہ
ہوں۔ عجیب جھگڑا تھا۔ لہٰذا سب برگد کے درخت کی طرف بھاگے حتیٰ کہ پروفیسر

اور چھڑیاں بھی آ پہنچیں۔

دونوں لڑکے بڑی شدت سے چلا رہے تھے منہ سے کف جاری تھا آستینیں چڑھی ہوئی تھیں جیسے ابھی ہاتھا پائی کی نوبت آ جائے گی۔

"میں کہتا ہوں میں کمینہ ہوں۔" ایک چیخ رہا تھا۔

"بے جا۔" دوسرا کہہ رہا تھا۔ "تو کیا تیری اوقات کیا ہے۔"

جب سب لڑکوں نے جھگڑے کا انداز دیکھا تو چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لڑکے فوراً تاڑ گئے کہ یہ جھگڑا نہیں کچھ اور بات ہے جانے مداری کے پٹارے سے کیسا سانپ نکلے گا۔

دیر تک چیخ چیخ جاری رہی۔ حتیٰ کہ سب لڑکیاں آ پہنچیں پروفیسر بھگت سنگھ بھی آ گئے۔ اور جی تو دور سے تماشہ دیکھتے رہے لیکن پروفیسر بھگت سنگھ بڑے سادہ لوح اور مخلص تھے وہ گھبرا گئے انہوں نے بچاؤ کرانے کی کوششیں کیں۔

عین اس وقت دونوں لڑکوں نے جھگڑے کا خطرناک پن پیدا کر دیا۔

ایک بولا۔ "بے ٹینگی میں میں تیرا باپ ہوں۔"

"بے جا۔" دوسرا چلایا۔ "گلیسکو بے بی تو دیکھو۔" "جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش ہے اور آ گیا ہے ہم سے مقابلہ کرنے۔ ابے میں تیرے باپ کا باپ ہوں وہ کمینہ ہوں ہیں۔"

"میں خالی کمینہ نہیں ذلیل بھی ہوں۔"

"کس قدر ذلیل ہو تم؟" دوسرے نے غصے سے پوچھا۔ "میں" پہلا بولا "میں پروفیسر بھگت سنگھ کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔"

"بس۔" دوسرا چلایا۔ "ابے میں کتے کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔"

پہلا بولا۔ "میں غفند کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔"

دوسرا خاموش ہو گیا۔ "نہیں بھئی میں اغفند کا جوٹھا نہیں کھا سکتا۔ میں ہار گیا ہوں"

گیا۔"

چاروں طرف سے قہقہوں کا شور اٹھا۔

دو لڑکوں نے بڑھ کر پہلے لڑکے کو شانوں پر اٹھا لیا۔ وہ اسے لے بھاگے جیت گیا!!! جیت گیا!!! وہ چلا رہے تھے اس سے بڑی ذلت نہیں ہو سکتی زندہ باد شام مردہ زندہ باد شام۔

"ارے" علی حیرت سے چلایا۔ "یہ تو شام ہے۔"

ادھر اسفند خود مسکرا رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے شام نے اس کا نام ہی نہ لیا ہو۔ اور لیا بھی ہو تو محض مذاق اور تفریح کے طور پر لیا ہو۔

لیکن بھگت سنگھ چلاتے جا رہے تھے "نالائقوں نے میرا نام خواہ مخواہ لے دیا ہے میں تو گروہ کا پیارا ہوں۔ مجھے کیوں گھسیٹتے ہو اپنے جھگڑوں میں۔"

پھر شام پیچھے سے علی کے کان میں کہہ رہا تھا۔ "وہ بچہ زندگی بھر آج کے سبق کو کبھی بھول نہ سکے گا۔" اور اسفند یوں دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو کیسے بھائی؟

اس روز رات کو بورڈنگ میں بہت ہنگامہ ہوا۔ ہر ڈارمیٹری میں لڑکے اس ڈرامے کو دہرا رہے تھے جو اس شام برگد کے درخت کے نیچے شام نے کھیلا تھا۔

"میں کمینہ ہوں۔" ایک ڈارمیٹری سے آواز آئی۔ "اب تیری کیا ہمت ہے جو ہمارے ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرے۔" دوسری ڈارمیٹری سے کوئی چلاتا۔ "سب جھوٹ ہے" تیسری ڈارمیٹری سے شور بلند ہوتا۔ اوپر چوبارے میں کھڑے اسد جی مسکرا رہے تھے "میں کہتا ہوں بھئی۔" وہ کہہ رہے تھے "اس بات کا تو فیصلہ شام کو ہو چکا اب کوئی اور دعویٰ کرو۔"

ڈائننگ ہال میں کونے کونے میں ان میں چند لڑکے باتیں کر رہے تھے۔

"یار شام نے وہ مار دی ہے وہ مار دی ہے اسفند کو کہ چاروں شانے چت کر دیا ہے۔"

''اچھا یار میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام ہے پھر آؤں گا۔ اب تو آتا ہی رہوں گا۔''

پھر ایلی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ''چلو یار ذرا کچھ دیر میرے ساتھ چلو پھر واپس آ جانا۔''

زنانہ ہوسٹل

دیر تک ایم کے اور ایلی لاہور کی ویران سڑکوں پر چلتے رہے۔ ایک دو مرتبہ ایلی نے کہا مجھے اب جانے دو یار۔ لیکن ایم کے نے بس تھوڑی سی دور اور کہہ کر اسے مطمئن کر دیا۔ پھر وہ لڑکیوں کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اور ایلی کو خیال ہی نہ رہا کہ اسے واپس جانا ہے اور نامانوس راستے میں وہ اتنی دور نکل آیا ہے کہ واپس بورڈنگ میں پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ ایم کے اسے ٹریننگ کالج میں لڑکیوں سے متعلق کارنامے سنا رہا تھا۔

ایک وسیع کوٹھی کے سامنے ایم کے رک گیا۔ کوٹھی کے چاروں طرف قد آدم دیوار بنی ہوئی تھی۔ اور سڑک کی جانب ایک بہت بڑا دروازہ تھا۔

''ایک بات مانو گے'' اس نے ایلی سے کہا ''اگر تم صرف پندرہ منٹ یہاں میرا انتظار کرو تو میں اپنے دوست سے مل کر واپس آ جاؤں گا پھر ہم اکٹھے واپس جائیں گے تم بورڈنگ چلے جانا اور میں بھاٹی دروازے چلا جاؤں گا۔''

اس وقت آدھی رات ہو چکی تھی ایلی اس ویران جگہ انتظار کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن اسے واپسی کے راستے کا بھی تو علم نہ تھا۔ اس لئے مجبوری میں اس نے ایم کے کی بات مان لی۔ اور بڑے دروازے کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

دیر تک ایلی وہاں بیٹھا رہا پھر وہ گھبرا کر ٹہلنے لگا۔ ایم کے کو گئے قریباً آدھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ دور کسی گھڑی نے ساڑھے بارہ بجائے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے ٹہلتے ٹہلتے تھک کر وہ بیٹھ گیا۔

دفعتاً مکان کے اندر سے شور اٹھا۔ لوگ دوڑ رہے تھے۔ کون ہے؟ کون ہے؟ کیا ہے؟

دو ایک عورتیں چیخ رہی تھیں۔ بلی وہ آوازیں سن کر چونکا پھر اس نے سمجھا شاید کوئی بات ہو ہوگی کوئی بات۔ پھر قریب ہی لوگ چل پھر رہے تھے ٹھک ٹک جیسے کوئی اونچی ایڑیاں فرش پر مار رہا ہو۔

پھر دھڑام سے صدر دروازہ کھل گیا۔ کچھ لوگ لالٹین اٹھائے باہر نکل آئے۔ بلی بیٹھے بیٹھے چپ چاپ ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کون ہیں یہ لوگ۔ وہ سوچ رہا تھا۔

ایک نوجوان ہاتھ میں لٹھ سنبھالے دوسرے میں لالٹین پکڑے اس کے قریب آگیا اس کے پیچھے دو مرد تھے اور ایک ادھیڑ عمر کی بیگم تھی۔

''کون ہو تم۔'' اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''میں ہوں۔'' بلی نے جواب دیا۔

''یہاں کیوں بیٹھے ہو۔''

''تھک گیا تھا بیٹھ گیا۔'' بلی نے بے پروائی سے کہا۔

اس پر بیگم آگے بڑھی اور تیزی میں پوچھنے لگی۔

''زنانہ بورڈنگ ہاؤس کے سامنے بیٹھنے کا مطلب۔''

زنانہ بورڈنگ ہاؤس۔ بلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا مجھے یہ معلوم نہ تھا بلی اٹھ بیٹھا ''آئی ایم سوری۔''

''لیکن تم ہو کون۔'' وہ بولی۔

زنانہ بورڈنگ کا نام سن کر بلی کو خیال آیا کہ ضرور لڑکے نے کوئی شرارت کی ہو گی۔ اس خیال پر وہ محتاط ہو گیا۔ ''دیکھیے محترمہ'' وہ بولا ''میں راہ گیر ہوں بھائی دور سے جاتا ہے تھک گیا تو ذرا سستانے بیٹھ گیا مجھے علم نہ تھا کہ یہ زنانہ بورڈنگ

ہے۔"

"کیا کرتے ہو؟" وہ بولی۔

"پردیسی ہوں کام سے لاہور میں آیا ہوں۔"

"ہوں۔" وہ غور سے بلی کی طرف دیکھنے لگی ______ پھر اس کا رویہ بدل گیا۔ بولی "تم نے ادھر کوئی آدمی گزرتے ہوئے تو نہیں دیکھا ہے کیا۔"

"نہیں تو۔" وہ بولا "کیوں کیا بات ہے۔"

"یہاں چوری کی وارداتیں ہو رہی ہیں آج کل" وہ بولی۔

"اچھا" بلی نے کہا۔ "تو مجھے چلے جانا چاہیے یہاں سے۔"

"ٹھہرو۔" گن مین والا جوان چلایا۔

"نہیں نہیں جانے دو شریف آدمی ہے۔" میم نے کہا۔ اور بلی چپ چاپ چلتا رہا۔

ابھی چند ہی قدم چلا ہوگا کہ اندھیرے سے ایک سایہ اس کی طرف لپکا۔ وہ ٹھٹھک کر رکا۔

"ڈر گئے کیا۔" مرے کی آواز آئی۔

"ارے تم ہو۔"

"ہاں میں ہوں۔"

"کسی لڑکی سے ملنے آئے تھے کیا۔"

"ارے یار" وہ بولا "مصیبت یہ ہوئی کہ دیوار پھلانگتے ہوئے کسی چوکیدار نے دیکھ لیا۔"

"تو کیا دیوار پھلانگ کر اندر گئے تھے۔"

"ورنہ تو کیا صدر دروازے سے جاتا۔ میاں زنانہ بورڈنگ ہے اندر جانے دیتا ہے کوئی۔"

بیٹھیں۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ کسی سے ملے یا کسی کے پاس بیٹھے۔

زرد دوپٹہ

لان میں بیٹھے بیٹھے دفعتاً اسے احساس ہوا کہ قریب ہی کوئی ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہے۔ وہ چونکا۔ سامنے پیڑ کے پیچھے کوئی بیٹھا تھا۔ شاید کوئی لڑکی ہو۔ وہ گھبرا گیا۔ لیکن اس نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔ پھر کچھ دیر کے بعد پودے کے پیچھے کسی نے ماچس جلا کر سگرٹ سلگایا۔ ارے شام کو پہچان کر وہ چلایا۔

"تم ہو شام۔" وہ بولا۔ شام اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔

"شام آہیں کیوں بھر رہے تھے؟" علی نے پوچھا۔

"اب عمر بھر آہیں ہی بھروں گا اور کیا۔"

"لیکن کیوں۔"

"کیا بتاؤں۔" شام بولا۔ "بزرگوں نے میری منگنی ایک ایسی لڑکی کے ساتھ کر دی ہے جو زرد دوپٹہ اوڑھتی ہے۔"

"تو کیا ہوا؟"

"میری تو زندگی ہی تباہ ہو گئی۔"

"کیوں؟ کیا وہ خوب صورت نہیں؟"

جو سر پر زرد دوپٹہ اوڑھ سکتی ہو وہ کیا خوب صورت ہو سکتی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم شام دفعتاً سنجیدہ ہو گیا "میں کسی لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا جو زرد دوپٹہ اوڑھتی ہے" حد سنجیدہ تھا۔ شام اور یوں سنجیدہ ہو۔ یہ بات علی کے لئے حیران کن تھی۔

لیکن تمہاری منگنی کب ہوئی؟ علی نے پوچھا۔

"آج۔ ابھی ابھی وہاں سے آ رہا ہوں۔ چلو یار چلیں۔ کہیں چلیں کسی ایسی جگہ چلیں جہاں کھو جائیں سب بھول جائیں۔"

علی چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی سے چلتے رہے پھر شام

سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ باتیں کرنے لگا۔ دراصل وہ بچی بچی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ سب کچھ کہہ دے سب بچھ اور اپنے دل کو ہلکا کر لے۔ اس کے انداز بیان میں دکھ تھا اس کے تبسم میں بلا کی طنز تھی۔

"مجھے کسی سے محبت کرنی پڑے گی۔ ہاں۔ ابھی فوراً ورنہ زندگی کیسے کٹے گی۔ لیکن مجھ سے محبت کرنے والا کوئی بھی تو نہیں ماتا جی بچپنے ہی میں چل بسیں۔ کوئی بڑی بہن ہوتی تو شاید بات بن جاتی میری کوئی بہن نہیں۔ ورنہ پتا جی ______ لیکن کبھی پتا نے بھی محبت کی ہے۔ افسوس۔ آج تک مجھ سے کسی نے محبت نہیں کی اور اب انہوں نے میرا ناطہ کسی لڑکی سے جوڑ دیا ہے جو زرد دوپٹہ اوڑھتی ہے۔ مجھ سے زیادہ دکھی کون ہوگا۔" وہ باتیں کئے گیا اور ایلی چپ چاپ سنتا رہا۔

"ارے۔" انہوں نے تعجب سے اس گلی کی طرف دیکھا جس کی طرف لوگ بھاگے جا رہے تھے ان کے گلے میں ہار تھے۔ ہونٹوں پر تبسم اور انداز میں عجب جوش و خروش تھا۔

"یہاں کیا شادی ہے؟" شام نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"مسلمانوں کی معلوم ہوتی ہے۔"

"شاید۔"

مائی اور بیٹا

"چلو یار چلیں ہم بھی شادی میں شریک ہو جائیں۔ دیکھیں تو بن بلائے مہمان بننے میں کیا مزا ہے۔" گلی میں داخل ہوتے ہی شام نے حیرت سے چیخ سی ماری "ارے۔" وہ بولا۔ "یہ تو چکلا ہے۔ سب میسوائیں بیٹھی ہیں۔" پہلی مرتبہ شام نے حیرت سے چیخ سی ماری "ارے" وہ بولا "یہ تو چکلا ہے۔ سب میسوائیں بیٹھی ہیں۔" پہلی مرتبہ شام کی ہنسی میں دکھ کا عنصر نہ تھا "آؤ یار آؤ۔" وہ بچوں کی طرح چلایا۔

"دیکھیں تو یہ نظارہ بھی تو شادی سے کم نہیں۔"

گلی میں جگہ جگہ کھلے دروازوں اور کھڑکیوں میں بیسوائیں بیٹھی تھیں۔ ہر بیسوا کے سامنے لوگ کھڑے اس کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ ویسے ہی گھور رہے تھے۔ کچھ ویسے ہی گھور رہے تھے۔ کچھ انہیں چھیڑ رہے تھے۔

پہلے ہی کھلے دروازے پر شام رک گیا۔ کچھ دیر تو وہ اسے جانچتا رہا پھر وہ بھول گیا کہ کہاں کھڑا ہے اور اس کی منگیتر اس رنگ کا دوپٹہ پہنتی ہے اور وہ کالج کا طالب علم ہے۔ وہ اسے خصوصی رنگ میں جانچنے لگا۔

"کیوں جی۔" وہ بیسوا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کوئی نیا مال ہے۔"

بیسوا نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دی۔ دروازے کے سامنے کھڑے لوگوں نے شام کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں حیرت جھلکی۔ کوٹ پتلون میں مسکراتا ہوا نوجوان لڑکا اس گلی میں شاید کبھی نہ دیکھا گیا تھا چونکہ وہ حصہ مزدوروں اور جاہلوں کے لئے مخصوص تھی اور سب بیسوائیں نچلے درجے کی تھیں۔

"نیا کوئی مال دال۔" شام نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

بیسوا پھر مسکرا دی اور اپنی چھاتیوں سے اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہی ہو بہت ہے جاؤ۔

"تو ذرا دکھاؤ نہ ہمیں" شام مسکرایا۔

اس پر لوگ ہنسنے لگے۔

"کچھ ہو تو دکھائے۔" ایک نے قہقہہ مارا۔

"سب ختم ہو گیا ہے۔" دوسرا بولا۔

"نہیں نہیں ضرور کچھ چھپا کر رکھا ہوگا۔" شام بولا "کیوں ______ مہارانی ہے نا یہ بات"

بیسوا نے اپنی آنکھیں شام کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

"اندر صندوق میں ہوگا۔" ایک بولا "یہاں تو نہیں۔"

"کیوں۔" دوسرے نے کہا "صندوقچی تو لٹ گئی۔"

بیسو نے غصے بھری نگاہ سے لوگوں کی طرف دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔ لوگوں نے قہقہہ لگایا اور دوسرے دروازے کی طرف چل پڑے۔

شام کی باتوں پر پہلی مرتبہ تو وہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ ویسے بے تکلف باتیں کرنا اور پھر ایسی جگہ جہاں پائے جانا بھی باعث شرم تھا۔ نہ جانے شام کو کیا ہو گیا ہے۔

"چلو چلیں اس نے شام سے کہا "یہ جگہ ٹھیک نہیں۔"

"جائیں گے کہاں" وہ بولا "دیکھو تو کتنی رونق ہے۔ ایسی جگہ کہاں ملے گی ہمیں وہاں۔"

دوسرے دروازے پر جا کر وہ چلایا۔ "افسوس دیوی نے یہ قمیص پہن رکھی ہے۔ سبز رنگ کی پھیکی پھیکی۔ سرخ قمیص پہنو تو ہمیں جوش بھی آئے۔"

بیسو نے اس کی طرف دیکھا۔ "خالی باتیں ہی بناؤ گے یا آؤ گے بھی۔"

"کیوں نہیں آئیں گے"۔ وہ چلایا "آئیں گے ضرور آئیں گے"۔

"تو پھر آ جاؤ۔" وہ نہایت فحش انداز سے اشارے کرنے لگی۔

"ابھی جوش میں نہیں۔" ایک بولا۔

"خود جوش میں آنے کا فائدہ ہمیں جوش دلاؤ تو بات ہے۔" شام چلایا۔

لوگ ہنسنے لگے "یہی بات تو ٹھیک ہے۔" ایک نے کہا۔

بیسو نے نہایت بے حیائی سے اپنی قمیص اتاری اور ایک سرخ قمیص کھونٹی سے اتار کر پہننے لگی۔ اس کی میلی انگیا دیکھ کر سب چلانے لگے۔

"ذرا آہستہ اتنی جلدی اچھی نہیں ہوتی۔" شام نے کہا۔

سرخ قمیص پہن کر وہ شام سے مخاطب ہو کر بولی "اب مرد کا بچہ ہے تو۔"

"میں تو مرد ہوں۔" وہ بولا "بچہ نہیں ہوں۔"

اس پر لوگ ہنسے۔

"تو پھر آنا۔" وہ بولی۔

"آئیں گے آئیں۔ کل آئیں گے۔" یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑے۔

اسی طرح وہ ہر جگہ رک کر باتیں کرتا رہا۔ ایلی کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔ فضول سی باتیں کر رہا تھا جانے شام کو کیا ہو گیا ہے اور پھر ایسی غلیظ جگہ اور وہ عورتیں لاحول ولا قوۃ وہ کیا عورتیں تھیں۔

دفعتاً شام کی نگاہ ایک اندھیری کوٹھڑی پر پڑی جہاں کوئی بتی روشن نہ تھی۔ دروازے کے باہر ایک بڑھیا بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔

"ارے" وہ چلایا "یہ بوڑھی اماں یہاں کس امید پر بیٹھی ہے۔ آؤ ایلی آؤ۔"

اس کے قریب جا کر شام کہنے لگا "مائی تم یہاں کس لئے بیٹھی ہو؟"

وہ خاموش بیٹھی حقہ پیتی رہی۔

"کیا تم بھی بیٹھی ہو۔" شام نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

"دکھتا نہیں" وہ بولی۔

"کیا تمہارے پاس بھی کوئی آتا ہے مائی۔" شام نے پوچھا۔

"بیٹا تمہاری طرح کوئی آتا ہے تو تم خوابوں میں آ جاتے۔" وہ نہایت بے شرمی سے کہنے لگی۔

شرم سے ایلی ڈوب گیا۔ پھر وہ بھاگا۔

"ارے ٹھہرو تو۔ میں نے کہا ٹھہرو نا۔" شام چلا رہا تھا۔ لیکن ایلی بھاگے جا رہا تھا۔ پیچھے پیچھے شام آ رہا تھا۔ اور گلی کے سب تماشبین ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ٹھہرو

ٹریننگ کالج کی زندگی کے پہلے دور میں ایک مسلسل کشمکش تھی اضطراب تھا ہر کوئی پرجوش تھا۔ پرامید تھا۔ کوشاں تھا۔ لیکن چھ ایک ماہ کے بعد ٹریننگ کی زندگی

نے دوسرا رخ اپنا لیا۔ بیشتر لڑکے جوڑیوں پر اثر ڈالنے کے لئے بے تاب تھے۔ مایوس ہو گئے۔ اور ان کی توجہ کسی اور طرف منعطف ہو گئی۔

ادھر لڑکیوں نے اپنا اپنا حلقہ اور اپنا اپنا مرکز متعین کر لیا۔ اس طرح زندگی میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ جیسے گدلے پانی کا بھرا گلاس کچھ دیر کے بعد نتھر کر صاف ہو جاتا ہے گرد و غبار سب بیٹھ جاتا ہے۔

لڑکیوں کی وہ پر شور محفلیں ختم ہو چکی تھیں۔ اب ہر لڑکی نے امتحان کی تیاری کے لئے ایک مخصوص کونہ مقرر کر لیا تھا مثلاً مس رعنا اس بنچ پر بیٹھ کر تیاری کرتی جو دالان کے شمالی کونے میں جھاڑیوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ مس رضوانہ نے سائنس روم کے عقب میں پڑی ہوئی گیلری اپنے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ جہاں سے ادھر ادھر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کالج کے لان میں پڑے ہوئے بنچ سب غائب ہو چکے تھے اور مخصوص مقامات پر رکھ دیئے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ امتحان کی تیاری اکیلے میں تو نہیں ہو سکتی ایک ساتھی کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور ایک سے زیادہ ساتھی ہوں تو بھیڑ لگ جاتی ہے اور پوری توجہ سے کام نہیں ہوتا۔ غالباً اسی وجہ سے لڑکیاں تقریباً غائب ہو چکی تھیں۔ عام طور پر وہ دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ البتہ کوئی خاص لیکچر ہوتا تو وہ اپنے اپنے اڈوں سے نکل آتیں اور لیکچر ختم ہونے کے بعد پھر وہیں لوٹ جاتیں۔

رائے نے پھر سے گاؤں جانا شروع کر دیا تھا۔ اور ہر بار گاؤں سے واپس آنے کے بعد ایلی کو اس لڑکی کے قصے سناتا جو اتنی بولڈ تھی کہ حد نہیں اور جس کی بولڈنس کی وجہ سے اس کے پیرنٹس نے حجاب کھانسنا اور تیوری چڑھانا چھوڑ دیا تھا۔

بابو کی تمام تر توجہ بورڈنگ کے پچھواڑے کے ایک مکان پر مرکوز ہو چکی تھی اور وہ روز ایلی کو بتایا کرتا تھا کہ لاجونتی بیچاری سارا سارا دن دھوپ میں کھڑی رہتی ہے۔ پاگل لڑکی اس طرح وہ اپنی صحت خراب کرے گی۔ لیکن بابو کے سمجھانے کے

پچھواڑے میں ان کا مکان ہے۔ ایک روز میں نے اسے چھت کی کھڑکی سے دو ایک اشارے کر دیے تھے۔ بس اس کی کھڑکی میں یوں جمی رہتی ہے جیسے سر پر شگن کا زیور جوڑ دیا ہوا ہو۔ تب سے پتی جیت ہو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" علی بولا۔ "تمھیں بھی لٹکنے کے لیے ایک کھونٹی چاہیے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" شام ہنسا۔ "لیکن وہ تو خود لٹک رہی ہے۔"

"یہ تو بلکہ اور بھی اچھا ہے۔" علی نے کہا۔ "پکا پکایا مل گیا۔"

"اونہوں" وہ بولا "یار لوگوں کو تو مار کر کھانے کی لت پڑی ہے۔" "عجیب بات ہے" وہ بولا۔ "اگر لٹک جائے تو اپنی طبیعت نہیں جمتی اور اگر وہ پروا نہ کرے تو ہم خود لٹک جاتے ہیں۔"

علی ہنسنے لگا۔

"ایک بات اور ہے" شام بولا۔

"وہ کیا؟"

"راجونتی کی عمر بہت چھوٹی ہے۔"

"اس میں کیا برا ہے۔ جتنی چھوٹی عمر ہوگی۔ اتنا جذبہ بے لوث ہوگا۔"

"اونہوں۔ ہمیں تو عیار چاہیے۔ جو ہمیں لوریاں دے دے کر سلائے پٹ پٹ کر جگائے اپنے بازوؤں میں سنبھالے۔"

اس شام وہ دونوں بورڈنگ سے نکل کر اس مکان کی طرف سیر کے لیے نکل گئے جہاں راجونتی کا گھر تھا تاکہ قریب سے راجونتی کو دیکھیں۔

راجونتی چودہ سال کی لڑکی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا لیکن نقوش جاذبِ نظر تھے نگاہوں میں عجیب دیوانگی سی تھی اور انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے محبت کی دنیا کے طور طریقے سے بھی واقف ہو جیسے کوئی دہلیز پر کھڑا ہو اور زندگی کے آنگن میں داخل ہونے کے لیے بیتاب ہو۔

واپسی پر ایلی کو سوجھی۔ "یار ایک بات کہوں بڑا مزا رہے گا جو تم مان جاؤ تو۔"

اس روز انہوں نے مل کر سازش کی کہ کسی طرح بابا کو یہ غلط فہمی دے دی جائے کہ لاجوتی اسے دیکھنے کے لئے کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے۔ چونکہ بابا جس ڈرمیٹری میں رہتا تھا وہاں سے بھی لاجوتی کا مکان صاف دکھائی دیتا تھا۔

اس مذاق کی وجہ یہ تھی کہ ایلی بابا کی باتیں سن کر تنگ آ چکا تھا۔ بابا یوں بات کیا کرتا تھا جیسے ہر جوان لڑکی اس پر ریجھی ہوئی ہو۔ اسے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ منہ پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں اور جوان لڑکیاں بھلا بابا سے کیسے محبت کر سکتی ہیں۔

چند ہی روز میں ایلی نے بابا کو یقین دلا دیا تھا۔ کہ لاجوتی اس پر دل و جان سے فدا ہو چکی ہے اور اس کے لئے ہر وقت کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے۔

اس کے بعد بابا روز ایلی کو لاجوتی کے قصے سنایا کرتا تھا۔ اور ایلی سمجھتا کہ بابا نے ایک سنہری سی دنیا بسا رکھی ہے۔ جسے حقائق سے کوئی تعلق نہیں اس لئے وہ بابا کے قصے یوں سنا کرتا تھا جیسے طوطا مینا کی کہانیاں ہوں اس نے انہیں کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ دل ہی دل میں وہ بابا کی حماقت پر ہنسا کرتا تھا پھر ایک روز رات کے نو بجے کے قریب بابا ایلی کے پاس آیا۔ اس وقت خوب بنا ٹھنا ہوا تھا۔

"ارے" ایلی نے کہا "آج تو دولہا بنے ہوئے ہو۔"

"ہاں یار۔ آج وہاں جانا ہے نا۔ اس لئے میں نے کہا ذرا اچھے کپڑے پہن لوں۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"بھئی وہیں" بابا بولا۔ اس نے اشارہ کر کے کہا۔

"وہاں کہاں؟"

"لاجوتی نے بلایا ہے۔" بابا نے اس کے کان میں کہا۔

"ارے ـــــــ" علی کو بھولی ہوئی الجوتی یاد آ گئی۔ "اس نے بلایا ہے۔"

"ہاں" وہ بولا "بیچاری کتنے دنوں سے بیمار ہے۔ کہتی ہے گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں وہ اکیلی ہے۔"

"ارے" علی سمجھ رہا تھا کہ بابا ویسے ہی گپ چلا رہا ہے۔ "یہ شاید الجوتی سے جل رہی ہو۔"

"ذرا میرے ساتھ چلو گے۔" بابا نے کہا "وہاں تک۔"

"کیوں؟"

"ایسے موقعے میں ساتھی ہو تو اچھا رہتا ہے۔ صرف مکان تک چلنا پھر چلے آنا۔" بابو نے کہا۔

"کب" علی نے حیرت سے پوچھا۔

"ابھی اور کب۔"

"ابھی ـــــــ!" علی نے حیرانی سے بابا کی طرف یوں دیکھا ـــــ جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ وہ دونوں چل پڑے۔ علی سمجھ رہا تھا کہ شاید بابو کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ چپ چاپ چلتے گئے۔ علی دل ہی دل میں بابو کی سادہ لوحی پہ ہنس رہا تھا۔

الجوتی کے مکان کے پیچھے وہ دونوں رک گئے۔ بابا نے کھڑے ہو کر سگریٹ سلگانا شروع کیا۔ بابو نے ایک ایک دو ماچس جلائی تو آہستہ سے مکان کا دروازہ کھلا۔ ہاتھ میں لالٹین تھامے الجوتی دروازے میں کھڑی تھی۔ "اچھا بھئی۔" کہہ کر بابو اندر داخل ہو گیا ـــــ اور علی حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔

ونڈو وینڈرز

وہاں سے واپس آتے ہی علی شام کی طرف گیا۔ وہ شام کو الجوتی اور بابو کی

ملاقات کا قصہ سنانے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ ڈارمیٹری میں شام سے دکھائی نہ دیا تو اس نے گوبند اور پریم سے پوچھا کہ شام کہاں ہے۔

"یہیں تو تھا ابھی۔" وہ بولے۔ "شاید کسی دوسری ڈارمیٹری میں بیٹھا گپیں ہانک رہا ہو۔" علی دیر تک ڈارمیٹریوں میں گھومتا رہا۔ جب وہ باہر آنے لگا تو رستے میں ایس۔جی مل گئے۔

"کسے تلاش کر رہے ہو؟" وہ بولے۔

"شام کو ڈھونڈ رہا ہوں۔" علی نے کہا۔ "کہیں چھٹی پر تو نہیں گیا۔"

"نہیں وہ تو حاضر ہے۔" وہ بولے "وارڈن کہہ رہا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے اور وہ سو گیا ہے۔"

"اوہ" علی بولا "طبیعت خراب ہے۔"

ایس۔جی کے جانے کے بعد وہ پھر سے شام کی ڈارمیٹری میں داخل ہوا۔

"شام کہاں ہے۔" اس نے وارڈن سے پوچھا۔

"اس کی طبیعت اچھی نہیں۔" وارڈن نے جواب دیا "سو گیا ہے۔"

علی شام کی سیٹ کی طرف جانے لگا تو وارڈن نے اس کی بانہہ پکڑ لی۔ "نہیں یار" وارڈن منت سے بولا "اسے نہ جگاؤ۔ مشکل سے آنکھ لگی ہے۔"

علی باہر نکل گیا لیکن باہر آتے ہی اس نے محسوس کیا جیسے کوئی بات ہو۔ کہیں شام نے کچھ کھا تو نہیں لیا۔ شاید زرد دوپٹے والی منگیتر کی وجہ سے وہ رک گیا۔ وہ پھر سے دبے پاؤں شام کی ڈارمیٹری کی طرف چل پڑا۔ اب کی بار وہ اس کی سمت سے داخل نہ ہوا جدھر وارڈن کی سیٹ تھی بلکہ پرلی طرف داخل ہو کر دبے پاؤں شام کی سیٹ کی طرف چلا گیا ____ چارپائی کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ واقعی وہ تو سو رہا ہے۔ اس نے سوچا۔ خواہ مخواہ تنگ کرنے کا فائدہ۔ نہیں میں نہیں جگاتا اسے۔ وہ چارپائی کے قریب تر ہو گیا۔ پھر اس نے جانے کس خیال سے سرہانے کی طرف سے

چادر کا پلو تھا دیا۔ رے وہ چھو نچکارہ گیا۔ بستر میں شام نہیں تھا۔ چارپائی پر چادر تھے وہ رکوٹ ور جسے گیا گیا یوں رکھا ہوا تھا جیسے کوئی سویا ہوا ہو۔

جب میں اپنے کمرے میں پہنچا اس وقت تقریباً بارہ کا وقت تھا۔ ان دنوں جی کے ور میں اپنے کمرے کو چھوڑ کر بورڈنگ سے ہسپتال کے ن ڈور وارڈ میں رہتے تھے۔

یک روز فٹ بال کھیلتے ہوئے جی کے زیر پے تھا ور س کی تین ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ورڈ کٹر نے اس کی ٹانگ کو پلستر کر دیا تھا۔ چونکہ بورڈنگ ور کالج کے تمام لڑکوں سے جی کے مراسم تھے ہذا ان کے کمرے میں اکثر بھیڑ لگی رہتی تھی لڑکے اس کی عیادت کو آتے تھے ہر وقت کوئی نہ کوئی جی کے پاس بیٹھا رہتا تھا اس بات کو محسوس کر کے ا۔ جی نے خود نہیں کہا تھا کہ وہ ان ڈور وارڈ میں چلے جائیں تو ان کے لئے آسانی رہے گی۔

ن ڈور وارڈ بورڈنگ کے ساتھ ملحق تھا لیکن وہ بورڈنگ سے الگ سمجھا جاتا تھا۔ وارڈ میں رہنے والے ان تمام پابندیوں سے مبرا تھے جو بورڈنگ میں رہنے والوں پر عائد تھیں۔ مثلاً بورڈنگ میں دس بجے باقاعدہ حاضری لگتی تھی اور پھر باہر کے دروازے مقفل کر دیئے جاتے تھے اور لالہ جی کی اجازت کے بغیر کوئی شخص نہ تو باہر جا سکتا تھا اور نہ اندر داخل ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بورڈنگ میں مہمانوں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ ان ڈور وارڈ میں یہ پابندیاں نہ تھیں۔ وارڈ کا ایک دروازہ باہر کھلتا تھا۔ اس سے وہ باہر جانے یا اندر آنے کے لئے قطعی طور پر آزاد تھے۔ اور باہر کے مہمان بے روک ٹوک ان کے پاس آ سکتے تھے۔

یہ وارڈ ایک فراخ ہال کمرہ تھا جس میں متعدد کھڑکیاں اور دروازے تھے سکی ساخت ڈارمیٹریوں سے مختلف تھی۔ دراصل یہ ایک نیا ونگ تھا جو حال ہی میں بنایا گیا۔ اور چونکہ ابھی بڑی انتظامات مکمل نہ ہوئے تھے اس لئے نہ تو وہاں کوئی نرس تھی

تھا۔ کمرہ صرف چار ایک خان بیڈ پڑے ہوئے تھے۔ البتہ جی کے اور ایلی نے اپنا تمام سامان کتابیں صندوق چارپائیاں میز کرسیاں وہاں منتقل کر دی تھیں۔

چونکہ جی کے ڈیڑھ ماہ سے صاحب فراش تھا اس لئے کالج اور بورڈنگ کے لڑکے اکثر عیادت کے لئے وہاں آ جایا کرتے۔ سارا سارا دن وہاں تاش کھیلی جاتا کیرم چلتا۔ شطرنج کی بازیاں کھیلی جاتیں۔ اس طرح وہ کمرہ کامن روم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا کہ یہ کامن روم جہاں ہر وقت دھما چوکڑی رہتی۔ اور جہاں شور مچانا اور دنگا فساد کرنا قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا تھا۔

وارڈ میں منتقل ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ ایلی کو ہر وقت بورڈنگ میں داخل ہونے یا وہاں سے باہر جانے کی اجازت مل چکی تھی۔ دروازے پر بیٹھا ہوا چوکیدار اسے دیکھ کر آپ ہی آپ اٹھتا اور بغیر پوچھے آہنی دروازہ کھول دیتا۔ شام کی ڈرمیٹری سے نکل کر جب وہ باہر آیا تو چوکیدار نے حسب معمول دروازہ کھول دیا۔ اس وقت گیارہ بجے تھے جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو بتی جل رہی تھی اور جی کے گدے پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے لکھنے کا پیڈ پڑا تھا اور قلم ہاتھ میں تھا۔

وہ چپ چاپ اپنے بستر کی طرف بڑھا۔ بستر جھاڑتے ہوئے اس نے جی کے سے پوچھا۔

”کیا لکھ رہے ہو؟“

جی کے نے کوئی جواب نہ دیا۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں۔“ ایلی نے کہا۔

کوئی جواب نہ پا کر وہ مڑا۔ جی کے کے قریب گیا۔ جی کے اسی طرح بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ بڑی محنت کر رہا ہے بیچارہ۔ ایلی نے سوچا۔

دفعتاً اس کی نگاہ پیڈ پر پڑی عنوان کو دیکھ کر وہ چونک کر رہ گیا۔ لکھا تھا میری پیاری سفینہ۔ سفینہ۔ ارے سفینہ کون تھی اور پھر پیاری جی کے اور پیاری۔ یہ کیسے ہو سکتا

نے یلی جی کے کے سب قریبی رشتہ داروں کو جانتا تھا۔ جی کے کی ہمشیرہ وہ سب
کے نام معلوم تھے۔ لیکن یہ سفینہ کون تھی۔ کیا جی کے بھی کسی کی محبت میں گرفتار تھا۔
نہیں نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اسے لڑکیوں سے محبت کرنے کے شغل سے سخت نفرت
تھی وہ محبت کا مذاق اڑایا کرتا تھا اور اسے ہوس سے تعبیر کرتا تھا۔ صراط مستقیم پر چلنے
والا شخص کسی کو میری پیاری سفینہ لکھے ایک حساب دان۔ ایک اصولی آدمی۔ نہیں یہ
نہیں ہوسکتا شاید یہ خط کسی عزیز کو لکھا ہو۔ ایلی نے پیڈ اٹھالیا اور باہر نکل گیا تاکہ
چھپ کر اسے پڑھ سکے۔
واقعی وہ ایک محبت بھرا خط تھا۔ جی کے اور یہ جذبات! ایلی حیرت سے اس سوئی
ہوئی گٹھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا سمجھے کیا جی کے کی
وہ شخصیت جس سے ایلی واقف تھا محض ایک بہروپ تھی۔
ایلی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ابھی اسے انسانی کردار کے تضاد کا شعور نہ تھا۔
اس نے پیڈ کو رکھ دیا اور سوچ بچار میں کھو گیا۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں
اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ پھر وہ چپکے سے باہر نکل گیا۔
وہ برگد کے درخت کے نیچے ساوی کھڑی ہنس رہی تھی۔ "ڈومہاراج جی
گیٹ لوسٹ" وہ مسکرانے لگی۔ ایلی نے ماچس کا ڈبہ ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ سگرٹ
ہونٹوں میں دبا رکھا تھا جسے سلگانا وہ بھول گیا تھا۔
ساوی نے اس ان سلگے سگرٹ کی طرف دیکھا۔ "سگرٹ خود گا ئیں گے مہا
راج یا میں لگا دوں۔" وہ مسکرائی۔ ایلی چونکا۔ اس کو وہ رات یاد آگئی جب وہ سفید منزل
کی سیڑھیوں میں ضد کئے بیٹھا تھا کہ ساوی خود سگریٹ سلگا کر دے۔
"تو جانے۔" ساوی بولی "کوئی ایسا ضدی بھی نہ ہو۔"
ایلی نے سگریٹ سلگایا اور پھر کالج کی طرف چل پڑا۔
کالج کی عمارت چاندنی میں چمک رہی تھی۔ عمارت کی چھت پر چیڑ دکھڑی

تھی۔ ارے وہ ٹھہر کر رکا۔ قریبی کاٹیج کی چھت پر کوئی تھا۔ نہ جانے کون ہے۔ کوئی ہوگا اس نے سوچا۔ شاید چوکیدار ہو۔ وہ گھبرا گیا کاٹیج کا چوکیدار بہت سخت آدمی تھا۔ وہ پرنسپل کو رپورٹ کرنے سے نہ چوکتا تھا۔ اسی وجہ سے لڑکے رات کے وقت ادھر آنے سے ڈرتے تھے۔

ایلی نے اپنا رخ بدل لیا۔ وہ مغربی سمت کو چل پڑا جس طرف کاٹیج کا لان تھا۔ اس وقت سارا لان چاندنی میں جگمگا رہا تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ کسی بنچ پر بیٹھ کر اس پھیلی ہوئی چاندنی کو دیکھے جو اسے سادی اور شہزاد کی یاد دلا رہی تھی لیکن لان میں جانا خطرناک تھا۔ اوپر سے چوکیدار نے دیکھ لیا تو۔ لان میں کوئی بنچ بھی تو نہ تھا۔ تمام بنچ لڑکوں نے لان سے اٹھا کر اس سے ملحقہ باغ میں رکھ دیے تھے جہاں بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں۔ ایلی ان جھاڑیوں کی طرف چل پڑا۔

دفعتاً وہ رکا۔ ان جھاڑیوں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ محتاط ہو گیا اور ایک پودے کے پیچھے چھپ گیا۔

''بھگوان کی سوگند میں زہر کھا لوں گا۔'' کوئی چلا رہا تھا۔ ''میرے پاس ہے۔ میرے ٹرنک میں پڑی ہے۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ صبح آؤ گی تو دکھا دوں گا۔''

''زہر ـــــ ٹرنک ـــــ ارے'' ایلی نے شاید آواز پہچان لی۔ شاید یہ ـــــ مگر یہ ساتھ کون ہے۔ ایلی پیچھے سے کھنچ گیا تاکہ کسی کو نظر نہ آئے کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر آواز آئی ـــــ ''بس اس قصے کا یہی انجام ہوگا ـــــ اور ـــــ''

آواز یوں دفعتاً بند ہو گئی جیسے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

''ایسی باتیں مت کیجئے۔'' کوئی بولی۔

''تو کیسی باتیں کروں۔''

''پیار کی باتیں۔''

''اس پیور نے پنڈولیم نکال دیا ہے۔''

''کیوں۔'' وہ بولی۔

شام ہنسا ''بس صبح شام مصروف رہتے ہیں۔ پڑھنے کی فرصت کسے ہے۔ ورنہ جگنو بن جانے امتحان میں تتلی کا نمبر آئے گا مرغی کا نہیں۔''

ایلی ہنسنے لگا۔ تتلی شام ہے اس نے سوچا۔

وہ ہنسی۔

''لیکن مجھ پر وہ نہیں۔'' شام نے کہا۔ ''چاہے تتلی مرغی کاٹنے پر اگر تم نے ایسی بے پروائی کی تو پھر ____''

''اونہوں'' وہ بولی ''پھر وہی بات۔''

''جگنو بن جانے میں جھوٹ ____''

اس کی بات ادھوری رہ گئی باغیچے میں خاموشی چھا گئی ہر طرف خاموشی ایلی نے محسوس کیا کہ اسے وہاں سے چلے جانا چاہیے وہ اٹھ بیٹھا اور بے پروائی سے باہر آ گیا پھر وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑا کمرے میں پہنچ کر اس نے بجلی بجھا دی اس کے دل میں ایک عجیب طوفان مچا ہوا تھا۔ اس نے] پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ سب اپنی اپنی دھن میں کھوئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی اپنی ڈفلی بجا رہا تھا۔ اپنی مراد کی دھن پر ناچ رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے اس قدر قریب تھے۔ لیکن پھر بھی دور ____ بہت دور ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی ایک کو دوسرے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ رات ایلی کے لئے گویا کشف حیات کی ایک رات تھی غالباً اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ اس مڈر بینڈ میں بیس کی حیثیت رکھتا ہے اور ایلی بذات خود ایک مڈر بینڈ تھی۔

پہلا سبق

امتحان کے قریب آنے پر لڑکوں کے پریکٹیکل لیسنز شروع ہو گئے اور سبق کی تیاری میں مصروف ہو گئے پھر انہیں پریکٹیکل کے لئے مختلف سکولوں کی جماعتیں مل

گئیں جہاں انہیں بچوں کو ایک مہینے کے لئے عملی طور پر پڑھانا تھا۔

بی ٹی اور سی ٹی کے طلبہ کی ڈیوٹیاں مختلف سکولوں میں لگ گئیں۔ کسی کو دور دراز کے مدرسے میں متعین کر دیا گیا کسی کو بھاٹی دروازے اور کوئی شیرانوالے بھیج دیئے گئے۔ ان تعیناتیوں کی وجہ سے کالج کی زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ کالج لان کی جھاڑیوں میں رکھی ہوئی تمام بنچیں ویران ہو گئیں۔ جماعتوں کے کمرے خالی دکھائی دینے لگے۔ بورڈنگ میں آنے جانے اور ملنے ملانے کے اوقات اور بورڈنگ کے معمولات بالکل بدل کر رہ گئے۔

خوش قسمتی سے ایلی کی ڈیوٹی سنٹرل ماڈل سکول میں لگ گئی جو کہ ہوسٹل کے متصل واقع تھا۔ اس بات پر اسے بے حد خوشی تھی۔ اس کے علاوہ سنٹرل ماڈل سکول لاہور کے تمام سکولوں میں ایک معیاری سکول مانا جاتا تھا۔ وہاں کے اساتذہ جدید طریقہ تعلیم سے واقف تھے اور بچے بہت ذہین سمجھے جاتے تھے۔

پہلی مرتبہ جب ایلی سنٹرل ماڈل سکول کی جماعت میں داخل ہوا تو کلاس ٹیچر نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور لڑکے ایک دوسرے کو کہنی مار کر ہنسنے لگے۔

کلاس ٹیچر ایک بھاری اور بھدے جسم کا شخص تھا۔ اس کے ماتھے پر ایسی شکن تھی جیسے پیشانی میں کھود دی گئی ہو۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرے پر بے حسی کا دبیز پردہ پڑا تھا۔ اور ہونٹ موٹے تھے۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی جسے وہ بار بار میز پر بجاتا تھا۔

"میں سنٹرل ٹریننگ کالج سے آیا ہوں۔" ایلی نے کہا "میرا نام الیاس ہے۔"

"ہوں" کلاس ٹیچر نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور ویسے ہی بیٹھا رہا۔ پیچھے لڑکوں کی ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ایلی نے ایک بار پھر ملتجیانہ نگاہ سے کلاس ٹیچر کی طرف دیکھا لیکن وہ جوں کا توں بیٹھا اسے گھورتا رہا۔

"تو مجھے کب سے کام شروع کرنا ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"ابھی۔" کلاس ٹیچر کی تیوری اور گہری ہو گئی۔

لڑکے قہقہے مار کر ہنس پڑے۔

اس پر کلاس ٹیچر کی توجہ لڑکوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس نے چھڑی اٹھا کر زور سے میز پر ماری۔ اور پھر تھو بیٹھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ غرایا۔

"کیا اسے اپنی تمیز داری کے متعلق کچھ علم ہے۔" ایلی نے سوچا۔

"ادھر آؤ وحید۔" وہ غرایا۔ "نیچے اترو۔"

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ بھی اس جماعت کا لڑکا ہو اور کلاس ماسٹر نے وحید کی طرح اسے بھی بنچ پر کھڑا کر رکھا ہو اور اب وحید کے بعد اس کی باری ہو۔ گھبرا کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا اور برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد کلاس ٹیچر باہر نکلا۔

"ہوں" وہ ایلی کو ڈانٹتے ہوئے بولا۔ "تو تمہیں ملی ہے یہ جماعت۔"

"جی" ایلی نے جواب دیا۔

"اور ایک ماہ میں تم اس کا ستیاناس کر دو گے؟"

ایلی محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ کہے گا۔ "نکالو ہاتھ۔"

"دیکھو" کلاس ٹیچر نے اسے پھر ڈانٹا۔ "کیا تمہیں علم ہے کہ ایک ماہ کے بعد مجھے تمہاری رپورٹ دینا ہو گی۔"

"جی۔" ایلی بولا۔

"اور اگر میں نے گندی رپورٹ دی تو تم فیل کر دیے جاؤ گے۔"

"جی۔"

"اگر مجھ سے اچھی رپورٹ لینی ہے۔" وہ بولا۔ "تو وعدہ کرو۔"

اس کے انداز میں اس قدر خلوص تھی کہ علی جھٹ بول اٹھا "جی کرتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں۔"

"وعدہ کرو کہ جو جو طریقے تعلیم کے تم نے سیکھے ہیں، وہ میری جماعت پر نہیں برتو گے۔ انہیں آج سے بھول جاؤ گے۔ وہ محض ہاتھی کے دانت ہیں۔"

علی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"یہ ڈنڈا ہے۔" کلاس ٹیچر چھڑی ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس کا استعمال فراخدلی سے کرنا ہوگا۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔" علی چلایا۔

"سبق رٹو کر یاد کرنا ہوگا چاہے سمجھیں یا نہ سمجھیں۔"

"جی۔"

"انہیں نتیجہ دکھانا ہے پڑھانا نہیں۔"

"جی اچھا۔"

"تو تم وعدہ کرتے ہو۔"

"جی کرتا ہوں۔"

"تو جاؤ پڑھاؤ۔" اس نے ڈرامائی انداز سے جماعت کی طرف اشارہ کیا۔

"بہت اچھا" کہہ کر علی چل پڑا۔

"ٹھہرو۔" وہ بولا ______ "تم ڈنڈا تو بھول گئے۔"

"اوہ۔"

کلاس ٹیچر نے چھڑی علی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کئی بار پھر سے ڈانٹا۔

"خبردار جو اسے بھولے۔ ورنہ تمہاری رپورٹ ______"

علی کانپتے ہوئے جماعت میں داخل ہو گیا۔

لڑکے کھڑے ہو گئے۔

''سٹ ڈاؤن'' علی نے کہا اور پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگا۔

لڑکے جوں کے توں کھڑے رہے۔

''سٹ ڈاؤن۔'' اس نے دہرایا۔

وہ ہنسنے لگے۔

''بیٹھ رہو، ہنسو۔'' وہ بولا۔

انہوں نے علی کو منہ چڑانا شروع کر دیا۔ جماعت سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ اس کونے میں گھڑی چل رہی تھی ٹک ٹک ٹک ٹک۔ ادھر چکی چل رہی تھی گھم گھم۔ گھم۔ گھم۔ پرلی طرف موٹر سٹارٹ ہو رہی تھی۔ ورہ وبول رہا تھا۔ کہیں مرغا اذان دے رہا تھا۔ بلیاں لڑ رہی تھیں۔

علی حیرت سے لڑکوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دیر تک وہ ان کی طرف دیکھتا رہا۔

پھر کلاس ٹیچر نے دروازے سے جھانکا۔

دفعتاً کمرے پر جیسے یک لخت خاموشی طاری ہو گئی۔

''تم لڑکوں کو پھر بھول گئے۔'' ماسٹر نے علی کو ڈانٹا۔ ''اور تم نے وعدہ کیا تھا۔ کیا تھا نہیں؟''

علی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم اچھی رپورٹ کے قابل نہیں ہو۔'' وہ بولا

پھر کلاس ٹیچر جس سرعت سے آیا تھا اسی سرعت سے چلا گیا۔

جماعت پھر سے آوازیں گونجنے لگیں۔

''فول۔ فول۔'' کوئی چلا رہا تھا اگرچہ سب کے ہونٹ بند تھے۔

''سلی۔ سلی۔ بوٹ ______ میاؤں دھپ۔ دھڑ ڑ ڑ م۔''

علی سر تھام کر کرسی میں بیٹھ گیا۔

جوں جوں امتحان قریب آتا جا رہا تھا کالج پر اداسی کا ایک دبیز پردہ پڑ رہا تھا۔ لڑکوں کی وہ خوش گپیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ لڑکیوں کے چہروں سے مسکراہٹیں مفقود ہوتی جا رہی تھیں۔ پروفیسروں کا رویہ حیرت انگیز طور پر بدل چکا تھا۔ اب وہ کالج کے لڑکوں سے یوں سلوک کرنے لگے جیسے وہ طالب علم نہیں بلکہ ہم کار ہوں۔

کونوں میں پڑے ہوئے بنچوں سے رنگین قہقہے سنائی دینے بند ہو گئے تھے۔ وہاں یا تو خاموشی چھائی رہتی اور یا کبھی کبھار چسکیوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہاں سے لڑکیاں باہر نکلتیں تو ایسے معلوم ہوتا جیسے روئی روئی ہوں۔

شام کی رنگین باتیں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ اس کی غصیلی بھنویں اور بھی بوجھل ہو گئی تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" علی شام سے پوچھتا۔ "تم وہ شام دکھائی نہیں دیتے۔"

"وہ شام ہو تو دکھائی دوں۔" وہ جواب دیتا۔

"تو وہ شام کیا ہوئی؟"

"شام ختم۔ اب تو رات پڑ چکی ہے۔ جدائی کی رات۔"

"ارے ستے ہی مر چلے ہو تم اس مہ جبین رادھا پر۔" علی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔

"شاید تم سمجھتے ہو مجھے معلوم نہیں۔" وہ چلایا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

شام نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تمہیں ہی کیا۔" وہ بولا۔ "سب کو معلوم ہے۔ سب جانتے ہیں حتیٰ کہ ہماری بیرڑی کا بھنگی بھی جانتا ہے۔ صرف تم دو ہیں۔ رادھا اور تم جو ابھی تک اپنے آپ کو فریب دیئے جا رہے ہیں کہ کوئی نہیں جانتا۔"

"ایک بات پوچھوں۔" علی نے کہا۔

"پوچھو۔" شام بولا۔

"رادھا میں وہ کونسی خوبی ہے۔ جو تمہیں پسند آ گئی ہے۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ اور پھر اپنی مست آنکھیں ایلی کی آنکھوں میں ڈال کر کہنے لگا۔

"صرف ایک۔ اور اس ایک خوبی پر ساری دنیا قربان کی جا سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ عورت میں بس یہی خوبی ہوتی ہے جس پر مرد مرتا ہے۔ تم تو نفسیات پڑھتے ہو۔ تمہیں تو جاننا چاہیے۔ باقی جو ناک نقشے اور رنگ کی بات ہے۔ سب باتیں ہیں۔ منہ زبانی باتیں۔"

"کیا واقعی وہ محبت کرتی ہے تم سے۔ سچی محبت۔"

"سچی محبت کا تو اسے خود کو پتہ نہیں اتنا پیار کرتی ہے۔ جیسے ماں بچے کو پیار کرتی ہے۔ اس عمر میں ماں مل گئی اور مجھے کیا چاہیے۔"

"تو کیا ماں کی تلاش تھی تمہیں۔"

"سبھی کو ہوتی ہے۔ کیا تمہیں نہیں!" وہ ہنسنے لگا۔ "یار یہ فلسفہ چھوڑو۔ مجھے تو غم کھائے جا رہا ہے اب میں کیا کروں گا۔ ہم کیسے دن گزارا کریں گے۔ پرماتما کرے ہم دونوں فیل ہو جائیں۔"

شامی کی باتیں عجیب تھیں۔ اس کی شخصیت میں عجب مٹھاس تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمام باتیں بآسانی کہہ سکتا تھا جو ایلی کے دل میں بھی تھیں لیکن وہ انہیں زبان پر لانے یا اپنے آپ سے اظہار کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ ڈرتا تھا غالباً اسی وجہ سے ایلی کو شامی سے محبت تھی۔

اس روز شامی کی بات سن کر ایلی نے محسوس کیا جیسے اس نے ایلی کے دل کا راز فاش کر دیا ہو۔ جیسے وہ ایلی کے اس راز سے کماحقہ واقف ہو اور اس بات کو اچھی طرح جانتا ہو کہ ایلی کو شہزاد سے کیوں محبت تھی۔ اور وہ ایلی کا راز فاش کر رہا تھا۔

روح کا تو وہ محض بہانہ تھا۔

یلی کو پسینہ آ گیا۔ اس کی زبان بند ہو گئی اس کے بعد نہ جانے شاہ کیا کہہ رہا تھا۔ شاید سرسری جسم کی تعریف کر رہا تھا۔ یا اس کے جسم کے خم و پیچ کی بات کر رہا تھا۔ یلی کے روبرو اس وقت شہزاد کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ کہہ رہی تھی۔

''میں نے اس سودے میں کچھ پایا نہیں کھویا ہے۔ ایلی میں نے اپنا آپ کھو دیا ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ میں اپنے آپ سے گئی ہوں۔ ایک تم ہو جس نے آج تک اس بات کو نہیں پایا۔''

جی۔ کے کی زندگی ٹھیک ہو چلی تھی لیکن وہ ابھی تک اسی کمرے میں مقیم تھے۔ اب آخری دم میں کمرہ بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیماری کے دم میں جی کے کی جذباتی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔

جس روز سے یلی نے اس کا محبت نامہ پڑھا تھا جی کے کے متعلق یلی کا نقطہ نظر ہی بدل گیا تھا پہلے اس کا خیال تھا کہ جی کے جذبات سے تہی طور پر عاری ہے۔ دوستوں سے تو وہ کثرت سے عام طور پر اظہار محبت کرتا تھا لیکن یلی کے اندازے کے مطابق وہ لڑکیوں سے محبت کرنے کا اہل نہ تھا چونکہ بنیادی طور پر وہ خود پسند شخص تھا۔ اور جو اس حد تک خود پسند ہو یلی کے خیال کے مطابق وہ کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن خط پڑھنے کے بعد یلی کے مفروضات کا محل دھڑام سے گر چکا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا بہرحال اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ جی کے کے دتے بدلتے موڈ در حقیقت اس راز کی وجہ سے تھے جسے وہ یوں سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ نہ جانے وہ کون لڑکی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں رہتی تھی۔ نہ جانے وہ دونوں کبھی ملتے بھی تھے یا نہیں۔ البتہ ایک بات اس خط سے واضح تھی کہ جی کے اپنی محبوبہ کے سامنے سرنگوں ہونے کا قائل نہ تھا۔ اس کے انداز میں پامردگی نہ تھی لیکن اس کے باوجود جی کے کے جذبات کی شدت دیدنی تھی۔

جس روز وہ ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تھے ایلی کے منہ سے بات نکل گئی۔

"جمیلے۔" وہ بولا۔ "مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہاری زندگی میں دکھ کا عنصر اس حد تک حاوی ہے میں سمجھتا رہا کہ تمہارا رویہ بدمزاجی کا شاہد ہے۔"

اس پر جی کے کی ناک یوں تن گئی جیسے کسی نے نکو رنگاں دی ہو لیکن وہ خاموش رہا۔

"پہلے مجھے تمہاری محبت کا علم نہ تھا۔" ایلی نے کہا "لیکن اب میں جانتا ہوں کہ تم دکھی ہو۔"

"نہیں نہیں۔" جی کے سنجیدگی سے بولا۔ "میرے دکھ کو چھوڑو۔ مجھے تو صرف یہ دکھ ہے کہ وہ دکھی ہے۔ اس کے دکھ کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا اور ______ اور ______" جی کے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اس کے سے محرومی کے سوا کچھ نہیں کچھ نہیں۔ مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔"

اس وقت وہ سامان باندھ رہے تھے۔

"کب سے دکھی ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"ازل سے" وہ بولا۔

"ازل سے!"

"ہاں۔ ازل سے۔" جی کے نے بڑے دکھ سے کہا۔ صدیاں گزر گئیں۔ صدیاں۔ اب تو اس بیچاری کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئی ہیں۔ ایک ڈھانچہ رہ گیا ہے اور وہ صرف اسی سے جی رہی ہے۔ صرف ایک آرزو۔ ایک امید کی زور پر۔" جی کے کے منہ سے ایک سسکی سی نکل گئی اور وہ غسل خانے کی طرف دوڑا۔ غالباً وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس عالم میں دیکھے۔

علی حیرت سے اس کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ زندگی کس قدر عجیب ہے۔ کردار کتنے عجیب تھے اور اس کے سوچے ہوئے خیالات اور پڑھی ہوئی باتیں اور سمجھے ہوئے اصول کس قدر غلط تھے۔

باہر میدان میں برگد کے پتے جھڑ رہے تھے۔ زمین خشک پتوں سے بھری تھی۔ درخت کے تنے کے ساتھ لگ کے اسفند ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری ملامت تھی۔ سامنے برآمدے میں کلاس ٹیچر چھڑی سنبھالے کھڑی تھی۔

علی نے محسوس کیا جیسے وہ سب بے بس اپاہج ہوں۔ نہ جانے وہ کون تھی جس نے کلاس ٹیچر کے ماتھے پر تیوری کندہ کر دی تھی جس نے اسفند کو چپ بخش دی تھی نہ جانے وہ کون تھی جس نے کے جی کے ٹاٹ کو دھار دے دی تھی۔ دور کوئی چیخ ہونک رہی تھی۔ مممممہ!

سیس توبیا

گاڑی میں بیٹھے ہوئے علی ایک انجانی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد وہ شہزاد کے پاس جا رہا تھا۔ وہ شہزاد ہوٹل والی جو صرف اس لئے بیٹھی تھی کہ اسے علی کے آنے کا انتظار تھا۔ علی کو بار بار شام کی بات یاد آ رہی تھی۔ عورت میں صرف ایک خوبی ہوتی ہے صرف ایک کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اس ایک خوبی کے لئے مرد اسے چاہتا ہے۔

ہوں۔ شام سچ کہتا تھا۔ عورت میں صرف خوبی ہوتی ہے۔ لیکن شہزاد میں تو بیسیوں خوبیاں ہیں۔ وہ اتنی دیر سے علی کا انتظار کر رہی ہے۔ اس سے محبت کر رہی ہے۔ بے لاگ محبت جس میں ہوس کا عنصر نہیں اور اس نے اس محبت کے لئے سب کچھ کھو دیا ہے۔ کچھ پانے کی امید نہیں۔ اس میں حسن ہے رنگینی ہے جرأت ہے۔ کتنی جرأت ہے اس میں۔ علی کے لئے وہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے لوگوں کی جلی کٹی باتیں سننے کے لئے تیار ہے۔

ایلی کے دل میں شہزاد کے لئے نئے جذبات ابھر رہے تھے۔ وہ شہزاد کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کھڑکی سے باہر ہرے بھرے کھیت دوڑ رہے تھے۔ دور پہاڑوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں اور ان کے اوپر نیلا آسمان پھیلا تھا۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جب وہ براتیوں کی حیثیت سے شہزاد کو لا رہے تھے۔ جب شہزاد زنانے ڈبے میں سبز گٹھڑی بنی بیٹھی تھی اور محلے کے لڑکے باری باری زنانے ڈبے کی طرف جاتے تھے اور بہانے بہانے ان سے بات کرنے کی کوشش کرتے تھے اور دعائیں مانگتے تھے کہ اس سبز گٹھڑی کے پٹ کھل جائیں اور وہ ایک جھلک دیکھیں صرف ایک جھلک ____ اس روز بھی گاڑی سرسبز میدانوں میں بھاگ رہی تھی اور دور پہاڑیوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں جن پر نیلا آسمان تنا ہوا تھا۔

اس سفر کو بیتے ہوئے آج بارہ برس ہو چکے تھے۔ بارہ برس۔ اب شہزاد چار بچوں کی ماں تھی مگر اس کے انداز کی رنگینی میں ذرا فرق نہ آیا تھا۔ اس کا چہرہ ویسے ہی جاذب نظر تھا۔ اس کے ماتھے کا تل ویسے ہی روشن تھا۔ اس کا جسم ویسے ہی خم و پیچ سے بھرپور تھا۔ آنکھیں اسی طرح مدھ بھری تھیں۔ ناچتی تھیں۔ ایلی کو شہزاد کا قرب حاصل ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ دس سال سے شہزاد نے اسے آنکھوں پر بٹھا رکھا تھا۔ اور صرف یہی نہیں دس سال سے اس نے اسے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اب تو بات اتنی پرانی ہو چکی تھی کہ لوگوں نے اسے تسلیم کر لیا تھا اور وہ تھک کر خاموش ہو گئے تھے۔

لیکن ایلی مسلسل دس سال سے شہزاد سے شاکی رہا تھا۔ اسے شکوہ تھا کہ شہزاد اس کے قریب نہیں آتی۔ اس سے دور رہتی ہے۔ اس سے صرف کھیلنا مقصود ہے جیسے ایلی کھلونا ہو۔ ایلی کا خیال تھا کہ شہزاد کو صرف ایلی کے اس جذبے کو قائم رکھنے کا شوق ہے جو اس کے دل میں شہزاد کے لئے موجزن تھا اس سے بڑھ کر خود ایلی سے کوئی

دلچسپی نہیں۔ یلی سوچ رہا تھا۔ ہاں۔ واقعی اس نے شہزاد کی محبت کی قدر نہیں کی بلکہ اسے کبھی تسلیم تک نہیں کیا۔ اور وہ ہمیشہ اس بات کا کوشاں رہا کہ اس سے جسمانی قرب پیدا کرے۔

پھر شادی کے آنے کے بعد یلی نے دفعتاً محسوس کیا تھا کہ شہزاد اس کی محبت میں اس کی زندگی میں رکاوٹ ہے۔ اور اس وجہ سے اس کی زندگی نارمل نہیں رہ سکتی۔ شادی سے میل ملاپ کے بعد اس نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ ایک شادی شدہ عورت سے محبت کرنا عظیم بدقسمتی ہے۔

لیکن یلی سوچنے لگا اس میں شہزاد کا کیا قصور کہ وہ شادی شدہ تھی۔ شہزاد نے تو اس کا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ خود یلی نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور ہاتھ تھامتے ہوئے تو اس کو احساس نہ تھا کہ اسے شہزاد سے محبت ہے اس وقت تو محض ہوس کی وجہ سے اس نے ہاتھ تھاما تھا۔ مدعا کہ اس کا کوئی مقصد نہ تھا۔ صرف ایک حسین عورت کا قرب۔ اور وہ قرب اسے حاصل ہو گیا تھا۔ اب وہ صرف اس لیے دکھی تھا کہ وہ شہزاد کو علیحدہ پانا چاہتا تھا۔ یہ تو ایک ناممکن خواہش تھی اور چونکہ پوری نہ ہو سکتی تھی لہٰذا اسے آتش رقابت میں جلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ شہزاد کے نقاب بکھرے ہوئے تاروں کو گنا کرتا تھا۔

یلی کو ان باتوں پر زہر خود ندامت ہو رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے شہزاد کی قدر نہیں کی۔ اس کی محبت کی قدر نہیں کی۔ اس کی قربانی اور جرأت کی قدر نہیں کی۔

"نہیں نہیں۔ اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ وہ بیوی ہے بیوی۔ وہ میرا کام ہے سے منانا۔ اس کے آگے سیس نوانا۔"

ہاں ہاں۔ اب میں اس کے پاس پہنچ لوں اب کی بار ________

مجھے کامیڈ ت ویر ت پڑ تھا۔ غالباً محلے کے لڑکے دوسری طرف کھیل رہے تھے

عورتیں غالباً گرمی کی وجہ سے اپنے اپنے مکانات کی چھتوں پر جا چڑھی تھیں۔ اس
وقت غالباً 9 بجے ہوں گے لیکن گرمیوں میں رات کے 9 بجے تک تو میدان میں چہل
پہل رہا کرتی تھی۔

علی نے اوپر کھڑکیوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ رابعہ کی کھڑکی بند تھی۔ اوپر کے
چوبارے کی کھڑکی کھلی تھی۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ جب وہ چھتی گلی میں داخل ہوا تو
مائی نخی کی آواز سن کر وہ ٹھٹھک گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں کوئی نہیں۔ مائی نخی اتنی لاغر
اور نحیف تھی کہ چھتی گلی کے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی وہ علی کو دکھائی نہ دی تھی۔

"کون ہے؟" مائی نخی نے پوچھا۔

"میں ہوں۔" علی نے سوچے بغیر جواب دیا۔

"میں کون۔" اس نے پوچھا۔

"علی۔" وہ بولا۔ "سلام کہتا ہوں۔"

"اچھا تو علی ہے۔" اللہ تجھے خوش رکھے۔ تیرا گھر آباد ہو۔ بیٹے۔ آج کی رات تو
بڑی دیر سے آیا ہے تو خیر سے تو ہے نا۔"

"ہاں ہاں۔"

"پھر اچھا کیا دیر سے آیا تو۔ یہاں روز آ کر کیا کرنا ہے تو نے۔ لڑکے اپنے کام
پر ہی اچھے لگتے ہیں۔ اچھا ہوا جو دیر سے آیا تو۔ جان چھٹی تیری۔ اس دلدل میں
پھنس کر تو نے کیا لینا تھا۔ خواہ مخواہ۔ اس کے تو لچھن ہی ایسے ہیں۔"

"علی اس کی بات سن کر چونکا۔ نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ علی نے اس کے بے
معنی باتوں سے مخلصی پانے کے لیے بات کا رخ بدلا۔"

"تو تو خیریت سے ہے ماں۔"

"اللہ تیرا بھلا کرے بیٹا میرا ______"

"اچھا تو کل ملوں گا ماں۔" یہ کہہ کر وہ چل دیا۔

لیکن وہ دروازے کس کی بات یاد کر رہی تھی کس کے بچپن کی بات کر رہی تھی۔ وہ

ور دیر سے آنے کا کون سا دن وہ جتا رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

آگئے مہاراج

رجو کا چوبارہ مقفل تھا۔ شہزاد کو حیرت سے ڈالنے کے لئے وہ دبے پاؤں اوپر چڑھنے لگا ____ اوپر پہنچ کر وہ رک گیا اور چوبارے کا جائزہ لینے لگا۔ اندر شہزاد چوکی پر بیٹھی تھی۔ اس کے قریب ہی صفدر ڈائل بیٹھا تھا۔ صفدر نے اپنی آنکھیں شہزاد پر گاڑ رکھی تھیں۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تبسم تھا۔

ایلی یہ منظر دیکھ کر ٹھہر گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے زینہ ہیٹ جب رہا ہو وہ مر جا رہا ہو۔ اس نے بصد مشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر آخری سیڑھی پر چڑھ کر روشنی میں آکھڑا ہوا۔

ایلی کو دیکھ کر صفدر گھبرا گیا اور فوراً سرک کر پیچھے ہو گیا۔ ایک ساعت کے لئے شہزاد کی آنکھوں میں تذبذب لہرایا ____ پھر وہ سنبھل کر بولی۔

"آگئے مہاراج۔" اس کی آواز میں خوشی کا عنصر نہ تھا۔

"جی آگئے۔" وہ بولا۔ غالباً اس کی آواز میں دھار تھی۔

"تو آجاؤ۔" وہ ہنسی۔

کتنی خوبصورت تھی وہ ہنسی!

ایلی سوٹ کیس اٹھائے اٹھائے فرحت کے گھر کی طرف نکل گیا۔

فرحت اور ماں سے باتیں کرتے ہوئے وہ مسلسل شہزاد کے چوبارے کی طرف دیکھتا رہا کہ وہ کب آکر اسے لے جائے۔

"اچھا تجھے کر بیٹھے کھڑوں۔ لو کب سے ادھر چائے کی پڑی ہے چلو چائے تو پی لو پہلے۔"

لیکن اس روز شہزاد فرحت کی طرف نہ آئی۔ البتہ اس کے آنے کے چند منٹ

پھر اسے خیال آتا کہ اب وہ چپ چاپ کھڑکی سے پھلانگ کر شہزادی کے
چوبارے میں آ رہا ہے۔ اب وہ دبے پاؤں اس کی چارپائی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب
اس نے شہزادی کو جگایا۔ شہزادی نے آنکھیں کھول دیں اور ______ اس خیال پر
ایلی تڑپ اٹھتا۔ آگ کا ایک شعلہ نہ جانے کہاں سے اٹھتا اور اس کے تن بدن کو اپنی
لپیٹ میں لے لیتا۔

ایلی دیوانہ وار اٹھتا۔ جی چاہتا کہ دیوانہ وار شہزادی کے چوبارے کی طرف اٹھ
بھاگے اور ان دونوں کے سرہانے کھڑا ہو جائے اور جب شہزادی اس کی طرف دیکھے تو
اس کے منہ پر تھوک دے اور پھر واپس آ جائے۔ دو ایک مرتبہ یہ دیوانگی اس شدت
سے مسلط ہوئی کہ وہ واقعی ادھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ پھر اسے خیال آیا اگر وہ
اکٹھے نہ ہوئے تو۔ اگر شہزادی اکیلی ہوئی تو۔ یہ ڈر اس کے لیے سوہان روح ہو گیا اور وہ
دعائیں مانگنے لگا۔ یا اللہ وہ اکٹھے ہوں۔ وہ کھڑکی پھلانگ کر آ چکا ہو۔

صبح سویرے حسب معمول شہزادی آئی مگر اس کے انداز میں نہ وہ شوخی تھی نہ
رنگینی۔ اس نے ایک نظر ایلی پر ڈالی اور پھر فرحت سے مخاطب ہو کر نہ جانے
کیا کہنے لگی۔ اندر سے ہاجرہ نکلی۔

”اے ہے۔“ وہ بولی۔ ”ایلی آیا ہوا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کیا۔ تو کل رات بھی
نہیں آئی۔“

”اب اسے آنے کی فرصت کہاں“۔ فرحت نے طنز کہا۔ ”وہ دن گئے اب۔
رات رات کی بات ہے۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ شہزادی ہنسی۔ ”دن تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔ دنیا کا یہی
دستور ہے میں نے کہا چلو میں بھی چار روز کے لیے خوشی منا لوں تو کیا حرج
ہے ______“

”توبہ ہے تم سے کون بات نہ کرے گی تو ناراض ہے کیا؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

"ناراض تو نہیں۔" وہ بولی "لیکن ڈر آتا ہے۔"

"کیوں؟"

"موڈ چڑھے ہوئے ہیں کوئی بے ادبی ہوگئی تو پٹ جاؤں گی۔" شہناز نے کہا۔

"تجھے بھی کوئی بھوت ستاتا ہے کیا؟" فرحت نے طنزاً پوچھا۔

"میں ہی تو پوچھتی ہوں۔" وہ بولی۔ "سبھی پوچھتے ہیں ناخداؤں نے کشتی دریا میں ڈال رکھی ہو۔ تم کنارے پر بیٹھے، بیاں بیاجاؤ۔"

"تو پھر کیوں ڈال رکھی ہے سمندر میں۔" فرحت بولی۔

"تھپیڑوں کا مزہ آتا ہے۔" شہناز ہنسنے لگی۔

"تو پھر روتی کیوں ہو؟"

"رو رہی ہوں کیا؟" وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔

"تم خواہ مخواہ جھگڑتی ہو۔" ہاجرہ بولی۔ "چھوڑو اب۔"

"چائے پی لے۔" فرحت نے شہناز سے کہا۔

"پلا دے۔" شہناز نے جواب دیا۔ "ہمارے ہاں کوئی پینے آئے تو پھر ہمیں ہی پینے کے لئے آنا ہوگا۔ کیوں مہاراج۔" وہ ایلی کی طرف مخاطب ہوئی۔ "ہم درشن کرنے کے لئے آئے ہیں۔"

ایلی کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

"دکھشنا دو نا۔" فرحت ہنسنے لگی۔

"دیں گے۔" شہناز بولی۔ "دیوتا بات تو کریں۔"

"یہ دیوتا پتھر کا نہیں بنا۔" ایلی نے کہا۔

"ہم کب کہتے ہیں۔" وہ ہنسی۔

"کبھی نہیں سمجھتی ہو۔" ایلی نے روٹھے کے انداز سے جواب دیا۔

"اونہوں۔" شہزاد بولی۔ "ابھی نہیں۔ ابھی مہاراج غصے میں ہیں۔ ابھی دال نہیں گلے گی۔"

"ہاں ہاں۔" ایلی بولا۔ "ابھی چولہے پر چڑھائے رکھو۔"

"ایلی سے جیتے تو جانیں۔" فرحت بولی۔ "ہمیں کوئی جواب کرنا آتا ہے تمہیں۔"

"اور مہاراج سے کیسے جیتوں۔" وہ بولی۔

عین اس وقت جانو آگئی۔

"ہائے ایلی آیا ہے۔ کب آیا تو۔ اب کی بار تو تیری شکل ہی نہیں دیکھی۔" پھر وہ شہزاد سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "وہ آیا ہے۔ تیرا صفدر۔ ادھر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔ کہتا ہے سنار کے ہاں جا رہا ہوں۔ بندے ٹھیک کرانے ہیں تو دے دے۔"

"ہائے میں تو بھول ہی گئی۔" شہزاد چلائی۔ "میں ذرا جا آؤں اس سے۔" اور پھر ایلی کی طرف دیکھے بغیر بھاگ گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے صفدر کی آمد کی بات سنتے شہزاد کا رنگ ہی بدل گیا ہو۔ نہ جانے یہ ایلی کا وہم تھا یا حقیقت پر مبنی تھا کہ صفدر کی خبر سن کر شہزاد کی آنکھوں میں وہی مسکراہٹ ابھر آئی تھی جو کبھی اس کی آمد پر ابھر آیا کرتی تھی۔

چائے پینے کے بعد ایلی باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

"کہاں جائے گا تو۔" ہاجرہ نے پوچھا۔

"باہر جا رہا ہوں۔ لوگوں سے ملنے کے لئے۔"

"لوگوں سے ملنے کے لئے۔" فرحت نے معنی خیز انداز سے کہا۔ "آج لوگوں کو ملنا یاد آگیا تجھے۔"

"میں نے کہا۔" ہاجرہ بولی۔ "تو کیا شہزاد سے ناراض ہو؟"

"نہیں تو۔" وہ بولا۔

سے پٹتے پٹتے جدا ہوا غصے میں نہیں۔ کیا فائدہ ہے؟"

"اس بے چاری نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ الٹا اس نے تو ہم سے بہت ہی اچھا سلوک کیا ہے۔" ہاجرہ نے کہا۔

"ہوں۔" علی بولا اور چل پڑا۔

جنسی عورت

بیٹھکوں کے قریب پہنچ کر رکتا اس نے باہر جانے کا ارادہ بدل دیا اور شہزاد کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا شاید یہ میرا وہم ہے ناحق اس پر شک کر رہا ہوں۔ شاید کوئی بات ہی نہ ہو۔

اسے وہ دن یاد آگیا۔ جب شہزاد نیٹنگ کلاس میں جانے سے پہلے برجے کے چوبارے میں شہزاد سے ملا تھا۔ شہزاد اس کے روبرو آکھڑی ہوئی۔

"تم سمجھتے ہو۔" اس نے کہا۔ "کہ میں تمہاری طرف اس لئے بڑھی تھی کہ مجھے ہوس پوری کرنا تھی۔ نہ میں نے تو ہوس پوری کرنے کے سب راستے بند کر دیئے ہیں۔ میں نے اپنے خاوند سے بگاڑ کر لیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں جاتی۔ یہاں میں کس لئے بیٹھی ہوں۔ کس لئے کس امید پر۔"

علی گھبرا گیا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یقیناً اس کا وہم تھا۔ ناحق اس پر شک کر رہا تھا۔ جب وہ شہزاد کے کمرے میں پہنچا تو وہ چپ چاپ بیٹھی مشین پر کام کر رہی تھی۔

"یہ دیکھو کون آیا ہے۔" جانو چلائی۔

شہزاد چپ چاپ کام کئے گئی۔

"میں نے کہا علی آیا ہے۔" جانو بولی۔

"آیا ہے تو ٹھیک ہے۔" وہ بولی "میں کیا جانتی نہیں کہ آیا ہے۔"

علی کو دھچکا سا لگا۔

"چائے نہیں پلاؤ گی کیا۔" ایلی نے دل کڑا کر کے کہا۔

"کیوں نہیں۔" وہ ویسے ہی کام میں مصروف رہی۔ "جاجو، لے چائے لا دے اس میز پر۔"

یہ نئی تھی۔ ایلی کا جی چاہا کہ اٹھ کر چلا جائے لیکن وہ ضبط کیے بیٹھا رہا۔ جاجو چائے لانے کے لیے نیچے چلی گئی تو اس نے شہزاد پر نگاہیں گاڑ دیں لیکن وہ اس قدر مصروف تھی کہ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

"یہ صفدر یہاں کب سے آتا ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"جب میں بلاتی ہوں آتا ہے۔" اس نے روکھے انداز سے جواب دیا۔

"دن میں کئے بار بلاتی ہو۔"

"جتنی بار دل چاہے۔" وہ بولی۔

"بہت دل چاہتا ہے تمہارا۔" ایلی نے نفرت سے پوچھا۔

"اپنا اپنا دل ہے۔" وہ بولی۔ "مجھ پر کون بندش ڈال سکتا ہے۔"

ایلی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ وہی شہزاد تھی جو کبھی بھی فرحت کے پاس بیٹھے ہونے سے کتراتی رہی تھی۔

"شہزاد کیا تمہیں معلوم ہے۔" ایلی نے کہا "کہ وہ ایک اوباش آدمی ہے۔ شرابی ہے اور اسے کسی کی عزت کا خیال نہیں۔"

"جس کی عزت ہو وہ سوچے یہ باتیں۔ مجھے ان سے کیا۔" اس نے جلے کٹے انداز سے جواب دیا۔

ایلی اٹھ بیٹھا اور شہزاد کی طرف بڑھنے لگا۔

"مہربانی کرو۔" وہ ہاتھ جوڑ کر طنزاً بولی۔ "مجھے آرام سے جینے بھی دو گے یا نہیں۔"

"لیکن تم نہیں سمجھتی۔" وہ چلایا۔

''میں سمجھنا نہیں چاہتی۔ مجھے کوئی نہ سمجھائے۔''

''تو کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔'' ایلی نے پوچھا۔

''مجھ سے یہ سوال پوچھنے کا کسی کو حق نہیں۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کے شرارے نکل رہے تھے۔

''شہزاد یہ تم کہہ رہی ہو۔'' وہ چلایا۔

وہ خاموش رہی۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں؟''

''میں کیا مجرم ہوں کہ جواب دیتی پھروں۔''

وہ چپ چاپ پھر سے کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ مشین چلانے لگی۔ دیر تک وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

کچھ دیر کے بعد جانو کی نیچے سے آواز آئی۔

''یہ آ گیا ہے صفدر۔'' وہ بولی۔

''چھ میں آئی۔'' یہ کہہ کر وہ قلانچیں بھرتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئیں

ایلی چپ چاپ اٹھا اور نہ جانے کدھر کو چل پڑا۔ اس کے حواس معطل ہو چکے تھے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دماغ میں ایک بھیانک خلا پھیل رہا تھا۔ اس وقت نہ اسے غم تھا نہ غصہ۔ اس کا ذہن ایک سادہ ورق میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے اردگرد چاروں طرف لاحد ودوسعتیں پھیل گئی تھیں۔ اور ان میں ایلی گویا کھو گیا تھا۔ وہ بوجھل اور بھیانک خلاؤں میں جھول رہا تھا جیسے سمندر ہو۔ اس میں لہریں اٹھ رہی تھیں اور ایلی کی ناؤ جھول رہی تھی۔ بہہ رہی تھی۔ بہے جا رہی تھی۔ نہ بادبان تھے نہ چپو۔ نہ کوئی راستہ نہ منزل۔

سارا دن نہ جانے وہ کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ محلے والے اسے دیکھ کر رک جاتے۔

"لیلی ہے۔ کب آیا تو۔ ارے۔" وہ چلاتے۔ "یہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ اپنی شکل کی طرف تو دیکھ۔ بیمار ہے کیا؟"

پہلے تو اس نے یہ بات سن کر تعجب کا اظہار کیا۔ پھر اس نے کہنا شروع کر دیا۔

"ہاں بیمار ہوں۔"

"کیا بیماری ہے؟" وہ پوچھتے۔

"بس رگڑتا رہتا ہے۔" وہ جواب دیتا۔

لوگوں کو ایسے سوال کرتے دیکھ کر اس نے اپنا پروگرام بدل دیا۔ اس کا ارادہ تھا کسی کے پاس جا بیٹھے لوگوں سے ملے۔ رضا تو امرتسر جا چکا تھا۔ چوہدری کی طرف ہی کسی بہانے وہ رجو کے گھر چلا جائے۔ لیکن یہ محسوس کر کے کہ اس کا چہرہ دیکھنے کے باوجود بھی تک دکھائی دے رہا ہے۔ وہ باہر قبرستان کی طرف چل گیا ورنہ جانے کہاں کہاں وہ ادھر ادھر پھرتا رہتا۔

وہ سوچ رہا تھا میں کیا کروں؟ کیا کروں میں؟

شہزادی وہ شہزادی نہیں تھی۔ کہاں وہ ہنستی کھیلتی مسکراتی ہوئی شہزادی اور کہاں یہ عورت۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک اجنبی عورت ہو جسے لیلی نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ اجنبی تو وہ تھی مگر اس کی وہ ہنسی کسی اور کے لئے مخصوص ہو چکی تھی اور پھر صفدر کے ساتھ۔ لیلی کے دل میں ٹیس سی اٹھتی۔ اگر شہزادی اسے یوں ہی ٹھکرا دیتی تو اسے تکلیف نہ ہوتی۔ کسی ایسے کے لئے ٹھکراتی جو کسی حیثیت کا مالک ہوتا۔ جس کی کوئی شخصیت ہوتی۔ کچھ بھی ہوتا لیکن صفدر ایک خود غرض شرابی۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوب جاتا۔

اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے صفدر ابھرتا۔ اس کی آنکھوں میں تحقیر بھری مسکراہٹ جھلکتی اور وہ لیلی کی طرف دیکھتا۔

"میں تو کہتا تھا بات کر رکھا میں کتنی منتیں کی تھیں کہ ہمیں بھی اس دہلیز پر بیٹھنے کی اجازت دو۔" وہ قہقہہ لگاتا۔ "لیکن تم کب مانتے تھے" ______ پھر وہ [illegible]

ٹھوکر کھا کے گرتا "حافظ خدا تمہارا" ___ وہ یوں شعر ادا کرتا جیسے جدا ہو رہا ہو۔ "اب چھٹی کرو بھائی۔" ___ پھر وہ شہزادو کی طرف متوجہ ہوتا اور دوسرا مصرعہ اسے مخاطب کر کے کہتا "اے دلربا ہوں میں فدا۔"

پھر پہنچ کر بھی بلی کو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ بہرحال ایک بات واضح تھی اس کا علی پور میں رہنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اسے جانا ہی ہوگا۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ یوں نہ جائے۔ شاید کسی روز شہزادو کہے۔ تم خود مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ کبھی یہ بھی برداشت کر سکتا تھا لیکن یہ الزام برداشت نہیں کر سکتا تھا اس نے شہزادو سے بے وفائی کی۔

"وہ چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے ثابت کر دے کہ شہزادو اس سے بے وفائی کر رہی ہے لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ بات تو واضح تھی۔ شہزادو کی ہر حرکت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی تمام تر توجہ صفدر پر مرکوز ہو چکی ہے اور اب وہ بلی کو محض ایک رکاوٹ سمجھ رہی ہے۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ ڈرامائی انداز سے اس وقت ان کے سر پر جا کھڑا ہو جب وہ ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کر رہے ہوں تاکہ وہ شہزادو کی بے وفائی اور اپنی مظلومیت کی دھاک بٹھا دے اور پھر ایک سچے عاشق کی طرح ان کے راستے سے ہٹ جائے اور باقی ساری زندگی اس بے وفا محبوبہ کی یاد میں رو رو کر بسر کر دے۔"

رات تک وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

رت جگا

فیصلہ کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ رات کے وقت وہ دونوں ضرور ملتے ہوں گے۔ صفدر اپنی کھڑکی سے پھلانگ کر شہزادو کے چوبارے میں جاتا ہوگا۔ شہزادو اکیلی ہی تو تھی۔ اس کی ماں بیگم میکے گئی ہوئی تھی۔ جانو گھر کا کام ختم کرنے کے بعد اپنے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ صرف شہزادو اور چارپائیاں چوبارے میں رہ جاتی

تھیں۔ پھر رکاوٹ کوئی تھی۔ وہ ضرور ملتے ہوں گے ضرور۔

بارہ بجے تک وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ اس نے بہانا بنایا جیسے سو رہا ہو۔ پھر وہ چپ چاپ اٹھا اور دبے پاؤں شہزادے کے چوبارے کی طرف چل پڑا۔ وہ اس دروازے میں جا کھڑا ہوا جو شہزادے کے کوٹھے پر کھلتا تھا اور حالات کا جائزہ لینے لگا۔ شہزادی کی پھپھیاں باہر صحن میں سوئی ہوئی تھیں اور وہ خود اندر کھڑکی میں کھڑی نائب صفدر سے باتیں کر رہی تھی۔ اسے یوں مصروف دیکھ کر وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور برابر کے خالی چوبارے میں جا کر چھپ گیا۔

وہاں کھڑا ہو کر وہ شہزادی کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اسے ان کی گفتگو کے متعلق کچھ علم نہ ہو سکا کیونکہ وہ ان سے کافی دور تھا لیکن ان کے قہقہے اسے سنائی دے رہے تھے۔ وہ کتنی خوش نظر آ رہی تھی۔

پھر دفعتاً انہوں نے ہنسنا موقوف کر دیا اور زیر لب باتیں کرنے لگے۔ ضرور وہ ملنے کی تفصیلات طے کر رہے تھے۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد شہزادی چلائی۔

"جائیے۔ آدھی رات ہو چلی ہے اب مجھے نیند آ گئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کھڑکی کو دھکا دیا اور پھر باہر چارپائی پر آ کر لیٹ گئی۔

دیر تک وہ وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔

محلے پر سکوت طاری تھا۔ تمام آوازیں بند ہو چکی تھیں البتہ احاطے میں چمگادڑیں چیخ رہی تھیں جو اس سکوت کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھیں۔ احاطے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ شہزادے کے کوٹھے پر بھی خاصا اندھیرا تھا۔ اندر چوبارے میں ایک چھوٹا سا دیا جل رہا تھا۔ جس کی مدھم روشنی صحن کے ایک حصے میں پڑ رہی تھی۔

اگر صفدر نے آنا تھا تو شہزادی نے دیا کیوں جلا رکھا تھا۔ وہ سوچنے لگا ______ شاید اس لئے کہ کھڑکی پھلانگ کر آنے میں اسے دقت نہ ہو۔ وہ

کھڑکی پر نگاہیں جمائے سوچتا رہا۔ مسجد کی گھڑی نے دو بجا دیے۔ وہ چونکا دو بج گئے۔

پھر وہ دبے پاؤں نکلا۔ اور شہزاد کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ وہ بڑے مزے سے پڑی بے خبر سو رہی تھی جیسے اس کی عادت تھی۔ ایلی کا دل چاہا کہ اسے جگا دے اور پھر اس کے پاؤں پر سر رکھ کر رو دے لیکن اسے شہزاد کے قہقہے یاد آ گئے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایلی دکھی ہے۔ دکھی نہ سہی چلو اداس ہی سہی اور وہ جان بوجھ کر صفدر کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی۔ اور پھر جب وہ اس وقت اس کے پاس آیا تھا تو کس بے اعتنائی سے اس نے کہا تھا۔ جاؤ اسے چائے پلا دے۔ جیسے کسی بھکاری کو بھیک دی جاتی ہے۔

چند منٹ وہاں رک کر وہ شہزاد کے چوبارے میں داخل ہو گیا۔

وہاں وہ صندوقوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ بہت رات بیت چکی اب تو شاید صفدر نہیں آئے گا۔ اسے اس بات پر دکھ ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کی سب سے بڑی خوشی اس بات پر منحصر تھی کہ صفدر کھڑکی پھلانگ کر آ جائے۔ آ کر شہزاد کو جگائے۔ وہ شہزاد اس کے گلے میں بانہیں ڈال دے پھر ایلی چپکے سے باہر نکلے اور ان کے روبرو آ کر کہے۔

"آداب عرض ہے محترمہ۔"

اور پھر چپ چاپ اپنے گھر آ جائے اور اگلے روز صبح سویرے ہی ہمیشہ کے لئے علی پور خیر باد کہہ دے۔ گھڑی نے تین بجا دیے۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی آرزو پوری نہ ہو سکے گی۔ شاید وہ اس لئے نہیں مل رہے تھے کہ ایلی وہیں تھا اور شہزاد کو ڈر تھا کہ کہیں بھانڈا پھوٹ جائے ______ پھر وہ علانیہ قہقہے کیوں مارتی تھی ______ ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

بہر صورت کوئی ثبوت تو ضرور ہونا چاہیے۔ شاید شہزاد کے ٹرنک میں صفدر کے

محبت نامے ہوں۔ صفدر نے ضرور خط لکھے ہوں گے۔ جیسے وہ خود شہزاد کو لکھا کرتا تھا۔

اس نے شہزاد کا صندوق کھول کر اس کی ہر چیز باہر نکال کر دیکھی لیکن اس میں کوئی خط نہ تھا البتہ اس میں کئی ایسی بیکار چیزیں پڑی تھیں جو کسی زمانے میں علی نے اسے دی تھیں مثلاً علی نے ایک مرتبہ شہزاد کو ایک کھلونا دیا تھا۔ سیاہ لکڑی کا بنا ہوا ایک جاپانی گڈا۔ اور علی نے یہ گڈا دیتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

''جانتی ہو یہ کون ہے؟'' ''یہ تمہارے میاں ہیں دیکھ لو'' ''پہچان لو۔''

اور شہزاد نے قہقہہ لگایا تھا۔

پھر وہ تسبیح تھی جو اندھیرے میں روشن دکھائی دیتی تھی۔ اس کے علاوہ ٹرنک میں شہزاد نے اپنی پرانی پھٹی ہوئی دو بنیانیں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔

جب بھی علی شہزاد سے ملتا تو وہ تقاضا کیا کرتا کہ شہزاد اسے اپنی پرانی میلی بنیان دے۔ علی کو شہزاد کے جسم کی بو سے بہت محبت تھی۔ وہ اس کی پہنی ہوئی میلی بنیان پہن کر بے حد مسرت محسوس کیا کرتا تھا کہتا تھا۔ یہ بنیان پہن کر محسوس کرتا ہوں جیسے تم مجھ سے بغل گیر ہو۔ اسی لئے شہزاد اپنی پرانی بنیانیں سنبھال کر رکھا کرتی تھی کہ علی آئے تو اسے تحفتاً دے۔

علی ان سب چیزوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے ان چیزوں کو دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔

مایوس ہو کر اس نے صندوق بند کر دیا۔

دفعتاً اس کی نگاہ لیٹر پیڈ پر پڑی۔ ہائیں۔ اس نے سوچا لیٹر پیڈ۔ شہزاد نے تو کبھی لیٹر پیڈ استعمال نہیں کیا۔ جب بھی اسے خط لکھنا ہوتا تھا تو وہ اپنی بچیوں کی سکول کی کاپی سے ورق پھاڑ لیا کرتی تھی۔ پھر یہ پیڈ۔

اس نے پیڈ کو اٹھا لیا۔ اچھا خاصا خوب صورت پیڈ تھا۔ ابھی نیا ہی تو تھا۔ صرف

''آج'' وہ گھبرا گئی۔ ''اے ہے دو چار دن تو رہ لے۔''

''ماں تم بھی حد کرتی ہو۔ اگر وہ خوشی سے جاتا ہے تو روکو نہیں۔'' فرحت بولی۔

''تو خوشی سے جا رہا ہے یلی؟'' ہاجرہ نے پوچھا۔

''تو کیا مجبوری سے جا رہا ہوں۔'' یلی نے جواب دیا۔

''تو شہزادہ سے ناراض ہو کر تو نہیں جا رہا؟'' ہاجرہ بولی۔

''وہ ماں۔'' فرحت چلائی۔

''ہائے کوئی بری بات کر رہی ہوں کیا؟'' ہاجرہ نے معصوم انداز سے کہا۔

''تو بھی بڑی بھولی ہے ماں۔''

''مجھے نہیں آتیں ٹیڑھی باتیں۔'' ہاجرہ نے کہا ''بچے کسی سے ناراض ہو کر کیوں جدا ہو کوئی۔''

''تو پھر ان دونوں کو منا دے۔'' فرحت ہنسنے لگی۔

''ہاں ہاں۔'' ہاجرہ بولی ''اس میں کیا حرج ہے۔''

''تو اس کی باتیں نہ سن ماں۔'' یلی نے کہا۔

''مجھے نہیں سمجھ میں نہیں آتیں یہ باتیں۔ میرا دل تو صاف ہے۔'' ہاجرہ بولی۔

''کچھ زیادہ ہی صاف ہے ماں۔'' فرحت ہنسی۔

''چل میرے ساتھ شہزاد کی طرف۔'' ماں نے فرحت کی بات پر غور کیے بغیر کہا۔

''نہیں ماں چھوڑ اس بات کو۔'' یلی گھبرا کر بولا۔

یلی رخصت ہونے لگا تو جانو نے شور مچا دیا۔

''کچھ خبر ہے اپنی دھن میں غرق رہو گی۔'' وہ شہزادہ سے کہنے لگی جو اس وقت صفدر سے باتوں میں مصروف تھی۔

''کیا ہے؟'' شہزاد بولی۔

"ایلی خانپور جا رہا ہے۔"

شہزاد نے قہقہہ لگایا "تو پھر؟"

"اے میں کہتی ہوں وہ سچی جا رہا ہے۔" جانو چلائی۔

شہزاد پھر ہنسی۔ "تو کیا کروں؟" وہ بولی "کیا گھوڑا گاڑی جوت کر لا دوں۔"

"ہائے بیوی تمہیں ڈر نہیں ہے تو ابھی کا تو ______" جانو رک گئی۔

"بہت منہ دیکھے میں نے۔" شہزاد نے کہا "اب نہیں ______"

ایلی نے سنا۔ اس کے دل پر کسی نے گویا جلتی ہوئی سیخ گاڑ دی۔

محلے کے چوگان میں محلے والیوں نے ایلی کو روک لیا۔

"کون جا رہا ہے ماں؟" ایک کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

"اپنا ایلی ہے۔" ماں نے کہا۔

"جا رہا ہے۔ علی پور چھوڑ کر جا رہا ہے۔" دوسری بولی۔

"ہے شہزاد کی کھڑکی خالی ہے۔" ایک نے طعنہ دیا۔

"وہ ادھر دوسری کھڑکی میں کھڑی ہے نا۔ اس لیے۔"

"ہے کتنی کھڑکیاں رکھتی ہیں اس کے چوبارے میں۔"

"بارہ دری ہے ماں۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"ایک دن جانا ہی پڑتا ہے بیٹا۔" ماں بولی "چلو اچھا ہی ہو تو بھی کام کاج پر لگے گا۔"

ایلی کا سر جھک گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ان سب نے گویا گندگی کی ٹوکری اس کے سر پر الٹ دی ہو۔ شرمساری اور ذلت سے لت پت وہ چل پڑا۔ اس کے قدم بوجھل ہو رہے تھے۔ گردن کا منکا گویا ٹوٹ گیا تھا۔ سامنے ایک خلا تھا۔ ایک دھندلکا تاریکی جو منہ کھولے بیٹھی تھی۔ دور مسعود کا گراموفون چلا رہا تھا۔

حافظ خدا تمہارا ۔ ے ذرا باہوں میں فدا۔

جن بابا

خانپور جاتے ہوئے علی کے دل میں غم بوند بوند اتر رہا تھا لیکن دراصل اس غم کی حیثیت ثانوی تھی۔ اسے شہزادی سے جدائی کا غم نہ تھا۔ شہزادی کی محبت کھو دینے کا صدمہ تھا بلکہ احساسِ ندامت اور شکست کی وجہ سے اس کا دل چور چور تھا۔

علی جذبہ عشق اور احساسِ غم سے بیگانہ تھا۔ اگر وہ عشق یا غم سے محروم نہ ہوتا تو یہ واقعہ اس کے اندر ایسی گہرائی پیدا کرتا جو اپنی نوعیت میں تعمیری ہوتی۔ اس کے برعکس وہ محسوس کر رہا تھا کہ دیوتا پتھر کے ٹکڑے کی طرح ٹھکرا دیا گیا۔ اور اب وہ دیوتا نہیں محض ایک پتھر ہے جو لوگوں کی ٹھوکروں میں پڑا ہے۔ آج تک اس کی تمام تر اہمیت کا انحصار شہزادی کی توجہ کا مرکز ہونے کی وجہ سے تھا ______ اب وہ کسی کی توجہ کا مرکز نہ تھا۔

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ گاڑی کی چھکا چھک کی آواز سے یوں سنائی دے رہی تھی جیسے شہزادی اور صفدر قہقہے مار مار کر ہنس رہے ہوں۔ سبھی اس پر ہنس رہے تھے۔

"آخر ایک نہ ایک دن جانا ہی پڑتا ہے۔" ماں ہنستی مسکراتی رہی تھی۔ "ایسے عمل کا یہی نتیجہ ہوتا ہی ہے۔" چچا صمد چلا رہا تھا۔

"بھئی اس کے چوبارے میں تو کھڑکیاں ہی کھڑکیاں ہیں۔ بارہ دری ہے۔"

"جا رہے ہو تو میں کیا کروں؟" شہزادی ہنس رہی تھی۔

"حافظ خدا تمہارا۔" صفدر قہقہے مار رہا تھا۔

اور جب وہ خانپور پہنچے گا تو علی احمد ہنسیں گے۔

"دیکھتی ہو نصیر احمد کی ماں۔ علی آ گیا۔ آخر آ ہی گیا۔ ہی ہی ہی ہی۔ بھئی بڑی ہمت کا کام کیا ہے علی نے۔ سنتی ہو نصیر کی ماں۔ کارنامہ دکھایا ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ وہاں سے چپکے سے آنا کوئی آسان بات تھی کیا؟ ______ ہونہوں۔ لیکن تمہیں کیا معلوم تم

کیا جانو۔"

اس کی آنکھ میں چمک ابھرے گی اور پھر وہ جھک کر راجو کے کان میں کہیں گے "تمہیں کیا پتہ مرد کی مجبوریاں۔ تم خود مجبوری ہو۔ ی ی ی۔"

ایلی کو خانپور جانے سے ڈر آتا تھا۔ علی احمد کے روبرو جانے سے ڈر آتا تھا۔ اگرچہ علی احمد نے واضح الفاظ میں ایلی کو کبھی "شہزادہ" کا طعنہ نہیں دیا تھا۔ لیکن ان کی ہنسی میں وہ ہمیشہ دھار محسوس کرتا تھا۔ ان کی خصوصی ہنسی ایلی کے لئے کند چھری کی حیثیت رکھتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے راستے میں وہ ایک روز کے لئے لاہور رک گیا۔

چکر

لاہور ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی اس لئے وہ سیدھا وہی مسلم ہوٹل چلا گیا اور کمرے میں سامان رکھ کر وہ چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

وہ محسوس کر رہا تھا جیسے پہلی مرتبہ گھر سے باہر نکلا ہو جیسے پہلی مرتبہ ایک بچہ انگلی کا سہارا لئے بغیر چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اگلے روز وہ لاہور میں گھومتا رہا یوں جیسے ایک بیگانہ شہر ہو۔

سنٹرل ٹریننگ کالج ویران پڑا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ایک اجنبی مقام پر ہو۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ابھی چند روز پہلے وہ اسی بورڈنگ میں رہتا تھا۔ وہ چھٹیاں وہ شاہ جی کے احاطے سب اس کے ذہن میں دھندلا چکے تھے جیسے انہیں کبھی خواب میں دیکھا ہو۔

شام کے وقت جب وہ انارکلی میں گھوم رہا تھا تو دفعتاً کسی نے آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ارے تم" کوئی چلایا۔

"شام" ایلی کی چیخ نکل گئی۔ "تم یہاں ہو؟"

"ہم اب کہیں جانے کے قابل نہیں رہے۔ بس اب تو یہیں پہ مقبرہ بنے

گا۔" شام مسکرا رہا تھا۔

"کیوں؟"

"بس سنگ ناقہ ہے۔" شام ہنسا۔ "وہ میرے لئے یہیں رک جائے تو پھر میں کہیں جا سکتا ہوں کیا؟"

"رک گئی ہے؟" یلی بولا۔

"ہاں۔ اس نے یہیں نوکری کر لی ہے۔"

"اور تم؟"

"میں نے لاہور کالج جوائن کر لیا ہے۔ کالج تو بہانہ ہی ہے۔" شام نے آنکھ ماری۔ "مطلب ہے جہاں فیڈنگ بوتل وہاں گلیکسو بے بی۔"

شام یلی کو اپنے بورڈنگ میں لے گیا۔ لیکن کمرے میں پہنچتے ہی جب اس نے روشنی میں یلی کی طرف دیکھا تو چلانے لگا۔

"ارے تم۔ تمہیں کیا ہوا؟"

"مجھے۔" یلی نے جھوٹ موٹ دہرایا۔ "کیوں مجھے کیا ہے؟"

"دیکھو مجھ سے بھید چھپاتے ہو۔" شام چلایا۔

"تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟" یلی نے پوچھا۔

شام کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

"بتاؤں؟" وہ بولا۔

"ہاں بتاؤ۔"

"پھس س س س س۔" وہ چلایا۔ "پنکچر۔"

"پنکچر" یلی نے بڑی حیرت سے دہرایا۔

"وہ پنکچر ہوتا ہے کہ ساری ہوا نکل گئی ہے ______ کیوں اب بولتے نہیں۔"

شام چلایا۔ "بولو نا۔"

"سچ کہتے ہو۔" علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ارے۔" شام علی کی آنسو دیکھ کر گھبرا گیا۔

"سب ختم ہو گیا۔" علی بولا "وہ تخت، وہ تاج شہنشاہی سب۔ صرف میں باقی رہ گیا ہوں۔ اور شاید میں بھی ختم ہو جاؤں۔"

"زہر ______" شام نے بات کو مذاق میں ٹالنے کے لئے کہا "ابھی تک میرے ٹرنک میں پڑی ہے۔ اور ہاں بھگوان کی سوگند بس ساری عمر ٹرنک میں پڑی رہے گی۔ نہ مجھ میں کھانے کی ہمت ہوئی نہ تم میں ہوگی۔" وہ ہنسنے لگا۔

"نہیں شام" علی بولا "ساری زندگی چوپٹ ہو گئی۔ بساط ہی الٹ گئی۔ اب جینا بےکار ہے۔"

"ایسے بودے بن جاؤ گے بیٹا۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زندگی پٹ سے چت ہو جائے گی۔ بساط پھر قائم ہو جائے گی۔ غم نہ کھاؤ۔"

"غم تو اب لگ گیا ہے۔" علی نے کہا۔

"ایک بات پوچھوں؟" شام نے کہا۔

علی نے اثبات میں اشارہ کیا۔

"اس نے بےوفائی کی۔ بس یہی بات ہے نا؟"

"ہاں۔" علی بولا "پہلے تخت پر بٹھایا۔ پھر مورچھل کرتی رہی اور پھر دھکا دے کر وہاں سے گرا دیا۔"

"بس تم سمجھو وہ شنی بن گئے۔ تمہارا نقصان ہو گیا۔"

"کیوں؟"

"جس نے کامیابی دیکھی۔ تخت پر بٹھایا گیا۔ مورچھل کر دیا۔ وہ مکمل نہیں ہوتا جب تک اسے عروج پر سے گرایا نہ جائے۔ سمجھو تمہارا نقصان ہو گیا۔ اب تمہیں پھیر بتلاؤں۔" وہ چہکنے لگا۔ "اب چکر پہ چکر لگ جائے گا۔ پھر تخت پر بٹھا دے

گی۔ شور چھل کرے گی۔ آؤ یار، اب اپنا آپ سنبھالو۔" شام کہنے لگا۔ "جوتیں کھانا تو اپنا پرانا پیشہ ہے۔ تم تو یوں شکل بنائے ہوئے ہو جیسے پہلی بار جوتا کھایا ہو۔ ہمت کرو۔"

"مجھے نصیحتیں کرتا ہے بے سالے۔" علی جلال میں آ گیا۔

"کرنے دو۔ کرنے دو۔" شام چلایا۔ "تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ میری نصیحتوں سے تم نے کون سا اثر لیا ہے۔ لیکن پتی بات بن رہی ہے۔ کرنے دو نصیحتیں مجھے۔"

"کیوں؟" علی نے پوچھا۔

"یار کچھ۔" شام بولا۔ "ساری عمر بیت گئی ہے۔ ہمیشہ مجھے ہی چکر ہوتا رہا۔ ہمیشہ لوگ مجھے ہی نصیحتیں کرتے رہے۔ بھگوان جانے یہ پہلا موقع ہے جب میں تمہیں نصیحت کر سکتا ہوں۔

دل چھوٹا نہ کرو۔"

"ہائے ہائے۔" ہوٹل میں پہنچ کر شام چلایا۔ "چار بوتل۔ وہسکی کی۔ ہاں۔" وہ بولا۔ "تیزی کی جو تخت پر بیٹھ کے شور چھل کرے۔"

خانپور پہنچتے ہی سب سے پہلے اسے جمیل مل گیا۔ جب علی پلیٹ فارم پر قلی ڈھونڈ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ کھڑکی کے قریب جمیل کھڑا ہے۔

"ارے تم۔" وہ حیرت سے جمیل کی طرف دیکھنے لگا۔

جمیل مسکرا رہا تھا۔

"میں تو یہیں ملازم ہوں۔ ابھی ٹھہرو، اکٹھے چلیں گے۔"

خانپور کے اس مختصر سے قیام میں جمیل علی کے لیے وجہ تسکین تھا۔ اگرچہ علی کو جمیل سے عجب سا محسوس ہو رہا تھا۔ چونکہ جمیل صفدر کا چھوٹا بھائی تھا، اس لیے وہ جمیل پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی میں کیا المیہ واقع ہوا ہے۔

آج تک علی نے شہزاد کو راز بنائے رکھا تھا۔ اس نے شہزاد کے متعلق پتہ کی

دوست سے بات نہ کی تھی۔ لیکن اب اس عظیم شکست کے بعد اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ سر کو در و دیوار پر پٹخ پٹخ کر اپنی تحقیر سنائے اور راہ چلتوں کو بتائے کہ اس نے ایلی سے کیا سلوک کیا ہے۔ ہر ملنے والے کو خبردار کرے کہ کبھی کسی عورت پر بھروسہ نہ کرے کبھی اس کی محبت پر اپنی خوشی کا انحصار نہ رکھنا۔ لیکن ایلی یہ بات جمیل سے تو نہیں کر سکتا تھا۔ صفدر کے چھوٹے بھائی سے یہ بات کرنا۔ یہ اسے گوارا نہ تھا۔

محفل

علی احمد کے گھر میں کئی ایک تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

مثلاً ان کی تیسری بیوی شمیم جو شمیم کے بجائے کماں کہلاتی تھی۔ وہ علی احمد کے گزشتہ بیان کے مطابق بذات خود ایک بیب تھی اب قطعی طور پر اپنی شخصیت کھو چکی تھی۔ شمیم کا بیب اب گل ہو گیا تھا۔ صرف یہی نہیں وہ اس حد تک اعتراف شکست کر چکی تھی کہ اب اس میں یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ عورت ہے۔ نہ جانا میدی اور بیوی کی شدت کی وجہ سے اس نے اپنا آپ مسخ کر دیا تھا۔ یا خود۔

علی احمد کی چوتھی بیوی راجو جو کسی زمانے میں دور بے کی رنڈی تھی اب چار دیواری سے گھرے ہوئے گھر کی خاتون بن کر رہ گئی تھی۔

نہ تو اس کی نگاہوں میں شوخی تھی نہ انداز میں نمائش اور نہ چال میں ایسی جو نگاہوں کو دعوت دیتی ہے۔ اس کی یہ تبدیلی حیرت انگیز تھی۔ لیکن اس سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ علی کا سپاہی ابھی تک اس قلعے کی تسخیر میں جوں کا توں منہمک تھا۔ اس کے علاوہ علی احمد کے گھر میں اب استانیوں کی آمد و رفت قطعی طور پر ختم ہو چکی تھی۔ ممکن ہے علی احمد نے خود ہی اس رسم کو توڑ دیا ہو یا شاید اس کی وجہ راجو کا رویہ ہو۔ بہرحال علی احمد کا گھر اب ایک گھر تھا۔

گھر میں علی احمد تھے۔ شمیم اور اس کی دو بیٹیاں۔ ناظمہ اور انجم اور راجو کے دو بیٹے شیر علی جو اس کے پہلے شوہر سے تھا اور نصیر جو علی احمد سے تھا۔

وہیں ہنس کر وہ ایک روز تو یلی کھویا کھویا رہا۔ پھر مختلف تعلق سے اس کی توجہ
کتاب پر مرکوز ہوگئی اور وہ شہزادی کو بھولنے کے لئے ______ اپنے کھوئے ہوئے
تخت و تاج کو بھولنے کے لئے کتاب میں کھو گیا۔

سارا دن وہ کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتا اور جب مطالعے سے تھک جاتا یا
جب سادی اور شہزادی کتاب کے صفحات سے جھانک کر مسکراتیں، شرارہ کرتیں تو وہ
کتاب پھینک کر جمیل کی طرف چلا جاتا۔ اور جمیل فارغ ہوتا تو وہ اسے اپنے
دوستوں کی محفل میں لے جاتا جہاں وہ تاش کھیلتے، گپیں ہانکتے اور حالاتِ حاضرہ پر
بحث کرتے۔

جمیل کے ساتھی تو بہت تھے لیکن ان میں صرف دو ایسے تھے جنہوں نے یلی کو
اپنی طرف متوجہ کیا۔ تقی اور راز۔

تقی ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ دبکا ہوا تھا۔ جسم منحنی تھا۔ آنکھیں اندر
دھنسی ہوئی تھیں۔ ناک اس حد تک ابھری ہوئی تھی کہ سوائے ناک کے کچھ دکھائی نہ
دیتا تھا۔ لیکن اس کی باتیں بے حد دلچسپ تھیں۔ ان میں رنگینی یا مزاح کی جھلک نہ
تھی۔ اس کے برعکس ان میں گہرائی ہوتی اور تقی کو یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ کوئی چونکانے
کی بات کر رہا ہے یا اس کی شخصیت میں انوکھا پن ہے۔ وہ یوں بات کرتا جیسے عام سی
بات کر رہا ہو۔ اور جب لوگ اس کی بات پر چونکتے تو وہ گہری سوچ میں پڑ جاتا۔

"ہاں یار۔" وہ سنجیدگی سے کہتا "مجھے احساس نہ تھا کہ میں انوکھی بات کر رہا
ہوں۔ میں تو یونہی بن سوچے سمجھے برسبیلِ تذکرہ کچھ کہنے کے لئے بات کر رہا تھا
"۔

اکثر وہ دفعتاً خاموش ہو جاتا تو جمیل پوچھتا

"کیوں تقی! تم کس سوچ میں پڑے ہو؟"

تقی چونکتا "کیا میں واقعی سوچ میں پڑا تھا"

"ہاں ہاں۔" رز چٹکی بجا کر گنگناتا "اسی سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا ہے۔"

اس پر تقی پوچھتا "یار اس کا اگلا مصرع کیا ہے؟"

رز اپنے آپ پر کیفیت طاری کرتے، آنکھوں میں مستی پیدا کرتے دوسرا مصرع گاتا۔

"دلبر کا کہا کرنا یا دل کا کہا کرنا۔"

"نہیں۔" تقی چڑتا "بات نہیں بنی۔ کشمکش کا سوال ہی پیدا ہوتا۔ بھئی دلبر کا کہا کرنا۔ مگر کیوں؟"

"تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیا سوچ رہے تھے۔" جمیل اسے چھیڑتا۔

"ٹھہرو۔" تقی چیختا "ایک سیکنڈ ——— ہاں ٹھیک ٹھیک سوچ رہا تھا میں واقعی۔ ٹھیک سوچ رہا تھا کہ کیا، تمہی مجھ میں اس قدر ضبط ہے کہ دو دن بیوی کو پیٹے بغیر رہ سکوں۔" تقی اس قدر معصومیت سے کہتا جیسے بیوی کو پیٹنا نہ صرف ایک نارمل بات ہو بلکہ اس کا فرض ہو۔

یار چلتے ہوئے دفعتاً تقی رک جاتا۔ "یار عجیب بات ہے۔" وہ گویا اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "ہے نا عجیب بات۔"

"کیا بات ہے؟" علی پوچھتا۔

"یار حد ہو گئی۔" تقی سر جھکاتے ہوئے سنجیدگی سے کہتا۔ "یہ جو نانک شاہی اینٹوں کی بنی ہوئی حویلی ہے نا۔ یہ سامنے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس حویلی سے پورے طور پر واقف ہوں۔ اور اس کا ایک ایک کمرہ اور دالان جانتا ہوں۔ حالانکہ میں کبھی اس کے اندر داخل نہیں ہوا۔ بلکہ اس سے پہلے میں نے اسے باہر سے بھی کبھی نہیں دیکھا۔ اس راستے سے کبھی آیا ہی نہیں میں۔ ہے نا عجیب بات۔" یہ کہہ کر تقی آنکھیں بند کر لیتا اور پھر کہتا "داخل ہوتے ہی ڈیوڑھی ہے۔ دو دروازے ہیں۔

یہاں دروازہ ایک کمرے میں کھلتا ہے۔ اس سے ملحقہ ایک دالان ہے۔ دالان میں ہرن کے سینگ دیوار پر ٹنگے ہوئے ہیں۔"

"ارے۔" راز چلاتا۔ "اب تم بھی کرو گے یہ رام کہانی۔ جانتے ہو تم حویلی کو تو پھر کیا ہو؟" "چھوڑو اب"

"نہیں یار۔" وہ چلاتا "بتا کیوں نہ۔" وہ ضدی بچے کی طرح اڑ جاتا۔

اس پر جمیل قہقہہ مارتا۔

"تو پھر کوئی سے کہ ایسا کیوں ہے ورنہ یہ ڈاکٹر تمہیں خوار کرے گا عمر بھر۔"

"ارے یار چھوڑو اب اس قصے کو۔" راز چلاتا "سنو تمہیں شعر سناؤں۔" اور وہ اپنے مخصوص انداز سے گنگنانے لگتا۔

تلخ گھونٹ

نقی کے مشاغل بے حد دلچسپ تھے۔ وہ حقہ پیتا تھا۔ چائے کا شوقین تھا۔ بحث میں بڑے شوق سے حصہ لیتا تھا۔ شطرنج اور تاش کھیلتا تھا۔ شعر کہتا تھا اور فرصت کے اوقات میں کپڑے پر سوئی تاگے سے رنگین چڑیاں کاڑھتا تھا اور بہ رغبت بیگم کو پہناتا تھا۔

راز کو گانے کا شوق تھا۔ جب وہ گاتا تو اس کی آنکھوں میں عجب مستی جھلکتی۔ برج کھیلنے کا شوقین تھا بشرطیکہ سیکس سے کھیلا جائے اور شوق کے باوجود ہارنے لگتا تو دفعتاً اسے کام یاد آ جاتا اور یا ویسے ہی کھیلنا چھوڑ دیتا۔ اس کی باتیں رنگین ہوتی تھیں۔ اسے اپنے والد صاحب کے متعلق قصے سنانے کا خبط تھا جو بنگال کی طرف کسی علاقے میں بڑے عہدے پر مامور تھے۔

جمیل ایک خاموش لڑکا تھا لیکن اس کا دل جذبات اور ذہن خیالات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرے۔ لیکن جہاں تک بات کرنے کا تعلق تھا اس پر ایک حجاب مسلط تھا۔ اس حجاب کی وجہ سے اس کی طبعی جولانی

گھٹ کر رہ گئی تھی۔ غالباً اس کی وجہ احساس کمتری کی شدت تھی۔ وہ عطف رفتہ لیکن
اس کی یہ عادت گونگے پن کی وجہ سے اذیت میں بدل چکی تھی۔ پھر ایک روز سے
اتفاق سے اس اذیت سے نکلنے کا ایک راستہ مل گیا اور اسے علم ہو گیا کہ شراب کے
چند گھونٹ پینے سے وہ اپنے گونگے پن کو دور کر سکتا ہے اور سوسائٹی میں ایسے ہی
چہک سکتا ہے جیسے کہ زیچ کا کرتا تھا۔ تاہم اس سے پہلے اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا
دل اور ذہن جذبات و خیالات سے بھرے ہیں۔ اس روز سے اپنے خیالات و
جذبات اپنی زبان سے سن کر حیرت ہوئی اور اسے یقین ہو گیا کہ اس نے چھپے ہوئے
خزانے کی کنجی پالی ہے۔

علی کو شراب سے خاص دلچسپی نہ تھی چونکہ اس کی شخصیت ہی میں مستی کا عنصر
تھا۔ اس کے لئے شراب محض ایک چھچھوری کی حیثیت رکھتی تھی جس سے کھیلنا سے
پسند تھا لیکن اس چھچھوری کی حیثیت محض تفریح کی تھی۔ وہ اپنی شخصیت کے اظہار کے
سے اس کا تعلق نہیں تھا۔ علی کے لئے شراب کا اثر خاصہ تکلیف دہ ہوتا تھا پھر
سے وہ دن یاد آ جاتا جب وہ اور منصر ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ جب منصر نے چڑ کر کہا تھا
:

”پیو دو بڑے۔“

ورنہ علی کو یہ فکر دامن گیر ہو گیا تھا کہ شراب پلانے سے منصر کا مقصد صرف یہ ہے
کہ ترنگ میں آ کر علی سادی کے اس رومان کا راز بتا دے۔ اور علی نے عزم کر لیا
تھا کہ چاہے وہ نشے میں دھت کیوں نہ ہو جائے وہ منصر کو حقیقت حال سے آگاہ
نہیں کرے گا اور یہ سوچ کر وہ پتھر بن گیا تھا۔ اس کے بعد جب کبھی اسے شراب
پینے پر مجبور کیا جاتا تو اس پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ محسوس کرتا جیسے اس کے
ساتھی منصر ہوں اور اس کا راز پانے کے لئے زبردستی پلا رہے ہوں۔

علی نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو کئی بار سمجھایا تھا کہ یہ خیال غلط ہے وہ اب

کوئی منصر نہیں۔ پینے سے مقصد صرف تفریح ہے لیکن سب بیکار۔ گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہی خود بخود وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں شہزاد کی بات نہ چھیڑ دے۔ بہر حال شراب ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہو چکی تھی۔ اس کے لئے وہ گھونٹ تلخ بن جاتا۔ جس کے بعد اس پر جمود طاری ہو جاتا۔ جسم منوں بوجھل ہو جاتا۔ سر چکراتا۔

علی کے لئے جمیل، ہاشمی اور رازی کی محفلیں یوں تھیں جیسی کسی طوفان زدہ ڈوبتی ہوئی کشتی کے لئے کنارہ ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر وقت اسی محفل میں بیٹھا رہے لیکن جب وہ وہاں پہنچتا تو نہ جانے کس اصول کے تحت اسے اپنی گزشتہ تباہی پھر سے یاد آ جاتی اور وہ محفل میں بیٹھ کر پھر سے اپنے آپ میں کھو جاتا۔ کنارے پر پہنچ کر پھر سے طوفان بیتنا شروع کر دیتا۔

علی نے ہر چند جمیل سے نہ کہا لیکن جمیل کے طرز عمل سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ سب جانتا ہو۔ سمجھتا ہو اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ خود جمیل نے کبھی شہزاد کی بات نہ چھیڑی تھی۔ جمیل نے علی کو کبھی نہ جتایا تھا کہ وہ دکھی ہے۔ شاید اس لئے کہ اسے مزید دکھ نہ ہو۔ جمیل نے علی کی آمد پر اس کی کیفیت بھانپ کر خاموش بے لاگ ہمدردی کی گود پھیلا دی تھی اور شاید اسی گود نے علی کو تباہ ہونے سے بچالیا تھا۔

علی کی آمد پر جمیل کی تمام توجہ علی پر مرکوز ہو گئی۔ وہ اس کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ اپنی گونگی منتوں سے اس کی تلخی اور اضطراب کو دور کرتا اور ہر وقت اس کے ساتھ رہتا۔ اس پر جمیل کی بیوی جو طبعاً خاوند کو جذب کر لینے کی قائل تھی۔ بگڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمیل کے گھر میں مشکلات پیدا ہو گئیں۔

گھر میں اسے کتابوں میں منہمک دیکھ کر علی احمد نے

"دیکھو نصیر کی ماں! ہمارا علی عجیب شے ہے۔ جب پڑھنے کے دن تھے تب

بیٹھ دیکھتا رہا۔ اور اب جب پڑھنے کے دن ختم ہو چکے ہیں تو کتابوں کا کیڑا بنا ہو ہے۔ ہی ہی ہی ہی" وہ ہنستے ______ "کیوں لیلی؟"

"اب تو ادب کا جنون ہو گیا ہے۔" راحت بولی۔ "اب اس کی شادی کی فکر کیجیے نا۔"

"یہ کسی کی شادی کا فکر کیوں کرنے لگے۔" شمیم بولی "یہ تو بس یوں ہی تانک جھانک میں لگے رہتے ہیں۔"

"نصیر کی ماں۔" وہ ہنستے۔ "اسی کے لئے تانک جھانک کرتا ہوں۔ تم سمجھتی ہو اپنے لئے کرتا ہوں۔ لاحول ولا قوۃ" وہ چلاتے۔

"وہیں کیوں نہیں کر دیتے جہاں وہ چاہتا ہے۔" راحت بولی۔

"وہاں کیسے کر سکتے ہیں۔" علی احمد جواب دیتے۔

"کیوں نہیں کر سکتے؟"

"وہ لوگ تو بہت بڑے ہیں اس لئے۔"

"پھر کیا ہو؟" شمیم بولتی۔

"میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔" راحت ہنستی۔

"بھئی تمہارے ہی بھلے کا سوچتا ہوں۔" علی احمد منہ پھلا کر کہتے۔

"ہمارے بھلے کی۔" وہ کہتیں؟"

"بھئی۔" علی احمد جواب دیتے۔ "اگر وہاں لیلی کا بیاہ کر دوں تو کیا وہ تمہاری قدر کریں گے۔ نصیر کی ماں انہیں دیکھ کر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ کہیں گے یہ کیا تمیز ہے نہ شکل نہ صورت نہ منہ نہ ماتھا نہ تہذیب نہ تعلیم۔ یہ کیا چیز ہے ہی ہی ہی ہی" وہ ہنستے "تو بھئی شمیم تم ہی انصاف کرو۔ میرا کیا ہے۔ پیٹ گزر تو ہو جائے گا۔ چند جماعتیں بھی پڑھی ہیں۔ کبھی بڑی بات بھی کر لیتا ہوں لیکن نصیر کی ماں کا کیا ہو گا۔ ہی ہی ہی ہی۔ اب تمہیں بولو۔ ہو گئی بولتی بند۔" ان کا قہقہہ گونجتا۔

"آپ سے کون سر کھپائے۔" راجو جواب دیتی اور پھر تھرتھر اندر چلی جاتی۔

اس پر علی احمد بھی اپنی ڈھیلی دھوتی سنبھالتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑتے۔

"اب دے نا جواب۔ کیوں نصیر کی ماں۔"

"نہ میں نہیں دیتی۔"

"کیسے نہیں دے گی۔ ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنستے۔

"چھوڑو بھی۔" اندر راجو تنک کر نخرے سے کہتی۔

"حافظ قرآن ہوتی تو چھوڑ دیتے لیکن تو کیا سمجھے گی اس لطیف اشارے کو۔ وقت کی ہولی نگری پڑی دولت پور میں۔ ہی ہی ہی ہی۔"

دفعتاً شمیم اور اس کی دونوں بیٹیاں ناظمہ اور انجم محسوس کرتیں کہ زمین کانپ رہی ہو ڈول رہی ہے اور وہ گھبرا کر ٹھٹک جاتیں اور اندر اپنے کمرے میں جا بیٹھتیں اور ایلی کو سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ اور وہ اٹھ کر جنگل کی طرف چل پڑتا۔

دیپالپور

چار ایک ماہ خانپور کے بعد ایلی کی تعیناتی دیپالپور ہوئی۔

دیپالپور ایک وسیع صحرا تھا جس میں یہاں وہاں دور دور مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس وسیع صحرا کو دیکھ کر ایلی نے محسوس کیا کہ جیسے مچھلی تالاب میں آ پہنچی ہو۔ ایلی ذاتی طور پر خود ایک ویرانہ تھا اور وہ ویرانے میں مل گیا۔ اسے ریت کے اس پھیلاؤ کو دیکھ کر سکون سا محسوس ہوا۔ جیسے وہ اپنے گھر آ گیا ہو۔ وہاں پہنچ کر ایلی نے جانا کہ خانپور میں محفل جما کر اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش غلطی تھی۔ اس کی زندگی میں دو رخی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ دل کے ویرانے کو بھولنے کے لئے محفلوں کا متلاشی تھا۔

دیپالپور پہنچ کر اس نے شدت سے محسوس کیا کہ اپنی اصلیت کو بھولنے کی کوشش سے سکون حاصل نہیں ہوتا بلکہ اپنی اصلیت میں ڈوب جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ اسے تسلیم کر لینے میں راحت ہے جھٹلانے میں نہیں۔

دیپالپور میں اس کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ کوئی دوست نہ تھا اس لیے وہ اکیلا ریت کے تودوں کی طرف نکل جاتا اور پھر کسی ٹیلہ نما تودے کے سائے میں بیٹھ کر رضی کی یاد میں کھو جاتا۔

ان دنوں وہ سادی کو بھول چکا تھا۔ اس کے صبح و شام شہزاد کے خیال سے پُر تھے۔ شہزاد اس کی زندگی پر یوں مسلط ہو چکا تھا کہ کسی اور کی گنجائش نہ رہی تھی۔ سادی کا خیال ______ ایک مسرت بھرا جام تھا۔ جس میں رنگ تھا لطافت تھی۔ اس کے برعکس شہزاد کے خیال میں تلخی تھی، غصہ تھا اور اس لیے شدت تھی۔ شہزاد نے اسے بے عزت کر کے اپنی محفل سے نکال دیا تھا۔ اس کے احساس خودی پر کاری زخم لگا تھا جسے یاد کر کے وہ تڑپتا تھا اور اس تڑپن، گداز اور شدت کی وجہ سے شہزاد کا خیال اس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔ ایلی دراصل ایک غم خور نوجوان تھا اور اس کا ایمان تھا کہ عشق کو محرومی اور غم سے تعلق ہے ______ اس کے برعکس مسرت اور خوشی محض عیاشی کا نام ہے۔ شہزاد سے ایلی کی محبت اب عشق میں بدل چکی تھی۔ اس سے آہیں بھرنا، ریت کے تودوں تلے بیٹھ کر رونا، [illegible] لینا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔

اس کے علاوہ شہزاد کا خیال آتے ہی اسے اپنے رقیب کا خیال آ جاتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوں گے۔ نگاہوں میں نگاہیں ڈالے ہاتھ میں ہاتھ دیئے وہ ہنس رہے ہوں گے۔ اشاروں میں باتیں کر رہے ہوں گے عہد و پیمان ______ اب وہ مل رہے ہوں گے۔ قریب اور قریب۔

ایلی کے دل پر ایک چوٹ لگتی۔ وہ گھائل ہو کر تڑپتا۔ اس تڑپنے میں اسے لذت میں اسے لذت محسوس ہوتی یا شاید دل ہی دل میں وہ انتقام لینے کے آرزو کو پال رہا ہو۔

دیپالپور میں پہلی مرتبہ اسے بچوں کو پڑھانے کا موقع ملا۔ لیکن دقت یہ تھی کہ وہاں کے بچے قطعی طور پر بچے نہ تھے۔ نویں جماعت کے طلبہ ایلی سے زیادہ طاقت

اور وہ قد میں لمبے تھے۔ پہلی مرتبہ جب وہ جماعت میں داخل ہوا تو انہیں دیکھ کر
حیران رہ گیا۔ لیکن جلد ہی وہ اپنے آپ میں کھو گیا۔ اسے اتنی فرصت نہ تھی کہ
دوسروں کے متعلق سوچے۔

اس کے ہم کار اساتذہ سب کے سب گویا ایک سانچے میں ڈھلے تھے۔ ان کی
چال ڈھال، بول چال میں یک رنگی اور مصنوعی وقار تھا۔ ان کی حرکات بھدی اور
بے جان تھیں۔ اور ان کے خیالات ایک ہی سمت میں چلتے تھے۔ ایلی نے شدت
سے محسوس کیا کہ وہ سب کولہو کے بیل تھے۔

محمود

سارے مدرسے میں صرف ایک شخص تھا جس کا انداز مختلف تھا۔ اس کا نام محمود تھا
اور وہ سکول کا کلرک تھا۔ شاید اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ وہ استاد نہ تھا۔ تو کیا اساتذہ کا
وہ رویہ اور انداز بچوں کو پڑھانے کے مشغلے کی قیمت تھی جو وہ ادا کر رہے تھے۔ ایلی
گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اس کے علاوہ محمود کی عمر بہت چھوٹی تھی۔ وہ عنفوان شباب میں تھا۔ اگرچہ اس کی
شادی ہو چکی تھی اور ایک بچی بھی تھی۔ محمود کا قد چھوٹا تھا اور اس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ بال
گھنے اور بھورے کالے تھے رنگ میلا میلا سا تھا بھنویں گھنی تھیں۔ پیشانی سے شدت کا
اظہار ہوتا تھا۔ ہونٹوں میں شرارت دبی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غصہ جھلکتا اور
بھنووں سے شوخی اور رندی ٹپکتا۔ اور ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ رومی ٹوپی جو وہ پہنتا تھا اور
نمازیں جو وہ باقاعدہ پڑھتا تھا محض جھوٹ تھیں۔

محمود کے کردار کا سب سے بڑا جزو جذبہ اور اس کی شدت تھی۔ یہ جذبہ گھڑی
کے پنڈولم کی طرح مذہب اور عورت کے درمیان گردش کرتا تھا ——— اس
کے علاوہ اس میں بے پناہ ذہانت تھی۔

محمود سے مراسم پیدا ہونے کی وجہ محض یہ تھی کہ ایلی کو جو مکان رہنے کے لئے ملا

وہ محمود کے مکان سے بالکل قریب تھا۔ ابتدا میں ایلی نے محمود کے لیے کوئی جاذبیت محسوس نہ کی تھی۔ نہ ہی وہ ایلی سے متاثر ہو سکا تھا۔ چند ایک مرتبہ ان کی ملاقات ہوئی پھر محمود نے آنا جانا شروع کر دیا۔ محمود کو صرف دو چیزوں سے دلچسپی تھی۔ ایک تو ایلی کی کتابوں سے اور دوسرے اس کے مکان کے جغرافیے سے۔ چونکہ اس کے چوبارے سے محلے کے بیشتر مکانات دکھائی دیتے تھے۔ محمود کو عورتیں دیکھنے کا شوق تھا اور عورتوں کے لیے اس کی شخصیت میں ایک انوکھی جاذبیت تھی۔ محمود کو دیکھ کر وہ چڑ جاتیں۔ انہیں یوں غصہ آنے لگتا جیسے انہیں چھیڑ دیا گیا ہو۔ پھر نہ جانے کس اصول کے تحت وہ غصہ دفعتاً روپ بدل لیتا اور عورت محمود کو ملنے کے لیے بڑی بے باکی سے باہر نکل آتی۔

ایلی کو محمود کی اس خصوصیت کا نہ تو علم تھا اور نہ اس سے کوئی دلچسپی تھی۔ ان کے میل ملاپ کی تمام تر وجہ انگریزی زبان تھی۔ اگرچہ وہ فقط میٹرکولیٹ تھا لیکن نہایت اچھی انگریزی زبان تھی۔ اگرچہ وہ فقط میٹرکولیٹ تھا لیکن نہایت اچھی انگریزی لکھتا تھا اور ایلی کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ محمود کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری کو دو مرتبہ یوں پڑھ چکا تھا جیسے ناول پڑھتے ہیں۔

چند ماہ دیپالپور رہنے کے بعد ایلی کو دھرم سالہ بھیج دیا گیا جہاں محمود کی جگہ پہاڑوں نے لے لی اور تو وہاں سے بیٹھنے کی بجائے وہ جنگل اور دیوداروں تلے بیٹھ کر آہیں بھرنے میں مصروف ہو گیا۔

دھرم سالہ سکول میں وہ اکیلا مسلمان ٹیچر تھا۔ چونکہ فارسی کا مولوی چند ایک ماہ ملازمت کرنے کے بعد ہی رخصت لے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہاں پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ مسلمان ہے۔ اس سے پہلے ایلی نے کبھی مذہب کے نقطہ نظر سے زندگی کو نہ دیکھا تھا بلکہ جہاں تک مذہب کا تعلق تھا وہ اس سے قطعی طور پر کورا تھا۔ اگرچہ دسویں جماعت میں اس نے کئی ایک روزے رکھے تھے اور زندگی بھر وہ عید کی

نماز پڑھنے جاتا رہا تھا۔

صرف علم ہی کی بات نہیں جذبے کے لحاظ سے بھی وہ مسلمان نہ تھا۔ پہلی مرتبہ جب منصور نے اس کے روبرو اپنے اسلامی جذبے کی وضاحت کی تھی تو اسے بات سمجھ میں نہ آئی تھی اگرچہ بات کی رنگینی سے متاثر ہوا تھا۔

اس روز وہ دونوں سفید منزل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ منصور نے جذبہ اسلام کی بات کی تو علی کی ہنسی نکل گئی۔ چونکہ منصور میں کوئی بات بھی اسلامی رنگ کی نہ تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ روزے نہیں رکھتا تھا اور عاشق مزاج تھا۔

علی نے طنزاً منصور سے کہا

"اچھا تو آپ مسلمان ہیں؟"

"بالکل۔" منصور جوش میں آگیا۔ "الحمد اللہ میں مسلمان ہوں۔"

"سمجھ میں نہیں آتا۔" علی نے کہا "آپ کیسے مسلمان ہیں۔"

"ٹھہریے۔" منصور ایک سیکنڈ کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "دیکھئے اگر اس وقت چھت پھٹ جائے اور جبرائیل اتریں اور کہے باری تعالے نے بھیجا ہے۔ فرمایا ہے کہ ناصر منصور کو ہمارا سلام پہنچا دو اور کہو کہ اسلام جھوٹا مذہب ہے اور عیسائیت سچی ہے۔ تو میں جبرائیل سے کہوں گا کہ باری تعلے کو میرا سلام دو اور کہو حضور کا ارشاد گرامی وصول ہوا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن ناصری منصور مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔"

علی اس نقطۂ نظر سے قطعی طور پر ناواقف تھا۔ صرف ناواقف ہی نہیں اس میں ایسے جذباتی نقطۂ نظر کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہ تھی۔ خصوصاً مذہب کے بارے میں۔ اس کے برعکس جذباتی طور پر وہ مسلمان ہونے پر شرمندگی محسوس کیا کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مذہبی نقطۂ نظر کا قائل ہونا ذہنی عدم تمدن کا اظہار کرنے کے مترادف ہے۔ اسی وجہ سے وہ نمائشی طور پر مذہب سے بے تعلقی اور بیزاری کا

اظہار کرنے کا مدعا وہ تھا۔ ورنہ مذہب کی بات کرنے میں دلچسپی نہ رکھتا تھا۔

رام دین

دھرم سالہ میں پہلی مرتبہ ایلی کو احساس ہوا کہ وہ مسلمان ہے۔

اس روز وہ حسب معمول پڑھا رہا تھا۔ پڑھاتے ہوئے اس نے پیاس محسوس کی۔

”دین محمد“ وہ چلایا۔ چونکہ اس کی جماعت میں صرف ایک مسلمان لڑکا تھا جو اسے پانی لا کر دیا کرتا تھا۔

اس روز دین محمد غیر حاضر تھا۔

”رام لال۔“ وہ بولا۔ ”مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔“

رام لال جوں کا توں اپنے ڈیسک پر کھڑا رہا۔

”تم جاتے نہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جی ماسٹر جی۔ میں ہندو ہوں۔“

”تو کیا ہوا؟“ ایلی چیخنے لگا۔

”جی میں بھرشٹ ہو جاؤں گا۔“

ایلی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ”دیکھو رام لال۔“ وہ اسے سمجھانے لگا۔ ”اگر تم میرے ہاتھ کا پانی پیو گے تو بے شک بھرشٹ ہو جاؤ گے لیکن اگر تم مجھے پانی لا دو تو اس میں بھرشٹ ہونے کی کیا بات ہے؟“

اس پر بھی رام لال جوں کا توں کھڑا رہا۔

”جاؤ نا۔“ ایلی کو غصہ آ گیا۔

”جی میں بھرشٹ ہو جاؤں گا۔“ وہ بولا۔

”اچھا تم جاؤ۔ مسٹنڈے۔“

ملک بھی چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

جمی کے دل میں ایک خلش تھی۔ اس نے جماعت کی طرف دیکھا۔ سبھی لڑکے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

جمی کی نگاہوں سے گویا پردہ ہٹ گیا۔

''میں مسلمان ہوں۔'' نہ جانے کون اس کے دل میں چیخ رہا تھا۔

''الحمد للہ کہ میں مسلمان ہوں۔'' آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جماعت سے باہر نکل گیا۔

اگلے روز جب وہ ارم دین کے تصور میں ڈبکیاں کھا رہا تھا کہ ڈاکیہ آ گیا اور اس نے ایک لفافہ جمی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لفافے پر غیر مانوس خط میں اس کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کس کا خط ہے۔ پتے بھی تو کئی ایک لکھے ہوئے تھے۔ علی پور کا پتہ۔ خانپور کا پتہ اور دھرم سالہ کا۔ جا بجا مہریں لگی ہوئی تھیں۔

اس نے خط کھولا۔ ایک چھوٹے سے کاغذ پر سرخی میں ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا کہ مجھ کو فراموش کر دیا

اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا اور اس نے لفافے کی مہریں پڑھنے کی کوشش کی۔ لفافے کی پشت صاف طور پر مہر لگی ہوئی تھی۔ گروکل ٹیٹ۔

''ارے۔'' اس کا دل ڈوب گیا۔ وہ خط کو سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

عجیب سی سیاہی تھی۔ نہ وہ سرخ تھی نہ ______ شعر کے نیچے ایک دھبہ سا پڑا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا وہ۔ خون۔ پھر اسے معلوم نہیں۔

وہ دھندلکا۔ وہ خلا۔

وہ بھول گیا کہ وہ ارم دین ہے۔ کمرے کی کارنس پر سادھوی کی مورتی رقص کرنے لگی۔ وہ رقص مسرت بھری حرکات سے عاری تھا۔ اس کے بال کھلے تھے۔ سیاہ لباس زیب تن تھا۔ نگاہوں میں حزن و ملال تھا۔ نرت میں اداسی اور غم کوٹ کوٹ کر

بھرا ہوا تھا۔

اس کے بعد میرا خیال ساوی پر مرکوز ہو گیا۔ شہزادوں کی صورت دھندلی پڑتی گئی۔ صفدر کے قہقہے بے معنی ہوتے گئے:

''ٹھیک ہے۔ اگر وہ صفدر کو چاہتی ہے تو ٹھیک ہے بلکہ اور بھی اچھا ہو۔ جان چھوٹی سو لاکھوں پائے۔''

سامنے ساوی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ دھرم سالہ کے سرسبز پہاڑوں پر دوڑ رہی تھی۔ مجھے بلا رہی تھی۔ میں نے سونٹا اٹھایا۔ کندھے پر بیگ ڈالا اور باہر نکل گیا۔

اسی طرح میں نے دو ماہ بسر کر دیے۔ وہاں وہ صرف دو ماہ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ دو ماہ پہاڑوں کی خاک چھانتا رہا۔ ساوی کے ساتھ وادیوں اور چوٹیوں پر گھومتا رہا۔

میں اسے کہتا: ''نہیں نہیں ساوی۔ میں نے تمہیں فراموش نہیں کیا۔ کیسے فراموش کر سکتا ہوں لیکن کیا کروں۔ میرے بس کی بات نہیں۔ کاش کہ تم والد صاحب کی رضامندی کی شرط نہ لگاتیں۔''

اور ساوی جواب میں کہتی ''میرا بس بھی تو نہیں چلتا۔ میں کیا کروں۔''

اور پھر ہم دونوں بانہوں میں بانہیں ڈال کر چل پڑتے جیسے اس مجبوری کو بھولنے کی کوشش میں سرگرداں ہوں۔

ہیڈ ماسٹر

دھرم سالہ کے بعد میری تعیناتی جاورا میں ہوئی اور میں جاورا چلا گیا۔ جاورا ملور کے قریب ایک مشہور قصبہ ہے۔ وہاں کا مدرسہ نہایت فراخ اور خوبصورت تھا اور اس کے ساتھ بہت فراخ گراؤنڈ اور باغ اور پارک ملحق تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک کالج ہو۔

جب پہلے روز علی نے سکول کا بینڈ دیکھا جس میں گیارہ بیگ پائپ بینیں بج رہی تھیں تو علی پر نشہ سا طاری ہو گیا۔

سب سے حیرت کن چیز جو جاور سکول میں نظر آئی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ علی نے کئی ایک سکولوں کے ہیڈ ماسٹر دیکھے تھے۔ وہ سب گویا ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر رسمی وقار اس قدر چھایا رہتا تھا۔ جیسے دور کا سفر کرنے کے بعد جوتے پر غبار کی تہہ جم جاتی ہے۔ غبار کی اس دبیز تہہ کی وجہ سے ان کے چہرے بے حس اور مردہ نظر آتے تھے۔ ان کی گردنیں گویا مکلّف ہوتیں جو بڑے تکلف سے حرکت کرتیں۔ آنکھیں نہ تو ہمدردی نہ شناسائی کی چمک سے واقف ہوتیں۔ وہ دیکھتی نہیں تھیں بلکہ کریدتی تھیں۔ نکتہ چینی کرتیں۔ وہ سب پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ ایک مخصوص انداز سے کھانستے۔ علی انہیں دیکھ کر لرز جاتا تھا۔ جھوٹے وقار کے حصول کے لیے وہ کتنی بڑی قیمت ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ پر زندگی حرام کر رکھی تھی۔ اور وہ سب علم کی دولت سے کورے تھے چونکہ ان میں طلب علم نہ تھی۔ طلب کیسے ہوتی جبکہ انہیں کامل یقین تھا کہ وہ جانتے ہیں۔ ان کے دلوں میں یہ شبہ کبھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ وہ جانتے ہیں شاید غلط ہو۔ شاید اس میں ترمیم کی ضرورت ہو۔ وقت کے تقاضے کے مطابق ردوبدل کی ضرورت ہو۔ انہیں دیکھ کر علی کے دل پر خوف مسلط ہو جاتا تھا۔ کہ ایک روز وہ بھی ہیڈ ماسٹر بن جائے گا۔ ہاتھ میں چھڑی تھام لے گا۔ آنکھوں سے دیکھنا چھوڑ کر گھورنا شروع کر دے گا اور بچوں کے دل میں ویسی ہی نفرت و حقارت پیدا کر لے گا۔

جاور سکول کا ہیڈ ماسٹر قطعی طور پر مختلف تھا اور یہ امر علی کے لیے باعث تعجب و مسرت تھا۔ اس کا نام شیخ مسعود تھا۔ وہ چالیس کے لگ بھگ ہو گا۔ جسم گٹھا ہوا۔ کلین شیو۔ آنکھوں میں جستجو اور چمک اور انداز میں ہیڈ ماسٹریت نام کو نہ تھی۔

"ہیلو صوفی صاحب" وہ علی کو دیکھ کر چلایا۔ "تو آپ ہیں ہمارے نئے

منیجر۔ اگر آپ تعیناتی کا خط نہ دیتے مجھے کچھ دیر اور تو میں کہنے ہی والا تھا کہ آپ کون سی جماعت میں داخل چاہتے ہیں۔" اس نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ "اب آپ ہی بتایئے صوفی صاحب۔ اگر سکول میں ایسے اساتذہ آ جائیں تو کس قدر مشکل ہو جاتی ہے۔ کیسے پتہ چلے کہ استاد کون ہے اور سٹوڈنٹ کون؟ خیر خیر مگر ایک بات ہے۔ آپ کی بات ہے میں کسی سے کہوں گا نہیں۔ یہ بتایئے کہ جماعت کو سنبھال بھی لیں گے۔" شیخ مسعود نے پھر قہقہہ لگایا اور پھر ایلی کی گھبراہٹ کو سمجھ کر فوراً بات بدلی۔ "اچھا وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے کھانا کیوں نہ کھا لیں۔ کہتے ہیں پہلے طعام پھر کلام۔ آپ یہ گھر سے میرا کھانا آیا ہوا ہے اور وہ مقدار میں اتنا ہوتا ہے کہ دو شخص پیٹ بھر کر کھا لیں پھر بھی بچ جاتا ہے۔"

شیخ مسعود باتیں کرتے ہوئے آگے آگے جا رہے تھے۔ ایلی ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

"لیکن ایک بات ہے۔" وہ ڈھکے ہوئے دسترخوان کے قریب جا کر کہنے لگے۔ "شرط لگا لو۔ اگر میری بیوی نے آج دال کے علاوہ کچھ بھیجا ہو۔ خدا کی قسم۔ بیگم واللہ سے کم نہیں۔ جب مہمان آتا ہو سو فیصدی دال پکاتی ہے۔"

یہ کہہ کر شیخ نے دسترخوان ہٹا دیا اور برتن کو دیکھ کر بے تحاشہ قہقہہ لگایا۔

"دیکھو صوفی صاحب۔ میں نے کہا نہ تھا۔ ہی ہی ہی۔" وہ قہقہے پر قہقہہ مارنے لگے۔

شیخ مسعود ایک عجیب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی طبیعت بیک وقت رنگی برنگی تھی۔ کبھی وہ اعلیٰ قسم کا سوٹ پہنے مدرسے میں آ جاتا اور انگریزی بولنا شروع کر دیتا۔ کبھی ململ پہنے وارد ہوتا اور دیہاتیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اسے کام کرنے کا جنون تھا اور وہ نکمے بیٹھنے سے بے حد خائف تھا جیسے اسے خود سے ڈر لگتا ہو۔ دفتر میں بھی کبھی نہ بیٹھتا بلکہ اساتذہ کو بلا کر اپنے گرد ایک بھیڑ لگا لیتا اور پھر ان سے بے

تکلف دوستوں سے باتیں کرتا۔ ان کے روبرو گالیاں دیتا۔ قہقہے لگاتا۔ گالی دینا اس کی عادت تھی۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ وہ غصے میں گالی دے رہا ہے یا بے تکلفی کے اظہار کے لئے یا ویسے ہی عادت پوری کرنے کے لئے۔ نہ جانے کس اصول کے تحت قہقہے لگاتے لگاتے دفعتاً وہ غصے میں آ جاتا اور پھر منظر ہی بدل جاتا۔ عام طور سے وہ بے تکلف گفتگو کے دوران میں اپنی طبیعت کی ستم ظریفی کے متعلق باتیں کرنے کا عادی تھا۔

"میں وہ ______ شخص ہوں۔" وہ گالی دے کر کہتا۔ "جو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے۔ خدا کی قسم۔ آج تک اپنی طبیعت کا منتر سمجھ میں نہیں آیا۔ افسوس تو یقین نہ کیجئے کہ ہنس رہا ہوں۔ اور غصہ۔ غصہ تو اس حد تک آتا ہے مجھے اور اس قدر آتا ہے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ایک بندوق خریدی تھی کہ چور اچکوں سے محفوظ رہوں لیکن اسے کھول کر اس کے کل پرزے الگ الگ صندوقوں میں بند کر رکھے ہیں کہ جب تک انہیں اکٹھا کر کے جوڑوں تب تک شاید غصہ اتر جائے ورنہ کبھی کر دے تو جہنم دہلی تو پہنچ سکے۔"

اس کی باتیں بے جوڑ ہوتی تھیں۔ بیٹھے بٹھائے اسے کوئی نہ کوئی خبط آ جاتا اور وہ فوراً اٹھ بیٹھتا اور اس خیال کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیتا۔

اس عجیب و غریب طبیعت کے باوجود علی کو شیخ مسعود بے حد پسند آیا لیکن دقت یہ تھی کہ شیخ مسعود علی کو کسی وقت بھی تو اکیلا نہ رہنے دیتا تھا۔ سکول بند ہوتا تھا تو وہ اسے بلا لیتا۔

"چلو صفی صاحب۔ تمہیں شہر دکھا لاؤں۔ بڑے بڑے دلچسپ لوگ ہیں یہاں۔"

"وہ دونوں شہر کی طرف چل پڑتے راستے میں شیخ چپس مانگتا جاتا اور ہر آتے جاتے سے ملتا اور بے تکلفی سے باتیں کرتا۔

رہے۔ چپکے چپکے وہ پوچھتا۔ آج بدھ ہے نا۔ آج تو مجھے چک میں جانا ہے۔ تانگے والے۔ شور مچا دیتا مگر پھر زبردستی ایلی کو تانگے میں سوار کر کے وہ چک میں کو چلے جاتے ہیں۔

شام کو جب وہ لوٹتے تو وہ زبردست ایلی کو پکڑ لیتا۔

"اب کھانا کھائے بغیر جانے نہ دوں گا"۔

کھانا کھانے کے بعد وہ کوئی قصہ چھیڑ لیتا اور ایلی سوچتا کہ کب بات ختم ہو اور وہ اجازت حاصل کرے۔

طبعی طور پر ایلی ایک تنہائی پسند تھا۔ اگرچہ سوسائٹی میں بیٹھ کر تو جاتا تھا اور بات بھی کر لیتا تھا لیکن اسے سوسائٹی میں بیٹھ کر سکون یا خوشی حاصل ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اس پر ایک اضطراب چھائے رہتا۔

اس کے علاوہ سادی اس کی منتظر رہتی تھی کہ کب اسے تنہائی حاصل ہو اور وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کریں۔

صرف اس وجہ سے ایلی چند ایک روز ہی میں شیخ مسعود کی مصاحبت سے اکتا گیا لیکن اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ زبردستی اپنے آپ کو الگ کر سکے۔ ویسے تو وہ بچتا تھا یا چوری چوری سرک جانے کی کوشش کرتا۔ سب کوششیں بےکار ہو جاتیں چونکہ شیخ مسعود اسے ڈھونڈ نکالتے اور پھر شیخ سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

ساتھی

جاوڑ میں ایلی نے صرف چند ایک ساتھی بنائے اور وہ سب مستقل طور پر شیخ کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ سکول کے اساتذہ بھی جہاں تک ممکن تھا اس سے دور رہنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ ایلی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر لوگ اس کے خلاف کیوں تھے حالانکہ شیخ کی شخصیت کے کئی ایک روشن پہلو تھے۔ ممکن ہے وہ ایک تاریک بھی ہوں۔ تاریک پہلو کس میں نہیں ہوتے۔

جاوداں میں سکول کے قریب ہی علی اور افضل نے مل کر ایک مکان لے رکھا تھا اور کام کاج کے لیے ایک نوکر رکھا ہوا تھا۔ افضل ڈاکخانے کا ایک کلرک تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا قد آور نوجوان تھا۔ مسلسل فکر کی وجہ سے اس کا چہرہ لمبا ہو چکا تھا۔ منہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں لیکن آنکھوں میں غم یا پریشانی کے بجائے شرارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہ تضاد کئی بار علی کو چونکا دیتا۔

افضل نچلا اور چپ چاپ بیٹھنے کا عادی نہ تھا۔ جب وہ بیٹھا ہوتا تو اضطراب کی وجہ سے اس کا پاؤں یا ٹانگ مسلسل حرکت کرتا جیسے مضطرب ہو۔ چہرے پر سوچ بچار اور فکر کے آثار چھائے رہتے اور وہ کوئی شعر گنگناتا رہتا۔ اسے اچھے شعروں سے والہانہ عشق تھا اور اسے سینکڑوں اچھے شعر یاد تھے۔

علی اسے پوچھتا،

"یار یہ کیا وجہ ہے؟ پیشانی سے تم فکر کرتے ہو۔ ٹانگیں اضطراب میں جلترنگ بجاتی ہیں۔ ہونٹوں پر گیت رہتا ہے اور آنکھیں نت نئی شرارت سے چمکتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟"

افضل مسکرا دیتا "بس دیکھ لو۔ جو موجود ہے حاضر ہے اور جو حاضر ہے اس میں حجت کیسی؟"

پھر ان کا پڑوسی شبیر تھا۔ شبیر سکول میں عربی اور فارسی پڑھاتا اور چھوٹی سی داڑھی رکھنے کے باوجود مولوی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے خوب صورت چہرے پر محبوبیت کی جھلک نمایاں تھی۔ نگاہوں میں شوخی تھی۔

اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ فرانس یا اٹلی کا باشندہ ہو۔ شبیر کی زندگی بیوی کے مرکز کے گرد گھومتی تھی بلکہ یوں کہیے کہ اسے مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ اس مرکز کے گرد گھومے۔ ممکن ہے اسے بھی اس مرکز سے کچھ لگاؤ ہو لیکن بظاہر سے کچھ لگاؤ ہو لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک بچہ ہو اور گھر والی اس کی دیکھ بھال کرتا ہے

فرض سمجھتی ہو۔ وقت پر اسے کھانا کھلاتی۔ وقت پر بستر پر لٹا کر سونے پر مجبور کر دیتی۔ مناسب لوگوں سے ملنے کی اجازت دیتی اور وہ بھی فقط مناسب وقت کے لیے۔ صرف ایسی جگہ جانے کی اجازت دیتی جہاں اس کے اخلاق پر برا اثر نہ پڑے۔

ایلی کو سب سے پہلے اس کا احساس اس روز ہوا جب وہ شبیر سے ملنے اس کے گھر گیا۔ وہ دونوں بیٹھک میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر دفعتاً اندر سے کسی نے چلا کر شبیر کو پکارا۔

"کون ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"بیگم چلا رہی ہے۔" شبیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو جا کر سن آؤ اس کی بات۔"

"پھر سہی۔" وہ بولا۔ "ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔" وہ پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

"دھڑ دھڑ ررررز م ——" قریب ہی ایک دھماکہ ہوا۔

"ارے۔" ایلی ڈر کر چلایا۔ "یہ کیا تھا؟"

شبیر کا منہ زرد ہو رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ زیر لب بولا۔ "بیگم نے پتھر کی سل دروازے پر دے ماری ہے۔"

"ارے۔" ایلی چلایا۔ "تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے روزمرہ کی بات ہو۔"

"ہاں۔" —— شبیر نے اثبات میں اشارہ کیا۔ "ہے۔"

"بیگم ہے یا پہلوان ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"دھڑام ——" دروازے پر پھر سل پڑی۔

ایلی اٹھ بیٹھا۔ "میں جاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "میرے شانوں پر تو صرف ایک ہی سر ہے یار۔"

اس کے بعد ایلی نے دیکھا کہ جب بھی شبیر ان کے ہاں آتا تو یوں دبے پاؤں داخل ہوتا جیسے چور ہو۔ ذرا سی آہٹ پر گھبرا جاتا۔

پھر ایک روز تو بالکل ہی بھانڈا پھوٹ گیا۔

ابھی شبیر کو آئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ گلی کا ایک لڑکا آیا۔

''شبیر صاحب کو گھر بلاتے ہیں۔'' وہ بولا۔

ایلی جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ شبیر جھٹ سے کونے میں جا چھپا اور اشارے سے ایلی کو کہنے لگا کہ کہہ دو شبیر یہاں نہیں آیا۔ لڑکے کے جانے کے بعد وہ کوٹھے پر چڑھ گیا اور دیوار پھاند کر ڈرائنگ ماسٹر کے گھر چلا گیا جس کے مکان کا دروازہ پرلی گلی میں کھلتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی چق کے پیچھے کھڑی ایلی کے مکان کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس لئے دوسری گلی سے گھوم کر گھر چلا گیا تاکہ بیگم یہ سمجھے کھڑی ایلی کے مکان کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس لئے دوسری گلی سے گھوم کر گھر چلا گیا تاکہ بیگم یہ سمجھے کہ کسی اور جانب سے آیا ہے۔ اس روز ایلی کو اندازہ ہوا کہ وہ فرنسیسی مولوی واقعی سکول کا بچہ ہو جو گھر سے چوری چوری آوارہ گردی کرنے کا عادی ہے۔

پھر ان کا پڑوسی ڈرائنگ ماسٹر جو طبعاً لاہور کا بھاماجھا تھا۔

اور وہ انگلش ماسٹر احمد تھا جو کلاس میں اونگھنے کا عادی تھا۔

اور جب محفل میں کوئی دلچسپ بات ہو رہی ہوتی تو اس کے دوران سو جایا کرتا تھا اور آخر میں تھا چودھری۔

چودھری کی بات بات تھرکتی تھی۔ اس کی بات میں دھار تھی اور نگاہوں کی مسکراہٹ قینچی کی طرح کاٹ دیتی تھی۔ سیدھی بات میں الجھاؤ ڈالنا۔ دوسروں کو بنانا اور پیچیدہ ترین مسئلے کو ہنسی میں ٹال دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔

ایلی کے یہ ساتھی اس کے شیخ کے ساتھ زیادہ میل ملاپ رکھنے کے حق میں نہ

تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شیخ مسعود قابلِ اعتماد آدمی نہیں۔ ایلی سمجھتا تھا کہ شیخ کے متعلق ان کے اندازے درست نہ تھے۔ اس کے علاوہ ان سب کی خواہش تھی کہ مل بیٹھیں۔ گپیں ہانکیں۔ تاش کھیلیں یا گھومیں پھریں۔ شاید اس لئے وہ ایلی کے شیخ سے زیادہ میل جول رکھنے کے خلاف تھے۔

جب اسکول میں آتے ہی ایلی کی حیثیت شیخ کے مصاحب کی طرح ہو گئی۔ وہ اس کا مشیر نہ بن سکتا تھا چونکہ شیخ اپنی مرضی کا مالک تھا اور کسی کے مشورے پر عمل کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسے کسی پر اعتماد نہ تھا۔ اس کے علاوہ ایلی اپنے احساس کمتری کی وجہ سے کسی کا مشیر نہ بن سکتا تھا۔

سکول سے فارغ ہو کر شیخ ایلی کو اپنے گھر لے جاتا۔ کہنے کو وہ ایلی سے کہتا،

"دو ایک خط لکھ لیں تو کیا حرج ہے۔"

اور پھر خود کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کرنا شروع کر دیتا۔ ساتھ ہی قہقہہ مار کر ہنستا:

"بھئی صفی! معلوم ہے میں دروازے کیوں بند کر رہا ہوں۔ جونہی مجھے خط لکھنے کا خیال آیا تو ساتھ ہی بے سوچے سمجھے میں نے دروازے بند کرنے شروع کر دیئے تاکہ خط لکھوں تو کوئی سن نہ لے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگتا۔

"تو کیا کافی دشمن خط لکھوانے ہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"نہیں تو" وہ ہنسنے لگا۔ "عام سرکاری خط ہیں لیکن میرے بہت سے مخفی دشمن ہیں۔ میری طبیعت ہی ایسی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری دنیا میری دشمن ہے۔ سب میرا بھید جاننے کی کوشش میں لگے ہیں۔ رات کو جب میں کمرے میں سوتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ ادھر سے مجھ پر وار کیا جا سکتا ہے۔ کھڑکیاں کھول کر نہیں سوتا چاہے کتنی گرمی ہو۔ چونکہ مجھے خیال آتا ہے کہ کوئی کھڑکی سے پستول چلا دے گا اور خود بھاگ جائے گا۔" شیخ مسعود ہنسنے لگا۔ "میری طبیعت ہی ایسی

ہے۔"

اس قسم کی باتیں سن کر ایلی کو شیخ پر ترس آتا تھا اور ساتھ ہی ڈر بھی۔ اس حد تک شکی اور بد اعتماد شخص پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا! وہ سوچتا۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ایلی کی طبیعت میں شیخ کے لئے نفرت پیدا ہوگئی اور شیخ ایلی پر شک کرنے لگا اور جابراتیں ایلی کی زندگی کا دھارا کسی اور رخ پر بہنے لگا۔

پاگل مولوی

نہ جانے ایک روز بیٹھے بٹھائے شیخ کو کیا سوجھی ایلی سے کہنے لگا

"مفتی۔ آؤ تمہیں تماشہ دکھائیں۔"

شیخ اسے دفتر میں لے گیا۔ پھر اس نے مولوی رحمت اللہ عربی ماسٹر کو بلا بھیجا۔ پہلے تو عربی ماسٹر سے اس نے چند ایک سوال کئے پھر جوش میں آ کر انہیں ڈانٹنے لگا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔

جیسے پٹاخے کو آگ دکھا دی گئی ہو ———— شیخ مسعود نے انہیں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ غلیظ گالیاں۔

اس پر عربی ماسٹر کا رنگ فق ہو گیا۔ انہوں نے بولنے کی کوشش کی لیکن زبان سے مہمل آوازوں کے سوا کچھ نہ نکلا۔ ظاہر تھا کہ شدت غصہ اور بے بسی کی وجہ سے مولوی صاحب کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جوں جوں ان کی حالت غیر ہوتی توں توں شیخ کا جوش بڑھتا۔

آخر مولوی صاحب کے لئے حالات ناقابل برداشت ہو گئے۔ ناقابل برداشت تو ہو چکے ہی تھے لیکن مولوی صاحب کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ مزید بے عزتی سے بچنے کے لئے وہ کمرے سے باہر چلے جائیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ دروازے کے باہر اساتذہ اور طلبہ کی بھیڑ

لگی ہے تو انہیں مزید بے عزتی کا احساس ہوا اور اس قدر صدمہ ہوا کہ بے ہوش ہو کر
گر پڑے۔

مولوی رحمت اللہ جاوید ایک معزز شخص تھے۔ صوم و صلوۃ کے پابند تھے۔ اکثر جمعہ کے روز جامع مسجد میں خطبہ پڑھتے۔ کم گو تھے۔ مدرسے کا کام بڑی محنت سے کرتے تھے۔

جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے غصے میں ڈویژنل انسپکٹر کو ایک پرچہ بہت خط لکھ دیا جس میں انہوں نے اس واقعہ پر علی بھی بھونچکا رہ گیا۔ یہ کیا تماشا تھا؟ کیا یہ واقعی شیخ کے بیہودہ مذاق کی حیثیت رکھتی تھی؟ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اسے سوچ بچار میں کھوئے دیکھ کر شیخ بھی تاڑ گیا کہ ضرور مولوی کے واقعہ نے اس پر گہرا اثر کیا ہے۔ یہ محسوس کر کے شیخ نے علی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے مولوی صاحب کا تذکرہ شروع کر دیا۔

”یہ مولوی لوگ بھی عجیب لوگ ہیں۔“ وہ بولا۔ ”انسان تو بھی مسئلے مسائل میں الجھ جائے کہ اسے یہ تمیز ہی نہ رہے کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ مولوی خود تو بے حد شریف اور بے زبان ہے لیکن اس کی بیوی اس کی شرافت اور بے زبانی کا خاطر خواہ فائدہ حاصل کرتی ہے۔“ شیخ نے قہقہہ مارا۔ ”ادھیڑ عمر کی عورت خود کیا فائدہ حاصل کرے گی لیکن اس کی بیٹیاں جو ______“ شیخ نے علی کو آنکھ ماری اور پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

علی کو اس کی ہنسی بری لگی لیکن اس میں اس قدر جرات نہ تھی کہ علانیہ احتجاج کرتا۔ بہرحال اس شام علی ہنستا ہنستا رہا اور شیخ ہر ممکن طریقے سے دلچسپ اور مزیدار باتیں سنا کر اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

جب علی گھر پہنچا تو وہاں تمام ساتھی بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب غصے میں تھے۔ علی پر وہ یوں برس پڑے جیسے مولوی کی بے عزتی اس کی وجہ سے ہوئی

ہو۔ فضل غصے سے کانپ رہا تھا شیخ کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور اس روز وہ بھول گیا کہ اس کی بیوی دیکھ رہی تھی کہ وہ علی کے مکان میں بیٹھا ہے۔ سمیع شیخ کو گالیاں دے رہا تھا۔ حمید سر جھکائے بیٹھا تھا اور چودھری مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ تمام شرارت الیاس آفندی کی ہے۔"

پانچ چھ روز کے بعد ڈویژن انسپکٹر سے دو خط موصول ہوئے۔ ایک تو شیخ کے نام تھا جس میں لکھا تھا کہ جواب دے کہ اس نے ایسا سلوک مولوی سے کیوں روا رکھا اور دوسرا خط ہیڈ ماسٹر کے توسط سے مولوی صاحب کے نام تھا جس میں ان سے اس امر کی جواب طلبی کی گئی تھی انہوں نے براہ راست انسپکٹر کو خط کیوں لکھا۔

شیخ نے اپنے نام کے خط کے متعلق تو کسی سے تذکرہ نہ کیا لیکن مولوی صاحب کے خط کی اس قدر تشہیر کی کہ بچے بچے کو علم ہو گیا کہ انسپکٹر نے الٹا مولوی صاحب کو ڈانٹا ہے۔

اس روز رات کو شیخ علی کو اپنے گھر لے گیا۔ کہنے لگا

"بھئی آفندی۔ میں سمجھتا ہوں مولوی صاحب سے زیادتی ہوئی ہے۔ ایک تو اس روز میں نے انہیں برا بھلا کہا حالانکہ وہ محض مذاق تھا۔ مجھے یہ نہیں کرنا چاہئے تھا اور اب انسپکٹر نے ان سے جواب طلبی کی ہے۔ بےچارہ بہت جلے گا۔"

علی کو موقع مل گیا۔ بولا "ہاں آپ نے واقعی مولوی صاحب سے زیادتی کی تھی۔"

"تو اب کسی طرح اس کا تدارک کریں۔" شیخ نے ہنس کر پوچھا۔

"کریں تو بہتر ہے۔" علی نے کہا۔

"تو میں معافی مانگ لوں۔" شیخ چلایا۔

علی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔ بشرطیکہ وہ کاغذ اپنے ہاتھ سے لکھ

دے کہ میں نے صدقِ دل سے معاف کر دیا۔"

شیخ کی یہ بات سن کر علی کے دل میں پھر سے اس کے لیے احترام پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد مسلسل دو روز سارا سٹاف مولوی صاحب کی منتیں کرنے میں لگا رہا کہ شیخ کو معاف کر دیں اور تحریر لکھ کر دے دیں۔ مولوی صاحب اس پر آمادہ نہ تھے لیکن آخر کار انہوں نے مولوی صاحب کو مجبور کر دیا اور انہوں نے یہ تحریر لکھ دی کہ اگرچہ شیخ کا طرزِ عمل نازیبا تھا تاہم ان کا راضی نامہ ہو گیا ہے اور انہوں نے شیخ کو معاف کر دیا ہے۔

یہ تحریر حاصل کرنے کے بعد شیخ نے سکول بند ہونے پر مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں بلایا جب سب اساتذہ اور طلبا جا چکے تھے اور پھر انہیں بے تعداد فحش گالیاں دیں اور جان بوجھ کر ایسے سخت کلمات کہے کہ وہ پھر غصے میں آ کر انسپکٹر کو شکایت کریں۔ شیخ کا یہ قدم سوچے سمجھے پلان کے مطابق تھا۔ بلکہ ایک چپڑاسی کو آگ لگانے کے لیے ان کے گھر بھیجا۔ چپڑاسی نے مولوی صاحب کو بتایا کہ انسپکٹر نے شیخ کی جواب طلبی کی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ مولوی صاحب شیخ کے خلاف شکایت کا ایک اور خط لکھیں۔ جب اسے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مولوی صاحب نے دوسرا خط لکھ دیا ہے تو شیخ نے انچارج کو اپنی طرف سے خط لکھا جس کا نفسِ مضمون یہ تھا:

"مولوی رحمت اللہ میرے باپ کی جگہ ہیں ان کی عزت کرتا ہوں۔
عرصہ چھ ماہ کا ہوا کہ وہ منت سے منہ کے بل گر پڑے تھے۔ ان کے سر
پر چوٹ آئی تھی جب سے ان کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔ کبھی کبھی
بے وجہ ناراض ہو جاتے ہیں اور پھر خود ہی مجھے معاف کر دیتے ہیں۔
غالباً وہ جوہر میں رہنا نہیں چاہتے۔ اس کی وجہ خانگی امور ہیں۔ بہرحال
میں نہیں چاہتا کہ ان کی بہتری میں حائل ہوں۔ مولوی صاحب کا معافی نامہ

رسالِ خدمت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے مجھے معاف کر دیا۔
اگرچہ میں نے کوئی گستاخی نہیں کی تھی۔ سہواً کوئی بات منہ سے نکل گئی
ہو جسے غلط فہمی کی وجہ سے انہوں نے برا مان لیا ہو تو مجھے علم نہیں۔"

یہ معروف ولایت سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر نئے نئے ہندوستان میں آئے تھے اور آتے ہی کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ پھر چند ماہ کے بعد محکمہ میں ڈویژنل انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ وہ ایسے ہتھکنڈوں سے واقف نہ تھے اور چونکہ طبعی طور پر کسی کا برا نہیں چاہتے تھے لہٰذا شیخ مسعود کے اس خط سے جو مولوی رحمت اللہ کے دوسرے شکایتی خط کے ساتھ موصول ہوا تھا انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی مولوی صاحب کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔ انہوں نے مولوی صاحب کے ساتھ بے حد ہمدردی محسوس کی۔ اپنے ڈپٹیوں کو بلا کر انہیں ساری بات سمجھائی کہ وہ دورے پر جائیں تو کوئی مناسب مقام تلاش کریں جہاں مولوی صاحب کو تبدیل کیا جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں بھی ڈپٹی یا معروف جاتے کمال ہمدردی سے کہتے:

"ہمارے ایک عربی مولوی ہیں جو بڑے معزز اور شریف آدمی ہیں۔ بس ذرا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ان کا۔ اگر آپ انہیں اپنے سکول میں لے لیں تو کیا اچھا ہو۔"

افسران کی اس بے پناہ ہمدردی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب کی دیوانگی پر مہر ثبت ہو گئی اور ڈویژن کے کونے کونے میں مولوی صاحب کے دماغی عارضے کا پرچار ہو گیا۔ حضرت شیخ مسعود نے اسے ہوا دی۔

مولوی صاحب کی بیگم کے کانوں تک بات پہنچی تو اس نے سر پیٹ لیا۔ کہنے لگی

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ وہ باؤلا ہے کوئی مانتا ہی نہ تھا۔"

یہ بات ان کی بیوی کے حق میں تھی چونکہ وہ مولوی صاحب سے الگ آزادی میں رہنا چاہتی تھی۔ اسے بہانہ مل گیا۔ ایک روز دفعتاً اس نے شور مچا دیا جب مولوی صاحب وظیفہ پڑھنے میں مصروف تھے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اس پر بیگم نے چیخ

بدلا۔

''دہائی خدا کی، یہ لوگوں کو کھانے کے لیے جائے نماز پر جا بیٹھا ہے۔''

یہ تو بہر صورت تمہید تھی۔ بیگم نے محلے کے چار بزرگوں کو بٹھا کر کہا کہ میں تو ہرگز اس دیوانے کے ساتھ نہ رہوں گی۔ اور یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ الگ رہ کر رہے اور مولوی صاحب انہیں باقاعدہ خرچ بھیجتے رہیں۔ اس فیصلے کے بعد وہ بچیوں کو لے کر چلی گئی اور مولوی صاحب تن تنہا رہ گئے۔

حالات کو یوں بدلتے دیکھ کر مولوی صاحب بھونچکے رہ گئے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بیٹھے بٹھائے چاروں طرف آگ سی کیوں لگ گئی ہے۔ کیوں لوگ انہیں پاگل سمجھنے لگے ہیں۔ حیرت اور گھبراہٹ سے ان کی شکل و صورت میں دیوانگی کی جھلک پیدا ہو گئی۔

شیخ مسعود وہ آدمی تھا جو حالات کے رخ کو سمجھ رہا تھا۔ مولوی صاحب کا ذکر آ جاتا تو وہ قہقہہ لگاتا اور خوش ہوتا جیسے کسان اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹتے وقت خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ شیخ اپنی اس کارروائی پر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اپنی اس صناعی میں مزید بیل بوٹے کاڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے اپنے ایک سکھ شاگرد سوہن سنگھ کو جو سکھوں کے ایک چھوٹے مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر بن چکا تھا اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مولوی صاحب کو اپنے سکول میں رہنے کی پیش کش کر دے اور بعد میں ذرا ان کے مزاج صاف کرنے کا انتظام کرے۔

انسپکٹر صاحب کو بھلا بات کی حقیقت سمجھنے کی کیا ضرورت تھی وہ تو صرف نظم و نسق چلانے پر مامور تھے انہوں نے سکھ ہیڈ ماسٹر کے اس اقدام کی تعریف کی اور مولوی رحمت اللہ وہاں تبدیل کر دیے گئے۔ ہیڈ ماسٹر سوہن سنگھ کے توسط سے مولانا کو چھوٹی سی کوٹھڑی مل گئی۔ اور وہ وہاں کسمپرسی کے عالم میں جا پڑے سوہن سنگھ نے پہلے ہی

چک میں مشہور کر دیا کہ ان کے دماغ میں کچھ فتور ہے۔

ایک روز مولانا نے جوشِ اسلام میں آ کر باآوازِ بلند اذان فرما دی۔ سوبھا سنگھ کا اشارہ تو پہلے ہی موجود تھا۔ لوگ مولوی صاحب پر پل پڑے۔ انہوں نے پیٹ پیٹ کر انہیں ادھ موا کر دیا اور کوٹھڑی سے ان کا سامان نکال کر باہر پھینک دیا۔ سامان کیا تھا۔ ایک بستر ایک لوٹا ایک جائے نماز اور ایک تسبیح۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ چک سے نکالا ملنے کے بعد مولوی صاحب نے عالمِ مجبوری میں علاقے کی اس واحد مسجد میں قیام کیا جو وہاں سے چار میل دور بر سرِ راہ مسافروں کے نماز پڑھنے کے لئے بنائی گئی تھی اور جو چار مربع فٹ اینٹوں کے چبوترے پر مشتمل تھی۔ اس علاقے میں صرف وہی پناہ گاہ انہیں مل سکی۔ انہوں نے اپنا سامان وہاں رکھ دیا اور خود اللہ کی یاد میں بیٹھ گئے۔ پھر ایک روز سوبھا سنگھ کے اشارے پر کوئی ان کا بستر غائب کر گیا۔ جب وہ سکول سے واپس آئے تو بستر کا کچھ پتہ نہ تھا۔ رات کو سردی کی وجہ سے وہ ٹھٹھر گئے اور اگلے روز سکول میں لڑکے ان کے آتے جاتے انہیں چھیڑ رہے تھے۔

"پاگل پاگل۔"

پھر معلوم نہیں کہ انہیں کیا ہوا۔ زمین نگل گئی یا آسمان نے ڈھانپ لیا۔

سازش

مولوی صاحب کے اس المیے پر میں ششدر رہ گیا۔ ملازمت کی دنیا سے متعلق یہ پہلی جھلک تھی جو میں نے دیکھی تھی۔ ملازمت میں سازش کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ آج تک وہ زندگی کو گویا کنارے پر بیٹھ کر دیکھتا رہا تھا۔ اس کے روبرو منشی اولڈ سکول کا ٹیچر کھڑا چھڑی ہلا رہا تھا۔

"بھول جاؤ۔ جو کچھ تم نے پڑھا ہے سب بھول جاؤ۔ کتابوں کی دنیا کو فراموش کر دو۔" وہ چھڑی آگے بڑھا رہا تھا۔ "یہ لو اسے استعمال کرنے میں دریغ کیا تو پٹ جاؤ گے۔"

دوسری طرف شیخ مسعود قہقہے مار کر ہنس رہا تھا

"دیکھ لیں یہ تماشہ دیکھا آپ نے۔ یہ بیوقوف کہیں کا۔ میری شکایت کرتا ہے۔ میری۔ بکری کا بچہ جنگلی سور سے کھیلنا چاہتا ہے۔ بے وقوف دیوانہ۔"

ایک طرف مولوی خود کھڑا تھا۔ اس کا چہرا بھیانک ہو رہا تھا۔ آنکھیں کھنچ گئی تھیں۔ ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ "یا اللہ" وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "یا اللہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"یا اللہ۔" علی دانت پیس کر بولا۔ "یہ تیری دنیا ہے کیا۔"

اللہ تعالیٰ کے خلاف اسے ایک اور شکایت پیدا ہو گئی اس زمانے میں وہ اس مشہور شعر کا قائل تھا۔ انسان پر ایک اور ظلم۔ اللہ تعالیٰ کی ایک اور توہین۔

"سور۔ سور ____ جنگلی سور۔" علی کے کانوں میں آوازیں آ رہی تھیں۔ گھر میں اس کے تمام ساتھی غصے سے بھرے بیٹھے تھے۔"

"اب ہمارے ہاتھ سے بچ کر نہ جائے۔" فضل کی ٹانگ ہل رہی تھی۔ آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

"وہ چال چلو۔" چودھری مسکرا رہا تھا۔ "کہ زندگی بھر شیخ کو معلوم نہ ہو کہ کون چال چل گیا۔ بس چاروں شانے چت کر دو۔"

اس رات دیر تک علی کے مکان پر کانفرنس ہوتی رہی۔ طے پایا کہ فوری قدم کیا جائے مگر شیخ کو علم نہ ہو کہ وار کدھر سے ہو رہا ہے ورنہ اگر وہ خبردار ہو گیا تو حملہ کرے گا اور اس میں حملہ کرنے کی عظیم صلاحیت ہے۔ جب ہمارے تمام لوگ مل کر بھی علانیہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

حملے کی تمام تفصیلات کو طے کر کے علی کے ذمے کر دیا گیا۔

اس کے بعد علی اور فضل کا گھر سازش کے اڈے میں بدل گیا۔ فضل کی آنکھوں میں پھلجھڑیاں چھوٹ گئیں جیسے بطخ تالاب میں آ پہنچی ہو۔ چودھری کے گال بھر

واقع ہوئی ہے کہ فضا کو سونگھنے سے نہیں چوکتا۔ جب وہ ہو جائے گا پھر تو وہ ساری ساری رات بستی کے چکر کاٹے گا جیسے مسلمان بادشاہ بھیس بدل کر رعایا کا حال جاننے کے لئے گھوما کرتے تھے۔"

"بھئی یہ تو ٹھیک ہے۔" افضل بولا۔

"اور اس گھر میں جو بات ہوتی ہے وہ آدھی گلی تک سنائی دیتی ہے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چندہ کر کے ایک پرانا ہارمونیم خرید لیا گیا۔ چند ایک تاش کی گڈیاں منگوائی گئیں۔ جب بھی بحث کا آغاز ہوتا تو ایک آدمی ہارمونیم بجانے پر تعینات کیا جاتا تاکہ باجے کے شور میں بات سنائی نہ دے اور سازشی ہر وقت تاش کے پتے تھامے رہتے تاکہ کوئی آ جائے تو سمجھے تاش کھیلنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کہیں سے ایک پرانا ٹائپ رائٹر حاصل کیا گیا اور شیخ کے خلاف گمنام چٹھیوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

ان چٹھیوں کا انداز انوکھا تھا۔ ایلی نے التزاماً انہیں یہ شکل دی کہ وہ عام گمنام چٹھیوں سے ہٹ کر رہیں تاکہ افسران بالا انہیں دلچسپی سے پڑھیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ نہایت مختصر ہوتیں اور زبان میں فقرے بازی انداز مفقود ہوتا۔ کوشش کی جاتی ان میں مزاح کا رنگ غالب رہے مظلومیت اور شکایت کا عنصر نہ ہو۔

ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ کو روز ایک چٹھی لکھی جاتی جس کا مستقل عنوان پٹیشن تھا۔ مستقل عنوان کے نیچے ایک ذیلی عنوان ہوتا۔ اس کے نیچے سیریل نمبر اور نیچے نفس مضمون۔ مثلاً

فلاں سال میں ۲۰۰ روپیہ بہار ریلیف فنڈ اکٹھا کیا گیا۔ چار صد روپیہ سرکاری بنک میں جمع کر دیا گیا۔

باقی چھ سو روپیہ کیا ہوا؟

باقی چھ سو روپیہ کیا ہوا؟

شیخ اور گھبرا گیا۔ "مجھے معلوم نہیں۔ میں نہیں سمجھا۔" وہ بولا۔

"آپ سمجھتے نہیں جانتے ہیں لیکن کسی سے کہتے نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔ اور شیخ کو مزید پریشانی سے بچانے کیلئے اس نے بات کی وضاحت کی۔ "دیکھئے شیخ صاحب۔" وہ بولا۔ "گزشتہ دو تین روز سے آپ پریشان ہیں۔ آپ کا چہرہ۔ آپ کی چال ڈھال، آپ کی باتیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ کوئی اہم واقعہ ہوا ہے جس کی وجہ سے آپ گھبرائے ہوئے ہیں اور سوچ بچار میں پڑے ہیں۔ صرف آپ کی زبان خاموش ہے۔ باقی تمام اعضاء چلا چلا کر وہ راز کہہ رہے ہیں لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ وہ راز آپ نے دل میں چھپا رکھا ہے۔" ایلی ہنسنے لگا۔

شیخ کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔ "کیا واقعی؟" وہ بولا۔ "تو کیا آپ اسی لئے مجھ سے ناراض ہیں؟"

"ناراض اس لئے ہوں۔" ایلی نے کہا۔ "کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں اور آپ مجھے بات نہیں بتا رہے۔"

شیخ نے قہقہہ لگایا۔

"اب ہنستے نہیں شیخ صاحب۔" ایلی جلال میں آ کر بولا۔ "بیکار راز رکھنے کا فائدہ جس کا آپ کے جسم کا بند بند اعلان کر رہا ہے۔"

"نہیں۔" ایلی بولا۔ "مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ آپ کوئی اہم بات چھپا رہے ہیں جسے آپ بہت اہم سمجھتے ہیں۔ اگرچہ مجھے اسے جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ صرف یہ بتائیے جس پر آپ کو اعتماد ہے۔"

"اعتماد تو مجھے کسی پر بھی نہیں۔" شیخ ہنسنے لگا۔

"تو نہ بتائیے۔ لیکن پھر یہ بھی ضروری ہے کہ آپ ضبط سے کام لیں اور یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ کوئی چیز اندر آپ کو کھائے جا رہی ہے۔"

شیخ کھسیانہ ہو گیا۔

علی ڈرتا تھا کہ کہیں شیخ اسے اس امر میں راز داں نہ بنا لے۔ کس حد تک وہ ہر رول ادا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ بہر حال اس کی باتیں سن کر شیخ اور بھی گھبر گیا اور علی کو شیخ سے دور رہنے کا جواز مل گیا۔

مسلسل ایک ماہ کی جواب طلبیوں پر شیخ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اسے شک تو ہر استاد پر تھا لیکن اسے یہ ثبوت نہ مل سکا کہ کون اس کے خلاف خط لکھ رہا ہے اور شکایت کی نوعیت اس قسم کی تھی کہ ان کا جواب اس سے بن نہ آتا تھا۔ اس کے اپنے ہتھکنڈے سب فیل ہو چکے تھے۔

شاید اسی وجہ سے اس نے ایک نیا طریقہ کار آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک خصوصی سٹاف میٹنگ بلائی اور اساتذہ کو جمع کر کے سب کے سامنے اس نے وہ راز فاش کر دیا۔

"حضرات۔" وہ بولا۔ "یہ میٹنگ میں اس لئے منعقد کی ہے کہ میں آپ سے براہ راست مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ کوئی شخص میرے خلاف مسلسل شکایات لکھ کر بھیج رہا ہے۔ اس معاملے کو چلتے ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جس صاحب کو مجھ سے شکایت ہے اور یہ مہم چلا رہا ہے وہ میرے روبرو آ جائے اور میں حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں اس کے خلاف کوئی کاروائی نہ کروں گا۔ بلکہ میں اس سے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں اور اس کی جائز شکایت دور کرنے کی کوشش کروں گا۔"

شیخ یہ کہہ کر رک گیا۔ تمام اساتذہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ دیر تک وہ انہیں نگاہوں سے کریدتا رہا۔

علی اٹھ بیٹھا۔

"میں دو ایک باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

"پوچھیے آصفی صاحب۔"

"یہ بتائیے کہ شکایات کی نوعیت کیا ہے؟"

ایک ساعت کے لئے شیخ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر حسب عادت بات ٹالنے کے لئے اس نے کہا

"بس معمولی قسم کی شکایات۔ ادھر ادھر کی۔"

"لیکن حضور۔" چوہدری فوراً بول کر کہنے لگا۔ "ایسی گمنام شکایات کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ کرنے دیجئے۔ خود ہی تھک کر رک جائے گا۔"

"آپ کو کسی پر شک ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"شک تو مجھے صفی صاحب آپ پر بھی ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

سارا سٹاف قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"یہ درست ہے۔" شیخ نے وضاحت کی۔ "جدید انگریزی میں لکھے جاتے ہیں اور جدید ترین ٹیچر اس سکول میں صرف آپ ہیں۔ اور انسپکٹر صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ ان دونوں کے نام بھیجوں جن پر مجھے شک ہے۔"

"ہاں ہاں تو ضرور لکھئے میرا نام۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تو پھر قبول کرو نا کہ تمہیں مجھ سے شکایات ہیں۔" شیخ ہنسنے لگا۔

"ہاں۔ مجھے آپ سے دو شکایات ہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "پہلی شکایت یہ ہے کہ آپ نے دو ماہ تک ہم سے یہ بات چھپائے رکھی ورنہ شاید حالات اس حد تک نہ بگڑتے اور دوسری شکایت یہ کہ آپ ہم سے تو مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم آپ پر اعتماد کریں لیکن آپ کو ہم سے کسی شخص پر اعتماد نہیں۔"

سارا سٹاف حیرت سے ایلی کی طرف دیکھنے لگا۔

مسٹر معروف

عین اس وقت تار والا ڈاکیہ داخل ہوا اسے دیکھ کر شیخ زمرد گھبرا گیا۔

"کیوں؟" وہ بولا۔ "کوئی تار ہے کیا میرے واسطے۔"

"نہیں جی۔" وہ بولا۔ "یہاں آصفی کے نام کا ہے۔" اس نے ایک تار ایلی کی طرف بڑھا دیا۔

ایلی نے تار کھول کر پڑھا۔

"کیوں خیریت تو ہے؟" شیخ نے پوچھا۔

"جی بالکل۔" ایلی نے جواب دیا۔ "والد صاحب نے مجھے خان پور بلایا ہے۔"

"خیر سے بلایا ہے کیا؟"

"لکھا ہے مسٹر معروف تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"مسٹر معروف تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن کیوں؟"

"مجھے نہیں علم۔" ایلی نے جواب دیا۔ "والد صاحب کو کسی طرح سے جانتے ہیں۔ شاید میری تعیناتی کی بات ہو کوئی۔"

ایلی خان پور پہنچا تو گھر میں سب لوگ اطمینان سے بیٹھے تھے۔ اس کا خیال تھا نہ جانے کتنی اہم بات ہو جس کے لئے مجھے بلایا ہے۔ شاید مسٹر معروف کو شک پڑ گیا ہو کہ وہ جاورہ ڈیمن کا ایڈیٹر ہے یا کسی نے بھید کھول دیا ہو۔ ممکن ہے شیخ مسعود نے خود شکایت کی ہو۔ بہر صورت بات اہم تھی لیکن وہاں جا کر اس نے محسوس کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"اچھا ایلی آیا ہے۔" علی احمد نے اس کی آمد کی خبر سن کر کہا۔ "بہت اچھا کیا جو آگئے۔ یہ ایلی تو [illegible] گویا جاورے کا ہی ہو کر رہ گیا۔"

"معروف صاحب کی کیا بات ہے؟" ایلی نے دبی زبان سے پوچھا۔

"ابھی مجھے تو معلوم نہیں۔ تم تو جانتے ہو اپنے ان سے تعلقات ہیں۔ سبھی افسر عزت کرتے ہیں۔ وہ تو اپنا سمجھو لو۔ یہ ان کی محبت ہے ورنہ۔۔۔ خیر خیر تو وہاں چائے پارٹی پر بیٹھے جاتے۔ اتفاق سے جاورے کی بات چل پڑی تو میں نے ڈپٹی

کمشنر صاحب سے کہا ہمارا ارادہ ہے وہاں جانے کا۔ اپنا لڑکا ہے نا وہاں۔ اس بات پر مسٹر معروف چونکے۔ اچھا تو الیاس وہاں ہے آج کل۔۔ آپ ہی نے تو تعیناتی کی تھی۔ میں نے جواب دیا۔ اس پر وہ بولے۔ تو اسے بلاؤ وہ ایک دن یہیں اور جب وہ یہاں آئے تو ذرا میری کوٹھی پر بھجوا دینا۔ ہی ہی ہی۔" علی احمد ہنسنے لگے۔ "وہ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ سبھی افسر تمہیں جانتے ہیں۔ کبھی کبھار کمشنروں میں تمہارا تذکرہ آ جاتا ہے نا اس لئے۔ دوست جو ہوئے اپنے۔ کیوں نصیر کی ماں۔ تو کیا دیکھ رہی ہے یوں۔ جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو بات کو۔ میں تو اب بالکل بے کار ہے۔ سمجھ کا خانہ ہی جو نہ ہو تو پھر کوشش بے کار ہے۔ ہی ہی ہی۔ کیوں شمیم۔ کیا یہ غلط ہے۔ ہی ہی ہی۔"

"اچھا بھئی کل آج شام کو تم معروف صاحب سے ضرور مل لینا۔ نئی کوٹھی سے واقف ہو نا۔ وہی کی دوکان کے بائیں ہاتھ صدر میں۔ تم شام کو آٹھ بجے پہنچ جانا ورنہ وہ کلب وب چلے جاتے ہیں۔ بیرے کو بتا کر دینا میں آصفی صاحب کا بیٹا ہوں۔ وہ مجھے جانتا ہے جب جاؤں بڑی خاطر مدارت کرتا ہے جہلمیہ ہے نا۔ یہ جہلمیے بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں اور معروف صاحب کو یاد دلا دینا کہ تم آصفی صاحب کے بیٹے ہو ورنہ شاید نہیں یاد رہے۔ ہی ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگے۔ "یہ ہو کر تمہیں وہاں جا دیں۔ ہی ہی ہی ہاں ابھی تم جیسے ماتحت تو ان کے سینکڑوں ہیں۔ بے چارے ملنے کو ترستے ہیں لیکن رسائی نہیں ہوتی۔ اور تم۔ تمہیں تو خود بلاوے دے کر بلوایا ہے انہوں نے۔"

"آصفی صاحب نے وہ سنا نہ جو ہوا۔" نصیر کی ماں نے طنز کیا۔

علی احمد ہنسنے لگے۔

"اب چمگادڑوں نے بھی بات کرنا سیکھ لی۔ ہی ہی ہی۔ سن رہی ہو شمیم۔ چیونٹیوں کے بھی پر نکل آئے۔ کہتی ہے میں پرندہ ہوں۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔"

مسٹر معروف ایک خوب صورت، رنگین مزاج، خاموش اور انسانیت سے بھرے ہوئے نوجوان تھے۔ وہ عام انسپکٹروں سے قطعی طور پر مختلف تھے اور ان کا انداز بالکل انوکھا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ براہ راست اس عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ ویسے عام طور پر محکمہ تعلیم کے افسر بتدریج ترقی کرنے کے بعد ڈویژنل انسپکٹر بنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ غالباً وہ پہلے ڈویژنل انسپکٹر تھے جو ولایت سے ڈگری حاصل کر کے آئے تھے۔ پرانے افسروں کا طرز عمل تحصیلداروں اور پٹواریوں کے بین بین ہوا کرتے تھے۔ وہ دیکھنے کی بجائے گھورتے۔ بات کرنے کی بجائے ڈانٹتے اور ماتحتوں سے دور رہتے تھے۔ اس کے برعکس معروف نہایت اخلاق سے ملتے یوں باتیں کرتے جیسے وہ افسر ہی نہیں اور ڈانٹنے کے فن سے تو وہ بالکل ناواقف تھے۔

ایلی معروف سے مل کر حیران رہ گیا۔ معروف نے اسے پاس بٹھا لیا۔ سگریٹ پیش کیا اور پھر یوں باتوں میں مصروف ہو گئے جیسے ایلی کو صرف کھیلنے کے لئے بلایا ہو۔

پھر دفعتاً انہوں نے موضوع بدلا اور جاہ پور کے متعلق پوچھنے لگے۔ کیا وہ اچھی جگہ ہے؟ موسم کیسا ہے؟ لوگ کیسے ہیں؟ سکول کیسا ہے؟ آپ کا دل لگ گیا کیا؟

پہلے تو ایلی بے پروائی سے ان کے سوالات کا جواب دیتا رہا پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ شاید جاہ پور دشمن کا بھید پانے کے لئے اس سے حالات پوچھ رہے تھے۔ اس پر ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شیخ صاحب کے خلاف کوئی بات نہ کرے گا۔

"ہاں تو ایلیاس صاحب۔ آپ کے سکول میں تو پارٹی بندی نہیں ہو گی کوئی؟"۔ معروف نے پوچھا۔

"میں نے تو نہیں دیکھی۔" وہ بولا۔

"ہیڈ ماسٹر تو وہاں کے بہت قابل اور کارکن آدمی ہیں۔"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "اور بے حد دلچسپ ہیں۔"

معروف صاحب نے طرح طرح سے ایلی کو بات کرنے پر اکسایا لیکن اس نے انہیں سرسری جواب دے کر ٹال دیا۔

آخر انہوں نے واضح بات کی:

"دیکھو ایلی۔ میں نے تمہیں صرف اس لئے بلوایا ہے کہ آج کل اسکول میں سخت گڑبڑ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کچھ لوگ ہیڈ ماسٹر کے خلاف سازش کر رہے ہیں اور چونکہ میرا اصول ہے کہ ایسے سازشیوں کو سخت سزا دیتا ہوں اس لئے تم خاص طور پر خیال رکھو۔ ایسے لوگوں سے مت ملو بلکہ اگر پتہ چلے تو ہمیں بتاؤ کہ وہ کون ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ایک دوست کا لڑکا ایسی بات میں الجھے۔ گڈ نائٹ۔"

معروف صاحب نے تھوڑری سے مصافحہ کیا اور ایلی گھر چلا آیا۔

اگلے روز معروف نے غالباً علی احمد سے بھی بات کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا دن وہ اسے نصیحتیں کرتے رہے۔

دیکھو ایلی ایسے لوگ ملازمت میں کبھی فائدے میں نہیں رہتے جو اس قسم کی سازشوں میں حصہ لیتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے افسر سے بنا کر رکھنی چاہیئے۔ چاہیئے وہ برا ہو اس کا سلوک کیسا بھی ہو ہمیں اس سے کیا۔ تم ہمیشہ ہیڈ ماسٹر کا ساتھ دینا اور بلکہ اگر تمہارا کوئی جاننے والا اس سازش میں شریک ہو تو اسے بھی خبردار کر دینا۔ اس کا بھلا کر دینا چونکہ معروف صاحب بہت سخت ایکشن لیں گے۔ یہ تو ان کی مہربانی ہے کہ تمہیں خود بلا کر بات سمجھائی ہے۔ تم میرے بیٹے ہو اس لئے۔ ورنہ تمہاری کیا حیثیت ہے۔ ایک معمولی ٹیچر۔ ایسے سینکڑوں ٹیچر مارے مارے پھرتے ہیں کون پوچھتا ہے۔ بی۔ اے ڈگریاں ان کی قیمت کیا ہے آج کل۔۔۔ اگر تم میرے بیٹے نہ ہوتے تو کیا تمہیں نوکری مل جاتی۔ ابی توبہ کرو۔ کون پوچھتا ہے۔ بی سی جی۔ کیوں نصیری کی ماں۔"

گاڑی میں بیٹھے ہوئے علی سوچ رہا تھا کہ مسٹر معروف کا مجھے بلانے سے یہ مقصد تھا کہ جاور کے حالات سے واقفیت حاصل کرے۔ انہیں۔ معروف کو صحیح حالات جاننے کی خواہش نہیں۔ اسے اس بات سے دلچسپی نہیں کہ نظم و نسق کی خرابیوں کو دور کیا جائے۔ انہیں تو صرف یہ فکر دامن گیر ہے کہ کسی جائز یا ناجائز طریقے سے نظم و نسق قائم کیا جائے قائم رکھا جائے۔ تبھی انہوں نے مجھے بلوایا تھا تاکہ میری معرفت ان لوگوں کو ڈرایا جائے کہ ایسی سازشوں کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا اور سازشیوں کو انسپکٹر صاحب سخت سزا دینے کے قائل ہیں۔

جاور پہنچ کر علی نے ساری بات کا رنگ ہی بدل دیا۔ سازشیوں کی محفل میں اس نے ایسی باتیں کیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مسٹر معروف انصاف کرنے کے قائل تھے لیکن وہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے جو جرأت سے شکایت نہیں کر سکتے اور شیخ صاحب کے پاس جا کر اس نے انہیں بتایا کہ معروف آپ کے بڑے مداح ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان لوگوں سے سمجھوتہ کریں جنہیں آپ سے شکایات ہیں تاکہ جاور اسکول کی مزید بدنامی نہ ہو۔

اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب علی واپس جاور پہنچا تو جاور اسکول کی سازش اور تقویت پکڑ گئی۔ وہ لوگ جو درپردہ سازشیوں کا ساتھ دے رہے تھے اس میں نمایاں حصہ لینے لگے۔ بلکہ ان کے لئے تازہ مواد دستیاب ہونے لگا۔ اور شیخ مسعود اس کا مقابلہ کرنے کی امید کھو بیٹھے اور انتہائی خطرناک قدم کو عمل میں لانے کی سوچنے لگے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ڈپٹی کمشنر سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ سی آئی ڈی اور سول پولیس سے خط و کتابت شروع کر دی۔ اپنے پرانے ہتھکنڈوں کے مطابق وہ اس بات کے قائل تھے کہ دشمن پر سخت وار کرنا چاہئے تاکہ وہ اپنے بچاؤ کی کوشش میں لگ جائے اور مزید وار نہ کر سکے۔

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک روز جب وہ سب مل کر ایک نئی اسکیم پر بحث کر رہے تھے تو شبیر کا بھانجا جاوید داخل ہوا۔ اس کی عمر نو سال کی ہو گی۔

"کیوں کیا بات ہے۔" شبیر اسے دیکھ کر چلایا۔ "کیا مجھے بلایا ہے؟"

"جی نہیں خان صاحب۔" وہ بولا۔

"تو پھر؟"

"پیغام دینا ہے۔"

"اچھا۔ شبیر بولا۔ "تو ٹھہرو میں بھی سنتا ہوں۔"

"جی۔۔۔" جاوید نے کہا۔ "انہوں نے کہا ہے کہ سب کے سامنے دینا پیغام سب کے سامنے۔"

"اچھا تو دو۔" افضل چلایا۔

"جی انہوں نے کہا ہے کہ جا کر کہہ دو اگر خان صاحب اس گھر میں پھر داخل ہوئے تو میں شیخ کے گھر جا کر ساری بات بتا دوں گی۔"

"کیا کہا؟" سب کے سامنے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"جی یہی کہا تھا۔"

"کس نے کہا تھا۔"

"شبیر کی بیگم نے اور کس نے۔" افضل بولا۔

"ویسے ہی رعب ڈالتی ہے اور کیا۔"

"اونہوں۔" شبیر بولا۔ "یہ نہ سمجھو تم اس سے واقف نہیں۔ وہ کر گزرے گی۔ وہ بڑی ضدی عورت ہے۔"

"تو پھر نہ آیا کرو یہاں۔" افضل بولا۔

"اسے تم سب سے نفرت ہے۔" شبیر بولا۔ "وہ اس مکان کو بہت برا سمجھتی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ وہ شیخ کے گھر جا کر اسے صورت حال سے مطلع کر دے۔"

"تو پھر کیا کیا جائے۔" احمد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کرنا کیا ہے۔" چودھری نے کہا۔ "آخر ایک نہ ایک دن تو بات کھلے گی۔"

شبیر کی بیوی کے رخ کو بدلنا آسان کام نہ تھا۔ اسے روز شور کرنے سے باز رکھنے کی صرف ایک صورت تھی کہ شبیر کو وہاں آنے سے منع کر دیا جائے۔ لیکن شبیر نے اعلان کر دیا۔ "میں مجبور ہوں چاہے لاکھ کوشش کروں میں تم سے ملنے سے باز نہ رہ سکوں گا۔"

"تو پھر اپنی بیوی کا ذمہ لو کہ وہ ایسی واہیات حرکت نہ کرے گی۔" فضل نے کہا۔

"نہ بھائی۔" وہ بولا۔ "یہ میرے بس کا روگ نہیں۔"

اس نئے جھمیلے کی وجہ سے نکڑ والے مکان کا نقشہ ہی بدل گیا۔ وہ سب گہری سوچ میں پڑ گئے۔

شبیر کی بیوی کو ہر اس مکان سے نفرت تھی۔ جس میں کوئی عورت نہیں رہتی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق صرف وہی مرد معزز ہو سکتا تھا۔ جس کے گھر ایک اپنی بیاہتا بیوی ہو اور چونکہ فضل اور ایلی کے گھر میں کوئی عورت نہ تھی۔ لہذا ساری دنیا کے گناہ اس مکان میں ہوتے تھے۔ وہاں تاش کھیلا جاتا تھا۔ واہیات گفتگو ہوتی تھی۔ شراب پی جاتی تھی۔ جوا کھیلا جاتا تھا۔ رنڈیاں آتی تھیں۔

ان حالات میں اس مکان اور اس کے مکینوں کے خیالات کو بدلنا قطعی طور پر ممکن نہ تھا۔

"بھئی کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" فضل بولا۔

"اچھا۔" ایلی نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا۔" لیکن اس کے باوجود اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح کوشش کرے۔

ساری رات وہ سوچتا رہا پھر دفعتاً اسے دعوت کا خیال آ گیا جو شبیر نے نہیں کھلائی تھی۔

اس دعوت سے کوفت بھی ہو گئے تھے۔

کرتب

ایک مرتبہ انہوں نے شبیر کو مجبور کیا کہ وہ انہیں دعوت کھلائے۔ پہلے تو شبیر نہیں ٹالتا رہا لیکن آخر اس نے محسوس کیا کہ دعوت کھلائے بغیر چارہ نہیں اس نے ایک دن مقرر کر دیا۔ مقررہ دن وہ سب تیار بیٹھے رہے کہ کب بلاوا آئے۔ آخر شبیر آیا وہ کہنے لگا۔ "مسجد میں بھی کھانا آتا ہے۔"

"آتا ہے کیا مطلب؟" افضل نے کہا "کیا ہم تمہارے گھر نہ جائیں گے۔"

"نہیں یار۔" وہ بولا۔ "وہاں جا کر کھانے کا کیا مزہ۔ میں تمہیں بتاؤں میں تم میری بیوی کی عادت ہے وقت نہیں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔"

اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ شبیر کا بھانجا ہاتھ میں بڑے تھال لئے ان کے گھر کی طرف آ رہا ہے۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہاں آنے کے بجائے وہ سیدھا آگے نکل گیا۔

انہوں نے بچے کو آوازیں دیں شور مچایا مگر وہ چپ چاپ سیدھا نکل گیا۔

"بیگم کی سہیلی کے ہاں کھانا پہنچانے گیا ہے۔" شبیر بولا۔ "ابھی واپس آ کر ادھر کھانا لے آئے گا۔ ٹھہرو نہیں۔" کچھ دیر کے بعد بچہ ویسے ہی بھرا ہوا تھال لئے واپس آ گیا۔ اسے دیکھ کر شبیر بولا۔

"کیوں تو کیا وہ لوگ گھر نہیں ملے؟ اچھا تو انہیں پھر دے آنا۔ یہ ہمیں دے دو۔"
شبیر نے کچھ اس انداز سے بات کی کہ افضل اور علی کو سمجھ میں نہ آیا۔

دراصل بات یہ تھی کہ شبیر کی بیوی علی اور افضل سے مشٹنڈوں کا کھانا پکانے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس لئے شبیر نے یہ بہانہ بنایا تھا کہ مسجد میں دو اللہ کے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی دعوت کرنا ہے۔ بیگم اس کی چال میں آ گئی اور اس نے کھانا تیار کر دیا۔

جب جاوید کھانا لے کر مسجد کی طرف روانہ ہوا تو حسبِ عادت دروازے میں کھڑی
دیکھ رہی تھی کیونکہ وہ مکان پر تو نہیں رہتا اور شبیر کی ہدایات کے مطابق جاوید سیدھا
نکل گیا تھا اور موڑ مڑنے کے بعد کچھ دیر وہاں انتظار کرتا رہا تھا تاکہ بیگم شبیر مطمئن
ہو کر اپنے کام کاج میں لگ جائے اور وہ کھانا لے کر لوٹ آئے۔

بہرحال میں اور فضل کو اس بھید کا علم نہ تھا۔ لہٰذا یہ خیال تھا کہ شبیر نے منتیں کر
کے بیوی کو دعوت پکانے پر تیار کر لیا ہے۔

اس رات مجھے خیال آیا کہ بیگم شبیر کو راضی کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ اگلے
روز میں نے گھر کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔

"کیوں بھئی۔" میں نے پوچھا۔ "شبیر کہاں ہے؟"

"وہ تو ابھی سکول سے نہیں آئے۔" جاوید بولا۔

میں نے باآواز بلند چلا کر کہا۔ لیکن شبیر تو آج سکول آیا ہی نہیں تھا۔ اس کا
مقصد یہ تھا کہ بیگم بات سن کر چونک جائے۔

"گھر سے تو سکول ہی گئے تھے۔" جاوید نے کہا۔

"میں نے کہا جاوید۔" میں بڑے رازدارانہ انداز سے بولا۔ "تمہارے گھر جب بھی
کریلے پکیں تو یاد رکھو تھوڑے سے مجھے دینا۔ اتنے اچھے کریلے تمہارے ہاں پکتے ہیں۔
کہ جواب نہیں۔ یار مجھے کریلے بےحد پسند ہیں۔"

جاوید چپ چاپ کھڑا تھا۔

میں نے تو ذرا آہستہ کر کے کہا۔ "چاہے تم چوری کرو لیکن صرف ایک بار کھلا
دو۔ صرف ایک مرتبہ تمہارے گھر کے پکے ہوئے کریلے کھائے ہیں۔ اس روز جب
شبیر نے ہماری دعوت کی تھی۔ کھلاؤ گے یار؟" اس نے کہا۔ "گھر نہ بتانا۔ چوری چوری
کھلا دینا۔ ضرور۔" مجھ کو اچھی طرح علم تھا کہ شبیر کی بیگم بڑی غور سے اس کی ہر بات
سن رہی ہے اس لئے اس سے جاوید کی بات منتیں کریں اور پھر چلا آیا۔

گھر آ کر اس نے فضل کو کہا۔ بھئی پتھر تو پھینک آیا ہوں اب پتہ نہیں کیسی لہریں اٹھیں یا تو کشتی ڈوب گئی ہو یا کنارے جا لگی۔"

"کیسا پتھر پھینکا ہے؟" فضل نے پوچھا۔

"بس سمجھ لو پتھر تھا۔ اب تو لہریں دیکھو۔

رات کو شبیر آیا تو اس نے آتے ہی شور مچا دیا۔ "یار یہ کیا حشر کر دیا تم نے ایسی حد ہو گئی۔"

"کیوں کیا بات ہے؟" فضل نے پوچھا۔

"بات؟ وہ بولا۔ بات کہاں تو معجزہ ہو چکا ہے۔"

معجزہ۔ فضل نے دہرایا۔ چھوڑ پاجی پرے یار۔"

"بات بتانے سے پہلے میں تمہیں پچھلا قصہ سناؤں" شبیر نے کہا۔ جب پہلی مرتبہ تم نے مجھ سے دعوت کھلانے کی بات کی تھی تو میں نے اپنی بیوی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ تمہارے لئے دعوت پکائے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اسے کہا تھا کہ مسجد میں دو مولوی ٹھہرے ہوئے ہیں ان کی دعوت کرنی ہے۔

"

ارے۔ فضل چلایا۔

"چپ۔" یہ بولا۔ بھئی جاؤ پہلے خوان لے کر آگے چلا گیا تھا۔"

"بھئی بیگم تو تمہارا نام تک سننے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن آج۔ معلوم ہے آج کیا مطالبہ کیا ہے اس نے؟"

"کیا؟ فضل بولا۔

"بس کل تم سامان خرید کر لا دو میں ان کی دعوت کروں گی۔"

"کس کی؟" فضل چلایا۔

"بھئی تمہاری اور کس کی۔" شبیر ہنسنے لگا۔ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا

تھا۔ جب سے آمنہ آئی ہے وہاں جا کر دیکھا ہے۔ نقشہ ہی بدل گیا ہے گھر کا۔"

"لیکن یہ ہوا کیسے؟ ساری بات بتاؤ یار۔" افضل بولا۔

"گھر والوں کو پہلے تو جواب طلبی ہوئی کہ بتاؤ آج سکول کیوں نہیں گئے تھے اور گئے کہاں تھے۔ پھر دوسری جواب طلبی ہوئی۔ جب آنٹی اس روز مجھے دھوکا دیا تھا نا۔ دعوت دوستوں کی کی تھی اور بہانہ مولوی صاحب کا بنایا تھا۔ بیگم کو یہ شکایت ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا کہ "اگر دوستوں کی دعوت کرنی تھی تو مجھے بتایا ہوتا تاکہ میں دل لگا کر پکاتی۔ میں نے تو ویسے ہی بے پروائی سے کھانا پکایا تھا۔ حیرت ہے یار۔"

"تو تیر نشانے پر بیٹھا۔" علی ہنسنے لگا۔

"سبحان اللہ کیا تیر ہے اور کیا تیر انداز ہے۔" شمیم نے کہا۔ "کیا بات کر دکھائی ہے تم نے جو میری دانست میں ممکن ہی نہ تھی۔"

"چلو" علی بولا۔ "شمیم سے جا کر شکایت کرنے کا خطرہ تو ٹل گیا۔"

"ارے" شمیم چلایا۔ "تو کیا اس لیے یہ چال چلا ہے۔"

"اور کیا دعوت کھانے کے لیے۔" علی ہنسنے لگا۔

م

"میں دعوت کھانے کے لیے ہی آیا ہوں۔" محمود داخل ہو کر بولا۔

"ارے تم؟" علی اسے دیکھ کر چلایا۔ "تم یہاں کہاں؟"

"دیکھ لو۔" وہ بولا۔ "ڈھونڈ ہی نکالا تمھیں۔"

"لیکن اس وقت کون سی گاڑی سے آئے ہو؟" علی نے پوچھا۔

"گاڑی کا تو وقت نہیں۔" افضل بولا۔

"میں موٹر سے آیا ہوں۔" محمود مسکرانے لگا۔

"بس سے اس وقت۔"

"تو کیا کار سے آئے ہو۔" علی نے طنزاً کہا۔

"ہاں ہاں آرام سے بیٹھ کر سب کتھا سناؤں گا۔"

"اچھا تو بیٹھ جاؤ۔" ایلی نے کہا۔ "پہلے ہماری بھگن منڈلی کی کتھا سن لو پھر تمہاری کتھا بھی سن لیں گے۔ چلو بھئی۔" ایلی چلایا۔ "پہلے کام پیچھے کلام۔"

اس پر اس کے ساتھی حصوں میں بٹ گئے۔ دو ایک طرف بیٹھ کر ہارمونیم بجانے لگے۔ چار تاش کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ کھیلنا تو کیا تھا دونوں شور مچانے لگے۔ جیسے تاش کھیل رہے ہوں۔ ایلی نے اٹھ کر پتوں کے ڈھیر تلے سے ٹائپ مشین نکالی اور ٹائپ کرنے لگا۔

"ارے۔" محمود حیرت سے چلایا۔ "یہ کیسی کتھا ہے۔"

"یہ سازش ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"سازش۔" محمود کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

اب کی بار محمود آیا تو اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔۔۔ رومی ٹوپی اور شیروانی غائب تھیں شیروانی کی جگہ پتلون نے لے لی تھی اور سر ننگا تھا۔

جب وہ دونوں اکیلے ہوئے تو انہوں نے بات چھیڑی۔

"کہاں ہو تم آج کل؟" ایلی نے پوچھا۔

"یہی تو مجھے معلوم نہیں۔" محمود نے کہا۔

"آخر کہیں تو ہو گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔"

"کیا لاپتہ ہو؟"

"نہیں تو۔" وہ بولا۔ "مجھے تبدیل کر دیا ہے۔"

"کہاں؟"

"امل پور۔"

"امل پور میں تو کوئی گورنمنٹ سکول نہیں۔"

''کوئی نہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''تو پھر؟'' ''میں نے بلقیس سے محکمے میں نوکری کر لی ہے لیکن۔''

یار میں یہاں کام نہیں کرنا چاہتا۔ محمود نے جملہ ختم کر دیا۔

''کیوں؟''

''اس محکمہ میں تو عورتیں ہی عورتیں ہیں۔''

''اس میں کیا دقت ہے۔''

''جس افسر کے ساتھ میں ہوں وہ تو ہر بات میں جذباتی پہلو مدنظر رکھتی ہے۔ پھول دیکھے تو یوں خوش ہو جاتی ہے جیسے نہ جانے کیا دیکھ لیا ہو۔ کوئی نوکر آ کر اپنا دکھڑا رو دے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ ہر بات میں ذاتی زاویہ ہر معاملے میں پرسنل ویو۔ نہ بھئی ان کے ساتھ میرا گزارا نہیں۔''

''تم بھی جذباتی پہلو اختیار کر لو۔''

''عورت کے ساتھ میں تو صرف ایک ہی پہلو اختیار کر سکتا ہوں۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''تو کر لو۔'' ایلی نے کہا۔

''نوکری ہاتھ سے جائیگی۔''

''جانے لگے تو سامنے جا کر رو دینا۔ وہ بھی رو پڑے گی بات ختم ہو جائے گی۔''

''سچ۔'' محمود کی آنکھوں میں عجیب چمک لہرائی۔

''تم خود ہی کہتے ہو۔ نوکر رو کر دکھا دے تو اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔''

''لیکن جذباتی پہلو اختیار کیسے کیا جائے۔'' اس نے پوچھا۔

''یہ تو آسان ہے۔'' ایلی نے کہا۔ ''نئے کپڑے پہنے تو شوق بھری نگاہوں سے دیکھو اور کہو یہ تو بڑا پیارا لگتا ہے۔''

''یہ تو میں کر کر کے تھک گیا۔'' وہ بولا۔ ''خوش تو ہو جاتی ہے وہ مگر میری طرف نگاہ بھر کر نہیں دیکھتی۔''

''خوب صورت ہے۔''

''بس خوب صورت تو نہیں بیبی میم ہے۔''

''میم۔'' ایلی چونک کر بیٹھ گیا۔

''اگر وہ موجود نہ ہوتی تو کیا تم سے یہ پوچھتا اگر۔''

''کار میں کیسے آئے تھے؟''

''اسی کی کار ہے۔'' وہ بولا۔

''ارے تو کیا اس نے اپنی کار دے دی تمہیں یہاں آنے کے لیے؟''

''خود پہنچانے آئی تھی۔ سو جانا۔''

''خود۔۔۔۔۔؟''

ایک ساعت کے لئے خاموشی چھائی رہی۔

اور اب وہ کہاں ہے؟'' ایلی نے پوچھا۔

''واپس چلی گئی۔''

''واپس کہاں؟''

''امل پور۔''

''تو گویا وہ تمہاری شوفر ہے اور تم پوچھ رہے ہو کہ کیا کروں بھئی واہ۔ ایلی ہنسا۔ جو آتا ہے مجھے بے وقوف بناتا ہے۔''

''یقین کرو۔ محمود بولا۔ میں خود بھی بے وقوف بنا ہوا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''کیا نہیں آتا سمجھ میں؟'' ایلی نے پوچھا۔

''کچھ بھی تو نہیں آتا۔'' وہ بولا۔ کسی وقت میری ہر بات مانتی ہے۔ کسی وقت بات نہیں سنتی۔ کسی وقت بات بات پر ضد کرتی ہے۔ جیسے ہر بات میری خواہش کے خلاف کرنے کی قسم کھائے بیٹھی ہو۔ کسی وقت ایسا ہوتا ہے جیسے مجھ سے بہت

قریب آ گئی ہو اور پھر ایک ساعت میں یوں دور چلی جاتی ہے۔ جیسے کوئی واسطہ ہو نہیں یار۔ وہ چپ رہا۔ میں تذبذب سے اکتا چکا ہوں۔ اگر میں اس زنانہ محکمے میں کام کرتا رہا تو کسی روز موقوف ہو جاؤں گا۔

محمود کے آنے پر ایلی مسلسل دو روز اس کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ دونوں کتابوں کی باتیں کرتے رہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری کے محاوروں پر بحث کرتے رہے عورت کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے رہے۔

پھر محمود نے سوشل ورکروں کی بات چھیڑ دی۔ یار ایلی یہ دنیا ہی نرالی ہے۔ وہ بولا۔ یہ قوم جسے عورت کہتے ہیں۔ عجیب قوم ہے۔ قہقہوں میں روتی ہے۔ آنسوؤں میں ہنستی ہے۔ نہ کہہ کر چھیڑتی ہے ہاں کہتے ہوئے جھجکتی ہے۔ میں آج کل الف لیلیٰ کی دنیا میں جی رہا ہوں۔۔۔ وہاں خوبصورت جنات ہیں۔"

ایلی حیرت سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ حتیٰ کہ دروازے سے پوں پوں کی آواز آئی۔

"ارے یہ کیا ہے؟" ایلی چلایا۔

محمود کا رنگ فق ہو گیا۔

"کار کا ہارن معلوم ہوتا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"ہاں۔"

"کیا وہ خود لینے تو نہیں آ گئی؟"

"یہی معلوم ہوتا ہے۔"

"اس نے کہا تھا کہ میں آؤں گی۔"

"نہیں تو۔" وہ بولا۔ "اس نے کہا تھا زیادہ سے زیادہ ایک روز رہنا پھر چلے آنا اور آج دو روز ہو چکے ہیں۔"

"تو یقیناً وہی ہے۔" ایلی نے کہا۔

''شیخ صاحب آپ کے تعاقب نہ گئے۔''

''کوشش تو بہت کی تھی میں نے۔'' شیخ ہنستے ہوئے بولا۔

''جی۔'' ایلی بولا۔ ''مجھے بھی حیرت ہے۔''

''چودھری آپ تو نہیں۔'' شیخ نے اپنا رویہ بدلا۔

لیکن نہ جانے کیوں ایلی کو غصہ آ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی بہانے شیخ سے ناراض ہو جائے تاکہ اس دوستی سے نجات حاصل ہو جس میں پھنسا ہوا تھا۔ اس دوستی پر اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔

''نہیں شیخ صاحب۔'' وہ بولا ''اس وقت فرصت نہیں۔''

ایلی کے اس رویے کی وجہ سے شیخ ایلی کے ساتھیوں کو بلاتا اور ان سے کہتا بھئی میری اور آصفی کی صلح کرا دو اور وہ سب مل کر ایلی کو مجبور کر دیتے پھر یہ قافلہ شیخ کے گھر جا پہنچتا۔

وہاں پہنچ کر ایلی صاف صاف بھری محفل میں کہتا۔ مجھے شیخ صاحب کے خلاف کوئی شکایت نہیں صرف اس بات کا رنج ہے کہ وہ مجھ پر شک کرتے ہیں اور پھر ان میں اتنی جرأت نہیں کہ صاف صاف منہ پر کہہ دیں۔ نہیں صاف صاف نہیں کہتے بلکہ عورتوں کی طرح طعنے دیتے ہیں۔'' اس پر شیخ قسمیں کھاتا کہ مجھے آصفی پر شک نہیں۔

شیخ کی یہ بات سن کر چودھری شور مچا دیتا۔ ''چلو بھئی صلح ہو گئی اب کوئی جھگڑا نہیں رہا اب آصفی شیخ صاحب سے بغلگیر ہو جائے۔ اٹھو آصفی۔'' فضل اس کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ شبیر آہستہ سے چلاتا۔ ''اور مٹھائی۔'' ''وہ تو ہو گی ضرور ہو گی۔'' چودھری چیختا۔

پھر وہ سب بیٹھ کر مٹھائی کھاتے اور قہقہے لگاتے ہوئے ایلی کے گھر کی طرف چل پڑتے۔ وہاں جا کر باجے بجنے شروع ہو جاتے۔ تاش کی بازی لگ جاتی اور پلنگ کے نیچے سے ناپ کی مشین نکل آتی اور چودھری قہقہہ مار کر کہتا۔ وہ بھئی آصفی

اسے شوق تھا کہ تصوریوں کو کام میں لائے اور دیکھے کہ زندگی میں وہ کیا شدید ترقی ہے۔ اس نے ان چند نظریات کو آزما دیکھا تھا اور اسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی تھی اس سے ان خیالات کو مزید آزمانے میں اسے راحت ہوتی تھی۔

ایک روز اس نے بڑی سنجیدگی سے شبیر کو کہا تھا۔ "شبیر میرا ایک پیغام بیگم تک پہنچا دو۔"

شبیر گھبرا گیا۔ "نہیں یار چھوڑو اس بات کو اس نیک بخت کو زیادہ تنگ نہ کرو کہیں وہ بالکل ہی بگڑ نہ جائے۔"

"نہیں یار" وہ بولا۔ "یہ خالی ریلے دیر تک نہ چلیں گے۔"

منتیں کر کے اس نے شبیر کو منایا تھا اور شبیر نے ایلی کی ہدایت کے مطابق بیگم کو پیغام دے دیا تھا۔

"میں نے کہا" شبیر نے بیگم سے کہا۔ "ایک کام کرو تو بڑی مہربانی ہوگی تو بڑا کام ہے۔"

"کیا ہے؟" وہ بولی۔

"یہ جو ایلی ہے نا۔ اس کی خواہش ہے کہ اچھی لڑکی سے اس کی شادی ہو جائے۔"

"تو پھر کرتا کیوں نہیں۔" بیگم غصے میں چلائی۔

"کسی اچھے رشتے کی تلاش ہے اسے۔ اچھی لڑکی ملے تو کرے۔"

"تو کہے نا اپنے ماں باپ سے۔" وہ بولی۔ "میں نے سنا ہے کہ ماں باپ کا کہا نہیں مانتا وہ۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" شبیر بولا۔

"جو ماں باپ کا کہا نہیں مانتا وہ کیا انسان ہے۔" وہ غصے میں بولی۔

"نہیں تم نہیں سمجھتی بیگم۔" وہ بولا۔ "اسے ماں باپ کے چناؤ پر اعتماد نہیں۔"

"بیٹے ماں باپ کے چناؤ پر اعتماد نہیں۔" بیگم چڑ گئی۔

دیکھو نا۔" وہ بولا۔ "اس کی چار مائیں ہیں۔"

"چار مائیں۔" وہ چلائی۔

"ہاں۔" شبیر نے کہا۔ "والد اپنی دھن میں لگے ہیں۔ والدہ کی کوئی بات نہیں۔"

"تت تت تت۔" بیگم تڑپ گئیں۔ "بیچارہ۔"

"کل بھری محفل میں کہہ رہا تھا۔۔۔" شبیر رک گیا۔ "لیکن چھوڑو اس بات کو۔"

"کہو تو کیا کہہ رہا تھا۔" وہ مصر ہو گئی۔

"چھوڑو چھوڑو۔" شبیر نے کہا۔

"چھوڑو کیوں۔"

"تم برا مانو گی۔"

"نہیں مانتی برا۔"

"سچ؟"

"کہہ جو دیا۔"

"کہہ رہا تھا میں نے آج تک کوئی ایسی عورت نہیں دیکھی جو اچھی لڑکی کا چناؤ کر سکتی ہو۔ صرف ایک بیگم شبیر ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"ویسے ہی اناپ شناپ بکتے رہتے ہیں یہ۔" وہ بولی۔

"نہیں نہیں وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔"

"اچھا۔۔۔" وہ بولی "تو کیا میں نے یہاں شادی ایجنسی کھول رکھی ہے۔ میں کیا کروں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بولا۔ "مقصد یہ ہے کہ انیس چاہتا ہے کہ اگر کوئی رشتہ طے ہو تو تم جا کر لڑکی کو دیکھ لو۔"

"آخر کس قسم کی لڑکی چاہیے اسے؟" بیگم نے پوچھا۔ "بے چارہ۔"

"اچھا تو کیا کسی نے چڑایا ہے تجھے؟"

"نہیں وہ تو کوئی اور معاملہ ہے۔" جمیل نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ تقی خود بتائے گا۔ لیکن تقی کے گھر کے جھگڑے کے بارے میں کچھ سوچو یار ہم سب بڑے پریشان ہیں۔"

شام کے وقت جب وہ تقی کے ہاں پہنچے تو وہ اردگرد اوزار رکھے جوتے کا تلا سی رہا تھا۔

"ارے تم یہ کیا کر رہے ہو۔" علی نے پوچھا۔

"جوتا سینا سیکھ رہا ہوں۔" تقی نے جواب دیا۔

"اور وہ چیزیں کیا ہوئیں جو تم کپڑے پر کاڑھا کرتے تھے۔"

"وہ نہیں۔" وہ بولا۔

"لیکن کوئی اور ہنر منتخب کرتے۔" علی نے کہا۔

"یہ ہنر تو نہیں۔" تقی نے اپنی تھوتنی اٹھائی۔ "ایک روز سوچ رہا تھا کہ آخر یہ جوتا جو میں خریدتا ہوں۔ میرے پاؤں کو کاٹتا کیوں ہے یہ بات میں عرصہ دراز سے سوچتا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ ذہن میں تھی یہ بات تو مجھے خیال آیا کہ یہ موچی لوگ سٹینڈرڈ سائز کے جوتے بناتے ہیں۔ یعنی اوسط سائز کے اور جن کے پاؤں اوسط سے ہٹ کر ہوں انہیں جوتے کاٹتے ہیں لہٰذا میں نے سوچا کہ اپنے پاؤں کے مطابق جوتا بنانا چاہیے یہ بات دیر سے میرے ذہن میں تھی۔ اب کی بار نہ جانے کیسے عمل میں آ گئی۔ وہ یوں ہوا کہ ایک روز میری جیب میں بیس روپے تھے اور میں اتفاق سے بازار میں جا نکلا جہاں موچیوں کے اوزار بکتے ہیں تو میں نے اوزار خریدے پھر جوتا سینے میں بنیاد پڑ گئی ہے۔ یہ جو ہمارے مکان سے باہر موچی بیٹھتا ہے اس سے ٹانکا لگانا سیکھ لیا۔ اللہ اللہ، خیر صلا۔ اب سوچتا ہوں کہ آخر چینی موچی کا کمال کیا ہے۔ یہی نا کہ وہ خوب صورت شکل کا جوتا نہیں بناتے بلکہ پیر جوتا بناتے

بیٹھی جو پاؤں پر فٹ بیٹھے۔"

''سنا ہے تم نے جمّو کو پینے کا شغل تیز کر دیا ہے۔ لیلی نے بات بدلی۔

''ہاں یار۔ تقی بولا۔ ''میں نے ابھی سنا ہے۔ کل رات کو میں کو میں جو پی بیٹھک سے باہر نکل کر ایک بند دوکان پر جا بیٹھا۔ میں نے سوچا آتے جاتے لوگوں کا تماشہ دیکھو تو وہ محلے والے آ کھڑے ہوئے وہاں۔ انہوں نے یہ مجھے دیکھا نہیں اور یہ پوچھا نہیں۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔ اس تقی بابو نے جو ساتھ والے گھر میں رہتا ہے نے بڑا دھم مچا رکھا ہے۔ محلے میں روز بڑی مجھے اس کی بات تو بری لگی۔''

تقی نے کہا ''لیکن جو جواب دوسرے نے دیا اسے سن کر تو بس ہو گیا ہوں۔''

''دوسرے نے کیا کہا؟'' لیلی نے پوچھا۔

کہنے لگا۔ ''چھوڑو جی اس کی بات کرتے ہو۔ وہ تقی تو مستی پر آئی ہوئی کتیا ہے۔ کتیا ہے وہ تو۔

''اس نے تو ابھی نہیں کیا۔ اور پھر سوچو تو بیگم سے لڑنے کو کتیا سے کیا تعلق۔ بڑی گہری بات کہہ دی اس نے۔ سمجھ میں نہیں آئی۔''

''تو پھر سے کیوں پیتے ہو۔'' لیلی نے پوچھا۔

''اگر اس نقطے کا مجھے علم ہوتا تو۔''

''تو کیا بے خبری میں پیتے ہو۔''

''ہاں یار۔ جب جمّو نے کہا تو مجھے خیال آیا کہ تقی بے خبری میں یہ عمل ہوتا ہے۔ مشکل سے کوئی وہ ہیئت بات کی اور مجھے غصہ آیا۔ یہاں تک تو شعور رہتا ہے۔ پھر جو ہوش آتا ہے تو میں بیٹھ رہا ہوتا ہوں اور وہ چیخ رہی ہوتی ہے۔''

''تو اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔''

''یار تم سے پڑھے لکھے ایسی بات کریں حیرت ہے۔ تم سمجھتے ہو جیسے میری نا

خوشی سے گزر جائیں گے۔"

تو ۔۔۔۔۔ یہاں

"ہاں تو بات بڑی لمبی ہے" تقی نے قصہ بیان کرنا شروع کیا۔

"پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں۔" وہ بولا۔ "کہ میں یہاں چکلے میں کبھی نہیں گیا۔ نہ ہی مجھے وہاں جانے سے کوئی دلچسپی ہے۔ سمجھو میرے دماغ میں یہ خانہ ہی سرے سے خالی ہے۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ چکلا کہاں واقع ہے۔ شاید کبھی کسی جگہ اس کے جائے وقوع کے متعلق سنا ہو۔ ضرور سنا ہوگا۔ لیکن مجھے شعوری طور پر علم نہ تھا کہ وہ کہاں واقع ہے۔"

"ایک روز" وہ بولا "مجھے جلدی تھی۔ ایک دوست سے ملنے کے لئے چندو محلے کی طرف جا رہا تھا۔ کالج دروازے پہنچا تو میں نے چکلے کی گلی کی طرف دیکھ کر سوچا کہ دور کا چکر کاٹ کر کیوں جاؤں۔ اسی گلی سے کیوں نہ نکل جاؤں ضرور یہ گلی آگے کہیں نہ کہیں نکل جائے گی۔ بند گلی تو معلوم نہیں پڑتی۔ اس طرح پہلی مرتبہ میں چکلے کی گلی میں داخل ہوا۔ اپنی ہی دھن میں چلا جا رہا ہوں کچھ سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کس سوچ میں پڑا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا ہی نہیں۔ شام کا وقت تھا۔ ابھی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس وقت وہاں بھیڑ نہیں تھی۔ بھیڑ تو رات کے وقت ہوتی ہے۔ آدھی گلی تو میں نے یونہی انجانے میں عبور کر لی۔ اب جو سر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو سامنے ایک کھڑکی میں بیٹھی ہے۔ میں گھبرا گیا۔ ادھر دیکھتا ہوں کہ ایک دروازے میں کھڑی ہے۔ ایک ادھر چوکی پر بیٹھی ہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں چکلے سے گزر رہا ہوں۔ طبیعت مکدر تو ہوئی لیکن میں نے سوچا اب آ ہی گیا ہوں تو نکل ہی جاؤں۔

"ابھی چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ دفعتاً میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ چوبارے کے جنگلے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر میں خواہ مخواہ رک گیا۔ عجیب انداز سے بیٹھی تھی۔ نہ تو

اور چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ نہ اپنا آپ دکھا رہی تھی۔ نہ مسکرا رہی۔ " بے خبری نہ تھی کہ وہ بیٹھی ہے یہ کھڑکی ہے یا کہاں بیٹھی ہے۔ باورچی خانے میں بیٹھی ہے یا پلیٹ فارم پر یا چھلکے میں۔ دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اس میں ٹھوڑی رکھی ہوئی تھی اور خود کھوئی ہوئی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے روٹی رو رہی ہو۔ بال کھلے تھے پریشان حال پڑے بے پروائی سے پہنے ہوئی۔ بس صرف ہونٹوں پر لپ سٹک لگی تھی اللہ اللہ خیر صلا۔

"اسے دیکھ کر مجھے صرف یہ خیال آیا کہ یہ کہاں کیوں بیٹھی ہے۔ چند ایک ساعت تو میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے سوچا چلو چھوڑو مجھے کیا لینا دینا ہے۔ بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے۔ چنانچہ میں چل پڑا لیکن یہ سوال میرے دل میں کانٹا سا لگا رہا کہ یہ یہاں کیوں بیٹھی ہے۔ دو قدم چلا پھر رک گیا۔ مجھے غصہ محسوس ہونے لگا۔ آخر یہ کیوں یہاں بیٹھی ہے۔ پھر رک گیا۔ پھر اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ لیکن غصہ بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ میں مجبور ہو گیا۔ جی میں آیا کہ جا کر پوچھوں تو اس میں حرج کیا ہے۔

"میں واپس آیا۔ لیکن جب اس کے چوبارے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو خیال آیا کہ آخر اوپر جا کر کہوں گا کیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا فضول خیال ہے۔ اگر میں نے کہہ دیا کہ بیٹھی ہوں تجھے کیا تو کیا جواب دوں گا۔ اس خیال پر میں آگے چل پڑا۔ لیکن آگے قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر قدم کے بعد رک جاتا۔ غصہ دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔ بہر صورت چلتا رہا۔ حتیٰ کہ میں نے سوچا آگے جانا بے کار ہے۔ اور پھر اس قدر غصے میں آ چکا تھا کہ کوئی اور بات ذہن میں نہ رہی تھی۔ لہٰذا میں نے ایک تانگا لیا اور تانگے والے سے کہا کہ مجھے گھر لے چلو۔ گھر پہنچ تو گیا لیکن وہاں بھی رہ رہ کر مجھے یہ خیال آتا کہ وہ وہاں کیوں بیٹھی ہے۔ اور وہ غصہ جو مجھے آ رہا تھا۔ وہ میں نے سب بیوی پر نکالا۔ پیٹ پیٹ کر اس کا پلستر نکال دیا۔ میرے اپنے ہاتھ دکھنے

لگے۔ پھر تھک ہار کر سو گیا۔

"اگلے روز پھر وہی چکر۔ دفتر گیا تو وہاں کام کرتے کرتے رک جاتا اور وہی خیال آتا کہ وہ وہاں کیوں بیٹھی ہے۔ ہزار سمجھایا لیکن بے کار۔ اب میں دفتر میں خواہ مخواہ لوگوں سے الجھ رہا ہوں بے کار باتوں پر لڑ رہا ہوں حتیٰ کہ صاحب سے جا کر الجھ پڑے۔

"پھر میں نے سوچا یہ تو بری بات ہے گھر چلو ورنہ کسی سے لڑ بیٹھوں گا۔ تو میں طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنا کر گھر چلا آیا۔ راستے میں اپنی حماقت پر سوچتا آیا۔ چلتا رہا اور سوچتا رہا چلتا رہا اور سوچتا رہا۔

"اب جو آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ تو اس کے چوبارے کے نیچے کھڑا ہوں۔ یعنی گھر کو پیچھے چھوڑ کر ایک میل آگے نکل گیا اور مجھے علم ہی نہ ہو کہ آگے نکل آیا ہوں یہ کہاں جا رہا ہوں۔

یہ راستہ غیر مانوس ہے۔"

چوبارے میں کوئی بھی نہ تھا۔ میرا مطلب ہے جنگلے میں کوئی نہ تھی۔ اس وقت کون ہوتا بھلا، دوپہر کو وہ بے کون خانہ بابا بیٹھی ہے۔

"وہاں جو ہوش آیا تو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں اور اس قدر شدت سے غصہ آیا اپنے آپ پر کہ اب اپنے دل کی بات ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لہٰذا اب مجھے اوپر چڑھنے سے کون روک سکتا تھا۔ اوپر چوبارے میں وہ میلے کچیلے کپڑوں میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ میں نے اوپر جاتے ہی اس سے لڑنا شروع کر دیا۔ وہی بات ہوئی نا۔ لڑتی ہوا۔ نہ جان نہ پہچان بڑی خالہ جی سلام۔ میں نے کہا تو یہاں کیوں بیٹھی ہے اور تیرا یہاں بیٹھنے سے کیا مقصد ہے اور تو کیا جانتی ہے پھر تیرا یہاں کیا کام؟

"پہلے تو حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی پھر ہنسنے لگی۔ سمجھتی ہوگی کوئی پاگل

ہے۔ پھر اس کے حواری آ گئے۔ انہوں نے آ کر مجھ سے بحث شروع کر دی اور غصے سے میرا دماغ اور بھی چل گیا اور میں نے اتنا اودھم مچایا اور ان سے تو تکار کی کہ کیا بتاؤں۔ پھر لوگوں نے مجھے چھڑایا اور تانگے میں ڈال کر گھر بھجوا دیا۔

''اگلے روز پھر وہی جنون۔ میری زندگی گویا حرام ہو گئی۔ بس یہی دھن جی میں سمائی تھی کہ وہاں جاؤں اور جا کر اس سے لڑوں۔ چار ایک روز میں نے زبردستی اپنے آپ کو روکے رکھا پھر مجھے خیال آیا کہ یہ جنون ایسے نہیں اترے گا۔ سمجھنا بجھانا فضول ہے۔ لہذا میں نے سوچ سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ وہاں جاؤں اور بک کروں۔ منہ مانگے دام دوں اور پھر لڑنے کی بجائے اس سے باتیں کروں شاید اس قدم سے دل کی بھڑاس نکل جائے تو صاحب۔'' تقی نے قصہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اس روز میں نے نیا سوٹ پہنا اور بن سنور کر رات کو وہاں جا پہنچا۔

''اس کے حواریوں نے جب دیکھا کہ میں رات رہنا چاہتا ہوں اور میرا ارادہ فساد کا نہیں تو انہوں نے مزاحمت نہ کی۔ البتہ حرامیوں نے مجھ سے بہت سے پیسے مانگے۔ ظاہر تھا کہ مجھے ٹھگ رہے ہیں۔ خیر میں نے کہا جو مانگو گے دوں گا۔

''تو جناب'' تقی بولا۔ ''میں وہاں ٹھہر گیا۔ لیکن یہ ماننے کی بات ہے کہ میں اس کے ہاں ٹھہرنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ یعنی میں صرف باتیں کرنا چاہتا تھا اور بس ٹھہرنا محض بہانہ تھا۔ خیر۔

تقی اور بوتو

''جب ہم اکیلے رہ گئے تو عجیب بات ہوئی۔ اب میں چپ چاپ کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا ہوں اور وہ کن انکھیوں سے میری جانب دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ آخر میں نے بات شروع کی میں نے کہا۔ بتا مجھے تو یہاں کیوں بیٹھی ہے۔''

وہ بولی۔ تو اس بات کو چھوڑ۔ تجھے اس کام سے واسطہ۔ میں نے کہا۔ میں تو آیا ہی اس لئے ہوں کہ تجھ سے پوچھوں کہ آخر بات کیا ہے؟ تو یہاں کی نہیں۔ نہ تو

یہاں کی لگتی ہے۔ نہ تیری کوئی حرکت ایسی ہے۔ جو ظاہر کرے کہ تو یہاں کی ہے
بلکہ تجھے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے مجھے جیسے کوئی مچھلی ریت پر پڑی ہے۔ تو تو یہاں
دم توڑ رہی ہے۔

''پھر میں نے اس سے محبت بھرے انداز سے بات کرنی شروع کی کیونکہ ویسے
تو وہ میرے سوال کا جواب نہ دیتی تھی۔ میں نے کہا۔ دیکھ بانو، چونکہ مجھے پتہ چل گیا
تھا کہ اس کا نام بانو ہے۔ یہاں اس بازار میں وہ بیٹھی ہیں جو جسم ہی جسم ہوں ورنہ تو تو
جسم ہے ہی نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تو بغیر جسم کے ہو۔ یہ روئی روئی
آنکھیں یہ کھوئی کھوئی نگاہ۔ جیسے کوئی راستہ بھول گیا ہو اور رو رو کر تھک گیا ہو۔

''وہ مجھ سے بار بار کہتی رہی تو چھوڑ اس قصے کو لیکن میں نے اپنی رٹ نہ چھوڑی
پھر وہ پوچھنے لگی۔ تو کون ہے۔ میں نے اسے اپنا نام اور کام بتایا۔ اپنے گھر کا پتہ دیا۔
پھر وہ پوچھنے لگی۔

''تو مجھے حق مہر دے گا۔'' اس پر میری ہنسی نکل گئی۔

''میں نے کہا۔ تو غلط سمجھ رہی ہے۔ مجھے تیری ہوس نہیں۔ مجھے عورتوں سے کچھ
دلچسپی نہیں اور نہ ہی میں تیری محبت کا مارا ہوا ہوں۔ میں تو صرف یہ پوچھتا ہوں
کہ تو یہاں کیسے آ گئی۔ یہ تیری جگہ نہیں۔

''قصہ کوتاہ۔ تھی بڑا۔ پھر وہ میرے پاس آ بیٹھی اور گھل مل کر باتیں کرنے لگی۔
روتی رہی۔ کہنے لگی میرے نصیب۔ پھر میں نے بحث چھیڑ دی اور پھر مجھے غصہ آنے
لگا اور جب اس نے دونوں بانہیں میری گردن میں ڈال کر ہونٹ میری طرف
بڑھائے اور بولی۔ اب چھوڑ بھی نا۔ تو غصے میں میں نے اسے تھپڑ مار دیا۔ وہ ڈر کر
گر گئی اور اس نے شور مچا دیا۔ پیشتر اس کے کہ کوئی آ پہنچے میں بھاگ آیا۔ اسے
ملے مجھے دس دن ہو چکے ہیں۔ اب یہ حالت ہے کہ چاہے میں پورب کو جاؤں
یا پچھم کو مجھے اس وقت ہوش آتا ہے جب میں اس کے چوبارے تلے جا پہنچا ہوں

ور ہوش آتا تو وہاں سے بھاگتا ہوں۔ سارے محلے میں چرچا ہو رہا ہے۔ لوگ گردن گھما گھما کر مجھے دیکھتے ہیں۔ انگلیاں اٹھا اٹھا کر میری طرف اشارے کرتے ہیں۔ محلوں کے لڑکے مجھے دیکھ کر ہنستے ہیں۔ لڑکیاں مذاق اڑاتی ہیں۔ اور وہ بانو۔ وہ تو مجھے دیکھ کر یوں ساکت ہو جاتی ہے۔ جیسے پتھر ہو گئی ہو۔ اس نے ہنسنا مسکرانا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو وہ ڈر کے مارے باہر بھی نہیں جھانکتی عجب تماشہ ہے۔ وہ ہانپنے لگا۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا۔ "یار وہ چائے تو مدت سے بنی ہوئی ہو گی میں لایا ہی نہیں۔" وہ اندر چلا گیا اور چند ساعت کے بعد چائے کا ٹرے اٹھائے ہوئے آیا۔ آتے ہی اس نے چائے بنانا شروع کی۔

"ہاں۔" وہ چائے بناتا ہوا بولا۔ "تو تمہاری نفسیات کیا کہتی ہے۔ کیا آصفی یہ سب گڑبڑ گھوٹالا کیا ہے۔ کیا کیوں ہو رہا ہے مجھ سے۔ ایسی عجیب و غریب باتیں کیوں ہوتی ہیں۔

کوئی بات بھی تو سیدھی نہیں ہوتی۔ یہ بات اتنی بے قاعدہ پیچیدہ اب بتاؤ میں کیا کروں۔"

"ارے۔" وہ چائے کی طرف دیکھ کر چلایا۔ "یہ کیا چیز ہے۔"

چائے کا رنگ ہلکا پیازی تھا۔ جیسے چائے نہیں بلکہ پشاوری قہوہ ہو۔

"اوہ" وہ بولا۔ "پھر اس نے گڑبڑ کر دی۔ نہ جانے قہوہ بنا دیا ہے کیا حد ہو گئی۔" اس نے چائے والی کشتی اٹھائی اور اندر چلا گیا۔

پہلے تو مکان سے اس کے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر دفعتاً چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ وہ وحشی ہو رہا تھا۔ نہ جانے کس چیز سے بیگم کو زد و کوب کر رہا تھا اور وہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی۔

"اور مارے اور پیٹ اور پیٹ۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔"

"تو توڑ دے۔ ایک بار میں قصہ ختم کر دے۔"

"وہ قصہ ختم کروں گا کہ دنیا دیکھے گی۔"

پڑوسی چاروں طرف، اکٹھے ہو گئے۔

"اب چھوڑ بھی کہ دوسری دم لے گا۔" ایک نے کہا۔

"یہ کیا قیامت اٹھا رکھی ہے تم نے۔" دوسرا بولا۔

"ارے نقی صاحب ارے نقی صاحب۔"

وہ ایک محلے والے بیٹھک میں آ گئے۔ "کیوں صاحب یہ کیا آئے دن کا فساد ہے ہمارے ناک میں دم آ گیا بھائی صاحب۔"

علی اور جمیل خاموش بیٹھے تھے۔

اندر جھگڑا بڑھتا جا رہا تھا۔

اس پر محلے والے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ لوگوں نے نقی کو پکڑ لیا لیکن وہ ویسے ہی چیخے جا رہا تھا۔ "نذیر خدا کا قسم میں تو چاہے ڈانٹ اب اور چاہے پٹائی ہو تو پورا زور ڈال دیتی ہے۔" وہ چیخ رہا تھا۔

"چلو چلیں۔" جمیل نے علی سے کہا۔

"لیکن یہ گڑبڑ۔" علی نے پوچھا۔

"یہ تو یوں ہی رہے گی۔" جمیل بولا۔ "کوئی مدد نہیں کر سکتا کوئی دخل نہیں دے سکتا۔"

"لیکن۔" علی بولا۔

"بے کار ہے نقی کا بھید کسی نے نہیں پایا۔"

"کیا وجہ تھی۔"

وہ دونوں بیٹھک سے باہر نکل آئے۔"

باہر بازار میں چراغ جل رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا آسمان پر گلابی بادل تیر رہے تھے۔

بیٹھک کے پاس ہی ایک عورت کو دیکھ کر وہ رک گئے۔

وہ ان کے قریب آ گئی۔ "یہ نیا محلہ ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"جی۔" جمیل نے جواب دیا۔

"مجھے تقی صاحب کے گھر جانا ہے۔" وہ بولی۔ "مکان نمبر ۳۰۳ آپ کو معلوم ہو گیا؟"

"تقی صاحب کے ہاں۔" جمیل نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی وہ بڑے اچھے صاحب ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ میں ملازم ہیں۔"

"آپ کون ہیں؟" جمیل نے پوچھا۔

"میں ـــــ" وہ رک گئی۔

"ان کی رشتہ دار ہیں کیا؟" جمیل نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ بولی "میں ان کی جان پہچان ہوں۔ مجھے ان سے ضروری ملنا ہے۔"

"آپ کا نام بانو ہے نا۔" جلیل نے کہا۔

حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"بانو ـــــ" جمیل نے حیرت سے عورت کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں" وہ بولی۔

"ارے تم یہاں چور بنے ہو۔" تقی نے بیٹھک سے سر نکال کر انہیں آواز دی۔

یہ لیجیے تقی آ گیا۔ جلیل نے کہا۔

بانو کو یوں اپنے گھر کے دروازے پر دیکھ کر تقی کی آنکھیں ابل آئیں ایک ساعت جیسے وہ جھجکا پھر وہ دیوانہ وار آگے بڑھا۔ بانو سمٹ کر رک گئی۔ خوف سے سہمی

"کل صبح۔"

اگلے روز سکول پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مسٹر معروف شیخ صاحب کے دفتر میں بیٹھے
تھے۔ باہر اساتذہ کے دل دھڑک رہے تھے اور وہ اتفاقاً لڑکوں کو گھور گھور کر اپنے دل
کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ سازشیوں کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ ان کے انداز
میں گھبراہٹ تھی۔ لیکن ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ چپڑاسی مؤدبانہ سٹولوں پر بیٹھے
تھے۔ ڈرل ماسٹر خصوصی طور پر کمرے میں احکامات نافذ کر رہا تھا اور ایلی سوچ
میں کھویا ہوا تھا۔ اسے بار بار فضل کی بات یاد آ رہی تھی۔ اس نے ایلی سے کہا تھا۔
تمہارے ساتھیوں میں جرأت نہیں نہ یہ بات رکیں گے نہ سامنے آ سکیں گے۔ اب
سوچ لو۔ آیا سامنے آتا ہے یا نہیں۔ دونوں پہلو ہیں۔ اگر تم سامنے نہ آئے تو ممکن
ہے سارا کیا کرایا بیکار جائے اور اگر سامنے آ گئے تو شاید زمانہ میں آپ کی مدد کچھ
بھی نہ ہو۔ ایلی سوچ رہا تھا۔

طبعی طور پر وہ سامنے آ جانے کا قائل تھا۔ وہ صرف اس پہلو پر غور کر رہا تھا کہ
میرے سامنے آ جانے سے باقی ساتھیوں کو نقصان نہ پہنچے۔

سکول کے بچے کو چھٹی دینے کے بعد مسٹر معروف نے اساتذہ کی میٹنگ بلائی۔
اب کمرے میں وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔ مسٹر معروف شیخ صاحب سے باتیں کر
رہے تھے۔ اساتذہ بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ مسٹر معروف کا شیخ سے برتاؤ ایسا تھا جس
سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شیخ مسعود کی بات کی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے ہر مشورے پر
عمل کرنے کے لیے بیتاب ہیں۔ باتوں کے دوران میں وہ نیچی نگاہ سے اساتذہ
کے ردعمل کا جائزہ لے رہے تھے یا شاید یہ دیکھ رہے تھے کہ جو اثر وہ پیدا کرنا چاہ
تے تھے کیا وہ پیدا ہو رہا ہے۔

شیخ صاحب نہایت مؤدبانہ بیٹھے تھے۔ لیکن ان کے چہرے سے فکر کے آثار مترشح
تھے۔ ان کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے جھجک اور گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

وفعتاً معروف صاحب نے اساتذہ کو خطاب کرنا شروع کیا۔

"اساتذہ کرام۔" وہ بولے "میں آپ کے سکول میں انکوائری کے لئے آیا ہوں۔
"

"گزارش یہ ہیں کہ تقریباً ایک سال سے جناب رائے گمنام شکایتی خط موصول ہو رہے ہیں۔ ان خطوط کا انداز وہ لکھا ہے۔ روز ایک خط بھیجا جاتا ہے۔ جس میں صرف ایک شکایت درج ہوتی ہے، وہ بھی نہایت اختصار سے گمنام خط لکھنے والا یقیناً کوئی ذہین آدمی ہے اور یہ بات بھی قابل ستائش ہے کہ یہ شکایت کسی خاص آدمی کے خلاف نہیں ہوتی۔ بہر حال ظاہر ہے کہ آپ میں سے کوئی ایک یا چند لوگ مل کر یہ خطوط بھیج رہے ہیں۔ میں صرف آج اس لئے آیا ہوں کہ اس کے متعلق انکوائری کروں لیکن انکوائری تبھی ہو سکتی ہے۔ جب مدعی اور مدعا علیہ دونوں موجود ہوں۔ مدعی شکایت پیش کرے۔ مدعا علیہ اس کا جواب دے اور میں انسپکٹر کی حیثیت سے دونوں پارٹیوں کے دلائل سن کر اس کا فیصلہ کروں۔ لہذا میں آپ کی خدمت میں ایک درخواست کروں گا کہ جو بھی مدعی ہے وہ اپنا آپ ظاہر کرے۔"

مسٹر معروف خاموش ہو گئے۔ کمرے پر سکوت طاری تھا تمام اساتذہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔

مسٹر معروف نے چند ایک منٹ انتظار کیا۔ وہ اساتذہ کو جانچتے رہے لیکن پھر مزید وضاحت کرنے لگے۔

"دیکھئے" وہ بولے۔ "یہ بات تو میں تسلیم کرنے کے لئے قطعی طور پر تیار نہیں کہ سٹاف کے علاوہ کوئی اور شخص ایک سال سے اس سکول کی شکایت بھیج رہا ہے۔ کیے درست نہیں۔" انہوں نے پوچھا۔ اساتذہ خاموش بیٹھے رہے۔

مدعی اور مدعا علیہ

"تو آپ کی خاموشی سے ظاہر ہے کہ آپ کو میرے نظریوں سے اتفاق ہے۔ مسٹر

معروف مسکرا کر کہنے لگے۔ لہٰذا اگر آپ میں ہی وہ صاحب موجود ہیں۔ جو ایسے خط
لکھ رہے ہیں۔ تو وہ مجھ سے بات کریں اور اگر آپ میں سے کوئی شخص ان خطوط کو
پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہے تو سمجھ لیجئے کہ انکوائری ختم ہو گئی۔ کیونکہ اگر آپ میں
سے کسی شخص کو کوئی شکایت ہی نہیں تو انکوائری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ایلی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر شیخ کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔ لیکن مسٹر معروف
نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں الیاس صاحب۔" معروف نے پوچھا۔

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔" ایلی نے کہا۔ "کیا گم نام خط لکھنے والے نے
انکوائری کا مطالبہ کیا ہے۔"

مسٹر معروف کچھ دیر تک خاموش رہے پھر بولے۔ میرے خیال میں نہیں۔ تو
آپ خود ہی انکوائری کے لئے تشریف لائے ہیں۔ لہٰذا مدعی کے ہونے نہ ہونے
سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ایلی نے کہا۔

"ہوں۔" مسٹر معروف مسکرائے۔ "کیا آپ چاہتے ہیں کہ انکوائری ہو۔"

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

مسٹر معروف نے تمام اساتذہ کو مخاطب کر کے کہا "کیا آپ میں سے کوئی
صاحب چاہتے ہیں کہ انکوائری ہو۔"

سب لوگ خاموش بیٹھے رہے۔

"میری ایک گزارش اور ہے۔" ایلی نے کہا۔

"کہیو۔" معروف بولے۔

"ابھی آپ نے فرمایا ہے کہ شکایات کسی فرد کے خلاف نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ
مدعا علیہ بھی کوئی نہیں ہے تو پھر مدعی کے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔" کچھ دیر
تک مسٹر معروف خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بولے۔ "الیاس صاحب معلوم ہوتا ہے

کیا آپ کو اس کیس سے خاص دلچسپی ہے؟"

"جی۔" ایلی نے کہا۔ اور اس کا دل بری طرح سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔

"کیا دلچسپی ہے؟" معروف بولے۔

"مجھے خطوں کی نوعیت کا علم ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ وہ خط میں نے لکھے ہیں۔" ایلی نے ٹھہر کر کہا۔ اور اس کا سر زمین سے یوں لگ گیا جیسے ہونٹوں کو آگ سی لگی ہو۔

مسٹر معروف نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔

اساتذہ کرام نے گردنیں اٹھائیں۔ ہال کمرے میں سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ چودھری بیگ کی آنکھ چمکی۔ شبیر نے آہیں بھرنا شروع کر دیا۔ احمد اور ڈار جنگ، ماسٹر مسکرا رہے تھے۔

"تو آپ مدعی ہیں۔ مسٹر معروف بولے۔

"جی نہیں۔" ایلی نے کہا۔ مجھے ذاتی طور پر کوئی تکلیف نہیں کوئی شکایت نہیں۔"

"دیکھئے ایلی صاحب" مسٹر معروف نے چیخ کر کہا۔ میں یہاں انصاف کرنے نہیں آیا۔

میرا فرض یہ ہے کہ آئین اور قوانین کے مطابق نظم و نسق نہیں بگڑ رہا۔ شکایت کنندہ مسعود کے خلاف نہیں۔ یہ خطوط آپ کو صرف اس لئے لکھے گئے کہ یہ فعل کا ارتکاب یہ جتا رہا ہے کہ آپ کے نظم و نسق کی توہین ہو رہی ہے آپ ہی مدعی ہیں آپ ہی مدعا علیہ ہیں۔"

"تو آپ ان شکایات کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے تیار نہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ ایلی نے کہا۔

"تو مجھے کیسے علم ہو کہ جو آپ نے لکھا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔

"شکایت کی تھی متعلقہ ریکارڈ کا حوالہ دیا ہے آپ ریکارڈ دیکھیں۔ گواہوں کی کیا ضرورت ہے۔"

مسٹر معروف بولے۔ یقین میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ریکارڈ دیکھوں۔ مسٹر معروف بولے۔

"تو نہ دیکھئے آپ جو نہیں آپ کا ظلم ثابت جائے۔"

مسٹر معروف نے ایک قہقہہ مارا۔ آپ بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ مسٹر آصفی۔ میں آپ کی ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ لیکن اس رپورٹ سے آپ نوکری نہیں کر سکیں گے۔"

انکوائری کے بعد فضا پر گویا ایک اداسی اور ویرانی چھا گئی۔ وہ اداسی جو کامیابی اور جدوجہد کے بعد چھا جاتی ہے۔ کیا تھی وہ انکوائری جس کے لئے انہوں نے زندگی کا ایک سال حرام کر دیا تھا۔ ایک سال محنت کی تھی۔ سوچ بچار کی تھی۔ پلان بنائے تھے آخر اس تمام تگ و دو کا مقصد کیا تھا۔ ایلی سوچ رہا تھا۔

مولوی! مولوی! منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا چلایا۔ مولوی! مولوی!!

اس کے روبرو پاگل مولوی آ کھڑا ہوا۔ وہ سڑک پر بنی ہوئی مسجد پر کھڑا تھا۔ "کن رہے ہیں آپ۔" ایلی چلایا۔ "کن رہے ہیں آپ۔ آپ کو ستانے والا آج خود مصیبت میں گرفتار ہے۔" "ہوں ہوں۔" مولوی نے مڑ کر ایلی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خاموش تھا۔ خوشی اور غم سے بے نیاز۔ "ہوں ہوں"۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا "بے کار ہے بے کار۔" ایلی کے دل سے آوازیں آنے لگیں۔ تم ایک دکھی کا دکھ دور نہیں کر سکے۔ تم اسے مسرت نہ دے سکے۔ الٹا تم نے ایک اور آدمی کو دکھی بنا دیا۔"

ایلی کے روبرو شیخ آ کھڑا ہوا۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہا تھا۔ میں صرف اس سے چٹ گیا۔"

وہ بولا۔ "کہ تم نے دوست بن کر مجھ پر وار کیا۔"

ادھر مسٹر معروف مسکرا رہے تھے۔ "اپنی زندگی سے انصاف کی توقع رکھو گے تو سدا دکھی رہو گے۔ سرکاری ملازمت میں انصاف نہیں ہوتا صرف ایڈمنسٹریشن ہوتی ہے اور ایڈمنسٹریشن کے پاٹ تلے ظالم مظلوم دونوں پستے ہیں۔"

علی کے ساتھی خاموشی سے بیٹھے تھے۔ ہارمونیم ایک طرف پڑا تھا۔ تاش کے پتے صحن میں بکھرے تھے۔

"کچھ مزا نہیں آیا علی۔" افضل کہہ رہا تھا۔

"ہاں یار کچھ بھی تو نہیں ہوا۔" شبیر آہیں بھر رہا تھا۔

احمد سر جھکائے بیٹھا گہری سوچ میں پڑا تھا۔

ادھر منشا کہہ رہا تھا۔ "اب اس انکوائری کا نتیجہ کیا نکلے گا۔"

٭٭

عین اس وقت باہر سے پوں پوں کی آواز آئی اور پھر محمود ہنستا ہوا اندر آ گیا۔

"چلو۔" وہ بولا۔ "جلدی کرو۔ جلدی۔ ابھی واپس آ جانا۔"

"کہاں جانا ہے۔" علی نے پوچھا۔

"کار۔" علی نے دہرایا۔

"ہاں ہاں۔" محمود بولا۔ "تم سے چند ایک ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"اچھا۔" علی بولا اور وہ دونوں باہر چلے گئے۔

دروازے کے باہر میدان میں کار کھڑی تھی۔

"بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ۔" محمود بولا۔ "ابھی بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ بڑی ضروری باتیں ہیں۔"

محمود نے اسے گاڑی میں دھکیل دیا اور جونہی وہ کار میں داخل ہوئے گاڑی چل پڑی۔

اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ میم کو بیٹھے دیکھ کر ایلی چلایا۔ "ارے یہ تو میم ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا۔" محمود ہنسا۔ "تمہیں کیا لگتی ہے" اس نے زیر لب کہا۔

"لیکن تم تو کہتے تھے باتیں کرینگے۔"

"باتیں ہی تو کریں گے۔"

"باتیں کیا جرم تو نہیں۔"

"لیکن یار۔" ایلی بولا۔

"میڈم یہ میرا دوست کہہ رہا ہے۔" محمود نے میم کو خطاب کر کے کہا۔ "کہ آپ کی موجودگی میں بات نہیں ہو سکتی۔"

وہ مسکرا دی لیکن پھر پنجابی میں کہنے لگی۔ "ہام پنجابی نہیں سمجھتا۔"

"معاف کیجیے۔" محمود بولا۔ "ہمیں شک ہے کہ آپ سمجھتی ہیں۔"

"شکی مجاج کچھ نہیں ہوتا۔" وہ پنجابی میں بولی۔

"لیکن آپ تو پنجابی بول رہی ہیں۔" ایلی نے کہا۔

"خالی بولتا ہے سمجھتا نہیں۔" وہ بولی۔

ایلی قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس نے محسوس کیا کہ کار میں تین بچے بیٹھے تھے۔ میم ویم کوئی نہ تھی۔ بس بچے وہ بچہ چاہ رہا تھا باتیں کریگا۔

"میرا تار ملا تھا۔" محمود نے پوچھا۔

"کیسا تار؟" ایلی نے کہا۔

"جو میں نے تمہیں دیا تھا کہ میں آ رہا ہوں تیار رہنا۔" محمود نے کہا۔

"نہیں تو۔" ایلی نے جواب دیا۔

"جبھی تو تمہیں پہلے سے علم نہ تھا کہ میں آ رہا ہوں۔"

"نہیں تو۔" ایلی نے جواب دیا۔

"اچھا تو تمہیں پہلے سے علم نہ تھا کہ میں آ رہا ہوں۔"

"نہیں تو۔" ایلی نے جواب دیا۔

"عجب سی بات ہے۔" اس نے کہا اور پھر وہ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے حتیٰ کہ ایلی کو یہ خیال بھی نہ رہا کہ موٹر کوئی اور بھی موجود ہے یا موٹر مسلسل چلے جا رہی ہے۔

دوکانوں کو دیکھ کر دفعتاً ایلی کو خیال آیا کہ اس کے پاس سگریٹ ختم ہو چکے تھے۔

"ذرا روکیے میں سگریٹ خرید لوں۔"

کار سے باہر نکل کر وہ حیران رہ گیا۔ "ارے۔" وہ چلایا۔ "یہ کونسی جگہ ہے۔"

غالباً وہ سمجھ رہا تھا کہ کار جاوراں کے چکر کاٹ رہی ہے۔

"کونسی جگہ ہے۔" محمود نے ہنس کر پوچھا۔

"یہ تو لاہور معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ پشاور ہے۔" محمود نے کہا۔

"کیوں پریشان کر رہے ہو اپنے دوست کو۔" مسز غلپ نے کہا۔ "یہ تو جاوراں کا بازار ہے۔"

"لیکن میں واپس کیسے جاؤں گا۔" ایلی نے پوچھا۔

"رات کی گاڑی سے چلے جانا۔ صبح پہنچ جاؤ گے۔" محمود نے کہا۔

"بیماری کی درخواست دے دینا۔" مسز غلپ نے کہا۔ "آخر میڈیکل سرٹیفکیٹ کس مرض کی دوا ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"یہ ٹھیک ہے۔" محمود چلایا۔ "تم ہمارے ساتھ ہی چلو۔"

"کہاں۔" ایلی نے پوچھا۔

"پشاور۔" محمود نے جواب دیا۔

''لیکن تم تو آکل پر ہوتا۔'' لِلی نے پوچھا۔

''مجبوری۔'' شمو بولا۔ ''دفتر تبدیل ہو کر نیا شہر میں چلا گیا ہے۔''

''اب غصہ میں آنے کا کیا فائدہ۔'' مسز فلپ نے کہا۔

''محترمہ۔'' وہ بولا۔ ''اس شخص نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔''

''کوئی نئی بات ہے؟'' وہ مسکرائی۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔'' لِلی نے کہا۔

''تو چھوڑو۔'' وہ بولی۔

اور موٹر پھر چل پڑی۔ رات لاہور رکنے کے بعد اگلے روز وہ تینوں نیا شہر جا پہنچے۔

مسز فلپ

مسز فلپ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ لیکن وہ یوں چلتی پھرتی تھی۔ جیسے ابھی ابھی جوان ہوئی ہو اور اسے اس خوش کن زندگی سے جو اس کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بے حد عشق تھا۔ وہ مسرت بھری حیرت سے ہر چیز کی طرف دیکھتی جیسے اس نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا ہو۔ بچوں کی طرح تالیاں بجاتی اور بہت چاہتی کہ کسی اور کو دکھائے۔ اس تازہ مسرت میں کسی اور کو اپنا شریک بنائے۔ اس کے لئے زندگی سکون اور اطمینان نہیں بلکہ مسلسل حرکت مسلسل مسرت اور مسلسل تگ و دو تھی۔ غالباً اسی وجہ سے وہ زندگی کی خوشیوں میں پندرہ افراد کو شریک کر چکی تھی اور اب مسٹر فلپ اس کا سولہواں خاوند تھا یا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس قدر ذہانت اور چمک کی مالک تھی کہ کوئی اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے ہمراہ چلتے تو تھے لیکن بہت جلد تھک کر پیچھے رہ جاتے۔ پھر وہ محسوس کرنے لگتی کہ وہ اکیلی ہے تنہا ہے۔ اس بات پر اسے غصہ آنے لگتا۔ اس وقت اس کی خواہش ہوتی کہ کوئی اس سے محبت کرے یا لڑے، بحث کرے یا ہاتھا پائی سے بھی گریز نہ کرے۔ اسے جمود سے نفرت تھی۔ سکون ایک

بھی تک چیز دکھائی دیتی تھی۔ اسے ہر بات گوارا تھی۔ سکون سے نکال کر پھر سے متحرک کر دیے جاتے۔ وہ حرکت کس قدر شدید اور خطرناک کیوں نہ ہو جاتی ہو تو وہ بھی چپ۔ مسز فلپ کے لئے وہ حد درجہ سکون تھا۔

اس کا خاوند مسٹر فلپ ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ لیکن خوبصورت کے علاوہ اس میں کوئی بات نہ تھی۔ جو مسٹر فلپ کی شخصیت کو جذب کر سکتی۔ درحقیقت مسز فلپ سے شادی کرنے سے مسٹر فلپ کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔

مسٹر فلپ ایک فیکٹری میں ملازم تھا اور اس کی ملازمت اس نوعیت کی تھی کہ تنخواہ میں گزر ممکن نہ تھا۔ وہ ہمیشہ حاجت مند رہتا۔ یہ حاجت مندی مسز فلپ کی اپنے خاوند سے دلچسپی میں گویا سونے پر سہاگے کا کام دیتی تھی۔ پھر مسز فلپ کے خطوں کا ایک تانتا بندھ جاتا۔ فلپ ڈارلنگ تمہیں مزید روپے کی ضرورت ہو تو مجھے فوراً مطلع کرو۔ نہیں ڈارلنگ گھٹیا سگریٹ نہ پینا۔ اگر وہاں تمہارے والے میں اعلیٰ سگریٹ دستیاب نہ ہوتے ہوں تو مجھے لکھنا کہ میں یہاں سے بھیج دوں۔

مسز فلپ میں مامتا کا ایک طوفان موجزن تھا۔ چونکہ سولہ شادیوں کے باوجود اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ وہ مسٹر فلپ کا یوں خیال رکھتی تھی۔ جیسے اس کا اکلوتا بیٹا ہو۔ مسٹر فلپ اس کی اس کمزوری سے واقف تھا اور دل کھول کر اس کے مامتا بھرے جذبات کو حرکت میں لانے اور ان میں شدت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کیا کرتا تھا۔ دقت یہ بھی تھی وہ بہت دور دراز مقام پر نوکری کرتا تھا اور مسز فلپ کو خالی خطوط پر گزر کرنا پڑتا تھا۔ شاید اسے خاوند کی جسمانی موجودگی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ہو مگر مسلسل تنہائی اسے کھائے جا رہی تھی۔

جب کبھی مسز فلپ کو اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوتا تو اسے غصہ آ جاتا۔ اس وقت اس کا جی چاہتا کہ کوئی ایسا ساتھی ہو جس پر وہ اپنا غصہ اتار سکے۔ یہ کیا زندگی ہوئی کہ لڑنے والا بھی کوئی نہ ہو۔ پیار کرنے والا نہیں نہ سہی۔ لڑنے والا بھی ہو

تو۔ اس وقت وہ غیر ارادی اپنے ہاتھوں سے لڑنے کی شدت سے کوشش کرتی مگر اس
کے ماتحت نہ جانے کس مٹی سے بنے ہوئے تھے۔ جواب میں سر جھکائے اس کے
روبرو کھڑے ہو جاتے۔ "یس میڈم سوری میڈم۔" اس بات پر میڈم کو اور غصہ آتا
اور آنکھیں دکھاتی منہ بناتی اور فر فر انگریزی بولتی جسے ان کے رہے سہے
اوسان بھی خطا ہو جاتے۔ اس پر مسز فلپ مایوس ہو کر کمرے میں جا کر رو دیتی رونے
سے دل کی بھڑاس نہ نکلتی تو مسٹر فلپ کو ایک لمبا خط لکھنا شروع کر دیتی۔

مسز فلپ کے ماتحت والے سمجھتے تھے کہ میڈم کی بات سمجھ میں نہیں آتی کبھی ڈانٹتی
ہے ہنسے جاتی ہے کبھی غیر ارادی رونا شروع کر دیتی ہے۔ خواہ مخواہ الجھتی ہے۔ منہ کو
آتی ہے اور پھر بیٹھ کر آنسو بہانے لگتی ہے۔ نہ جانے کیسی افسر ہے گھڑی میں کچھ
گھڑی میں کچھ بھی معطل کر دینے کی دھمکی دے رہی تھی اب چپڑاسی کے ہاتھ بادام بھیج
دیے کہ پشاور سے آئے ہیں تم بھی کھاؤ۔

محمود نے جب آسامیوں کا اشتہار دیکھا تو فوراً ایک عرضی دے دی تھی۔ اس
وقت یہ علم نہ تھا کہ ویلفیئر کے محکمہ میں زیادہ تر کارکن عورتیں اور محکمہ کا چیف بھی
عورت ہے۔ عورتوں کے متعلق محمود کا رویہ عجیب تھا۔ اگرچہ وہ اس قسم کا فرد نہ تھا پھر بھی
اسے عورتوں سے بے حد دلچسپی تھی۔ ایسی دلچسپی جو ایک نارمل مرد عورت سے
محسوس کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اسے عورت سے ڈر لگتا تھا۔ وہ ان سے گھبراتا تھا۔ ساتھ
ہی انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی شدید کوشش کرتا۔ یہ ظاہر نہ ہونے دیتا کہ توجہ
جذب کرنے کی کوشش کر رہا ہے یا انہیں غیر ازمعمول اہمیت دے رہا ہے بلکہ اس کے
برعکس وہ بے پروائی کا لبادہ اوڑھے رکھتا اور ماتھے پر یوں تیوری جماتا جیسے نسوانی حسن
سے مستغنی ہو۔ پھر موقعہ ملنے پر ایک شدت بھی دکھاتا۔ آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر مسکراتا گلیڈ آئی چمکاتا اور پھر تیوری چڑھا کر یوں منہ موڑ لیتا۔ جیسے جانتا ہی
نہ ہو۔

میڈم اور محمود

جب وہ نیا نیا اس محکمے میں آیا تو عورتیں ہی عورتیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ لیکن اس گھبراہٹ کے ساتھ ہی دلچسپی بھی محسوس کی۔ بہر حال اس نوکری میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اسے محکمہ چیف۔ یعنی میڈم سے کام پڑتا تھا۔ میڈم کو دیکھتے ہی محمود نے تیوری چڑھا لی اور اپنے کام میں محو ہو گیا۔ جیسے اسے عورت و مرد کی تمیز ہی نہ ہو۔ لیکن منیجر کی ایک کارکن بڑی بانکی تھیں۔ کئی ایک شوخ تھیں۔ ایسے حالات میں ہر وقت پیشانی پر تیوری چڑھائے رکھنا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ لہذا جب میڈم کی توجہ ادھر ہوتی تو وہ کارکن پر آنکھ چلاتا اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔

آنکھ چلا کر دفعتاً پھر سے پتھر ہو جانے کے فن میں محمود کو خوب مشق تھی۔ لیکن دقت یہ تھی۔ کارکنیں بالکل ہی نوجوان تھیں۔ وہ اس کی نگاہ کی متحمل نہ ہو سکتی تھیں۔ پگھل کر موم ہو جاتیں اور موم سے چھینٹے اڑتے اور میڈم پر جا پڑتے۔ اس پر میڈم کو غصہ آ جاتا۔

میڈم کو اس بات پر غصہ آتا کہ ابھی یہ لڑکی مناسب طریقے سے باتیں کر رہی تھی اب منہ بنانے لگی لفظوں کو رولنے لگی۔ آنکھیں چمکانے لگی۔ ادا کرنے لگی۔ گال تمتما گئے یہ کیا گڑبڑ ہے۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ لڑکیاں محمود کے رعب داب سے آ کر رعب کھا جاتی ہیں۔ اسے پتہ نہ تھا کہ محمود اپنے ماتھے کی شکن اتار سکتا ہے۔ وہ ایک بار میڈم نے علانیہ محمود سے اس تبدیلی کی بات کر دی جو اس کی موجودگی میں لڑکیوں میں ظاہر ہوتی تھی۔

اس پر محمود گھبرا گیا اور اسے غصہ آ گیا اور اس کا رویہ میڈم سے اور بھی سخت ہو گیا۔

ایک روز جب میڈم نے کہا۔ "تم نے دیکھا محمود کہ جب اس لڑکی نے تمہیں دیکھا تو اس کے ہاتھ میں پنا شیک کرنے لگا۔ حتیٰ کہ رنگ بدل گیا۔"

میڈم کی اس بات پر محمود کو غصہ آتا تھا تو پھر تمہیں کیا۔ وہ دل میں کہا کرتا۔ اس

روز تو سے بہت غصہ آیا۔

وہ بھی غصے سے بھرا بیٹھا تھا کہ مالی پھول لے آیا۔ میڈم نے پھول دیکھ کر گویا خوشی سے چیخ ماری۔ "یہ دیکھا تم نے کلرک۔" وہ چلائی "کتنے خوبصورت پھول ہیں یہ دیکھو تو۔"

محمود نے منہ موڑ لیا۔ "نہیں میں نہیں دیکھتا۔" اس کے منہ سے نکل گیا۔

میڈم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

کسی ماتحت نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ شاید اسے غلطی لگی ہو۔ شاید کلرک نے غلطی سے بات کر دی ہو۔ یہ کیسے ہے کہ ایک ادنیٰ ماتحت مجھ سے لڑنے کی کوشش کرے۔

"تمہیں دیکھنا پڑے گا۔" وہ شدید جوش میں بولی۔

"یہ میرے فرض میں سے نہیں ہے۔" محمود نے گھور کر میڈم کی طرف دیکھا۔

میڈم کا منہ سرخ ہو گیا۔ شاید خوشی سے یا وہ غصے میں چلانے لگی۔ یہ شاید لڑکی کے اس نئے مکان پر خوشی سے چیخ رہی ہو۔

"یہ کوئی بات کرنے کا طریقہ نہیں ہے کلرک۔" وہ بولی۔

"میڈم یاد رکھیے کہ میرا نام کلرک نہیں محمود ہے۔" محمود نے کہا اور پھر خراماں خراماں چل پڑا۔ جیسے شاہ کا پارٹ ادا کرنے کے بعد ایکٹر بڑے رعب سے سٹیج سے باہر چلا جاتا ہے۔ میڈم حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

اگلے روز جب محمود دفتر آیا تو وہ جان بوجھ کر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ ورنہ عام طور پر اس کا دستور تھا کہ آتے ہی پہلے میڈم سے ملتا کام کاج کے متعلق پوچھتا اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔

کچھ دیر کے بعد مالی آیا۔ "میم صاحب بلاتی ہیں۔"

"اچھا" محمود نے کہا۔ "کام سے فرصت ہو گی تو آؤں گا۔"

ان کو گئے ابھی دیر نہ ہوئی تھی کہ میڈم خود آ گئی۔ وہ بولی۔ "مجھے پھول نہیں دکھانے۔

بلکہ خط کا جواب لکھوانا ہے۔"

"ہوں۔" محمود نے سر ہلایا اور اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔

اس روز میڈم بے حد خوش تھی وہ بار بار محمود کے کمرے میں آتی اور اسے کوئی نہ کوئی بات سمجھا کر یا بتا کر چلی جاتی اور کچھ دیر کے بعد لوٹ آتی۔ محمود کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا رویہ کیوں بدلا ہوا ہے۔ اس نے کلرک کی جگہ مسٹر محمود کہہ کر اسے پکارنا کیوں شروع کر دیا ہے۔

شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ میڈم اس کی امداد کے بغیر کام نہیں چلا سکتی تھی۔ چونکہ دفتر کے دوسرے کلرک قابلیت اور ذہانت سے خالی تھے اور روزمرہ کے معمول کام کے علاوہ کچھ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ محمود کو اپنی قابلیت پر اعتماد تھا اور یہ اعتماد مزید مشکلات کا باعث تھا۔

ایک روز میڈم محمود کا لکھا ہوا خط پڑھ کر بولی۔ "ٹھیک ہے لیکن الفاظ کے ہجے ٹھیک کرو۔"

"ہوں۔" محمود بولا اور اس نے میڈم کے سامنے وہ خط لفافے میں بند کر کے ڈسپیچر کو دے دیا۔ "اسے ابھی ڈسپیچ کر دو۔" وہ بولا۔

"لیکن میں نے کہا تھا الفاظ کے ہجے ٹھیک کر کے بھیجو۔"

محمود بڑے اطمینان سے خط کی نقل اٹھائی پھر آکسفورڈ ڈکشنری لی اور وہ نقل اور ڈکشنری میڈم کی طرف بڑھا دی۔

اس بات پر میڈم سٹپٹا گئی۔ "میں نے کہا تھا کہ تم ہجے دیکھو۔"

"میں تو وثوق سے جانتا ہوں کہ ہجے ٹھیک ہیں۔" محمود بولا۔ میڈم چپ سی رہیں۔

محمود کے اس قسم کے طرز عمل سے میڈم چونکی اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ

یک مرد سے بت کرری ہے کلرک سے نہیں۔ غالباً سے پنا خاندیاد آجاتا ور پھر

شاید س خیال پر کہ فطرت کو مردوں کا سہارا حاصل کرنے کا حق ہے یا شاید اس سے کہ اس

کا خاوند تنہ دور کیوں رہتا ہے وہ غصے سے مجسمہ بن جاتی۔ بہر صورت میڈم ور محمود

کے درمیان عجیب چپقلش شروع ہوئی۔ غالباً محمود کی خواہش تھی کہ کسی وجہ سے میڈم

ناراض ہوکر اسے واپس اپنے محکمے میں بھیج دے۔ اس لئے اس نے جان بوجھ کر

میڈم کی باتوں کو رد کرنا شروع کردیا سے قطعی طور پر علم نہ تھا کہ یکی باتیں کر کے وہ

میڈم کو حساس دلا رہا ہے کہ وہ کلرک نہیں مرد ہے ور میڈم چیف کے علاوہ عورت

بھی ہے۔

س کے بعد محمود نے مسز فلپ کے نجی معاملات میں دخل دینا شروع کردیا۔ یہی

تو وہ چاہتی تھی کہ کوئی س کے معاملات میں دلچسپی لے س سے جھگڑے

مشورے دے تاکہ سے یک ساتھی کی موجودگی کا حساس ہو۔

گرچہ مسز فلپ تنخواہ ملتے ہی یک معقول رقم مسٹر فلپ کو بھیج دیا کرتی تھی۔ لیکن

جلد ہی فلپ کی زیادتی کا تذکرہ ہوتا ور تمام ضروریات مثلاً سگریٹ وہسکی کافی کی کمی

کی شکایت ہوتی۔ مسز فلپ پھر کچھ روپیہ بھیج دیتی۔ لیکن جلد ہی پھر یسا ہی خط

موصول ہوتا۔ پھر روپیہ بھیجنے کے علاوہ صبح شام مسٹر فلپ کی پریشانیوں کی باتیں کرتی

رہتی تھی۔ س نے کبھی ن مطالبات کا بدلہ نہ مانا تھا۔ بلکہ کثر وہ اس قدر روپیہ رسال

کردیتی کہ خود پنی ضروریات میں تخفیف کرنی پڑتی ور یسا بھی ہوتا تھا کہ سے خود

کھانے پینے کے لئے قرض لینا پڑتا تھا۔

سترھویں لے پالک

یک روز جب ہو مسٹر لے پالک کو دھری تنخواہ رسال کرری تھی تو محمود نے کہا۔

''میڈم یہ آپ کیا کررہی ہیں۔ آپ نقد روپیہ بھیج دیتی ہیں ور مسٹر فلپ سے

دھڑ دھڑ خرچ کردیتے ہیں ور سگرٹ اس کی تمام ضروریات وہسکی وسکی پوری

ہوئے بغیر رہ جاتی ہیں۔"

"تو میں کیا کروں۔" میڈم چلائی۔

"سیدھی بات ہے۔" محمود بولا۔ "روپے کی جگہ سگریٹ، بسکٹ، چائے، کافی وغیرہ بھیجے تاکہ ضروریات پوری ہو جائیں۔"

"سچ" وہ چلائی اور بچوں کی طرح خوشی سے تالیاں پیٹنے لگی۔ "یہ بات تو مجھے سوجھی ہی نہیں۔"

"میں بھی تو سمجھ رہا ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔

"سچ۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "تمہارے بغیر ——" وہ دفعتاً رک گئی۔ اس روز غالباً پہلی مرتبہ صحیح طور پر اس حقیقت کا اظہار کرتے کرتے اس نے خود کو روک لیا۔ محمود پھر بھی بات کو پا نہ سکا اور مسز فلپ اس حقیقت کو صحیح طور پر پانے کے بعد شدت سے اسے نظر انداز کرنے اور بھول جانے کی کوشش میں کھو گئی۔ جب ایلی نے یہ تجویز پیش کی تو ان دونوں کی عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ پا نہ سکا تھا وہ پا چکی تھی۔ لیکن نظر انداز کرنے کی کوشش میں شدت سے مصروف تھی۔ ادھر مسٹر فلپ نقد روپے کی جگہ اشیا کی کھیپ موصول کر کے حیران رہ گیا تھا۔ ایسی بات تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس کی پیاری بیوی تو ہمیشہ سے نقد روپیہ بھیجا کرتی تھی اور منی آرڈر سے نہیں بلکہ تار کے ذریعے۔ اور آج خلاف معمول سگریٹ کے ڈبوں اور بسکٹ کی بوتلوں کی کھیپ اس کے روبرو پڑی تھی۔ خیر اشیا تو کچھ بری نہ تھیں لیکن وہ اس افراط سے بھیجی گئی تھیں کہ مہینہ بھر مطالبہ کرنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ اور نقد روپیہ وصول کرنے کی کوئی امید نہ تھی۔

یہ دیکھ کر وہ چڑ گیا۔ نہ جانے میری بیوی کو کون ایسے کرتا رہا ہے۔ ورنہ وہ تو صرف محسوس کرنا جانتی ہے۔ سوچنا نہیں۔

مسٹر فلپ نے اس بھید کو جاننے کے لئے اپنے ذرائع مستعمل کرنے شروع کر دیے ورنہ غالباً گھر کے کسی نوکر نے مسٹر فلپ کو صورت حالات سے واقف کر دیا۔

یلی کے نیشن پہنچنے پر میڈم کو یاد آیا کہ وہ ملفیئر کے طالب علموں کے پرچے جو اس کے پاس دیکھنے کے لیے آئے ہوئے تھے ____ انہیں چیک کر کے واپس کرنے کی تاریخ سر پر آن پہنچی تھی۔ اس لیے اس نے محمود کو بلا کر اس نئی مشکل کا تذکرہ کیا۔

محمود نے کہا۔ میڈم اس میں کیا مشکل ہے۔ اگر ہم چار شخص بیٹھ جائیں تو ایک رات میں بارہ سو پرچے ختم کر دیں گے۔ میں ہوں یلی ہے۔ آپ ہیں اس کے علاوہ آپ کی ڈپٹی ناظمہ ہے۔"

میڈم کو یہ تجویز پسند آئی اور ایک رات وہ چاروں میڈم کی کوٹھی کے بڑے کمرے میں بیٹھ گئے تاکہ پرچے دیکھ کر صبح سویرے انہیں واپس بھجوا دیں اور اس اہم فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔

ادھر مسٹر فلپ کو جب معلوم ہوا کہ میڈم کا ایک گروپ اسے ایسے ویسے مشورے دے رہا ہے تو اس نے سوچا کہ اس مصیبت کو کسی طرح شروع شروع میں ہی ختم ہونا چاہیے ورنہ اگر مسز فلپ اس راستے پر چل نکلی۔ تو پھر اس کا زاویہ نگاہ بدلنا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے صورت حالات کو جانچنے کے لیے اس نے آٹھ یوم کی رخصت لی۔ اور طرح طرح سے بغیر نئے شہر آ گیا۔ دن بھر وہ سٹیشن پر ویٹنگ روم میں بیٹھا رہا۔ جب رات پڑی تو چھپ کر گھر آیا۔ آ کر اس نوکر سے ملا جس نے اطلاع بہم پہنچائی تھی۔ نوکر نے کہا۔ صاحب وہ تو اس وقت بھی اندر کمرے میں بیٹھے ہیں۔ دو مرد ہیں ایک عورت ہے اور میڈم ہے۔"

یہ سن کر مسٹر فلپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے سب نوکروں کو اکٹھا کیا۔ ایک پلان مرتب کیا۔ جس کے مطابق ایک نوکر نے بجلی کا مین سوئچ بند کر دیا اور باقی سب نے اس کمرے پر یلغار بول دی جس میں یلی محمود میڈم اور ناظمہ پرچے دیکھنے میں مصروف تھے۔

بجلی بند ہوتے ہی کمرے میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ محمود نے ایک چنگھاڑ سی ماری۔ میڈم چلانے لگی۔ ناظمہ چیخ رہی تھی۔ علی حیران تھا کہ اچانک کیا ہو گیا ہے۔ ایک جوتا اس کے سر پر پڑا اور وہ اٹھ بیٹھا۔

کمرے میں سے عجیب و غریب آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ڈر گیا۔

کمرے کی ایک کھڑکی مکمل کھلی تھی۔ محمود نے باہر چھلانگ لگا دی اور پھر چیخنے لگا۔ "علی علی۔"

محمود کی آواز سن کر علی کا دل بیٹھ گیا اس نے خطرے کو شدت سے محسوس کیا اور وہ کھڑکی کی طرف بھاگا۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ محمود اور علی چپ چاپ ویران گلی میں دوڑ رہے تھے۔

"لیکن بات کیا تھی۔" علی پوچھ رہا تھا۔

"خاموش۔" محمود کا رویہ ایسے جیسے وہ بھی ڈر رہا تھا۔

اپنے مکان کے قریب پہنچ کر محمود رک گیا۔ بولا۔ "گھر جانے میں خطرہ ہے۔"

"لیکن کیوں۔" علی نے پوچھا۔

"شاید وہ پولیس لے کر ہمارے گھر آئیں۔"

"لیکن کون۔" علی نے پوچھا۔

"وہی۔" محمود بولا۔ "جو وہاں میڈم کے گھر آئے تھے۔"

"وہ تھے کون؟" علی نے پوچھا۔

"معلوم نہیں ____ لیکن مجھے خطرے کی بو آتی ہے۔ دشمن ہمیں آسانی سے نہیں چھوڑے گا۔"

"تو پھر۔" علی نے پوچھا۔

"ہمیں گھر نہیں جانا چاہیے۔"

"لیکن اس وقت گلیوں میں آوارہ گردی کرنا بھی تو ٹھیک نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ چلایا۔ "چلو ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں جا بیٹھیں۔"

صبح سویرے ہی محمود نے ایلی کو کہنی ماری۔ "اب دن چڑھنے کو ہے۔" وہ بولا۔ "اب یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔"

"تو پھر جائیں کہاں۔"

"باہر دور۔ کسی ویرانے میں۔" محمود بولا۔ "جب تک ہمیں صورت حال کا علم نہ ہو ہمارا یہاں جانا ٹھیک نہیں۔" وہ دونوں نیا شہر کی گندی ندی کی طرف چل پڑے اور ٹیلوں میں جا چھپے۔

ادھر میڈم کو جب معلوم ہوا کہ یہ حرکت اس کے خاوند کی تھی اور اسے شک تھا کہ میڈم اور محمود کے درمیان ناجائز تعلقات ہیں تو وہ ضد میں آ گئی اور ایک جھٹکے سے اس نے اپنے شوہر کو خاموش کر دیا ناجائز تعلقات کو جائز بھی بنایا جا سکتا ہے۔ مسٹر فلپ مجھے روکنے والے تم کون ہو۔"

پھر مسٹر فلپ اس کے قدموں میں گر کر رو رہا تھا۔ اظہار محبت کر رہا تھا اور میڈم یوں پتھر بنی بیٹھی تھی جیسے وہ ماں ہو ______ اپنا اکلوتا بیٹا دفن کرنے کے بعد قبرستان سے لوٹی ہو۔ غالباً وہ اپنے مستقبل کے پلان کے متعلق سوچ رہی تھی اور اس کا ساتھ ہوتے ہوئے فلپ اس موہوم خطرے سے بے خبر بنا ہوا بیٹھا تھا۔

پہلی ٹھوکر

ایلی واپس جاورا پہنچا تو سکول پر سکوت طاری تھا اساتذہ اداس تھے اور ایلی کے ساتھی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ شیخ مسعود اور وہ خود تبدیل کر دیے گئے ہیں اور جاورا کے تمام اساتذہ کو وارننگ کا ایک خط موصول ہوا ہے۔ جس میں مسٹر معروف نے اعلان کیا ہے کہ اگر جاورا سکول میں مزید کسی قسم کی گڑبڑ ہوئی تو زبردست ایکشن لیا جائے گا۔

جب وہ گھر پہنچا تو فضل خاموش بیٹھا تھا۔ "تم آ گئے۔" وہ بولا۔

"ہوں۔" ایلی نے کہا۔

"کہاں رہے اتنے دن۔"

"پھنس گیا۔"

"ہوں۔" وہ خاموش بیٹھا حسب عادت پاؤں ہلاتا رہا۔

"ایلی۔" وہ بولا۔

"جی۔"

"تمہیں معلوم ہوا۔"

"کیا؟"

"تمہاری تبدیلی ہو گئی ہے۔"

"ہاں۔"

"تو تم جاؤ گے؟"

"جانا ہی پڑے گا۔"

"ہوں ـــــ تم چلے جاؤ گے تو میں کیا کروں گا۔" فضل کی آواز کانپ رہی تھی۔

"اگر ہمیں معلوم ہوتا۔" شمیم بولا۔ "تو یہ کام ہی نہ کرتے۔"

"پتہ ہے۔" حمید نے کہا "شیخ کی ترقی رک گئی ہے۔"

"اس سے ہمیں کیا فائدہ۔" فضل نے کہا۔ "پتہ ہے مولوی کا کیا حشر ہوا۔"

"کیا؟" شمیم نے پوچھا۔

"پاگل خانے میں ہے۔"

"کیوں بھئی۔" ایلی نے پوچھا۔

"سچ۔ ایک آدمی خود چل کر آیا تھا سو ہوش کھو بیٹھا ہے۔ ہماری محنت بالکل کارت گئی۔ نہ مولوی کو بچا سکے نہ شیخ کو توڑ سکے پتہ ہے مسٹر معروف نے کیا کہا تھا۔"

شبیر نے پوچھا۔

"کب؟"

"تمہارے جانے کے بعد ایک دن پھر آئے تھے۔" شبیر بولا۔ "سب اساتذہ کو اکٹھا کر کے وعظ فرمایا تھا۔"

"کیا کہا تھا؟"

"کہنے لگے۔ سب ہیڈ ماسٹر ایسے ہی ملیں گے۔ تم خود ہیڈ ماسٹر ہو گے تو ویسے ہی ہو جاؤ گے۔"

"سچ کہتا ہے۔" افضل بولا۔

"اللہ بچائے۔" علی نے کہا۔

وہ سب گہری سوچ میں پڑ گئے۔

دروازہ بجا تو وہ چونکے۔

"میں اندر آ سکتا ہوں؟" کسی نے باہر سے پکارا۔

"آ جاؤ میں۔" افضل بولا۔ "یہاں۔"

کسی نے دروازے کی طرف نہ دیکھا۔

"یہ شیخ مسعود بڑا حرامی ہے۔" افضل بولا۔ "اس کا ہم کچھ نہ بگاڑ سکے۔"

"یہ تو غلط ہے۔" دروازے سے کہا۔

انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ سامنے خود شیخ مسعود کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"تم نے میری وہ پذیرائی کی ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ "جو آج تک کوئی نہ کر سکا تھا۔ میں تمہاری عظمت کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔"

"نہیں شیخ صاحب۔" افضل نے کہا۔ "جو تم نے مولوی کیا تھا ہم اس کا مقام نہیں لے سکے۔"

"چھی تم مولوی کا مقام لے رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا یا اللہ آخر اصغی کا

میرے خلاف ہو جاؤ۔ کس وجہ سے؟ میں نے آج آصفی کے خلاف کچھ نہیں کیا۔ نا

مجھے آصفی سے یک گانہ سا ہے۔ کیوں آصفی صاحب کیا یہ سچ ہے کہ تم مولوی کا

نقامے رہے تھے۔" "سچ ہے۔" ایلی بولا۔

"ہاں۔" شیخ نے سر جھکایا۔ "مولوی سے مذاق میں زیادتی ہوئی۔"

"بہر حال میں چاہتا ہوں کہ ہم دوستوں کی طرح جدا ہوں۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

"آج سے تم میرے دوست ہو۔ ہمیشہ ہی تھے۔ میرے دل میں تمہارے خلاف غصہ بہت تھا۔ لیکن اس کے ساتھ میں تمہاری قابلیت کا بھی معترف ہوں۔" شیخ کی آواز جذبے سے کانپ رہی تھی اس کی آنکھیں نم ناک تھیں۔

"میں جرمنی جا رہا ہوں لیکن یہ آدمی کی دوستی پکی ہوتی ہے۔" ہاتھ ملاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ "زندگی میں میری یہ پہلی ٹھوکر ہے۔"

"ٹھوکر تو لگی ہی نہیں۔" افضل مسکرا کر بولا۔

"لگی ہے۔" شیخ نے جواب دیا۔

"صرف ترقی ہی بند ہوئی ہے نا۔" افضل نے کہا۔

"ٹھوکر دل پر لگی ہے تنخواہ پر نہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

جن

جاوید چھوڑنے کے بعد ایلی کا دل کچھ سے اچاٹ ہو گیا۔ محبت کے متعلق اس کے احساسات میں تلخی پیدا ہو چکی تھی۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ سے دوسرے پہلو کی تلخی کا احساس ہوا تھا۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کیا یہ زندگی ہے۔ کیا زندگی میں انصاف کو دخل نہیں۔ کیا نقد میاں بھی مسٹر معروف کی طرح خالی ایڈمنسٹریشن پر رہتے ہیں۔ کیا وہ بھی ایک ہیڈ ماسٹر ہیں۔

سکول کی فضا سے وہ بیزار ہو چکا تھا۔ یہ ادارے جہاں ملک کی آئندہ نسلوں

کی تشکیل ہو رہی تھی۔ اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر کی عجیب و غریب ذہنیتوں کی وجہ سے تعفن سے بھرے ہوئے تھے۔ اساتذہ کے انداز میں خود پرستی جدیدیت اور جھوٹے وقار کی جھلک تھی اور ان پر بے حسی کا کلف لگا ہوا تھا۔ شخصیات میں وسعت کا فقدان تھا۔ گھریلو معاملات کے الجھاؤ کا عکس ان کی شخصیتوں میں جھلکتا تھا۔ وہ علم کی ظاہری شکل پر مرکوز تھے۔ مفہوم ان کی نگاہ سے اوجھل تھا۔ ایلی کی نگاہ میں وہ سب کیڑے تھے۔ رینگنے والے کیڑے، سینٹرل ماڈل سکول کے کلاس ٹیچر کی طرح وہ چھڑی کے سہارے چل رہے تھے۔ انکا ایمان تھا کہ چھڑی ہاتھ میں ہو تو سب مشکلات دور ہو جاتی ہیں۔

ایلی کو سب سے بڑا ڈر تھا کہ ایک روز وہ بھی ویسا ہی ہو جائے گا۔ وہ بھی خلاصوں میں لکھی ہوئی تاویلوں کو علم سمجھنے لگے گا۔ بچوں کے ذہن پر آہنی پابندیاں ڈالنے کو اخلاق سے تعبیر کرے گا اور پھر وہ بھی ہیڈ ماسٹر بن جائے گا ——

اس خیال پر اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔

”نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

جماعت کی سازش سے ایک فائدہ ضرور ہوا تھا۔ اس کے ذہن سے شہزاد کی بے وفائی کی تلخی دور ہو چکی تھی۔ اگرچہ گھاؤ ویسے ہی لگا تھا لیکن اب وہ درد میٹھے درد کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

شہزاد کی بے وفائی نے ایلی کے جذبے کو کم نہیں کیا تھا الٹا اسے قائم کر دیا تھا۔ تقویت بخش دی تھی۔ طبعی طور پر ایلی بے وفا محبوب سے محبت کرنے والا شخص تھا۔ اس کے نزدیک محبت فرحت بخش جذبہ نہ تھا۔ بلکہ فرحت بخش جذبات تو اسکی نگاہ میں عیش پرستی کے مظہر تھے اور محبوب پر شک و شبہ کرنے کی عادت جو اس نے اپنا رکھی تھی اسی وجہ سے تھی۔ اگر محبوب بے وفائی نہ کرے تو اسکی محبوبیت کی حیثیت قائم رکھنے کیلئے ضروری تھا کہ اس پر موہوم بے وفائی تھوپ دی جائے اور خیالی رقیب قائم کر

کے محبت کے جذبے کو حقیقی بنایا جائے۔

جب سے وہ شہزاد کے گھر سے نکلا تھا۔ ایلی کے ذہن میں شہزاد کی محبوبیت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ اب وہ بے وفا حسینہ ایلی کے تخیل میں رقیب سے عشق کھیلتی نظر آتی تھی اور ایلی کی طرف دیکھ کر نفرت بھرا قہقہہ لگاتی۔ "تم" اس کے ہونٹ تحقیر سے ہلو سا بن جاتے اور اس کا قہقہہ گونجتا۔ اس پر ایلی محسوس کرتا کہ واقعی اسے شہزاد سے محبت ہے اور اس کی محبت کو عیش پرستی سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔

اب وہ ایک سچے عاشق کی طرح امید پر جی رہا تھا کہ ایک روز شہزاد کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ محسوس کرے گی کہ واقعی ایلی اس کا سچا عاشق تھا اور رقیب تو صرف مطلب پرستی کے لیے اس کا ساتھ بنا ہوا تھا۔ پھر وہ عفو کی طالب گار ہوگی اور آ کر اس کے قدموں پر گر پڑے گی۔ مگر وہ سوچتا۔ میں اسے قدموں پر گرنا تو میرا کام ہے۔ میں قدموں پر گر پڑوں گا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مجھے تھپکے گا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جائے گی اور وہ رو رو کر کہے گی۔ مجھے معاف کر دو ایلی۔ مجھے معلوم نہ تھا اس وقت میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں گا اور پھر ______"

لیکن پھر کا سوال۔ جس مقصد کے لئے وہ جی رہا ہے۔ وہ تو پورا ہو چکا ہوگا۔ پھر اس کا زندہ رہنے کا بھلا کیا فائدہ۔ بس اس کے قدموں میں پڑے پڑے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی اور اور یہ دیکھ کر شہزاد کی چیخیں نکل جائیں گی اور وہ بیراگن ہو جائے گی اور گلی گلی اکتارے پر گاتی پھرے گی۔

اے ری میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کو

ساوی کے نقوش ایلی کے دل سے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ غالباً اس لیے کہ اس کا چہرہ ہمیشہ متبسم دکھائی دیتا۔ اس کا جذبہ ہمیشہ جنون نظر آتا۔ اس کا خیال ہمیشہ ایلی کے دل میں زندگی اور رنگینی کا تصور پیش کرتا۔ ساوی کے خیال کے ساتھ آتش رقابت کی جلن محسوس نہ ہوتی تھی۔ اسے ساوی کی محبت پر کبھی شک پیدا نہیں ہوا تھا۔

"ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے۔ "تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نوکری سے چھٹی۔"

"ہے۔" وہ چیخ اٹھی۔

"ہاں۔" علی احمد بولے۔ "یعنی ہمارا بیٹا نہ رہا۔ سمجھی۔ کیا سمجھی؟"

یلی کو اس پر غصہ آ گیا۔

"یعنی آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی وجہ سے نوکری پر قائم ہوں۔" ایلی نے دبی زبان سے کہا۔

"بالکل۔" وہ بولے۔ "ورنہ ایک دن نوکری نہیں کر سکتے تم۔" علی احمد جلال میں آ گئے۔

"یعنی مجھ میں ذاتی طور پر قابلیت نہیں کہ نوکری پر فائز رہ سکوں۔"

"تو" اس نے کہا۔ "ابھی تو آپ ادھر کہہ رہے تھے کہ معروف یلی کی تعریف کر رہے تھے۔"

"ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے۔ "تمہیں کیا پتہ۔ قابلیت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ یہ قابلیت جو یلی میں ہے۔ نوکر شاہی کی قابلیت نہیں۔ یہ تو بچے ہی پڑھانے کی قابلیت ہے۔ نہ یہ تیل دیکھ سکتا ہے۔ نہ تیل کی دھار یہ تو پڑھوں میں چھتی اچھی چھینٹ سکتا ہے۔ ہی ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگے۔

پھر انہوں نے یلی کو نصیحت کرنا شروع کر دی۔

"دیکھو یلی۔ نوکری میں ہمیشہ اپنے افسر کا ساتھ دینا چاہیے۔ مجھ چاہے وہ اچھی ہو یا برا، غلطی کر رہا ہو یا ظلم۔ تمہیں اس سے کیا۔ وہ کیا کرے تم پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔ کیسے کرے گا۔ کیسے کرے گا۔ اسے معلوم نہیں کہ تم کس کے بیٹے ہو اور ہمارے معروف سے کتنے تعلقات ہیں۔ یہ لوگ آنکھوں کے اندھے ہوتے ہر بات کی خبر رکھتے ہیں اور دیکھو اگر اپنے افسر کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہو تو۔" وہ بولے۔"

"بھئی واہ۔" وہ ہنسا۔ "یہ کیا چھپانے کی بات ہے۔ بڑی بہادری کی تم نے کہ
پوچھ لیا۔ اے بھائی جب خاموشی سے تمہاری بات سنوں تو سمجھ لو کہ خاموش ہوں اور
جب بات کروں تو سمجھ لو کہ قائل ہوں۔"

"شرمندہ نہیں ہوتا ہوں۔ زبان سے رنگ اتر جاتا ہے۔ بس اتنا صرف
تھا۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"تم سمجھتے ہو۔" جمیل بولا "کہ صرف تمہیں ہی سوجھتی ہیں۔ یہ غلط ہے شاید مجھے تم
سے بھی زیادہ سوجھتی ہیں تم سے زیادہ انوکھی۔ لیکن جب ملتا ہوں تو واضح ہو کر نہ ہو
زبان گنگ رہتی ہے۔ دل کو وہ زنگ لگا ہوا ہے کہ اترتا نہیں۔ تم پی کر آپے میں
نہیں رہتے میں پی کر آپے میں آ جاتا ہوں۔ بس اتنا فرق ہے۔"

"جو نہیں۔" ایلی بولا۔

"ہو۔" جمیل چلایا۔ "ہم بات کریں تو بکو نہیں۔ بھئی واہ اور تم خود بات کرو تو
Pure wisdom تمہاری بات عقل کا نچوڑ ہماری بکواس۔ کچھ انصاف ہے۔"

"چھوڑو وہ بکواس۔" ایلی نے کہا۔

"خدا کی قسم۔" جمیل بولا۔ "کیا غلط ہے۔ واہ واہ اگر مجھے کوئی ایک محبت بھرا خط
لکھ دیتی تو کبھی بوتل کا محتاج نہ ہوتا عمر بھر لیکن کسی حرامزادی نے نہیں لکھا اور نتیجہ یہ
ہے۔ جب تک اندر دھت نہ ہو جائے بات نہیں بنتی۔"

"تمہاری بیوی نہیں منع کرتی تمہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"پہلے پہل جب نئی نئی آئی تھیں تو کیا کرتی تھی۔ اب نہیں خدا کی قسم اب تو
کہتی ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"کبھی توبہ کر دوں تو مصیبت پڑ جاتی ہے اسے پھر وہ بہانے بہانے مجھے کہتی
ہے کہ توبہ توڑ دوں۔"

گانے لگا۔

"تو یہ کسی کے آنے کی اجازت ہے۔" ایلی نے کہا۔

جمیل ہنسنے لگا۔ "خط اسے لکھا ہے۔ لیکن اس بے چاری کے نام صرف سرنامہ ہے باقی سارے خط میں تمہارا تذکرہ ہے اور تمہارے خیال سے اس قدر بھری بیٹھی تھی کہ لفافے پر پتہ بھی تمہارا ہی لکھ دیا۔ ہاہاہاہا۔ لگن ہو تو ایسی ہو۔" وہ ہنسنے لگا۔

ایلی نے وہ خط پڑھا تو اس کا دل ڈوب گیا۔ سادی کے جذبے کی شدت مجسم ہو کر اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ اس کے انداز بیان میں اس قدر جذبہ اس قدر لطافت اور رنگینی تھی کہ وہ تڑپ گیا۔ اس نے کبھی سادی کے دکھ کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کے لاشعور میں سادی اور غم دو متضاد چیزیں تھیں۔

لیکن سادی کا وہ خط پڑھ کر ایلی پر گویا دکھ کا ایک پہاڑ آ گرا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ گھر سے بھاگ کر باہر نکل جائے اور پھر جوگی بن کر پہاڑی پر جا بیٹھے۔

وہ ایک دن تو وہ چپ آہیں بھرتا رہا پھر شدت جذبہ سے مجبور ہو کر علی احمد کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس نے سادی کا تذکرہ پھر سے چھیڑ دیا۔ علی احمد پہلے تو اس کے تیور دیکھ کر گھبرا گئے۔ لیکن جلد ہی انہوں نے پینترا بدلا اور اپنی عادت کے مطابق ہنسنا شروع کر دیا۔ "نصیر کی ماں یہ سنا تم نے ہی ہی ہی۔" اور اس ہی ہی ہی میں بات دب کر رہ گئی۔

کیے ہوئے ٹھلکچول کونے میں سوتا رہا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں بچہ جاگ نہ پڑے۔ اسے آرزو تھی کہ وہ جاگ اٹھے۔ ڈھکی چھپی آرزو۔ وہ ممتا بھرے ہاتھ سے تھپکیں تھپکتے تھے ممتا بھری گود میں ڈال لیں۔

اسی ڈر کے مارے چار سال وہ علی پور نہ آیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں سویا ہوا بچہ پھر سے نہ جاگ پڑے۔ وہ گویا جو اس نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ ٹوٹ نہ جائے اور لوگ اس حقیقت سے واقف نہ ہو جائیں کہ وہ ایک پرانا کیڑا ہے۔ پلپلا۔ رینگتا ہوا کیڑا۔

اس کے باوجود جب بھی علی پور سے کوئی آتا۔ وہاں سے خبر آتی تو ایلی کے کان کھڑے ہو جاتے۔ بظاہر بے پروائی دکھاتے ہوئے بڑی توجہ سے علی پور کی باتیں سنتا اور پھر تنہائی میں بیٹھ کر بڑے انہماک سے خبروں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑتا اور پھر اندازے لگاتا کہ شہزاد کا کیا حال ہے۔ اور صفدر اور شہزاد کے تعلق کے متعلق محلے والوں کا کیا خیال ہے۔ کیا شریف حالات سے بے خبر ہے۔ کیا شہزاد شریف کے ساتھ نہیں جاتی۔

شروع شروع میں محلے سے جو خبریں آتی تھیں ان میں شہزاد اور صفدر کا بہت چرچا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ دونوں کا ایک دوسرے بغیر دم نکلتا ہے۔ وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر آوازیں دیتی رہتی ہے۔ وہ منڈیر سے جھانکتا ہے۔ ’’اچھی سودا منگوا دو گی۔ آج تو کریلے پکاؤ۔ وہ جو زیور تم نے بنوایا تھا۔‘‘ کھڑکی میں کھڑے رہتے ہیں دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔ وہیں کھڑے دوپہر سے شام ہو جاتی ہے۔ نہ جانے ان کی باتیں ختم کیوں نہیں ہوتیں۔ رات کو گراموفون کو سامنے بیٹھ کر گیت سنتے ہیں۔ آدھی رات بیت جاتی ہے۔ لیکن وہ اللہ کے بندے نہیں تھکتے۔

پھر آہستہ آہستہ باتیں رنگ بدلتی گئیں۔ صفدر کے شراب کے نشے میں دھت رہنے کی باتیں چل نکلیں تو اب ہر وقت بوتل منہ سے لگائے رہتا ہے۔ اور کیوں نہ

ہو۔ شہزاد کا حال ہے یوں نہ بتائے محبت کی تو کہتے ہیں قاضی بھی نہیں چھوڑتا اور صفدر

تو بچے کا شربت پی کر روزانہ کرتا ہے۔ بیوی کو پیٹتا ہے۔ چیخ چیخ کر شعر گاتا ہے۔

اگرچہ علی کو یقین تھا کہ اسے ان باتوں سے قطعی دلچسپی نہیں ہے قطعی طور پر

پرواہ نہیں کہ شہزاد وہ کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے یا بازار میں صفدر نماز پڑھتا ہے یا

شراب کے نشے میں دھت رہتا ہے۔ ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن یہ

باتیں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ صفدر کے شراب پی کر چلانے کی بات سن کر اسے بے

حد خوشی ہوتی تھی۔ ایسی خوشی جس کا اعتراف وہ اپنے آپ سے بھی نہیں کرتا تھا ایک

پر اسرار خفیہ خوشی۔ اب شہزاد کو سمجھ آ جائے گی۔ اب وہ جانے گی کہ سچے اور جھوٹے

عشق میں کیا فرق ہوتا ہے۔

ان چار برسوں میں علی پور جانے کے کئی ایک موقعے ملے تھے۔ لیکن علی نے

جان بوجھ کر علی پور جانے سے احتراز کیا تھا۔ وہ علی پور سے ڈرتا تھا۔ وہ شہزاد کی آواز

سننے سے ڈرتا تھا۔ وہ آواز جو محلے میں گونجتی تھی جس کے سر محلے والیوں سے قطعی

طور پر مختلف تھے۔ جس میں اچھی زیر و بم تھا۔ وہ عجیب سی جھنجھناہٹ تھی۔ جو سیدھی

دل پر اثر کرتی اور پھر تن من میں دھنکی سی بجتی۔

بہرحال جب سکول کالج کی چھٹیوں کی وجہ سے ڈیڑھ دو مہینے بند ہو جاتا تو علی

مشکل میں پڑ جاتا چھٹیاں گزارنے کے لیے جب وہ خان پور جاتا تو کوئی نہ کوئی علی پور کی

بات چھیڑ دیتا۔

مشتاق احمد کہتے۔

"نصیر کی ماں کتنی خوشی کی بات ہے کہ علی چھٹیاں ہمارے پاس بسر کرتا ہے۔"

"بے چارہ اپنی ماں سے ملنے سے بھی گیا۔" راجو دبی زبان سے کہتی۔

"اس کا نام زندگی ہے نصیر کی ماں۔" علی احمد چلاتے۔ "کبھی دھوپ کبھی چھ

اؤں ہے۔"

''میں نے کہا۔'' رجو نے دیکھ کر بولی ''ایلی آیا ہے۔''

''لیکن ____'' رجو کہتے کہتے رک گئی۔

''لیکن ____'' علی احمد چلانے لگے۔

رجو کی آواز مدھم پڑ گئی۔ ''ہم تو علی پور جا رہے ہیں۔''

''تو پھر ____ تو مطلب کی بات کر۔''

''مطلب یہ'' اس کی آواز مدھم پڑ گئی۔ ''وہ کہاں رہے گا چھٹیوں میں۔''

''ہی ہی ہی ہی۔'' علی احمد ہنسے۔ ''نصیر کی ماں تو بھی ہمیشہ بے فکری لگاتی ہے۔ اسے بھی ساتھ لے چلو۔ آخر ایک دن جانا ہی پڑے گا۔ آج نہیں کل سہی۔ کل نہیں پرسوں۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ہی ہی ہی ہی۔'' وہ ہنسنے لگے۔

جب وہ علی پور پہنچے تو محلے کا احاطہ محلے والیوں کی آوازوں سے گونجنے لگا وہ سب علی احمد کو چھیڑنے لگیں۔

قافلہ

دفعتاً ایلی کو خیال آیا۔ وہ سہم گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ احاطے کے میدان میں کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس نے چند ایک لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ڈیوڑھی میں جا کر رک گیا۔ اس کا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ باہر چڑیلیں چیخ رہی تھیں۔ کوے کائیں کائیں کر رہے تھے اور ان میں علی احمد کے قہقہوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

''کون؟ علی احمد آیا ہے؟''

دفعتاً ایک مختلف نوعیت کی آواز سنائی دی۔ نوکیلی۔ سریلی۔ مبہم آواز۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔ جسم میں پھریریاں سی چلنے لگیں۔

''ہائے یہ تو سارا قافلہ ہے کسی کو چھوڑ تو نہیں آئے پیچھے۔''

''تو گھبرا نہیں۔'' علی احمد بولے۔ ''سبھی ساتھ ہیں۔ سبھی۔'' علی احمد نے قہقہہ

گیا۔ "تو بڑی بات سن شہزادی، سنا ہے تو نے اپنے میاں کو عاق کر دیا ہے۔"

"وہ کیسے۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ تو نے اسے ریٹائر کر دیا ہے۔"

"عمر عمر کی بات ہوتی ہے۔" وہ ہنسی۔

"عمر تو ڈھلتی ہی ہے۔ کیوں چاچی۔ جھوٹ کہتا ہوں کیا؟ ہی ہی ہی ہی۔"

"اب کیا رہا ہے پیچھے۔" نجمہ بولی۔

"ٹھگا نہیں کیا میں نے تجھے۔" علی احمد نے قہقہہ لگایا۔

"ٹھگا ہوں کی جیت ہو تجھ ہرا دیا اپنے آپ کو۔" ماں مدھم آواز میں بولی۔

"ہی ہی ہی ہی۔" علی احمد کا قہقہہ گلی کے بند بند میں ناچنے لگا۔ میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

محلے میں کئی ایک تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ عورتوں نے احاطے کے میدان میں بیٹھ کر چرخہ کاتنا اور ازار بند بنانا ترک کر دیا تھا۔ سر جھکا کر چلنے والے بڈھے قد میں کم رہ گئے تھے۔ محلے کے نوجوانوں کی وہ حالت نہ رہی تھی۔ اب وہ چھاتی نکال کر چلنے لگے تھے۔ نوجوان لڑکیاں بوڑھیوں کی موجودگی میں سینہ نکال کر کھڑی ہو جاتیں۔ نظر بچا کر مسکراتیں۔ بال جھٹکتیں۔ بچے بڑوں کا کہنا نہ مانتے ضد کرتے بڑوں کو منہ پر جواب دیتے محلے کی بوڑھیاں بالکل ویسی ہی تھیں جیسے کہ پہلے ہوا کرتی تھیں ان میں قطعی طور پر کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ البتہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بہت سی ادھیڑ عمر کی عورتیں ان کی صف میں شامل ہو گئی تھیں۔

ایک نئی چیز جو محلے کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ گراموفون باجہ تھا پہلے تو محلے میں صرف ایک باجہ ہوا کرتا تھا۔ جو بالا کے کمرے میں یوں بجا کرتا تھا جیسے مکھیاں بھن بھنا رہی ہوں بالا کے پاس چند ایک پرانے ریکارڈ تھے۔ جن کی آواز اسکے کمرے میں گھٹ کر رہ جاتی تھی جو چلتے چلتے میرا نام جوگی بان سوا دو پہر کر ختم ہو

چھوڑ دیا پیچھے تو بیچ بچانے کا نام نہ لیتا تھا۔ مجھ جو چھوڑا تو بالکل ہی چھوڑ دیا۔"

پھر وہ بی بی کے قریب تر ہو جائیں۔ "اچھا ہی کیا تو نے جو اس دلدل سے نکل گئی یہ مردوں کا کیا کام۔ کہ دلدل میں پھنسے پھنسے رہیں مرد تو چلتے پھرتے گھوڑے ہوتے ہیں۔"

"اے کوئی جگہ ہوتی تو جان کی بازی لگاتا۔ وہ تو بارہ دری ہے بارہ دری ایک آیا ایک گیا اچھا ہو تیری جان چھوٹی۔"

اے میں نے کہا بی بی تجھے معلوم ہے تمہیں اس اللہ مارے شرابی نے کیا کیا بیچ کر کھایا ہے۔ مجھ تو نچوڑ دیا۔ اچھا ہوا اسے بھی سمجھ آ گئی کیا کیا ہوتا ہے لیکن اسے کیا سمجھ آئے گی۔ وہ تو کہتی ہے لوٹ لو وہ خود لٹنے کے لیے بے قرار ہے۔ خاوند سے بگاڑ ہو چکا ہے۔ لیکن وہ تو بد ہو ہے بد تو۔ ورنہ عورت کی کیا مجال ہے۔ کہ خاوند کا کہنا نہ مانے۔ اس بے چارے نے ہزار منتیں کیں کہ چل میرے ساتھ چل لیکن اس اللہ کی بندی پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"اے ہے۔ اب تو لڑکیاں جوان ہو چلی ہیں۔ پھر بھی یہ بچی ہٹ سے باز نہیں آتی۔ ادھر وہ کالے منہ والا شرابی روز بی بی کی بیوی کو پیٹتا ہے پھر ڈھیٹ جس کا سے آوازیں دیتا ہے پیچھے چلا جاتا ہے منتیں کرتا ہے اور جب گھر نہیں ملتی تو پھر سے بیوی کو پیٹنے لگتا ہے۔ توبہ ہے۔ لوگ اتنے بے شرم ہو گئے ہیں۔ کہ توبہ ہے نہ کسی کی شرم نہ لحاظ۔"

بی بی ان کی باتیں سن سن کر ان ٹکڑوں کو جوڑتا رہا بہر حال وہ خوش تھا۔ ہنگامہ ہو چکا ہو اسے سمجھ میں آ گیا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ کیا عشق اسے کہتے ہیں۔

خوشی کے باوجود ایسی باتیں سن کر اس کے دل پہ چھریاں لگیں۔ اس نے بھی آپ تو کر عزت و ناموس گنوا دیا۔ بچی جوانی برباد کر دی۔

ہاجرہ نے بی بی کو گلے سے لگایا۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ "ہے بی بی تو

تو ہم سے ملنے سے بھی گیا پہلے ہمارے پاس روک ہمارا نہ تھا۔ اب ساتھ ہم کو بھی چھوڑ دیا۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا علی پور آنے کو اس سے تو وہی دور اچھا تھا۔ تمہیں دیکھ تو لیتے تھے۔ اب تو دیکھنے سے بھی گئے۔"

ہاجرہ روئے جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے فرحت چپ چاپ کھڑی تھی۔ ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہے۔

"چل ادھر فرحت کی طرف۔" ہاجرہ بولی۔ "تو کیا ادھر علی احمد کے گھر رہے گا۔ اکیلا ہی۔ نہ بیٹا چل ہمارے ساتھ رہ جیسے ہمیشہ رہا کرتا تھا۔"

فرحت کی طرف جا کر رہنا ________ گویا پھر سے منجدھار میں کودنے کے مترادف تھا۔ وہاں شہزاد تھی۔ صرف ایک چھت درمیان حائل تھی ایلی ادھر جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے چپ چاپ کھڑا رہا۔

"تو بھی حد کرتی ہے اماں۔" فرحت بولی۔ "اگر ایلی کا جی ادھر رہنے کو چاہتا ہے۔ تو تو اسے کیوں مجبور کرتی ہے۔ ادھر لے جا کر خواہ مخواہ پھر سے مصیبت سر پر کھڑی کرنی ہے کیا۔ مشکل سے جان چھوٹی ہے پہلے ہی۔"

"اچھا" ہاجرہ بولی۔ "جس طرح تو خوش رہے۔ جیسے تیری مرضی۔"

ایلی کو یقین تھا کہ شہزاد علی احمد کے گھر آنے کی جرات نہ کرے گی اور اگر آئی بھی تو اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ اس کا سامنا کر سکتا ہے۔ اسے تو صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ کہیں وہ کمرے میں ایلی کے روبرو آ کھڑی ہو پھر اسے خیال آتا کہ آخر وہ کیوں آئیں گی۔ اس کی آمد کا خطرہ دراصل محض خوش فہمی ہے۔ آخر اسے آنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

چار ایک دن کے بعد ایک روز علی احمد اور گھر کے جملہ لوگ علی احمد کے کسی دوست کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو گئے انہیں صرف چند ایک گھنٹے کے لیے باہر رہنا تھا۔ ایلی نے اس بات کو چنداں اہمیت نہ دی۔ اس لیے وہ کتاب اٹھا کر ایک

الگ کمرے میں جا بیٹھا اور مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

ہاں ـــــ ہوں

اسے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ سر اٹھا کر دیکھتا ریشمی پیراہن ایک خوشبودار گٹھڑی اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی گٹھڑی کے اوپر لمبے سرے پر سیاہ ناگن بل کھائے ہوئے تھی۔

وہ چونکا۔ کون ہے“

گٹھڑی سے دبی ہوئی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ ایلی گھبرا گیا۔

اس نے چوٹی کو چھوا ـــــ ماتھے پر تل دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا اس نے چوٹی کو چھوڑ دیا دھم سے گٹھڑی پھر سے گر گئی۔ سسکیوں کی آواز اور بلند ہو گئی۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ ٹھوکر مار کر اس ریشمی گٹھڑی کو پرے ہٹا دے اور پھر خراماں خراماں کمرے سے باہر نکل جائے جیسے ہیرو سٹیج سے نکلتا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ریشمی گٹھڑی کو اٹھا کر سینے سے لگا لے۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ کچھ نہ کہے۔ بیٹھا رہے۔ کیا اپنے شرابی محبوب سے تنگ آ گئیں۔ کیا دل بہلانے کے لیے کوئی اور نہیں ملتا۔“

”مجھے معاف کر دو۔“ وہ اس کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی عظمت کا اعتراف کس طرح ہو سکتا تھا۔ اس سے عظیم تر لمحہ اس کی زندگی میں کیا ہو سکتا تھا۔ وہ خوش تھا اس کی تذلیل پر خوش تھا۔ اپنے اعتراف شکست پر خوش تھا۔ ہاں وہ چاہتا کہ یوں ہی بیٹھا رہے۔ دیوتا بن کر بیٹھا رہے اور اس کے قدموں پر وہ سرنگوں رہے۔

تمام دنیا پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کائنات گویا رک گئی تھی۔ روئے زمین پر کوئی اور نہ تھا۔ صرف دیوتا اور پشیمان پجارن۔ کائنات کی تخلیق کا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ صرف وہ دونوں باقی رہ گئے تھے۔ باقی ایک خلا تھا۔ معنوں کو گھیرے میں لیے ہوئے ایک

عظیم تر خلاء۔

صدیوں خاموشی طاری رہی صرف ہچکیاں۔ لمبی۔ دبی۔ دبی ہچکیاں پھر چہروں کی گٹھڑی میں حرکت ہوئی حرکت ہوئی۔ پیشانی کا سیاہ تل ابھرا۔

"میں میں ــــــ تم۔" آدھی ہچکی نے اس کی بات کاٹ دی

"تم ہو؟" لیلی نے نفرت بھرے انداز سے کہا بناوٹی نفرت۔

"ہاں ــــ میں۔"

"تم۔" لیلی کی نگاہ کند چھری کی طرح چبھ گئی۔

"ہاں میں۔ چور چور ہو کر تمہارے قدموں میں آ گری ہوں۔"

"جو شہزادی کے ہاتھ گڑی بنے ــــ"

"تم مجھے شہزادی کے ہاتھ دے گئے تھے نا۔"

"میں دے گیا تھا؟" نفرت سے اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"تم نہ جاتے تو ــــ"

"اب کیا رکھا ہے؟" وہ بولا۔

"سچ ہے" وہ تلخ ہنسی۔ اس نے معافی بھرے انداز سے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور اپنا منہ ننگا کر کے بولی۔ "اب کیا دھرا ہے۔"

وہ اسے دیکھ کر چونکا۔ اس کے روبرو شہزادی نہ تھی۔ ایک مٹا مٹا چہرہ ویران آنکھیں ہڈیاں بھرے گال، داغ دار جلد۔ بجھا بجھا سا وہ اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ جیسے کسی نے اس کے سینے پر گھونسا مار دیا ہو۔ اس کا دل ڈوب گیا۔

"بس" وہ بولی "اب کیا رکھا ہے۔ ویرانی، تباہی سے ہوئے کو کون منہ لگاتا ہے۔ چور چور ہو جائے تو کون ٹکڑے چنتا ہے۔" وہ خاموش کھڑی رہ گئی۔

کمرے کی فضا گویا منٹوں بوجھل ہو گئی۔

ایک اداس بھاری خاموشی چھا گئی۔

دور کوئی کراہ رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ سسکیاں لے رہا تھا۔

"مجھے معلوم تھا۔" وہ بولی "اب تم بھی منہ لگاؤ گے۔ اب رکھا ہی کیا ہے۔" اس نے سسکی زدہ قہقہہ لگایا۔

"تو پھر" وہ بولا۔

"پھر ــــ ہونہہ ــــ"

"آخر پھر مجھ پر نوازش کیوں کی گئی؟"

"تم پر میں کیا نوازش کروں گی؟"

"تو کیا یہ نئی چال ہے۔"

"چال" وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ اس ہنسی میں دھار تھی۔ اسی دھار کی نوک کا رخ اس کی اپنی طرف تھا۔

"گناہ بخشوانے آئی تھی کیا؟"

"پھر بھی خدا بن کر بیٹھ گئے ہو تم۔"

ایلی بھونچکا رہ گیا۔ اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔

"تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔"

"بہرحال تم کو سمجھتا ہوں۔"

"ہونہہ" نفرت سے اس کی ناک دھار بن گئی۔ "تم ــــ مجھے سمجھتے کیا تم۔ تم مجھے کیا سمجھو گے تم میں اتنی جرأت ہی نہیں کہ دوسرے کو سمجھ سکو۔ دوسرے کو دیکھ سکو۔ سمجھنا تو دور کی بات ہے۔"

"جی" وہ غصے میں بولا "میں تمہیں نہیں سمجھ سکا۔ نہیں سمجھ سکتا۔"

"خود پرست شخص کسی کو نہیں سمجھ سکتا۔"

"جی میں خود پرست ہوں۔"

"تمہاری خود پرستی نے ہم سب کو تباہ کر دیا۔

"اس شرابی کو بھی ____" اس کی آواز میں تمسخر تھا۔

"ہاں اس نالی کے کیڑے کو بھی۔"

"نالی کا کیڑا؟"

"ہاں۔ اس کا مقصد مجھے لوٹنا تھا۔ اس نے مجھے دل بھر کر لوٹا۔ اور میں جان بوجھ کر لٹتی رہی۔ مجھ میں اب اپنے آپ لٹانے کی جرأت ہے۔"

"____"

"تمہاری طرح نہیں کہ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے گئے۔"

"میں چلا گیا؟"

"تمہیں مجھ پر اعتماد نہ تھا۔ تم کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ تم میں اتنی وسعت نہیں۔ تم شک کے زور پر پیار کرتے ہو۔ محبت کرنا نہیں جانتے۔" "آج تم بھی میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ گری ہوئی کو پاؤں میں روند رہے ہو۔ میں صرف تمہارے سامنے گری ہوں کسی اور کے سامنے نہیں۔ اتنی گری ہوئی بھی نہ سمجھو مجھے۔"

شہزاد کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے اور وہ یوں کھڑی تھی جیسے چلتے ہوئے جہاز میں کوئی بے یارومددگار کھڑا ہو۔

دیر تک وہ یوں ہی کھڑی ٹکٹکی باندھ کر ایلی کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہ تلے ایلی ایک انجانی گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اسے لٹا ہوا دیکھ کر وہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے وہ کبھی نہیں چھوڑ سکتا جیسے اس کا ساتھ دینا اس پر فرض ہو چکا ہو۔

سکھ میں چاہے وہ اس کا ساتھی نہ بنتا لیکن دکھ میں وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اب شہزاد کے پاس رہ کیا گیا تھا۔ جوانی ڈھل گئی تھی۔ جوبن ختم ہو چکا تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس کے قدموں پر گر جائے اور رو رو کر اس سے معافی مانگے لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی۔

دفعتاً وہ آگے بڑھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ایلی کا سر تھام لیا "لیکن تم یوں

چوہے کی طرح کیوں دبکے بیٹھے ہو۔ یوں منہ چھپائے پھرتے ہو۔ کبھی ٹی پر نہیں آتے۔ اور اب آئے تو سامنے یوں نہیں آتے۔ مجھ سے دلچسپی نہیں تو نہ سہی مجھے کسی کی ضرورت نہیں لیکن مجھ سے نفرت کی بھی حد ہے۔ نفرت کرو تھوکو، میرے منہ پر تھوکو ٹھوکر مار کر مجھے باہر نکال دو۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے ایلی کا منہ اپنی طرف موڑ لیا۔

ایلی نے یوں محسوس کیا جیسے پٹاخے کو آگ دکھا دی گئی ہو۔ بھن سے اس کا سر ہوائی کی طرح چلا گیا۔ اس نے ان جانے میں اٹھ کر شہزاد کو دونوں بانہوں میں تھام لیا مگر پھر دیوانگی بھرے جوش سے اس ریشمی گٹھڑی کو سیٹ پر اپنی گود میں ڈال دیا۔ پھر وہ نہ جانے غصے میں، جوش میں یا نفرت کی شدت کی وجہ سے چیخنے لگا۔

"تم کمینی ہو۔ حرامزادی ہو۔ فاحشہ ہو۔ تمہیں دوسروں کو تباہ کرنے میں دلچسپی ہے۔ تم انسانوں سے کھیلتی ہو۔ تم حرام خور ہو۔"

"ہاں ہوں۔" وہ بولی "مگر تو میرا کیا کرتے ہو۔" اور پھر گٹھڑی سی بن کر پڑ گئی۔

ایلی نے اس گٹھڑی کی طرف دیکھا۔ جو اس کی گود میں پڑی تھی۔ پھر دفعتاً اس کے ذہن میں گاڑی کی کوک سنائی دی۔ گاڑی اونچے اونچے ٹیلوں کے درمیان چھکا چھک چلی جا رہی تھی۔ ایک ڈبے میں مونگیا رنگ کی گٹھڑی پڑی جھول رہی تھی۔

"ارے یار غضب ہو گیا۔ تباہی بربادی۔ لٹ گئے۔" ارجمند چلا رہا تھا۔ پھر گٹھڑی کے پٹ کھلے اور دو تانی ناگ باہر نکلے۔

سارے عالم پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایلی نے گود میں پڑی ہوئی گٹھڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ میں نے کیا کر دیا پھر اسے اپنے آپ کو بدرو میں پھینک دیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔" غصے سے اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ "تم لوگ میرا کیا کر سکتے ہو۔ تم میرا کیا کر سکتے ہو ہو۔" کوئی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

غصے سے ایلی کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ اس ریشمی گٹھڑی پر پل پڑا۔

اگلے روز جب وہ جنگلے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا تو پچھواڑے سے شور بلند ہوا۔ "روحو شمیم۔ کوئی ہے بھی اس گھر میں کہ کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہو۔"

بی شہزادی آئی تو زمن چونکا۔ وہ تو علی احمد کے گھر نہ آتی تھی۔ کبھی آتی بھی تو سال میں ایک مرتبہ۔ لیکن اس طرح گھر والوں کو آوازیں دے رہی تھی جیسے روز کی آنے والی ہو۔ اور پھر اس کی آواز اس طرح گھنٹی کی طرح بج رہی تھی جیسے ٹن جوں کا توں قائم ہو۔ بات کا انداز بھی وہی تھا۔ جیسے ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔

"بی بی جی" علی احمد ہنستے ہوئے آگے بڑھے۔ "تو" وہ بولے "ہماری قسمت وقت میں جاگ گئی۔"

"کس نے جگا دی آپ کی قسمت" راجو نے پوچھا۔

"دیکھو شہزادی آئی ہے ہمارے گھر۔"

"اب تو آئے گی ہی۔"

"کیوں" علی احمد بولے۔

"اب سودا بک گیا" شہزادی چلائی "اب خطرہ کیسا۔"

"ابھی تو گودام بھرے ہیں۔" علی احمد بولے۔ "کیوں نسیم کی ماں ٹھیک ہے نا۔"

"تم آپس میں ہی فیصلہ کر لو۔" راجو ہنسنے لگی۔

"جبھی تو میں آئی ہوں۔" شہزادی نے کہا۔ "میں نے کہا آج روبرو فیصلہ ہو جائے۔"

"تو آؤ بیٹھو۔ ہمارے پاس تو کبھی بیٹھی ہی نہیں تو۔ بس منڈیروں پر چیل کی طرح منڈلاتی رہتی ہے۔"

"کبھی تمہیں بھی موقعہ دیا ہوتا۔ بی بی جی" علی احمد ہنسنے لگے۔

"جسے سدھ بدھ ہی نہ ہو اسے کیا موقع دینا" وہ ہنسی۔

"اب آئے گی بھی یا ریان کی باتوں میں الجھی رہو گی۔" اندر سے رجو بولی۔

"آتی ہوں۔ یہ سب تو صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔"

علی احمد ہنسنے لگے "بھئی بڑی تیز ہے یہ شہزادی۔"

"ابھی کیا دیکھا ہے۔" وہ اندر جانے کی بجائے سیدھی علی کی طرف آتے ہوئے بولی اور بے پروائی سے برسبیل تذکرہ علی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "تو یہ پڑھنے کی جگہ ہے۔ مگر یہ وقت پڑھنے کا ہے۔ میرا یہ خط تو ڈال آؤ ذرا ڈاک میں۔"

شہزادی نے ایک لفافہ علی کی طرف بڑھا دیا۔ اور پھر جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ علی احمد سے بولی۔ "اے ہے مہمان آئے ہیں کچھ تو شرم کرو۔ کچھ منگواؤ شہزادی آئی ہے۔"

ان کی گھبراہٹ دیکھ کر شہزادی مسکرائی پھر مڑ کر علی سے کہنے لگی۔ "یہ خط تمہارے بیبے نے کہیں ڈاک میں ڈالا تو میں پٹ جاؤں گی۔"

علی نے دیکھا تو لفافے پر شریف کا پتہ لکھا ہوا تھا۔

لفافہ کھولا تو اندر مختصر طور پر لکھا ہوا تھا "مجھ سے آج ہی ملو میں نے تم سے بہت باتیں کرنی ہیں۔ وہ بیٹھک جو احاطے میں کھلتی ہے۔ اس کی تیسری کھڑکی اندر سے کھلی ہو گی کھڑکی میں اندر رسی پڑی ہو گی۔ اٹھا لینا۔ بارہ بجے سے پہلے نہ آنا۔"

رجو کے چوبارے کے نیچے کی بیٹھک جس کی کھڑکیاں احاطے کے میدان میں کھلتی تھیں سال ہا سال سے بند پڑی تھی۔ اس میں گھر کا کاٹھ کباڑ ڈھیر کیا ہوا تھا۔ رجو اور شہزادی کے مکان کا صدر دروازہ جو چھتی گلی میں کھلتا تھا جسے ڈیوڑھی کہتے تھے۔ لیکن یہ ڈیوڑھی مشترکہ تھی۔ یہاں سے چار ایک مکانات کو رستے جاتے تھے۔ اس لیے صدر دروازہ زینت کو چوری چھپے شہزادی کے گھر جانے کے لیے مستعمل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میدان میں کھلنے والی بیٹھک کی کھڑکیاں ان کے گھر میں داخل ہونے کا واحد رستہ ذریعہ تھا وہ بھی صرف اس لیے ممکن العمل تھا کہ رجو ان دنوں باہر گئی ہوئی

تھی۔ ورنہ خدا جانے کس وجہ سے اپنے چوبارے میں آ گئی تھی شاید اس کی وجہ صفدر ہو۔ جس کا مکان شہزادے کے چوبارے سے عین ملحق تھا۔

اس رات وہ جنگلے میں لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔ گھر کے زیادہ تر لوگ اوپر چھت پر سوئے تھے۔ باہر صحن میں زینے کے پاس ہاجرہ کی چارپائی تھی۔ جس کے پاس ہی وہ جائے نماز پر بیٹھی نہ جانے کیا پڑھ رہی تھی۔ انہی دنوں ہاجرہ نے گاؤں کے ایک بزرگ جنہیں حاجی صاحب کہتے تھے کی بیعت کر لی تھی اور نمازوں اور وظائف میں مصروف رہتی تھی۔

نیچے احاطے کے میدان میں چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ چاندنی خوفناک تاثر بھی پیدا کر سکتی ہے۔ محلے میں چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ برتن بج رہے تھے چارپائیاں گھسیٹی جا رہی تھیں ______ دروازوں کے پٹ بند ہو رہے تھے۔

آہستہ آہستہ محلے پر خاموشی طاری ہوئے جا رہی تھی۔ خاموشی کے وقفے لمبے ہوتے جا رہے تھے پھر محلے کی مسجد سے نمازی وظائف سے فارغ ہو کر گھروں کو لوٹ رہے تھے قدموں کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں ٹپ ٹپ قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتی تھی۔ کوئی دروازہ چرچوں کر کے کھلتا اور ٹھک سے بند ہو جاتا۔ پھر خاموشی چھا جاتی۔ چند ساعت کے بعد پھر ٹپ ٹپ قدموں کی آواز آتی آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جاتی اور پھر چرچوں ٹھک کے بعد خاموشی کا ایک اور وقفہ شروع ہو جاتا۔

ماچھن

احاطے کے میدان کے عین درمیان میں کنوئیں کی منڈیر کے قریب ماچھن ڈھیر ہو رہی تھی۔ ماچھن ایک مستانی تھی۔ جو سارا دن نہ جانے کہاں کہاں گھومتی پھرتی اور شام کے وقت محلے کے احاطے میں آ جاتی اور کنوئیں کی منڈیر کے قریب رات بسر کر

تی تھیں۔

ماجھا کو اپنی سدھ بدھ نہ تھی۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ لیکن جسم پھولا ہوا تھا۔ غالباً
اس کے جسم میں حسیت مفقود ہو چکی تھی۔ اگر کوئی ماجھا کے جسم پر چٹکی بھرتا تو ماجھا کو
قطعی طور پر احساس نہ ہوتا۔ وہ آپ ہی آپ بیٹھی قہقہہ مار کر ہنسنے لگتی یا پھوٹ پھوٹ
کر روتی یا چیخیں مارتی رہتی۔ اس کے جسم پر ایک لمبا چغہ پڑا رہتا تھا۔ سر اور جسم میں
جوئیں چلتی تھیں اور رات کو جاگتے ہیں بیٹھے بیٹھے اس کا پیشاب اور پاخانہ خطا ہو جاتا
تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ ماجھا کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔ کس کی بیٹی ہے اور
اس کی یہ حالت کیوں ہوئی ہے؟

کوئی کہتا کہ وہ میر پیر گھرانے سے ہے اور کشتۂ محبت ہے۔ محبت کی شدت کی
وجہ سے دیوانی ہوئی ہے کوئی کہتا کہ نوجوانی میں غنڈوں نے اس سے زیادتی کی اور
عفت مآب لڑکی کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہوش کھو بیٹھی۔

رات کے وقت محلے کے کتے اسے چاٹتے رہتے تھے پھر نہ جانے کون آتا ہے
چاٹ گیا کہ ماجھا پیٹ سے ہو گئی۔ لوگوں نے حیرت سے ماجھا کی طرف دیکھا۔
مردوں نے نگاہیں جھکالیں عورتوں نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ لیں۔ اور اس عجیب و
غریب قسم کے تصرفات کرنے لگیں۔ دیر تک وہ اس ٹوہ میں لگی رہیں کہ بدکار
خواتین ہوشیار ہوا۔ معلوم تو نہیں لیکن وہاں تو سدھ بدھ ہی نہ تھی لہذا بات ختم ہو گئی۔
معینہ وقت پر بصد مشکل عورتیں اسے کمرے میں لے گھسیں۔ ماجھا کے ہاں ایک
وقتی چاند سے مکھڑے والا بچہ پیدا ہوا۔ اور چند روز زندہ رہ کر مر گیا اور ماجھا فراغت
پا کر سیدھی کنوئیں کی منڈیر کے قریب جا کر ڈھیر ہو گئیں اور اسی طرح قہقہے مارنے
چیخنے اور رونے میں مصروف ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

پھر ایک روز آدھی رات کے وقت محلے میں شور مچ گیا۔

جو بہت دیر کے بعد دوکان سے واپس گھر آ گیا۔ ان دنوں کسی تہوار کی وجہ سے
دوکان پر سلائی کا کام بہت زیادہ تھا۔ جب وہ احاطے کے میدان کے قریب آیا تو
اس نے دیکھا کہ ماچھے کے ڈھیر کے قریب ایک اور ڈھیر لگا ہوا ہے۔ وہ چونک کر
رکا۔ دوسرے ڈھیر میں حرکت ہوئی۔ "کون ہے۔" وہ چلایا۔ پھر حرکت ہوئی۔ ایک
سایہ سا بلند ہوا۔ وہ تیزی سے گلی کی طرف بڑھا۔

جو نے شور مچایا۔

اس پر محلے کی بوڑھیاں کھڑکیوں میں آ کھڑی ہوئیں۔

"کون ہے؟" ماں چلائی۔

"میں ہوں ماں جی۔" جو بولا "یہاں کوئی تھا۔"

"کہاں تھا کوئی۔" دوسری بولی۔

"یہاں ماچھا کے پاس۔"

"ہے کون ہے۔ کالے منہ والا۔"

"معلوم نہیں ماں، میں آیا تو کوئی تھا۔ میرے سامنے بھاگ کر گیا ہے۔"

اس پر محلے کے دو ایک مرد لالٹین اٹھائے باہر نکل آئے اور اسے تلاش کرنے
لگے۔

ادھر عورتیں ہونٹوں پر انگلیاں رکھے بد دعائیں دینے لگیں۔

"نہ جانے کون بے شرم ہے۔ نجانے کیا زمانہ آیا ہے۔"

"اور پھر ماچھے کے پاس ہاں۔ وہ تو گندگی کا بورا ہے۔"

"بے بڑی یہ مرد تو گدھے ہو جاتے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں اسے پکڑ کر باندھ دو۔ اور صبح گدھے پر بٹھا کر شہر میں پھراؤ۔"

لیکن عورتوں کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی ____ تلاش کے باوجود کوئی نہ ملا۔

بہت تا ضرور ہوا کہ محلے والے چوکنے ہو گئے اور محلے والیوں کی دلچسپی اس

حد تک بڑھ گئی کہ جب بھی رات کے وقت کسی کی آنکھ کھلتی یا نیند نہ آتی تو وہ اٹھ کر کھڑکی سے جھانک کر میدان میں نگاہ دوڑاتی کہ ماجھا کے ڈھیر کے پاس کوئی اور ڈھیر تو نہیں پڑا۔

جو کے اس انکشاف کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ محلے کے جوان اور عمر رسیدہ کنوارے محلے والیوں کے شبہات کا مرکز بن گئے۔ اور رات کے وقت میدان میں جانا خطرہ مول لینے کے مترادف ہو گیا۔

ہاں، میں آ گیا

گھڑیال نے بارہ بجائے۔ علی چپ چاپ میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ محلے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

علی نے مڑ کر اپنے گھر کا جائزہ لیا۔ علی احمد کوٹھے پر چوبارے میں تھے۔ شمیم اور اس کی دونوں بچیاں اندر کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ شمیم کے خراٹوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ بیٹھک کے باہر دالان میں ہاجرہ تھی۔ لیکن ہاجرہ کے متعلق علی کو کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔

وہ چپ چاپ اٹھا۔ دبے پاؤں غسل خانے میں گیا۔ پھر صحن کا جائزہ لیا۔ دالان میں ہاجرہ گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ اس نے سیڑھیوں کا دروازہ کھولا۔ اور انتظار کرنے لگا۔ پھر وہ چپکے سے نیچے اتر آیا۔ ڈیوڑھی میں گھپ اندھیرا تھا۔ ڈیوڑھی مشترکہ تھی۔ ڈیوڑھی کے پیچھے چھ سات مکانات تھے۔ وہ رک گیا دیر تک کھڑا رہا پھر اس نے دروازہ کھولا اور باہر میدان کا جائزہ لینے لگا۔

باہر نکل کر اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ بند کیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کنوئیں کے منڈیر کے پاس ماجھا کا ڈھیر پڑا تھا۔ جو اس کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔

دفعتاً وہ چونکا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ماجھا سے دس فٹ کے فاصلے پر کوئی دیوار سے لگ کر کھڑا تھا۔ علی کونے میں چھپ گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ یقیناً وہ

محلے کا آدمی نہ تھا۔ اس کا جسم گول مٹول تھا۔ کپڑے پھٹے پرانے تھے۔ چہرے پر
وحشت سی برس رہی تھی۔ یقیناً وہ شخص ماجھا کے لیے وہاں حاضر تھا۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ خود بھی وہاں کسی ماجھا کے لیے حاضر ہے۔ ان دونوں
میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ اس کے دل اس نامعلوم شخص کے لیے ہمدردی سی پیدا
ہوگئی۔ وہ ماجھا کے لیے کتنا خطرہ مول لے رہا تھا۔ اور ماجھا وہاں گندگی میں لتھڑی
پڑی تھی۔ اس سے بو آتی تھی۔ سوجے ہوئے پنڈے کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔

میں نے جیب سے ٹارچ نکال بٹن دبایا نامعلوم شخص دیوانہ وار بھاگا میں نے
ٹارچ گل کر دی چند ساعت کے لیے انتظار کیا۔ پھر وہ چپ چاپ ٹہلتا ہوا مسجد کے پٹ پر زور
دینے لگا۔ کھڑکی کے پٹ کھل گئے۔ اس نے اندر سے بند کر دیا۔ اور پھر ٹارچ کی روشنی
میں کاٹھ کباڑ سے بھری ہوئی بیٹھک میں دبے پاؤں چلنے لگا۔ سیڑھیاں چڑھنے کے
بعد وہ چوبارے کی طرف بڑھا تو رابعہ کے کمرے سے شہزادو نے جھانکا "تم آ گئے۔
خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ شہزادو ایک ماجھا ہے۔ اور اس سے صفدر کے تعفن کی بو آ رہی
ہے۔ اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ میں کیوں آیا ہوں۔ کیوں پھر سے اپنے آپ کو
تعفن میں جھونک رہا ہوں۔ اس کے دل سے آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے اندر میں
جھجھک تھی۔ شہزادو اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ "تم سچ مچ آ گئے ہو ایلی۔"

"ہاں میں آ گیا۔" وہ بولا۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ بولی۔ "میں سمجھتی تھی تم اب نہ آؤ گے کیا واقعی تم نے
مجھے معاف کر دیا ہے۔ کیا واقعی۔" وہ اس کے ساتھ چمٹ گئی۔

آہستہ آہستہ صفدر کا تعفن ختم ہوتا گیا۔ اور اس کی بجائے شہزادو سے وہی خوشبو آنے
لگی جس سے وہ بہت مانوس تھا۔

اس کا انداز وہی تھا۔ وہی حرکات۔ وہی آواز۔ وہی باتیں۔ بالکل صرف اس

کے چہرے پر وہ معصومیت نہ تھی۔ انداز میں شوخی نہ تھی۔ اب اس ہتھیلی میں وہ مینڈکیاں نہیں پھدکتا تھا۔ خدوخال میں ایک عجیب سی موہوم بے حسی آچکی تھی۔ لیکن یہ سب باتیں ضمنی تھیں۔ سب سے اہم بات تھی کہ سالہا سال کی گمنامی کے بعد آج پھر سے تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اور وہ اسے مورچھل کر رہی تھی۔ اور اس کے گرد خوشبو کی طرح منڈلا رہی تھی۔ اور لمبی لمبی زلفیں پیار سے اس کے گالوں کو چھو رہی تھیں اور ریشمیں ملبوسات اس کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے اور نادیدہ آنکھیں اسے رکھ رہی تھیں۔ اس پیش نظر منظر کے عقب میں ایک رسیلی آواز دھیرے سے مدھر سر میں کوئی دکھ بھرا گیت الاپ رہی تھی۔

آج پیا سنگھاسن پر براجمان تھا۔ سامنے گوپیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

دور نہ جانے کہاں چھپ کر رادھا رو رہی تھی۔

اس کے بعد یہ اس کا معمول ہو گیا۔ رات کو وہ دیر تک پڑھتا رہتا پھر لیمپ بجھا کر مسجد کی آوازیں سنتا رہتا۔ الماریوں میں رکھے جاتے۔ پلنگ کھینچے جاتے دروازے بند ہوتے اور آخر نمازیوں کے قدموں کی ٹپ ٹپ جیسے ٹین کی چھت پر بوندیں گر رہی تھیں۔ ٹپ ٹپ تھمتی، دروازہ کھٹکتا اور پھر خاموشی کا وقفہ شروع ہو جاتا اور پھر وہ ٹپ ٹپ کی مدھم آواز پھر سے سنائی دیتی قریب آتی اور پھر مدھم پڑتی جاتی اور آخر جب دروازہ کھلتا اور کھٹک سے بند ہو جاتا۔ اور خاموشی کا ایک اور وقفہ شروع ہو جاتا۔

رات کے بارہ کے قریب گلی سے ایک سایہ ابھرتا اور پھر میدان کے کسی نہ کسی کونے میں جا کھڑا ہوتا۔

ایلی کو اس سائے سے بے حد دلچسپی ہو چکی تھی۔

دھوپ چھاؤں

ایلی کی نیت میں وہی دورخی ابھر رہی تھی۔ وہی دھوپ چھاؤں جو غالباً بچپن ہی

سے اس کی روح میں دبکی بیٹھی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا کہ اس کا کھویا ہوا تخت واپس
واپس مل گیا تھا۔ اور وہ پھر کسی حسینہ کا محبوب تھا۔ حسینہ نہیں لیکن اب بھی وہ مخلیک کی
محبوب تھی۔ اس کی محبوبیت کو اس کے جسم اور خدوخال سے تعلق نہ تھا۔ اس کی باتیں
اس کا انداز اس کا کردار اس کی محبوبیت کے ضامن تھے۔ اس کے علاوہ ایلی کو رہ رہ
کر یاد آتی کہ صفدر نے کس طرح اس سے دھوکا کیا۔ کس طرح اس کا مذاق اڑایا۔ کس
طرح اس نے صفدر کے خیال سے اسے بیوقوف بنایا۔ اس وقت ایلی محسوس کرتا جیسے وہ
ایک نمبر ہو ایک ایسا عاشق ہو۔ جس کا نام رانجھا اور مہینوال جیسے عاشقوں کی
فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہو۔

لیکن اس کی خوشی کے ساتھ ہی بیٹھے بٹھائے اسے خیال آتا کہ وہ ایک اوچھے
فریب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی زندگی غلاظت سے بھری ہے۔ اس کی محبت
دراصل جسمانی حرص۔ اور اس کی ملاقاتیں اپنی پرانی رنگینی کھو چکی ہیں۔ ان میں
وہ شوق نہیں۔ وہ انتظار نہیں۔ وہ شوخی نہیں۔ اسے محبت نہیں کہا جا سکتا۔ اب وہ ایک
تعلق تھا ایک بھونڈا بھدا عام سا تعلق جو عورت اور مرد کے درمیان ہوتا ہے۔

پہلے اسے یہ شکایت ہوتی تھی کہ شہزاد اسے قریب بیٹھنے سے جھجکاتی ہے۔ وہ جان
بوجھ کر اس سے دور رہتی ہے۔ اور قریب ہوتے ہوئے بھی نہ جانے کہاں ہوتی
ہے۔ اب جب اس سے رات کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اب وہ محسوس
کرنے لگا تھا کہ اپنی محبوبیت اور رنگینی کے باوجود شہزاد ایک اوچھی ہے۔ اور وہ خود
تعفن کا شیدائی۔ اس خیال پر اسے اپنے آپ سے نفرت پیدا ہوتی۔ اور وہ شہزاد سے
نفرت کرتا اور اپنی زندگی کو ذلت بھری حماقت کے مترادف سمجھتا۔

رات کے بارہ بجے تو ایلی میں تعفن کا شیدائی ابھرتا۔ اوچھی کی دھن اس پر
جزیرے کے بڈھے کی طرح سوار ہو جاتی۔ لیکن جب وہ شہزاد کے پاس پہنچتا تو تخت
پر بیٹھ کر مور چھل کرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ہزار داستان کا کوئی شہزادہ ہو

اور سوتے جاگتے کا دلچسپ کھیل کھیل رہا ہے۔

صبح کے وقت شہزاد کھڑکی میں سوار ہو کر کسی نہ کسی سے باتوں میں مصروف رہتی۔

میں نے کہا ماں جی یہاں کھڑکی میں کس کی راہ دیکھ رہی ہو۔"

"ہے لڑکی کیا بہری ہے تو" ماں ہونٹ پر انگلی رکھتی۔

"میں نے کہا چاچی۔" شہزاد چیختی۔ "کیا بات ہے آج۔"

پھر وہ شمیم سے مخاطب ہوتی۔ "میں نے کہا وہ اپنے علی احمد کو کہاں چھپا رکھا ہے تم نے۔"

"میں کیا جانوں" شمیم جل کر کہتی "پوچھو راجو سے جو اسے بغل میں دبائے بیٹھی ہے۔"

"ہائے آخر تمہارا بھی تو حق ہے۔" وہ ہنسی۔

"نہ بہن میں اس سوکھی گانٹھ کو لے کر کیا کروں گی۔" شمیم بولی۔

اس پر علی احمد چوبارے سے نکل کر منڈیر پر آ کھڑے ہوتے۔

"کیوں بھئی شہزاد" وہ چلاتے۔ "اب تو ہم کو بھی کبھی کبھی یاد کرتی ہو"

"جی" وہ بولی "وقت وقت کی بات ہے۔ برا وقت کسی پر نہ آئے۔"

"ہی ہی ہی" علی احمد ہنستے "لیکن چیز وہی جو برے وقت کام آئے۔"

"کام آئے تو ہے نا۔" وہ ہنس کر کھڑکی سے ٹل جاتی۔

ایلی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب ڈرامہ اس کے لیے کھیلا جا رہا ہے۔ صبح کے وقت سے قرب اور لگاؤ کا احساس دینے کے لیے صرف یہی ایک طریقہ تھا۔ جب وہ بنگلے میں بیٹھا پڑھ رہا ہوتا تو شہزاد کسی کو مخاطب کر کے پوچھتی۔

"کیوں جی کیا ہو رہا ہے۔"

ایلی جھٹ اوپر دیکھتا اور کتاب کی طرف اشارہ کرتا۔

"ہو چکی۔ وہ چلاتی" سارا دن بس آلو ہی چھیلتی رہتی ہو۔"

ایلی کتاب بند کر کے بیٹھ جاتا۔

"تو میں نے کہا زینب ذرا میری طرف منہ کرو تو بات کروں تم سے۔"

"اے ہے۔ زینب ذرا میری طرف منہ کرو تو بات کروں تم سے۔"

"اے ہے۔" زینب چیخی۔ "میرے منہ پر کیا دھرا ہے۔ جو تم دیکھو گی۔"

"تمہیں کیا معلوم۔" شہزاد ہنسی۔

"آخر کیا بات ہے۔" زینب پوچھتی۔ "جو مجھ سے کرو گی۔"

"بات کا کیا ہے کوئی زبان سے تھوڑی ہی کی جاتی ہے۔ آمنے سامنے بیٹھ جاؤ تو بات بن جاتی ہے چاہے منہ سے نہ بولو۔"

"اب مجھے سامنے بیٹھا کر اب کیا بات بتاؤ گی۔" زینب حیرت سے چلاتی اور ہنس ہنس کر ایلی کا برا حال ہو جاتا۔

پھر وہ کھڑکی سے جا لگتی تو چیخ کر کسی سے کہتی۔ "ابھی آئی جی۔"

مجھ پر تھوکو

ایک روز رات کے نو بجے کے قریب جب ایلی محلے کی آوازیں سننے میں مصروف تھا دفعتاً شہزاد کے مکان کے عقب شور و غل بلند ہوا۔ کوئی چیخیں مار رہی تھی۔ محلے والیاں کھڑکیوں میں آ کھڑی ہوئیں۔

"کون ہے ماں؟"

"اے ہے وہی سیدہ ہے۔ اس شہابی کی بیوی اور کون۔"

"میں جانوں اسے پیٹ رہا ہے۔"

"کوئی نئی بات ہے۔ لیکن جاجاں روز پیٹتا ہے۔ روز پیٹتا ہے۔"

"نہ جانے کیوں وہ کیوں رہتی ہے شہابی کے گھر میں۔"

"پوچھو اس سے۔"

"میں جانوں ماں ایسی بھی ہوتی ہیں کئی ایک۔"

"ری کیسی۔"

"تمہیں ہدیہ بانٹنے کا شوق ہوتا ہے۔"

"ہے نہیں پھوپھی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"تو تمہیں کیا معلوم کیا کیا ڈھنگ آتے ہیں ایسیوں کو۔"

"سکینہ تو ایسی نہیں۔"

"بس تو رہنے دے میری زبان نہ کھلوا۔"

میں نے کہا اس کی بھتیجی بتا رہی تھی مجھے کہہ رہی تھی۔ جو صفدر نے بتایا تو بیوی کا جی نہیں لگتا گھر میں۔"

"ٹھیک تو ہے شرابی جی نہیں لگائے گا تو کون لگائے گا۔"

"اب بڑی بی یہ صفدر تھوڑے چار دن کا مہمان ہے جب سے اس کا گھر چھوڑا ہے۔"

"کس کا اب؟"

"اسے ہے ستہ بول" ماں بولی۔ "اپنی تمہ" کاتب سے کہتے ہیں پیٹ چیتا ہے۔"

"وہ کیا ہوتی ہے اماں؟"

"اسے ہوتی ہوگی کچھ۔ وہی جو دن کے تل سے بچتی ہے جتے بھک سے آگ لگتی ہے۔

سارا کلیجہ جل چکا ہے۔

ابھی وہ دونوں باتیں ہی کر رہی تھیں کہ پچھلی گلی سے شور سنائی دیا۔ اور پھر صفدر میدان میں آ کھڑا ہوا وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر عورتوں نے کھڑکیوں کے پٹ بند کر دیے اور دروازوں سے دیکھنے لگیں۔ بلی چھلانگ لگا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسے صفدر کے روبرو جانے کی ڈر لگتا تھا۔ شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔

"اپنے گھر" وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ "اپنا گھر۔ ہی ہی ہی۔"

انہوں نے اسے شانوں سے پکڑ لیا اور گھسیٹنے لگے۔

"نہیں نہیں میں ہوش میں ہوں ___ ہوش میں ہوں ___ تمہاری قسم"

صفدر کے جانے کے بعد محلے کی بوڑھیوں نے کچھ بات شروع کر دی۔

"ہائے ہے کیا حالت بن گئی ہے اس کی۔"

"ہاں اچھا بھلا تو ہوتا تھا یہ"

"تو اس بیٹے کی بات چھوڑو اب چودہ سال میں یہ دوسرا نشہ پیا ہے۔ اس نے اسے بوکھلا دیا ہے۔"

"دوسرا نشہ کون سا ماں۔"

"اے آہستہ بات کرو لڑکی۔ اگرچہ اس کی کھڑکی بند ہے پر وہ سب کچھ سن رہی ہے۔" ماں نے شہزادی کی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اس رات جب علی شہزادی کے پاس پہنچا تو وہ خلاف معمول خاموش تھی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

"تم اداس کیوں ہو۔" علی نے پوچھا۔

"نہیں تو" شہزادی نے آنسو پونچھ کر کہا۔

"رو تو رہی ہو۔" وہ بولا۔

"کیوں کیا صفدر کا غم ہے۔" علی نے اسے طعنہ دیا۔

شہزادی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ "علی" وہ بولی "مجھے اس کا طعنہ دیا کرو۔"

"کیوں کیا جھوٹ ہے۔" علی نے پوچھا۔

"نہیں سچ ہے۔" وہ بولی "لیکن ___"

"لیکن کیا؟"

"اس کا ساتھ دے کر میں نے اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہ سے گرا دیا۔ میں خود اپنی نگاہ سے گر گئی ہوں۔"

"کیوں" علی نے پوچھا "کیا میرا ساتھ دے کر تم لوگوں کی نگاہ سے نہیں گری تھیں۔"

"نہیں" بولی۔

"بدنام نہیں ہوئی کیا؟"

"ہوئی ہوں۔ لیکن میں ذلیل نہیں ہوئی۔ الٹا مجھے فخر ہے کہ میں نے تمہارا ساتھ دیا۔"

"یہ کیا دلیل ہوئی؟" علی ہنسنے لگا۔

"مجھے نہیں پتہ کیوں بدنامی کے باوجود میری تذلیل نہ ہوئی بلکہ میری گردن اونچی رہی۔ لوگ باتیں کرتے رہے۔ بکتے رہے میں نے ذرا بھر پرواہ نہ کی۔ لیکن چھوٹے آدمی کو منہ لگا کر ذلیل ہو گئی۔" شہزادی کے منہ سے بے ساختہ دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔ علی حیران تھا۔ اس نے شہزادی کو ایسی بے بسی اور خود ترسی کی حالت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

تعفن کا شیدائی

ابھی وہ بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ احاطے کے میدان میں شور بلند ہوا "حرامزادہ جا رہا کہاں۔" ایک پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ چاروں طرف کھڑکیاں کھل گئیں۔ بوڑھیاں چلانے لگیں۔

"کسے پکڑ رہے ہیں۔؟"

"پتہ نہیں۔"

"اسی حرامی کو مار۔"

"ارے کس کو۔"

''مینہ ـــــ مچھا کو پکڑے بیٹھا تھا۔''

''ہے اللہ'' چاروں طرف سے شور بلند ہوا۔

مرد جوتی پہن کر باہر کی طرف بھاگے۔ عورتوں نے چیخیں چلائیں۔ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ ایلی گھبرا گیا۔

''میں جاتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''گھر میں سب کو پتہ چل جائے گا کہ میں موجود نہیں۔''

''پتہ چل جائے گا۔'' وہ بولی اور اس نے ایلی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس پر ایک چادر پھینک دی اور پھر کھڑکی کھول کر ایلی کو اسی طرح ساتھ چمٹائے کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔

''یہ کیا کر رہی ہو۔''

ایلی چلایا۔

''چپ رہو۔ مرو نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔'' شہزاد نے گرفت اور مضبوط کرتے ہوئے کہا اور پھر با آواز بلند چلانے لگی۔

''کون ہے یہاں؟''

''نہ جانے کون ہے'' ماں نے جواب دیا۔

''ذرا دیکھو تو۔ کیوں چیخا، دیکھا ہے۔''

''کوئی باہر کا ہے۔''

نیچے سے کسی نے جواب دیا۔

سامنے جنگلے سے شمیم چلائی ''شہزاد یہ ساتھ کسے چمٹائے کھڑی ہو۔'' شہزاد قہقہہ لگا کر ہنسی۔

''جانو سا تو نہیں'' شمیم نے پوچھا۔

''تم بھی حد کرتی ہو۔ بھلا جانوں کو بغل میں دبانے کو کسی کا جی چاہے گا۔''

میدان میں پھر شور مچ گیا۔ وہ اسے لوہے کی نال سے باندھ رہے تھے۔"

"یہ ٹھیک ہے، یہ ٹھیک ہے۔" وہ چلا رہے تھے۔

"رات بھر تو یہیں نل سے بندھا رہے، صبح بات کریں گے۔"

ہر کوئی نیا مشورہ دے رہا تھا۔

ایلی سوچ رہا تھا ایک دن وہ بھی اسی طرح پکڑا جائے گا۔ اور وہ سب اس کے منہ پر تھوکیں گے۔

"میں چلتا ہوں۔" وہ گھبرا کر بولا۔

"نہ جاؤ۔" وہ بولی۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"تمہیں ڈر لگتا ہے کیا؟ تمہیں؟"

"ہاں" وہ بولی "اب تو ہر بات پر ڈر لگتا ہے۔"

"اور اس وقت تو یوں نڈر کھڑی ہو۔"

"اس وقت تم جو ہو سو ہو۔ تم ساتھ ہو ایلی تو میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ کسی سے نہیں۔"

"آہستہ بولو۔" وہ چلایا۔ "کوئی سن لے گا۔"

"پڑے سن لے۔" وہ بولی "اس دورخی سے نجات ملے۔"

"یہ کون ہے تمہارے ساتھ۔" ماں نے پوچھا۔

"سہیلی ہے میری" وہ ہنس بولی۔

"تیری سہیلیوں کا بھی شمار نہیں لڑکی۔" ماں بولی۔

ایلی گھبرا گیا۔ اس نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بھاگ کر نیچے آیا۔

شہزاد کی دیدہ دلیری کو دیکھ کر ایلی بے حد خوش ہوتا تھا شاید اس لیے کہ اس کی دلیری میں عجیب سی رنگینی کی جھلک ہوتی تھی یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ ایلی خود بے حد ڈرپوک واقع ہوا تھا۔ اس لیے وہ دوسروں کی دلیری سے بے حد متاثر ہوتا تھا۔

لیکن کچھ دیر بعد اس دلیری کا بیلی کے دل پر عجیب سا ردعمل ہوتا۔ اس کے دل میں شہزادے کے متعلق عجیب و غریب شبہات پیدا ہوتے۔ شاید اس وقت جب میں شہزادے کے پاس تھا۔ شہزادے نے کسی اور کو دوسرے کمرے میں چھپا رکھا ہو۔ شاید میرے وہاں پہنچنے کے بعد بیٹھک کا بھی دروازہ کسی دوسرے کے لیے بھی کھلتا ہو۔ شاید بیک وقت وہ کئی ایک سے کھیل رہی ہو۔ شاید ______

اس کے دل میں شبہات یوں بھنبھناتے جیسے حلوائی کی دکان پر مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ اس کی نگاہوں تلے عجیب و غریب مناظر یوں آکھڑے ہوتے جیسے وہ خیال نہیں بلکہ حقیقی ہوں۔ پھر رقابت کا دیوتا اسے اپنی چنگل میں لے لیتا اور وہ کرب سے تڑپتا۔ یہ کرب اس حد تک شدت اختیار کر لیتا کہ بیلی کا سانس بند ہو جاتا۔ دل ڈوبنے لگتا اور سینہ پھٹنے لگتا۔ شاید یہی جذبۂ رقابت محبت میں اس کے لیے تازیانہ بن جاتا۔

اس رات شہزادے کے گھر سے واپس آنے کے بعد سے اس پر رقابت کا شدید دورہ پڑ گیا۔ میدان میں سے سب لوگ جا چکے تھے۔ عورتوں نے کھڑکیاں بند کر دی تھیں محلے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کنوئیں کی منڈیر کے پاس ماجھا کا خیمہ ڈھیر لگا تھا۔ سامنے کی دیوار کے قریب کیل کے ساتھ ماجھا کا جبلی شاید بندھا ہوا تھا۔ بیلی جوشِ رقابت سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ عین اسی طرح جبلی رسے کے بندھن کھولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

دفعتاً بیلی کو خیال آیا۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

جبلی کی دیوانہ وار جدوجہد سے بیلی کو یہ شبہ گزرا کہ وہ اس قید سے مخلصی پانے کے لیے جدوجہد نہیں کر رہا۔ بلکہ ماجھا کے تعفن کی لذت کا بندھن اسے مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنے آپ چھڑا کر اس غلاظت بھرے کنوئیں میں چھلانگ لگا دے۔ اگر وہ جبلی کو کسی ایسی جگہ باندھے جہاں سے ماجھا کا قرب حاصل کرنے کا امکان نہ ہوتا

تو غالباً وہ صبح تک چپ چاپ دیوار سے لگا کھڑا رہتا۔

ایلی نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں کتنی مناسبت تھی۔ دونوں ہی ماجھا کے دیوانے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس ماجھا سے خوشبو آتی تھی۔ وہ گونگی تھی اس کے تکلم میں شوخی تھی۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ دبے پاؤں اتر کر اس ماجھے دیوانے کو کھول کر آزاد کر دے، لیکن پھر خیال آتا کہ وہ رسہ جو اس کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ اس کا بندھن نہ تھا۔ اس کا بندھن تو ماجھا تھی، اس کا تعفن تھا۔

چاہے کچھ بھی ہو اس نے سوچا اور چپ چاپ اٹھ کر دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ میدان میں پہنچ کر اس نے کیل کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ بھاگ گیا۔ اس نے سوچا۔ ڈر کر بھاگ گیا۔ وہ واپس اوپر آ گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

دفعتاً اس کی نگاہ میدان پر پڑی۔ ماجھا کے ڈھیر کے قریب ہی ایک اور ڈھیر اس کی طرف آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔

وہ چپکے سے لیٹ گیا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

وہاں ماجھا دور دوسرے کسی کتے کو دھتکار رہی تھی۔

محلے کی چمگادڑیں چیخ رہی تھیں۔ دور بہت دور کوئی گاڑی ہونک رہی تھی۔

نہ جاؤ نہ جاؤ

ایک روز رات کے ایک بجے کے قریب شہزاد کی طرف جاتے جاتے ہوئے جب وہ ہاجرہ کی چارپائی کے قریب پہنچا تو ہاجرہ دفعتاً چونک کر بیدار ہو گئی اس نے چارپائی سے ایک جست لگائی اور آ کر ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

ہاجرہ کے جاگنے پر ایلی قطعی طور پر نہ گھبرایا۔ چونکہ وہ رات کو اکثر اٹھ کر پیشاب کرنے کا عادی تھا۔ بچپن ہی سے ایلی کو مسلسل البول کی شکایت تھی۔ سبھی جانتے تھے کہ وہ بار بار پیشاب کرنے کا عادی ہے اگر ہاجرہ نے اسے دیکھ لیا تو اس میں

گھبراہٹ کی کوئی بات نہ تھی۔

"کیوں کیا بات ہے؟" ایلی نے دہرایا۔

ہاجرہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔

"تم ادھر نہ جاؤ ایلی" ہاجرہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"کدھر" ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

"میں تمہاری منت کرتی ہوں۔" وہ اپنی ہی دھن میں بولے گئی۔ "دیکھو میں پاؤں پڑتی ہوں۔"

"لیکن کس لیے ماں" ایلی تنگ کر بولا۔

"بیٹا میری بات مان لے۔"

"آخر بات کیا ہے؟"

"مجھے انہوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"حاجی صاحب نے۔" بولی۔

"کون حاجی صاحب؟"

"نہ بیٹا یوں نہ بول۔" "آہستہ بول۔ سب جاگ اٹھیں گے کیا وہ ماں۔"

"لیکن ماں مجھے کچھ پتہ بھی چلے۔"

"ادھر آ۔ ادھر میں تجھے بتاؤں" وہ اسے علیحدہ کمرے میں لے گئی۔

"حاجی صاحب میرے مرشد ہیں" وہ بولی "وہ بڑے کامل بزرگ ہیں۔ ابھی انہوں نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا اور کہنے لگے ایلی ادھر جا رہا تھا۔ اسے روک لے۔ اور میں گھبرا کر جاگ پڑی۔ اور کیا دیکھتی ہوں کہ تم کھڑے ہو۔"

ایلی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ "اماں تم بھی حد کر دیتی ہو۔" وہ بولا۔ "کون جا رہا ہے کہاں جا رہا ہے۔ میں تو پیشاب کرنے کے لیے اٹھا تھا تمہارے مرشد کو غلطی لگی

ہے۔"

"نہ نہ نہ" ہاجرہ چلائی "پاگل ہو۔ تم نہیں جانتے۔ تمہیں معلوم نہیں۔"

"تو نہیں ہوگا۔" علی بولا "اب آرام سے سو جاؤ۔"

اس کے بعد دیر تک علی جاگتا رہا۔ لیکن اسے شک تھا کہ ہاجرہ بھی جاگ رہی ہے۔ اس کے مرشد نے کیا اثر ڈال دی تھی۔ خواہ مخواہ پھر جب ہاجرہ خراٹے لینے لگی تو علی نے دیکھا کہ تین بج چکے تھے اور ادھر جانا بالکل بے کار تھا۔ لہذا اس نے ادھر جانے کا خیال ترک کر دیا۔

اگلے روز ہاجرہ علی کو فرحت کے ہاں لے گئی اور ابتدائی خاطر تواضع وغیرہ کرنے کے بعد کہنے لگی "علی میری ایک بات مان لے صرف ایک بات اس کے بعد جو جی میں آئے کرنا۔

میں کچھ نہیں کہوں گی۔ صرف ایک بات مان لے میری خاطر۔"

"کیا بات ہے۔" علی نے پوچھا۔

"دلی جا کر حاجی صاحب کی بیعت کر لے۔ بس اور کچھ نہیں۔"

"بیعت" علی نے حیرت سے پوچھا "وہ کیا ہوتی ہے۔"

"وہ بھی ہوتی ہے۔" وہ بولی "چاہے کچھ بھی ہو وہ تو کر لے۔"

"اماں تو بھی پاگلوں کی باتیں کرتی ہے۔" فرحت نے کہا۔

"چلو میں پاگل ہی سہی۔" ہاجرہ نے کہا۔

علی رضامند ہو گیا۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا۔ ویسے عام طور پر وہ ہاجرہ کی بات سن کر ہنس دیا کرتا تھا۔ لیکن اس روز نہ جانے کیا ہوا۔ بولا "بس اتنی سی بات ہے چلو میں اس مرشد کی زیارت کر آؤں جو آدھی رات کے وقت آ کر اماں کو الٹی سیدھی باتیں بتا کر پریشان کرتا ہے۔"

اس بات پر ہاجرہ اس قدر خوش ہوئی کہ وہ سب کچھ بھول گئی اس نے فوراً روپے

کا تھا۔ کیا۔ وہ دوڑی دوڑی جلیل کے پاس پہنچی جلیل آصفیہ کا بیٹا تھا۔ جو ہاجرہ کی سگی بہن کی لڑکی تھی۔

اب جلیل وہ جلیل نہ تھا جس سے کسی زمانے میں ایلی متنفر تھا۔ جب وہ رفیق اور یوسف علی رفعت کے ہاں جایا کرتے تھے اور جلیل آنکھیں بنا بنا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا جو ان کی بیٹھک کے متصل کی گلی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ اور پھر وہ یوسف کو بتایا کرتے تھے اور وہ ہنستا تھا اور بازی گروں کی طرح قلابازیاں لگاتا تھا جسے دیکھ کر لڑکی بے حد محظوظ ہوتی تھی۔

اب جلیل کا طرز زندگی بدل چکا تھا۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ باقاعدہ نماز پڑھا کرتا تھا۔ جلیل نے بھی انہی حاجی صاحب کی بیعت کر لی تھی۔ اس کی تبدیلی اس قدر حیرت انگیز تھی کہ اس کا چہرہ تک بدل گیا تھا۔ شاید ہاجرہ کا خیال تھا کہ حاجی صاحب سے بیعت کر لینے کے بعد ایلی بھی داڑھی رکھ لے گا۔ نماز پڑھنے لگے گا اور اس کی زندگی بھی یکسر بدل جائے گی۔

اگلے روز جب ایلی شہزاد سے ملا تو اس نے ماں کی ساری بات سنائی۔ وہ ہنسنے لگی۔

"بے چاری ہاجرہ۔" وہ بولی "اسے علم نہیں کہ تمہارا باپ کسی اور کا مرید نہیں بن سکتا۔ حاجی صاحب جتنا چاہیں زور لگا لیں۔ ٹھاٹ سے وہ تین تین پیگ پیتے رہیں گے۔"

"لیکن یہ بیعت کیا ہوتی ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ۔" وہ بولی "ہاجرہ تو مجھے بھی مجبور کر رہی تھی۔"

"کس سے؟"

"کہ میں بھی بیعت کر لوں حاجی صاحب کی۔ مجھ سے ہاجرہ نے کہا۔ رابعہ نے اصرار کیا۔ رفیق نے منتیں کیں۔ ان دنوں حاجی صاحب یہیں آئے ہوئے تھے۔ علی

پور ملی۔ اور یہ سب یوں ان کے گرد بیعت کی بھیڑ لگائے بیٹھے تھے جیسے بتاشے بٹ رہے ہوں۔"

"تو پھر تم نے کیوں نہ کی۔" ایلی نے پوچھا۔

"پہلے سے کی نہ کی ہوتی تو کر لیتی۔" وہ بولی۔

"پہلے سے کی ہوئی ہے تم نے؟"

"ہاں۔" وہ بولی۔

"کس کی؟"

"تمہاری اور کس کی۔" وہ اس کے قریب تر ہو گئی۔ "مجھے اتنا زبردست مرشد ملا ہے کہ اب کسی اور کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی۔

دلی

اگلے روز ایلی جمیل کے ساتھ دلی روانہ ہو گیا۔

دلی میں وہ غلام محمد کے گھر ٹھہرے۔ غلام احمد ان کا عزیز تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ خوش شکل تھا اور رنگین مزاج واقع ہوا تھا۔ اسے گانے کا بہت شوق تھا۔ اور جب وہ گاتا تو اس کا چہرہ کسی انجانی جذبے سے منور ہو جاتا۔ اسے بہت سے گیت یاد تھے۔ خصوصاً ایسے گیت جن کی دھنیں چلنت تھیں۔ اور گاتے ہوئے اس کا دھیان بندھ جاتا تھا۔

دلی پہنچتے ہی جمیل نے کہا کہ وہ اسی شام حاجی صاحب کی طرف جائیں گے۔

غلام محمد نے قہقہہ لگایا۔ بولا "شام کے وقت بزرگوں سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا۔ بہتر ہے کہ آپ انہیں کل صبح ملیں۔"

پھر وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "چلو بھائی صاحب۔ آج شام کو دلی کی سیر رہے۔"

جب جمیل نماز پڑھنے کے لیے چلا گیا تو احمد نے ایلی کو کہنی ماری۔ "کل تو بھائی صاحب آپ باقاعدہ طور پر مرید بن جائیں گے۔ پھر تو دنیا ہی بدل جائے گی۔ آج

آخری مرتبہ ذرا تسلی سے گھوم پھر لو۔ آ دونوں کی بانکیاں دکھ نہیں تھیں۔

احمد علی کو لے کر چاوڑی جا پہنچا۔ پہلے تو اس نے سارے بازار کا جائزہ لیا۔ پھر باری باری چوباروں پر جانا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو علی گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہر بیٹھک پر لوگ احمد کو بڑے تپاک سے ملتے ہیں اور یوں باتیں کرتے ہیں جیسے مدت کی جان پہچان ہو تو وہ مطمئن ہو گیا۔

دلی کی طوائفوں کو دیکھ کر علی بہت حیران ہوا حالانکہ اس نے لاہور اور امرتسر میں بھی دیکھی تھیں لیکن یہاں کی بات ہی کچھ اور تھی۔ انہیں دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسبیاں ہیں اور بازار میں کاروبار کے لئے بیٹھی ہیں۔

ان کی گفتگو بہت سنجیدہ تھی۔ انداز میں نمائش نام کو نہ تھی بلکہ ایک عجیب سے دوستانہ اور گھریلو انداز کی آمیزش تھی۔ احمد صرف ان بیٹھکوں پر جاتا تھا جہاں محفل نہ لگی ہوتا کہ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقع ملے۔ وہ ایک سے اس نے گانے کی بھی فرمائش کی۔ ان کا گنگنانا کس قدر پیارا تھا۔ چونکہ اس وقت وہ رنگی ساز کے شور و شغب سے پاک تھا۔ وہ یوں بیٹھی گا رہی تھی جیسے کوئی گھر والی ہنڈیا پکاتے ہوئی گنگنا رہی ہو۔

ہو کے رہے گا

اگلے روز صبح سویرے جلیل اور علی صاحب کی طرف چل پڑے۔

دیر تک وہ بلی ماران کی گلیوں میں گھومتے رہے۔ آخر ایک مکان پر پہنچ کر جلیل نے دستک دی۔ ایک نوجوان لڑکا باہر نکلا اور انہیں ایک کمرے میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد حاجی صاحب تشریف لائے۔

ان کا قد درمیانہ تھا۔ عمر چالیس سے متجاوز۔ رنگ گندمی تھا۔ خدوخال عتیق تھے جسم دبلا پتلا۔ چہرے پر جلال اور دبدبے کی بجائے بے بسی اور عجز چھایا ہوا تھا۔ بہت ان کی سرمے سے بھری ہوئی آنکھیں بے حد متورم اور نم آلود تھیں اور ان کا سر

حرکت کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے ـــــ حاجی صاحب؟" ایلی نے اپنے آپ سے کہا اور اسکے دل سے خوف اور گھبراہٹ دور ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا کہ حاجی صاحب ایک انسان ہیں۔ نہ تو دیوتا ہیں اور نہ جن یا بھوت! ان سے بات کی جا سکتی ہے اور ان کی بات کاٹی جا سکتی ہے۔

جمیل صاحب سے باتیں کر رہا تھا اور ایلی سوچ رہا تھا۔

جمیل سے باتیں کرنے کے بعد حاجی صاحب ایلی کی طرف متوجہ ہوئے۔

آپ کے مزاج اچھے ہیں۔ اور سب طرح خیریت ہے۔ جملہ متعلقین اچھے ہیں۔ آج کل آپ کہاں مقیم ہیں۔"

انہوں نے ایسے بیسیوں سوال کر ڈالے۔ اور ایلی مشینی طور پر ان کے جواب دیتا چلا گیا۔

پھر وہ حاجی کے ہمراہ جامع مسجد کی طرف چل پڑے۔

ہر چند قدم کے بعد کوئی نہ کوئی راہ گیر حاجی صاحب کو جھک کر سلام کرتا اور وہ بڑے خلق سے ان سے باتیں کرتے اور پھر جلد ہی رخصت طلب کر کے آگے چل پڑتے۔ ایلی مشین کی طرح حرکت کر رہا تھا۔ جیسے گردن اور سر کے درمیان ایک نرم تار لگا ہو جو سر کے بوجھ کی وجہ سے جھول رہا تھا۔

جامع مسجد پہنچ کر حاجی صاحب نے وضو کیا۔ پھر ایلی سے کہا۔

"بھائی وضو کر لو۔"

ایلی کو وضو کرتے دیکھ کر حاجی صاحب خاموش رہے۔ جمیل نے ایلی کو ٹوکا۔

"وضو یوں۔" جمیل بولا "یوں نہیں بلکہ ـــــ"

حاجی صاحب نے جمیل کی بات کاٹ کر کہا۔

"انہیں کرنے دیجئے جیسے بھی یہ کر رہے ہیں ٹھیک ہے۔"

ایلی نے حیرانی سے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ عجیب پیر ہے جو احکام صادر نہیں کرتا۔ اس کی آواز اس قدر مدھم ہے۔ پیروں کی آواز تو حلق کے نچلے پردے سے نکلا کرتی ہے اور انداز جابرانہ ہوتا ہے۔ یہ تو بڑے ملائم انداز سے بات کر رہا ہے جیسے معذرت کر رہا ہو۔ بلکہ اس کا تو تمام تر وجود ہی ایک معذرت ہے۔

ایلی کو شک پڑنے لگا کہ وہ پیر نہیں بلکہ کوئی تاجر ہے جس نے پیری مریدی کا دھندا چلا رکھا ہے۔ پیر تو بہوند لے مریدوں کو ڈانٹتے ہیں۔ دھمکاتے ہیں۔ ایلی کو براہ راست کسی پیر سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ پیر کیسے ہوتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیسے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ پیر بڑے بارعب اور جلالی ہوتے ہیں اور مریدوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔

بنیا تاجر

بہر حال اسے یقین ہو گیا کہ حاجی صاحب نے پیر بننے کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ وضو کرنے کے بعد انہوں نے ایلی کو اپنے روبرو بٹھایا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے اور کچھ پڑھنے لگے۔

"ایک بات پوچھوں۔" ایلی نے کہا۔

جی فرمایئے۔" حاجی صاحب بولے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔"

"آپ کی والدہ کے حکم کو بجا لا رہا ہوں۔" وہ بولے۔

"واہ واہ۔" ایلی نے سوچا۔ "اپنے مرید کا حکم بجا لا رہا ہے۔ کسی پیر نے کبھی مرید کے متعلق ایسی بات کی ہے بھلا۔ لاحول ولاقوۃ۔"

"پھر بھی۔" ایلی نے پوچھا "اس عمل کو کیا کہتے ہیں۔"

"اسے بیعت کہتے ہیں۔"

"بیعت کیا ہوتی ہے۔"

"بیعت ایک تعلق ہوتا ہے جیسے دوستی ہوتی ہے۔"

"دیکھئے۔ حاجی صاحب۔ میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔"

"فرمایئے۔"

"اگر آپ اپنی طاقت سے مجھے نیک بنا دیں تو مجھے ایسی نیکی مطلوب نہیں۔"

"کیوں۔" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں وہ نیکی چاہتا ہوں جو میرے دل سے نکلے۔ کسی کی بخشی ہوئی نہ ہو۔"

وہ ہنسنے لگے۔

"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ آپ بہت سمجھدار ہیں۔"

"ارے۔" میں حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ "یہ تو بالکل ہی تاجر ہے۔"

"اگر آپ اپنی نیکی اور عبادات کے زور سے مجھے اللہ سے ملا دیں۔" میں نے کہا "تو بھی مجھے منظور نہیں۔ ملنا ہے تو میں اپنے زور پر ملوں گا۔ اس کے علاوہ" وہ بولا "میں نہیں چاہتا کہ بدل جاؤں۔ میں اسی طرح رہنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ہوں۔"

"بہت اچھے۔ بہت اچھے۔" وہ بولے۔ "نہایت اچھے خیالات ہیں آپ کے۔"

"ارے۔" میں نے پھر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ بالکل ہی عجیب قسم کا مرشد ہے یہ۔"

"باقی رہا تعلق کا سوال۔" میں نے کہا تو ابھی میرا اور آپ کا تعلق پیدا نہیں ہوا۔ تعلق تو دل کی بات ہے جو آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے اور پھر بڑھتا ہے۔ اگر آپ والدہ صاحبہ کا فرمان پورا کرنا چاہتے ہیں تو بسم اللہ۔

"بہت خوب۔" حاجی صاحب نے کہا۔ اور ازسرنو اس کے ہاتھ تھام کر بیٹھ گئے۔

"ایک بات اور ہے۔" میں نے پھر انہیں روکا۔

"ہاں ہاں۔" وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اس وقت میرے دل میں پسندیدگی یا خواہش کا جذبہ موجود نہیں ہے۔"

حاجی صاحب نے پیار بھری نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔ چار ایک منٹ وہ یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں کی چمک چھو اور بڑھ گئی تھی۔ اور چہرے پر ایک عجیب قسم کی مسرت پھیلی ہوئی تھی۔

وہ جلیل سے مخاطب ہوئے۔

"جلیل صاحب" وہ بولے۔ "آپ والدہ محترمہ کو میرا سلام دیں۔ ان سے کہیں کہ آپ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ لیکن ان سے کہہ دیں کہ ____"

وہ بولے۔ "ایلی صاحب ہمارے دوست ہیں۔ مخلص ہیں اور ہم اپنے دوست سے کوئی بات چھپا کر نہ رکھیں گے۔"

ایلی نے پھر حیرانی سے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔

"معاف کیجیے گا۔ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولے۔ "چونکہ ہمارے دل میں آپ کی دوستی کی خواہش ہے لہذا اس خواہش کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو آپ کا دوست سمجھتے ہیں۔ چاہے آپ کے دل میں ایسی خواہش ہو یا نہ ہو۔ آپ کے دل میں بھی پیدا ہو جائے گی۔ انشاء اللہ دیکھئے نا اگر آپ کے دل میں یہی خواہش بڑی چیز ہے ایلی صاحب ____ ہاں تو جلیل صاحب آپ والدہ محترمہ سے کہہ دیں۔" حاجی صاحب نے جلیل سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ان سے کہہ دیں کہ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ ہمارا مطلب ہے جس بات کا والدہ محترمہ کو ڈر ہے وہ ہو کر رہنے والی ہے۔ جو اللہ کو منظور ہے وہی ہوگا۔ ڈرنے کی بات نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اسی میں بہتری ہے۔"

"اور" حاجی صاحب نے کچھ وقفے کے بعد کہا۔ "والدہ محترمہ سے کہہ دیں کہ

ابھی وقت نہیں آیا ــــــ وقت آئے گا ضرور آئے گا اور بہت اچھا ہوگا۔ بہت اچھا۔ ماشاء اللہ علی صاحب کے خیالات بہت بلند ہیں۔ انشاء اللہ بہت اچھا ہوگا۔ گھبرائیں نہیں۔ ایک وقت آئے گا جب علی صاحب بہت اچھے دوستوں سے ملیں گے۔ ان کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ انشاء اللہ۔"

جادوئی مرہم

اسی روز شام کے وقت وہ دوبارہ حاجی صاحب سے ملے تو وہ تیار بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی بولے۔

"جمیل صاحب۔ آپ آگئے۔ اچھا کیا آپ نے۔ اب آپ نماز سے فارغ ہولیں۔ جب تک میں علی صاحب کو دنیا کی سیر کرالوں۔ کیوں علی صاحب۔ آپ دنیا کی سیر کریں گے۔ آئیے۔"

علی نے پھر حیرت سے اس عجیب و غریب ہستی کی طرف دیکھا۔ درحقیقت اب وہ قطعی طور پر بھول چکا تھا کہ حاجی صاحب بھی ولی یا اللہ لوگ ہیں۔ اب وہ انہیں تاجر بھی نہیں سمجھتا تھا۔ دنیا کی بنیاد۔ اب حاجی صاحب اس کے نزدیک ایک خوش مزاج، با اخلاق اور خلوص سے بھرا انسان تھا۔

وہ دونوں چل پڑے

علی حیران تھا کہ یہ عجیب سرمد چشم کیف مزاج آدمی اسے کہاں لے جائے گا۔ وہ بھلا اسے دنیا کی کیا سیر کرا سکتا ہے۔ دنیا کی سیر تو احمد نے کرائی تھی۔ وہ وہ کیا چیزیں دکھائی تھیں۔ لیکن احمد کے ساتھ جانے میں ایک قباحت ضرور ہوتی تھی۔ احمد کا اس کے ساتھ کچھ یہ طرز عمل تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان کا نوکر ہو۔ وہ اسے اہمیت ضرور دیتی تھیں لیکن اتنی اہمیت جیسے نوکر کو دی جاتی ہے۔ وہ اس سے یوں بات کرتی تھیں جیسے وہ ان کا دوست نہ ہو بلکہ ہم کار ہو۔

"آپ نے دنیا کی سیر کی ہے کیا۔" حاجی صاحب نے پوچھا۔

ایلی چونکا۔ "جی ہاں۔"

"کون کون سی جگہ دیکھی ہے۔" وہ بولے۔

"جی چاوڑی میں گیا۔"

ایلی کا جواب سن کر حاجی صاحب چونکے۔

"خوب۔" وہ بولے۔

"کیا آپ نے کبھی چاوڑی کی سیر کی ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولے۔ "ہم تو بھائی وہیں رہا کرتے تھے۔"

"وہیں رہا کرتے تھے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کیمسٹ کی دکان تھی۔ کلکتے میں ہیڈ آفس تھا۔ بمبئی اور دلی میں برانچیں تھیں۔"

"ارے۔" ایلی چونکا۔ "تو کیا گھاٹا پڑ گیا۔"

"نہیں تو۔" وہ بولے۔ "بس چھوڑ دیا کاروبار۔"

"کیوں۔" اس نے پوچھا۔

"اللہ میاں سے دوستی ہو گیا۔"

"نہیں۔" وہ مسکرائے۔ "ابھی تو معمولی جان پہچان ہوئی ہے۔"

"ایک بات پوچھوں۔" ایلی نے کہا۔

"ضرور پوچھیے۔ جو جی چاہے پوچھیے۔"

"اللہ میاں کیسے ہیں۔"

"بہت پیارے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔ "بہت ہی پیارے۔"

"وہ تو بہت سخت ہیں۔" ایلی نے کہا۔

حاجی صاحب مسکرائے۔ "سخت ہوتے تو کیا ہم سب اس قدر بگڑے ہوئے ہوتے۔"

ایلی کو یہ خیال کبھی نہ آیا تھا۔ اس نے اس زاویے سے اللہ تعالیٰ کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ ایک عظیم ہستی تھی۔ بے نیاز بے پروا۔

''ایلی صاحب۔'' وہ بولے۔ ''اللہ تعالیٰ سے دوستی کر کے دیکھو۔ اس قدر مخلص دوست نہیں مل سکتا۔''

''میں اس قابل نہیں۔'' ایلی نے جواب دیا۔

''قابلیت اور اہلیت وہ خود عطا کرتے ہیں۔'' حاجی صاحب نے کہا۔ ''صرف اس کی دوستی کی خواہش پیدا کرو۔ صرف خواہش۔''

''خواہش تو خود پیدا ہوتی ہے زبردستی پیدا نہیں کی جا سکتی۔'' ایلی نے کہا۔

''تو یہ خواہش ان سے مانگو۔ اللہ میاں سے پیار تو خوب صورت سے خوب صورت عورت سے پیار کرنے سے کہیں زیادہ رنگین ہے۔''

حاجی صاحب کی باتیں عجیب تھیں۔ ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ اس شخص کا تخیل کس قدر رنگین ہے۔ اس کی غمناک نگاہ میں کتنی محبت ہے۔

''کیا آپ نے کبھی عورت سے بھی یارانہ لگایا تھا۔'' ایلی نے پوچھا۔

وہ مسکرائے۔ ''ہاں ہاں۔''

''مجھے بتائیے۔'' ایلی بولا۔

''ہم نے ایک مرہم بنایا تھا۔''

''کیسا مرہم۔''

''ہم نے بہت سی روایات سے ایک مرہم تیار کیا اور پھر سات روز ایک وظیفہ کیا ایسے مقام پر وظیفہ کیا تھا جو لق و دق ویرانہ تھا۔ بمبئی میں سمندر کے ساحل کے پاس ایک پرانا مکان تھا جو مسمار ہو چکا تھا۔ اس میں بیٹھ کر ہم نے وظیفہ پڑھا اور پھر مرہم مکمل ہو گیا۔ وہ وظیفہ بھی اس مرہم کا ایک جزو تھا۔''

''لیکن وہ مرہم کیوں بنایا آپ نے۔''

وہ مسکرائے۔ ''بھائی نوجوان تھے۔ عورتوں کا شوق تھا۔ ان دنوں یہی چاہتا تھا

کہ کوئی چیز ہاتھ لگے کہ جس عورت سے آنکھ چار ہوں وہ دل وجان سے ہم پر نثار

ہو جائے۔ ان دنوں جوانی کا جوش تھا۔ روپیہ عام تھا۔ صحت ماشاءاللہ جوبن پر تھی۔

عاشق مزاج تو بچپن ہی سے تھے۔

میں ہنسنے لگا۔ وہ بالکل بھول گیا کہ یہ وہی صاحب ہیں جنہیں بیعت کرنے کے

لئے وہ بھی پورے دن آیا تھا۔

''مرہم کا نسخہ ہمیں بڑی تلاش سے ملا تھا۔'' حاجی صاحب نے پھر بیان کرنا

شروع کیا۔ ''ایک سادھو سے ہمیں یہ نسخہ ملا۔ بڑا گیانی قسم کا سادھو تھا۔ اس نے سالہا

سال تپسیا کی تھی لیکن گیانی ہونے کے باوجود بڑا موجی آدمی تھا۔ میں نے صبح شام

اس کی خدمت کی تو ایک روز بولا۔

''ارے عقل کے اندھے۔ مانگا بھی تو کیا مانگا تو نے۔ بھگوان کے درشن مانگتا۔

یہ نہیں تو سونا بنانے کی ودیا مانگتا۔ اس سے تو یہی تھا کہ سندرتا بھری ناری پانے کی کوشش

کرتا۔ ناری میں بڑی شکتی ہے۔ اگر کچھ بننا ہو تو محبوب بنو۔ عاشق نہ بنو۔ مگن ناری مانگی تو

کیا مانگا۔ چنے آپ کو بھسم کرلو گے تو کیا ہوگا؟ اچھا اب جو مانگا ہے وہی پا جاؤ گے۔''

میں حیرت سے حاجی صاحب کی بات سن رہا تھا۔

''بس تو میں بھائی ہم نے وہ مرہم بڑی محنت سے تیار کیا۔ اس مرہم کی خاصیت

یہ تھی کہ ایک ایک سلائی آنکھ میں لگاؤ جس عورت کی آنکھوں سے آنکھیں ملاؤ۔ وہ

تمہارے پیچھے چلی پڑے گی۔ تمہاری گرویدہ ہو جائے گی۔''

''اچھا۔ تو پھر آپ نے وہ مرہم آزمائی۔'' میں نے پوچھا۔

''صرف ایک بار۔'' وہ بولے۔

''اس کا اثر ہوا؟''

''ہاں۔ اس قدر اثر ہوا۔ اس قدر اثر ہوا کہ ______'' وہ رک گئے۔

''شام کا وقت تھا۔ بمبئی کا موسم بڑا خوشگوار تھا۔ وہ مرہم لگا کر ہم چوپاٹی کے ساحل پر بیٹھے تھے اس وقت ساحل کے باغیچے میں بنچ پر ایک پارسی خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت خوبصورت تھی۔ اگرچہ نوجوان نہ تھی۔ ہم اس کے پاس جا بیٹھے اور اس تاک میں رہے کہ کب وہ ادھر دیکھے اور اس سے آنکھیں چار ہوں۔

جب آنکھیں ملیں تو وہ گویا ہمیں دیکھ کر جیسے ٹھٹھک سی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ ٹکٹکی باندھ کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک تو ہمیں اس کا بہت لطف آیا۔ لیکن پھر ہم گھبرا گئے۔

''گھبرانے کی کیا بات تھی۔'' علی نے پوچھا۔

''بھئی۔'' وہ بولے ''یا وہ نگاہیں جمائے رکھنے والی عورت۔ وہ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیدہ دلیری سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جا رہی تھی۔ نہ اس کی نگاہ میں شرم تھی نہ جھجک۔ اور پھر اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ سچ پوچھو تو اس وقت اس میں ذرہ بھر نسائیت نہ رہی تھی۔''

علی بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

''بہت جلد ہم اس سے تنگ آگئے۔'' انہوں نے پھر بات شروع کی۔ ''پھر ہم نے دیکھا کہ ایک اور عورت سڑک پر چل رہی ہے۔ ہم نے اس سے آنکھیں ملائیں تو وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اب وہ کھڑی ہماری طرف دیکھ رہی ہے۔ اسی طرح آدھ گھنٹے میں ہمارے گرد تین عورتیں کھڑی ہو گئیں۔ اس پر آنے جانے والوں نے مشکوک نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک سپاہی آ گیا۔ اس کے روبرو ہم تو گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ لیکن وہ اسی طرح ٹکٹکی باندھ کر ہماری طرف دیکھتی رہیں۔ اس نے تحقیقات شروع کر دی اور ہم وہاں سے کھسک آئے۔''

''پھر اس رات ہم تھیٹر دیکھنے چلے گئے۔ ہمارے آگے صوفے پر دو لڑکیاں بیٹھی

تھیں۔ جب وقت آیا تو ان دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ ہم پہلے ہی تاک میں بیٹھے تھے۔ ہم نے خوب آنکھیں چار کیں۔ اگلی وہی حالت ہوئی۔ اب وہ مستقل طور پر منہ موڑ کر بیٹھ گئیں۔ کھیل شروع ہو گیا لیکن وہ اسی طرح سٹیج کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی رہیں۔ ان کے والدین نے بڑی کوشش کی کہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھیں لیکن لڑکیوں نے ان کی بات کی کوئی پروا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ہنگامہ ہو گیا اور ہم وہاں سے بھی بھاگے۔

"عجیب مرہم تھا وہ۔" علی بولا۔

"ہم نے تو یہ محسوس کیا کہ جس کی طرف ہم دیکھتے تھے اس کی روح گویا شل ہو جاتی تھی اور خالی جسم رہ جاتا اور پھر اس جسم سے خوف آنے لگتا۔ نسائیت تو گویا ختم ہو جاتی۔ یعنی گلاب کے بجائے مردہ کا پھول رہ جاتا جس میں نہ بو ہوتی نہ باس۔ یہ دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ طلب میں اتنی کہ یوں نہ لگی طلب پیدا کریں جہاں حصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خالی طلب بس وہ ــ طبیعت نے پلٹا کھایا اور سب کچھ چھوڑ دیا ___ سب کچھ کاروبار، شوق، تماش، سب کچھ۔"

کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو رہے پھر بولے۔

"علی صاحب یہ تو سب جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہیں اپنی طرف بلا لیتے ہیں۔ ہم پر بھی کرم کر دیا انہوں نے۔ ان کی کرم نوازیاں ہیں۔" وہ خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد بولنے لگے۔

"آپ علی صاحب آپ کو اللہ کے بندوں سے ملائیں۔ ہمارے پاس اور کیا ہے۔ بس حاضر تو فقط وہ بات ہے۔"

"جی اچھا۔" علی نے جواب دیا۔

عربی ماسٹر

___ "تو کن سے ملیں گے آپ عقل والوں سے یا دل والوں سے یہ دل

تو اللہ کے بندوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک سے ایک انوکھا ہے۔ ایک سے ایک نرالا ہے۔ اس پر خدا کا ہمیشہ کرم رہا ہے۔ اس شہر سے بہت لگاؤ ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کے لئے خزانوں کے منہ کھول رکھے ہیں۔ جس کی جتنی ہمت ہو اٹھا لے۔ بھائی ہم تو ابھی مبتدی ہیں اس مکتب میں ابھی الف کے چکر سے نہیں نکلے ہیں تو بتائیے عالم سے ملیں گے یا۔۔۔۔۔۔؟"

"جی۔ عالم سے ملائیے۔" ایلی نے جواب دیا۔ ایلی ابھی عقل کے چکر سے نہیں نکل پایا تھا۔ ابھی اسے معلوم نہ تھا کہ دل کسے کہتے ہیں۔ اس کی دانست میں انسان کی نفسیات میں صرف دو چیزیں اہم تھیں۔ عقل ذہن۔ ایلی کو یہ علم نہ تھا کہ دل کسے کہتے ہیں۔ قلب کیا ہے۔ اور روح کس بلا کا نام ہے۔

چوبارے پر چڑھتے ہوئے حاجی صاحب کہنے لگے۔ "جن صاحب سے آپ کو ملانے جا رہا ہوں ان کا نام محمد حسین ہے۔ عمر بھر عربی پڑھاتے رہے ہیں۔ ماشاءاللہ۔"

"عربی ماسٹر!" ایلی کے ذہن میں حقارت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ عربی ماسٹر بھلا کیا عالم ہوگا۔ انہیں تو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ وہ عربی ماسٹروں سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ حلق کے نچلے پردوں سے بات کرتے۔ بار بار لاحول پڑھتے اور تہذیب جدید کی ہر بات پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں انگریزی زبان سے چڑ تھی۔ جسے انگریزی زبان سے چڑ ہو وہ کیا عالم ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ چپ چاپ حاجی صاحب کے پیچھے پیچھے زینہ چڑھنے لگا۔

ایک مختصر سی بیٹھک میں چاندنی کا فرش ہو رہا تھا۔ یہاں وہاں کئی ایک ضخیم کتابیں پڑی تھیں۔ ان کے درمیان چار ایک ڈیسک نما چوکیاں رکھی تھیں۔ ایک ایسی ہی چوکی کے پاس ایک دوہرے بدن کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سادہ کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ کھدر کا لمبا چغہ اور پاجامہ۔ سامنے چار ایک لوگ

بڑے احترام سے بیٹھے تھے۔

ماسٹر صاحب جملہ دونوں سے مخاطب تھے۔ وہ انھیں سمجھا رہے تھے کہ ہر چیز میں ہونا اور پھر وحدہ ہونا دونوں بیک وقت غیر از امکان نہیں۔

وہ بڑی روانی سے اردو بول رہے تھے۔ ایلی کے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ انگریزی کا کوئی لفظ استعمال کیے بغیر اپنا مفہوم واضح کر رہے تھے۔ ایلی غور سے ان کی بات سنتا رہا لیکن اسے خاک سمجھ نہ آیا۔ چونکہ وہ ان الفاظ اور اصطلاحات سے قطعی ناواقف تھا۔ البتہ ایلی پر محمد حسین کی شخصیت نے خاص اثر کیا۔ ان کی طبیعت میں سادگی تھی۔ ان کی باتیں جذبہ سے سرشار تھیں اور ان کا انداز دوستانہ تھا۔

جب وہ جزو اور کل کا مسئلہ سمجھا چکے تو سامعین نے جو پہلے ہی ڈر اور احترام سے جھکے بیٹھے تھے اجازت حاصل کی اور رخصت ہو گئے۔

اس وقت مولانا نے حاجی صاحب کو دیکھا۔ بڑی تعظیم سے انھیں ملے۔ ایلی سے شفقت بھرا مصافحہ کیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ ابھی چند ایک منٹ ہی ہوئے تھے کہ دو صاحب آ گئے۔ آتے ہی کہنے لگے۔

"مولانا۔ ایک مشکل درپیش ہے۔ امداد کے لیے حضور کی طرف رجوع کیا ہے۔"

"کہیے کہیے۔ مولانا نے بے تکلفی سے کہا۔

"گستاخی معاف۔" وہی صاحب بولے۔

"شوق سے پوچھو میاں۔ جو جی میں آئے پوچھو۔ جو جی میں آئے کہو۔ اگر ہماری دانست میں بات آ گئی۔ تو بیان کر دیں گے۔ صحت کے ضامن نہیں۔ اپنا اپنا خیال ہے۔ میاں اپنی اپنی رائے ہے۔ علم تو وہ سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں اور ہم تو ابھی بھی کنارے پر بیٹھے ہیں۔ علم کی تو ہوا بھی نہیں لگی۔ ہاں ہاں شوق سے کہو۔"

"سوال یہ ہے حضور مولانا کہ گو کا کیا ذائقہ ہے۔"

یک ساعت کے لیے مولانا نے سر جھکا لیا۔ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر سر اٹھا کر مسکرانے لگے۔ بولے۔

"میاں ہمارا مذہب کہ گُوں کے تین ذائقے ہوتے ہیں۔"

"تین ذائقے۔" میں حیرت سے مولانا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"پہلے اس میں مٹھاس ہوتی ہے۔ پھر وہ کھٹاس سے بھر جاتا ہے۔ اور بالآخر زہر بن جاتا ہے۔۔۔۔۔۔

یوں سمجھیے کہ ہمارے اندر اسی کی بنیادیں پائی ہیں۔ پہلی حالت میں اس پر مکھی بیٹھتی ہے اور مکھی ہمیشہ مٹھاس پر بیٹھتی ہے۔ نہ کھٹاس پڑتی ہے نہ چیونٹی منڈلاتی ہے نہ کوئی اور جانور تو خدا ہو کہ تیسری کی حالت میں وہ زہر ہو جاتا ہے۔"

اس پر واہ واہ سبحان اللہ کا شور مچ گیا۔

ابھی وہ دونوں صاحب جو گُوں کے ذائقے کے متعلق پوچھنے آئے تھے اجازت حاصل کر رہے تھے کہ چھ سات لوگ اور آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی ایک نیا مسئلہ پیش کر دیا۔

ان میں سے ایک صاحب کہنے لگے۔

"مولانا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اجمیر شریف کے گزشتہ عرس میں ہم آپ کو اجمیر شریف میں ملے تھے۔ اس روز جمعرات کا روز تھا۔ آپ ہمیں اس حجرے میں لے گئے تھے۔ جہاں آپ ٹھہرے ہوئے تھے اور شاید آپ کو یاد ہو کہ آپ نے ہمیں مسئلہ ارتقاء سمجھایا تھا۔"

"شاید۔ مولانا بولے۔ ہمیں یاد نہیں۔ خیر آپ بات کہیے۔"

اس کے بعد ایک اور صاحب بولے۔ کہنے لگے۔

"مولانا۔ عرس کے روز ہم دلی میں آپ سے ملے تھے۔ اسی ویران خانے میں۔ بلکہ باتوں باتوں میں آپ نے اجمیر شریف کا ذکر کیا تھا۔"

"اب سوال یہ ہے کہ۔" ایک اور صاحب کہنے لگے۔ "کیا یہ ممکن ہے مولانا کہ ایک شخص بیک وقت دو مختلف مقامات پر موجود ہو۔ اگر یہ ممکن ہے تو یہ فرمایئے کہ ایسے صاحب کا روحانی طور پر کیا مرتبہ ہوگا۔"

مولانا ہنسنے لگے۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد بولے۔ روحانی طور پر اچھے مرتبے اور مقام والے صاحب کے لیے عین ممکن ہے کہ وہ بیک وقت دو مختلف مقامات پر موجود ہوں۔ سبحان اللہ۔ کیا مرتبہ ہے۔ وہ رک گئے۔

"آخر عربی ماسٹر ہے نا۔" علی نے سوچا۔ خود ستائی سے کیسے بچ سکتا تھا۔"

کچھ توقف کے بعد مولانا نے کہا "جناب عالی، ایک شرط لازم ہے اس سلسلے میں، وہ یہ کہ بیک وقت دو مقامات پر حاضر ہونے والے صاحب کو یہ احساس ہو کہ وہ بیک وقت دو مقامات پر موجود ہے۔ اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں یہ شعور ہے کہ ہم اس روز روم میں موجود تھے اجمیر شریف کی حاضری کا ہمیں شعور ہے نہ احساس نہ علم لہٰذا مرتبے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

پچھلے دو آدمیوں نے اس پر شور مچا دیا۔ بولے "حضرت ہم نے تو بقائمی ہوش و حواس آپ کو وہاں دیکھا ہے۔ آپ سے ملاقات کی ہے آپ نے ہم سے گفتگو فرمائی ہے۔"

"بالکل بالکل۔ مولانا نے کہا۔ ہم آپ کی بات جھٹلاتے نہیں۔ یقیناً آپ درست فرماتے ہیں۔ آپ نے ضرور ہم سے ملاقات کی ہوگی۔"

"تو پھر۔ تو پھر۔ انہوں نے شور مچا دیا۔

"میاں۔" وہ بولے وہ قادر مطلق بہت بڑا شعبدہ باز ہے۔ اگر وہ چاہے کہ کوئی فرد دو جگہ موجود دکھائی دے تو یہ اس کی شعبدہ بازی ہے۔ جتنا اگر ہم از خود اپنی مرضی سے اور ارادے سے دو جگہوں پر موجود ہوتے اور ہمیں اس امر کا شعور ہوتا تو اور بات تھی۔ کیوں حاجی صاحب؟" انہوں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔

آپ۔"

احمد نے آداب عرض کیا اور اس کے پاس جا بیٹھا۔

"تشریف رکھئے نا۔" وہ ایلی سے لپٹ گئی۔

ایلی چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا۔

"یہ کون صاحب ہیں۔" اس نے احمد سے پوچھا۔

"یہ میرے بھائی ہیں۔ الیاس آصفی۔"

"ایلی صاحب۔" وہ بولی "میں نے آپ کی تصویر نہیں دیکھی ہے۔"

"یہ تو خود تصویر ہیں۔ ان کی تصویر کیا ہوگی۔" احمد بولا۔

"کیا مطلب۔"

"بولتے نہیں تصویر بن کر بیٹھے رہتے ہیں۔" احمد نے قہقہہ مارا۔

"جنہیں دیکھنا ہو وہ بولتے نہیں۔" ایلی نے بصد مشکل ایک بھڑکیلی بات کی۔

"ارے۔" وہ ہنسی "تو آپ دیکھتے ہیں۔"

"جی۔" ایلی نے بالی پر بھرپور نگاہ ڈالی۔

"دیکھنا تو اچھی چیز نہیں۔" وہ بولی۔ "خواہ مخواہ خطرہ مول لینا۔" وہ مسکرائی۔ "اس سے تو دکھنا کہیں اچھا ہے۔"

"تو ابھی آپ دیکھتی نہیں۔" احمد ہنسنے لگا۔

"ہمارا کیا ہے۔" اس نے ایک آہ بھری۔ "ہماری طرف سبھی دیکھتے ہیں اور کوئی بھی ہمیں نہیں دیکھتا۔ اپنی یہ حالت ہے کہ بات کہیں چھپتی نہیں۔"

"تو آپ ایک وقت دو جگہ ہوتی ہیں۔" ایلی نے کہا۔

وہ ہنسی۔ "ایک جگہ رہیں تو جیون کیسے کٹے۔ اور یہ جو روپ ہے یہ تو نقلی ہے۔"

"اور اصل چیز کسی میں باندھ کر رکھی ہے۔" احمد ہنسا۔

"نہیں۔" وہ بولی۔ "اصلی چیز خاک میں مل چکی ہے۔"

"خاک میں مل کر ہی تو سونا بنتا ہے۔" ایلی نے ایک درشنی فقرہ چست کیا۔

"بنتا ہوگا۔ ہم تو مٹی بن کر رہ گئے۔"

"اے تو بیٹھی کیا کر رہی ہے پگلی۔" اس کی ماں نے غصے سے ادھر دیکھا۔ "اٹھ اب تیار ہو۔"

"بیٹھ لینے دے ماں۔" وہ بولی "بیٹھ لینے دے کچھ دیر اور۔ ساری عمر تیار ہی ہونا ہے نا۔"

چٹی کے انداز کو دیکھ کر ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ ادا چٹی کا بھیس بنا کر بیٹھے ہوں۔ یہ بولی حقیقت سے کس قدر قریب ہے۔ ویسے دیکھنے میں کس قدر دور۔ یہ حقیقت کیا چیز تھی۔ اسے یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن اس کے وجود کی شدت سے محسوس کرتا تھا۔ حقیقت ایلی کے لئے وہ مقام تھا جہاں سے ہر چیز اپنی تمام تر عریانی میں پورے طور پر دکھائی دیتی ہے۔

دیر تک وہ دونوں چٹی کے پاس بیٹھے رہے۔ احمد کو نہ جانے کیا سوجھی وہ اٹھ کر بہت سے چلغوزے لے آیا اور وہ تینوں بچوں کی طرح چلغوزے کھاتے رہے۔ احمد نے بہت سے چلغوزوں کے مغز نکال کر چٹی کو پیش کیے۔

"اونہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "خود توڑ کر کھانے میں مزہ ہے احمد۔ مغز دو مجھے چلغوزے کھانے کا سارا رومان ختم ہو جاتا ہے۔"

"آپ کو رومان سے دلچسپی ہے کیا۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن ہمارے لئے رومان کچھ اور چیز ہے۔ یہ رومان نہیں۔ اس کی حقیقت ہم پر اس حد تک آشکار ہو چکی ہے کہ کسی گنتی شمار میں ہی نہیں رہا۔"

"ہمیں بھی پتہ چلے۔" ایلی بولا۔

"اونہوں۔" وہ مسکرائی "چلا بھی جائے تو بھی نہ چلے گا۔ آپ کی دنیا اور ہے ہماری اور۔ آپ دیکھتے ہیں اور ہم پر دکھنا لازم ہے۔ رہا دیکھنا تو میں دیکھ دیکھ کر اکتا

گئی ہوں۔ پھر بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ آنکھیں بند کرلوں پھر بھی دکھتا ہے۔"

اس کی بات سن کر ایلی خاموش ہو گیا۔ اسے کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی۔

"وہ دھن ایسے ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "مکھ موڑ مسکات جات۔"

اور وہ گانے لگی۔ دفعتاً اس کے چہرے کا عالم ہی بدل گیا۔ پہلے اس پر بے نیازی کی دبیز تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ جمال اور بے نیازی جس میں تصنع نہ تھا لیکن جونہی اس نے آہستہ آواز میں گانا شروع کیا بے نیازی ختم ہو گئی۔ ایک بھرپور تڑپ ایک دلفریبی جیسے دفعتاً محبوبیت کی وہ کیفیت ختم ہو گئی ہو۔ جو خود بخود بلا جدوجہد بغیر خواہش اور کوشش کے چھائے ہوئے تھی۔ اب وہ محبوبیت پیدا کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ دونوں کیفیات میں کتنا فرق تھا۔ پہلے وہ خداداد جیتی تھی۔ بے نیاز لاشعوری محبوبیت سے سرشار۔ اب نہ جانے کیا بن گیا تھی۔ گویا وہ قوی خواہش بذات خود محبوبیت کی کاٹ تھی۔

مہارانی

علی پور جاتے ہوئے راستے میں ایلی دلی کے تاثرات میں سرشار رہا لیکن علی پور پہنچ کر جب وہ پہلے روز شہزاد سے ملا تو وہ تاثرات سب کے سب یوں کافور ہو گئے جیسے صبح کی دھند سورج کی شعاعوں سے صابون کے بلبلوں کی طرح اڑ جاتی ہے۔

"ہمارے مرشد جی کسی کے مرید بن آئے تو اب ہمارا کیا ہوگا۔" شہزاد نے کہا "ہماری تو کوئی حیثیت ہی نہ رہی نا۔" وہ ہنسنے لگی۔

"تم مہارانی ہو۔" وہ بولا "اور مہارانی مہارانی ہی ہوتی ہے۔"

"جب مہاراج ہی بھگشو ہو جائیں تو مہارانی کہاں رہی۔"

"جسے تم ساحر سمجھتی ہو وہ بھلا بھگشو کیوں بنے۔ بھگشو تو وہ بنتا ہے جس کے ہاتھ پلے کچھ نہ ہو۔"

"ہاں تو پھر حاجی صاحب نے کیا کہا۔ مجھے سب کچھ بتاؤ نا۔" شہزاد اس کے

قریب تر ہو گئی۔

حاجی صاحب نے کہا۔ "اس کا مرشد بہت زبردست ہے۔ اس کو سنبھالنا اپنے بس کا روگ نہیں۔"

"جی۔"

"تمہاری قسمت۔۔۔ بابا جتنا! حاجی چاہے کچھ بھی ہے لیکن صاحب نظر ضرور ہے۔"

"۔۔۔ یہ ہوتا ہے۔ صاحب نظر۔"

"اس نے مجھے دیکھ کر تمہاری طاقتوں کا اندازہ لگا لیا۔ مجھ میں تمہارا پرتو دیکھ لیا۔"

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ شہزاد کو سب کچھ بتا دے۔۔۔ وہ پیغام جو حاجی صاحب نے اس کو دیا تھا ـــــــ "ہو کے رہے گا۔" ایلی کے دل میں کوئی چلا رہا تھا۔ "ہو کے رہے گا۔" اس کی زبان پر بار بار آتا تھا لیکن نہ جانے کیوں۔۔۔ نہیں چاہتا تھا کہ شہزاد کو اس راز سے آگاہ کرے۔ شاید اسے یہ خوف دامن گیر تھا کہ شہزاد اسے رد کر دے گی۔ جیسے وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی۔ بہرصورت اس نے بات پھر سے چھیڑی۔ بولا۔

"شہزاد ایک بات کہوں۔"

"کہو۔" وہ بولی۔

"اس طرح کیسے زندگی بسر ہوگی۔"

"کس طرح۔" اس نے پوچھا۔

"اس طرح چھپ چھپ کر ملنے سے انجام کیا ہوگا۔"

"انجام تو ہو چکا۔" وہ بولی۔ "میں نے تمہیں کھو کر پا لیا۔"

"لیکن میں نے تو تمہیں نہیں پایا۔"

"تم نے کھویا ہی نہیں تھا۔ پھر پانے کا کیا سوال ہے۔"

"نہیں شہزاد۔ ہماری زندگی ایک ڈھونگ ہے۔ ایک مسلسل جھوٹ۔ فریب۔

ہم دوسروں کو دھوکا نہیں دے رہے۔ خود کو دھوکا دے رہے ہیں۔ خود فریب کھا رہے ہیں۔"

"فریب ہی سہی۔" وہ بولی۔ "مجھے یہ فریب کھانے ہی دو۔ تمام زندگی بیت گئی ہے اب باقی رہا کیا ہے۔"

"نہیں شہزادی۔" وہ بولا۔ "چلو کہیں چلے جائیں۔ اب بھی وقت ہے۔"

"میری طرف دیکھو۔" وہ بولی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا ہے؟"

"دیکھا۔" وہ بولی "کیا اب بھی یقین نہیں۔ میں چھ بچوں کی ماں ہوں۔ چھ بچوں کی۔"

"تو پھر؟"

"اپنی زندگی تو میں نے تباہ کر لی۔ اب تمہاری زندگی تباہ کیسے کروں۔"

"اس طرح تو بہت آباد ہے۔" وہ بولا۔

"تم شادی کر لو جی۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو۔"

"ہاں۔" وہ بولی۔ "میں یہ بخوشی برداشت کر لوں گی۔"

"تو پھر بات کیا ہوئی۔"

"بس تم مجھ سے الگ نہ ہونا۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔"

"نہیں شہزادی۔" وہ بولا۔ "یہ ہو کے رہے گا۔"

"کیا ہو کے رہے گا۔"

"ہم ایک دوسرے کے ہو کے رہیں گے۔"

"وہ تو ہم ہیں ہی۔" وہ بولی۔

"علانیہ ہو کے رہیں گے۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ "ملا جی ہی تو ہیں۔ سبھی جانتے ہیں۔ خود شریف جتاتا ہے۔"

"شریف جتاتا ہے۔" ایلی نے دہرایا۔

"ہاں۔ وہ صفدر کے متعلق مجھے طعنے دیتا تھا تو میں نے صاف کہہ دیا۔ میں نے کہا طعنہ دینا ہے مجھے تو ایلی کا دو۔ اس شرابی اور کمینے کا طعنہ نہ دو۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں تمہاری ہو چکی ہوں۔ صاف بتا دیا۔"

"اور وہ؟"

"وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔" وہ بولی۔ "کوئی بات نہیں کی۔ مجھے معلوم نہیں ایلی کہ میں کیسے تمہاری ہو چکی ہوں۔ صاف بتا دیا۔"

"اور وہ؟"

"وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔" وہ بولی۔ "کوئی بات نہیں کی۔ مجھے خود معلوم نہیں ایلی کہ میں کیسے تمہاری ہو گئی۔ تمہارے پاس دھن نہیں۔ دولت نہیں۔ خوب صورتی نہیں۔"

"خوب صورت تو میں ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"آئینہ دیکھو جا کے۔ نہ تم بچے ہو نہ جوان ہو۔ نہ جانے کیا ہو تم۔ مجھے جسمانی ہوس نہیں تم سے۔ کچھ بھی نہیں پھر بھی تمہاری ہو چکی ہوں ــــ پتہ نہیں کیوں۔ حالانکہ تمہیں مجھ پر اعتماد بھی کبھی نہیں ہوا۔ تم ہمیشہ شک سے دیکھتے رہے۔ ــــ پھر بھی ــــ" اس کی ہچکی نکل گئی۔

ایلی نے شدت سے محسوس کیا جیسے شہزاد پہیلی ہی ہو۔ جس نے کہا تھا "سب ہمیں دیکھتے ہیں لیکن دیکھتا کوئی بھی نہیں" شہزاد کو محلے کے سب جوان بوڑھے دیکھتے تھے۔ لیکن شاید اسے کوئی نہ دیکھ سکا تھا۔ وہ بھی پہیلی کی طرح ہر وقت موجود رہتی تھی۔ قریب ہو کر دور رہتی۔ دور ہوتے ہوئے اس قدر قریب آ جاتی۔

جمیل نے آتے ہی شور مچا دیا۔

"تو علی صاحب ڈیرہ میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ کاش کہ میں بھی ڈیرہ میں ہوتا۔ مگر کچھ پروا نہیں۔ خان پور سے کچھ زیادہ دور نہیں۔"

علی ہنسنے لگا۔ "یہ تو الٹا اچھا ہے۔"

"سب معلوم ہو جائے گا۔" جمیل چلانے لگا۔ "وہ چھچھ ہوگا وہ چھچھ ہوگا۔ برخوردار کہ سمجھ میں آ جائے گا تم کو۔ یہ درانی خان بنا پھرتا ہے۔ عزت دار گردانا جاتا ہے۔ ورنہ ہم کو لوگ رذیل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ تو ہم سب کا پیر مرشد ہے۔ لیکن یہ فریب دے رکھا ہے لوگوں کو کہ وہ تجھے باعزت سمجھتے ہیں۔ چھچھ بیٹا ____ تو بھی یاد کرے گا۔"

علی نے حیرت سے جمیل کی طرف دیکھا۔ جمیل نے تو اس سے کبھی ایسی باتیں نہ کی تھیں۔

"ارے۔" دفعتاً اسے خیال آیا۔ "تو نے تو زبان لی ہوئی ہے۔ یار نے پی رکھی ہے۔"

"ہاں پی رکھی ہے۔" جمیل بولا۔ "پھر تمہیں کیا تکلیف ہے سالے۔ لوگوں کو کیا تکلیف ہے۔ ہم جو جی چاہے کریں۔ کوئی ہے سالا جو پوچھنے کی جرات رکھتا ہو۔"

شام کو سیر کے بہانے جمیل اسے شہر لے گیا۔ علی چونکہ خود رو تھا۔ وہ شہر سے واقف نہ تھا۔ بہرحال جمیل کے ساتھ ساتھ چلا گیا۔

"ارے۔" دفعتاً علی چونکا۔ شہر کے لڑکے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ "ارے دیکھو وہ ماسٹر جی جا رہے ہیں ____" ایک ساعت کے لیے وہ چونکا۔ پھر اپنی طبعی بے نیازی کی وجہ سے سب بھول گیا۔ دفعتاً اس نے دیکھا کہ وہ چکلے میں کھڑا ہے۔

"ارے۔" وہ چلایا۔ "یہ کہاں لے آئے ہو مجھے۔"

"ابھی دیکھنا۔" جمیل بولا۔ "آج ڈیرے کے بچے بچے کو پتہ چل جائے گا کہ تو شریف اور رنڈی باز ہے اور کل وہ سکول میں تیرا مذاق اڑائیں گے۔ ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگا۔

پھر جمیل اسے باری باری چوبارے پر لے گیا اور بڑے اہتمام سے اس نے بیبیوں سے اس کا تعارف کرایا

"یہ ایلی آصفی ہے۔ میرا بھائی ہے۔ اور یہاں گورنمنٹ سکول میں ماسٹر ہے۔"

وہ سب کی سب جمیل کے ڈیرے سے تبادلے پر افسوس کا اظہار کرتیں تو وہ چلا کر کہتا۔

"یہ ایلی جو یہاں ہے۔ بس سمجھو میں یہاں ہوں۔ میری جگہ یہ حاضری دیا کرے گا۔ کوئی کام ہو سیدھی سکول چلی جانا اور ایلی آصفی کا پوچھنا۔"

ایلی سخت گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا مگر جمیل کے سامنے بے بس تھا۔

آخر کار جمیل ایلی کو لے کر ایک چوبارے میں جا پہنچا۔

"یہ گھر میرا خاص گھر ہے۔" وہ بولا۔

"ان کے مجھ سے پرانے مراسم ہیں۔ آؤ تمہیں ملاؤں۔ ہاں بھئی حساب سے کھڑی ہو جاؤ۔

یہ ہے سب سے بڑی بہو۔ اور یہ منجھلی گوری اور یہ چھوٹی بہو۔ بیٹھ جاؤ۔ اب سب بیٹھ جاؤ۔"

وہ تینوں بیٹھ گئیں۔

اتنے میں باہر سے کسی نے آواز دی اور دو خوش پوش پٹھان داخل ہوئے۔

"ارے بھئی۔"

جمیل انہیں دیکھ کر چلایا۔ "گاہک خود بخود منہ اٹھائے چلے آرہے ہیں۔"

تو ودود نے تینوں جنوں کی طرف دیکھا۔

بوڑھی عورت کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ "آپ کچھ دیر کے بعد آ جائیں۔ ان کے جانے کے بعد۔" اس نے دروازہ بند کر دیا اور واپس اپنی جگہ آ بیٹھی۔

"ہاں تو" جمیل بولا "ان کی صفات سنو۔ یہ خوشبو مرہم ہے۔ یہی مرہم جو ہر قسم کی جلن دور کرتی ہے۔ پھوڑا ہو، پھنسی ہو، غم، فکر ہو، آتشک ہو۔ روپے پیسے کا نقصان ہو جائے۔ پریشانی ہو۔ کچھ ہو۔ اس کے پاس آ جاؤ۔ یہ پچکار کے سب غم دور کیوں بولو۔"

میں نے بوا کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ خود دکھ بھری بوتل ہو۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ آنکھیں نمناک تھیں۔

"اور یہ دیکھو دوری یہ گوری نہیں گورا ہے۔ تم نے بھی گورے دیکھے ہیں۔ بس یہ سمجھو کہ یہ ملکی فوج کا گورا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھو نیلی ہیں اور یہ ہر وقت مسکاتی ہے ہر وقت بارش ہو دھوپ ہو رہی ہو۔ اس بوتل سے میٹھے چھینٹے نکلتے ہیں۔ یہ تمہیں ہنسا سکتی ہے۔ بچپن کر تم سے کھیلے گی۔ ہنسے گی۔ ہنسائے گی۔ دکھ دور نہیں کر سکتی لیکن ہنسا سکتی ہے۔ کھلا سکتی ہے۔ یہ تو گورے کی طرح حرامی مگر ساتھ چلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کچھ دیر کی ساتھی۔

"اور یہ بوا" اس نے چھوٹی کی طرف دیکھ کر کہا "بس دیکھو اسے۔ یہ تو خاص پٹاخہ ہے۔ ان چاہا پٹاخہ۔ نہ کوئی اسے چلا سکتا ہے نہ کوئی اس سے کھیل سکتا ہے۔ اگر ضرورت ہے یہ کرنا ہو۔ آزادی تنگی حاصل کرنی ہو۔ اگر اطمینان کھونا ہو۔ اگر طوفان کے جھکولے دیکھنے ہوں تو اس سے آ ملو۔ یہ ایک ہنگامہ ہے۔ بارود ہے پھلجھڑی پوٹاش ہے۔"

"اور یہ میرا اپنا گھر ہے۔ یہاں میں دو سال گزارے ہیں دو سال۔ اب یہ تمہارا گھر ہے بچے اور اگر تم نے یہاں باقاعدہ حاضری نہ دی تو مجھ سے برا کوئی نہ

ہوگا۔"

اگلے روز جب یہ سوال کیا تو اس کی طرف انگلیاں اٹھ رہی تھیں۔ لڑکے اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح ان لڑکوں کو کنٹرول کرے گا۔ کس طرح ان کے سامنے استاد کی حیثیت سے کھڑا ہوگا۔ لیکن اس معاملے میں اسے اپنے آپ پر اعتماد تھا۔ اس نے کبھی رسمی استادوں کی طرح بچوں سے سلوک نہ کیا تھا۔ اس نے کبھی رسمی طور پر سبق نہ پڑھایا تھا۔ اس کی باتیں سن کر لڑکے تعجب سے اس کی طرف دیکھتے جیسے انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ مسکرانا شروع کر دیتے اور بالآخر اس کے دوست بن جاتے۔ خاص طور پر وہ شیطان لڑکے جنہیں کنٹرول کرنا مشکل سمجھا جاتا تھا۔

نویں جماعت میں داخل ہو کر اس نے پہلے ہی سبق میں چٹکلے کے موضوع پر اظہار خیال شروع کر دیا تا کہ بچوں کے دل کی بات چھوڑ نہ بن جائے۔

ڈیرہ میں وہ واحد شخصیت جس نے ایلی کو متاثر کیا، غلام کی تھی۔ اس کا نام غلام علی تھا لیکن سبھی اسے غلام کہتے تھے بلکہ وہ خود اس بات پر مصر ہوتا کہ اسے غلام کہا جائے۔ وہ کہا کرتا۔

"بھئی گھر والوں نے مجھ پر زیادتی کی ہے کہ علی کی غلامی کا اعزاز بخش دیا۔ اس اعزاز کا میں اہل نہیں۔ اتنی عظیم شخصیت کی غلامی ____ نہ بھئی میں تو اللہ کے ہر بندے کا غلام ہوں۔ آپ کا۔ ان کا۔ سب کا۔"

غلام کا رنگ گورا تھا۔ جسم بھرا بھرا اور خدوخال میں جاذبیت تھی۔ اس کی آنکھیں بے حد پرکشش تھیں۔ ان کا رنگ شربتی تھا۔ اور ان میں شرارت یوں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ اس معزز چہرے پر ان آنکھوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان میں ہر وقت سوڈے کی بوتلیں چھلکتی نظر آتی تھیں۔ ایک عجیب سی پھوار پڑتی اور دیکھنے والوں کو فرحت سے بھگو دیتی۔

غادہ کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا کہ وہ نظر بھر کر راہ چلتی ہوئی خاتون کو دیکھے گا تو وہ مجبور ہو کر اس کے پیچھے چل پڑے گی۔ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اس کے قدموں میں آ گرے گی۔ لیکن عام عورت کو دیکھ کر نگاہیں جھکا لیتا تھا اور اکثر وہ اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ نظر بھر کر کسی عورت کو دیکھ نہ لے۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس کیا جیسے اس نے دلی والے حاجی صاحب کی بنائی ہوئی مرہم کی دو سلائیاں آنکھوں میں لگا رکھی ہوں۔

غادہ

غادہ سے پہلی کی ملاقات الطاف اور اسد کی وساطت سے ہوئی تھی۔

عارف ان لوگوں میں سے تھا جو نو وارد سے تعلقات پیدا کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔

اور بے تکلف سے کھانے کی دعوت دینے کے مشتاق۔

عارف کی دعوت اس کے چھوٹے بھائی ارشد نے دی۔ ارشد نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ تین بھائی تھے۔ الطاف، اسد اور ارشد۔ اسد سکول سے تحصیل کر چکا تھا اور اب لاہور کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ ارشد کی بات سن کر ایلی نے ٹال دیا۔ کہنے لگا۔

"بھئی۔ ہم تمہارے بڑے بھائی سے واقف نہیں۔ ان سے جا کر کہنا کہ ناواقفوں کو کھانا کھلانا اچھا نہیں ہوتا۔"

شام کو عارف خود آ گیا۔

"السلام علیکم۔" وہ بولا میرا نام الطاف ہے۔ میں ارشد کا بڑا بھائی ہوں۔ مجھے اب تو ہماری واقفیت ہو گئی۔ اب چلیے گھر۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

عارف کی معصومیت اور سادگی سے ایلی بے حد متاثر ہوا۔

اسی روز کھانے پر جب الطاف کو معلوم ہوا کہ ایلی کورٹ سے دن چھٹی ہے تو وہ

بولا چلیے آپ کو اپنے ایک دوست سے ملاؤں۔ اسے موسیقی سے دلچسپی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے منجھلے بھائی اسد کو اشارہ کیا اور وہ گوندھے ہوئے آٹے کا گولا اچھالتا ہوا ان کے ساتھ چل پڑا۔ جتنا ہی الطاف سادہ طبیعت تھا اتنا ہی اسد پھکڑ کیسا تھا۔

وہ یوں بات کرتا جیسے ابھی ابھی ولایت سے تحصیل علم کر کے آیا ہو۔ بہرحال اسد کی نسبت میں کو اس آٹے کے گولے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک انگلینڈ ریٹرنڈ خوبصورت جوان جس نے ایک اچھا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا وہ آٹے کے گولے سے یوں کھیل رہا تھا۔ اور یوں بسر غلام۔

جب وہ غلام کے گھر پہنچے تو ایک بچے نے دروازہ کھولا۔ اور بیٹھک کی طرف اشارہ کر کے چلا گیا۔ بیٹھک میں میز پر چند ایک کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ دو کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف بستر لگا ہوا تھا۔ دوسری طرف فرش بچھا ہوا تھا اور فرش کے ایک کونے پر جائے نماز پر غلام نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ جائے نماز کے قریب ہی ایک ستار رکھی ہوئی تھی۔

وہ سب چپ چاپ بیٹھ گئے۔ الطاف نے ایک رسالہ اٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگا۔ اسد نے کونے سے ایک گٹھڑی اٹھائی۔ اسے کھولا تو اس میں سے طبلے کی جوڑی نکل آئی۔ پھر اس نے آٹے کے گولے کو جو وہ ساتھ لایا تھا توڑ کر اس پر لگانا شروع کر دیا۔ میں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ہوں تو یہ آٹے کا گولا طبلے پر لگایا جاتا ہے۔

غلام نے سلام پھیرا اور پھر کسی سے کچھ کہے بغیر سلام پھیرا اور پھر کسی سے بات کیے بغیر سلام علیکم کیے بغیر ستار اٹھائی اور اسے بجانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مدھم سے میں اسد نے طبلہ بجانا شروع کر دیا۔

وہ خاموش بیٹھے تھے۔ ستار گویا کراہ رہی تھی۔ اور طبلے کی تھاپ دل میں اتر رہی تھی۔ میں یہ بھول گیا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ کون ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ کوئی

دس منٹ کے بعد دفعتاً دھن دھن کی آواز آئی اور ساز ختم ہو گیا۔ غلام محمد اٹھ بیٹھا۔

"معاف کیجیے۔" وہ علی سے مخاطب ہو کر بولا "میں نماز میں مصروف تھا۔ آپ کو انتظار کی زحمت کرنی پڑی۔"

"لیکن آپ تو ستار بجا رہے تھے۔" علی بولا۔

"نہیں تو۔" غلام بولا "میں تو نماز کے بعد دعا مانگ رہا تھا۔"

"دعا مانگ رہے تھے۔" علی نے دہرایا۔

"جی۔" غلام نے کہا۔ "دعا زبان سے نہیں مانگی جاتی۔ دل کے تاروں کی لرزشوں سے مانگی جاتی ہے۔"

"اور یہ ستار غلام کا دل ہے۔" احمد نے ہنس کر کہا۔

"بس یہی ہے۔" غلام بولا "میری ساری کائنات یہ ستار ہے۔ اسی سے نماز پڑھتا ہوں۔ اسی سے دعا مانگتا ہوں۔ یہی بھگتی ہے۔ یہی دھیان ہے۔"

سوڈے کی دو بوتلیں کھلیں۔ رنگ پچکاری کی پھوار پڑی۔ پنگھٹ چھوٹ کر پاس آ گیا۔

گوپیوں کی قطاریں رقص کرنے لگیں۔ دور کنہیا کی مرلی کی مدھم سریں گونج رہی تھیں۔ ایک ساعت کے لئے علی بھونچکا رہ گیا۔

ارے۔ یہ کیا چیز ہے۔ یہ نمازیں یہ دعائیں یہ لرزشیں اور یہ نگاہ۔ بس ایک ساعت میں نہ جانے کیا کر دیا۔ علی غلام کا غلام بن گیا۔ اس کے بعد علی کا دستور ہو گیا۔ سکول سے فارغ ہونے کے بعد رات کا کھانا کھا کر وہ غلام کے پاس جا بیٹھتا۔ غلام جائے نماز پہ ستار بجاتا۔ علی اپنا سر گھٹنوں میں دبائے بیٹھا رہتا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے۔ بے مقصد آنسو۔ غم کے نہیں وفور جذبات کے آنسو۔ حتیٰ کہ عشا کی نماز کا وقت ہو جاتا۔ اور غلام اٹھ کر نماز پڑھنے لگتا اور علی گھر چلا آتا۔

رمز نوازی

چند ہی دنوں میں ایلی غلام کا بے تکلف دوست بن گیا بلکہ ایلی کو غلام سے محبت ہو گئی۔ غلام کی طبیعت میں بلا کی رنگینی تھی لیکن نہ جانے اس رنگینی کے دھارے کا رخ کدھر کو مڑ گیا تھا۔ اس رنگ پچکاری نے روپ بدل لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی طبیعت میں بلا کی سادگی تھی۔ سادگی اور عجز اور بے نیازی۔ ایلی محسوس کرتا تھا جیسے غلام دوستی کی ایک ایسی بوتل تھا جس میں سے شراب انڈیل کر آب زم زم بھر دیا تھا۔

ایک روز ایلی نے بے تکلفی سے پوچھا۔ "غلام تم غلام کیوں ہو؟"

غلام نے جواب دیا "میں لوگوں کا غلام بننا چاہتا ہوں۔ لیکن نہیں بن سکا۔ اپنا غلام نہیں بننا چاہتا لیکن ہوں اور ______"

"پھر غلام کیوں کہلواتے ہو۔"

"اس لئے کہ میں غلام ہوں۔ اپنے مرشد کا غلام ہوں۔"

"تو کیا تمہارا کوئی مرشد بھی ہے۔"

"ہاں ہے۔"

"میں تو تمہیں مرشد بنانا چاہتا تھا۔" ایلی نے کہا۔

"تو بنا لو۔ چاہے کسی کو بنا لو۔ مجھے بنا لو میرے حضرت صاحب کو بنا لو کسی پتھر کو بنا لو یا کسی ولی کو بنا لو لیکن بناؤ ضرور۔ بے مرشد جینا تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے بے پتوار کی ناؤ۔"

"جسے چاہوں بناؤں۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نشہ اندر سے نکلتا ہے اپنے اندر سے جتنا گڑ تمہارے اندر ہے اتنا میٹھا ہوگا۔ ہر صورت میں ہو جائے گا۔"

"کیا تم میں گڑ ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

تھی۔" وہ بولا "بہت تھا۔ بے اندازہ تھا لیکن میں نے تو سارا پیسہ بہوٹیوں کو کھلا دیا۔"

"ہوں۔" ایلی ہنسا۔ "تو تمہاری زندگی میں یہ بہوٹیاں تھیں۔"

"تھیں۔" وہ بولا "بھائی صاحب۔ یہ بہوٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میری زندگی داستان بے حد مختصر ہے۔ عورت شراب اور راگ۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ جس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھتا تھا وہ آپ ہی چلی آتی تھی۔ یوں چلی آتی تھی جیسے پتہ نہیں کس کے زیر اثر ہو۔ اور پھر اپنی عادت تھی کہ ہر روز نئی کو آنکھ بھر کر دیکھتا تھا حتیٰ کہ نشہ سا ہو گیا جاتا تھا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "میں نے تو اپنا سارا خزانہ ان بہوٹیوں کو کھلا دیا۔ اگر دس سال پہلے مرشد مل جاتے تو آج تک بہت بڑا ولی بنا ہوتا تمہاری قسم۔"

"اور اب؟" ایلی نے پوچھا۔

"اب تو کچھ ذرے رہ گئے تھے۔ سارا ہی لٹا بیٹھا تھا۔ حضرت اللہ کا اگر اس کا کرم نہ ہوتا تو ____ نہ جانے کیا ہوتا۔"

"خادم۔" ایلی نے پوچھا۔ "تم نے مرشد کی جستجو کی تھی کیا؟"

"نہیں۔" وہ بولا۔ "مجھے تو شعور بھی نہ تھا کہ مرشد کسے کہتے ہیں۔ کبھی اس زاویہ نگاہ سے دیکھا ہی نہ تھا۔ خیال بھی پیدا نہ ہوا تھا۔"

"تو پھر کیسے مل گیا؟" ایلی نے پوچھا۔

"بس اللہ نے دے دیا۔ بیٹھے بٹھائے دے دیا۔ ذرہ نوازی کر دی۔"

"آخر کس طرح۔" ایلی نے پوچھا۔

"یہ بھی ایک راز ہے۔" وہ بولا "اسے راز ہی رہنے دو۔ تم سے سن کر کیا کرو گے۔"

"مجھے تو اللہ پر اعتماد ہی نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"ہاں ہاں۔" اس نے ایک بھرپور نگاہ ایلی پر ڈالی۔ "تمہیں اعتماد نہیں ہے۔" ٹھیک تو ہے۔" اس نے ستار اٹھالی اور بجانے لگا۔

علی نے کچھ کہنا چاہا تو غلام نے ہاتھ کے اشارے سے چپ کر دیا۔

"باتیں کرنے سے کچھ نہیں ملتا۔" وہ بولا "سنو بس کان دھرو۔ پھر یہ بوند بوند دل میں ٹپکے گا اور ایک روز دل کی ناؤ جو ریت میں پھنسی ہوئی ہے ان بوندوں کے پانی میں بہہ نکلے گی۔ سنو۔" اور وہ مدھم آواز گانے لگا۔

میں چوہڑی سرکاردی ہاں میں چوہڑی

نورانی

ڈیرہ میں علی کی زندگی کا مرکز غلام بن گیا۔ غلام کی ستار نے توجہ نے علی پر ایک جادو کر دیا۔ اس کی تاروں کی لرزشوں نے علی کے دل میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ اس سے پہلے جب بھی اس کے دل میں جذبہ پیدا ہوتا تھا تو وہ فوراً شہزاد پر مرکوز ہو جاتا تھا اور وہ شہزاد کے تصور میں کھو کر رہ جاتا۔ لیکن غلام کی ستار نے گویا اسے شہزاد سے بے نیاز کر دیا۔ اب اس کے دل میں جذبہ پیدا ہوتا تھا لیکن وہ شہزاد پر مرکوز نہ ہوتا۔ اس کا کوئی بھی مرکز نہ ہوتا تھا۔ ایک انتہائی بے مرکز جذبہ جیسے دلتا اس کے دل کا سوتا سمندر بن گیا ہو۔ ایک بے نام غم بے کنار بحر۔ اس کے لئے یہ کیفیت بالکل نئی تھی۔

پھر ایک روز نورانی آ گیا۔

علی وہاں ایک عام مکان میں رہتا تھا۔ اس مکان میں دو کمرے ایک باورچی خانہ ایک غسل خانہ۔ ایک برآمدہ اور صحن تھا۔ ان کے علاوہ ایک تنگ سی بیٹھک تھی۔ علی کا سامان اس حد تک مختصر تھا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ ساری چیزیں سمٹ کر ایک کمرے میں آ گئی تھیں اور باقی سب کمرے خالی پڑے تھے۔

ایک روز دروازہ بجا اور ایک سیاہ فام فربہ قسم کا آدمی اندر داخل ہوا۔

"معاف کیجئے گا۔" وہ بولا۔ "میرا نام نورانی ہے اور میں محکمہ تعلیم میں اسسٹنٹ انسپکٹر ہوں۔ میرا تبادلہ یہاں ہو گیا لیکن ابھی مکان کا بندوبست نہیں ہوا۔ اگر آپ

اجازت دیں تو میں چند روز کے لئے آپ کی بیٹھک میں ٹھہر جاؤں۔ میں آپ کو کرایہ ادا کروں گا۔ اور جب بھی چاہیں گے بیٹھک خالی کر دوں گا۔"

ایلی نے غور سے اس لمبے تڑنگے آدمی کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ چہرے پر عجیب سی کرختگی تھی۔ ماتھے پر تیوری چڑھی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سی خوفناک کشش تھی۔ اور نام نورانی۔۔۔ سبحان اللہ کیا نورانیت ہے۔ ایلی نے سوچا۔

"بہت اچھا۔" ایلی نے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ فی الحال۔"

"شکریہ۔" نورانی نے کہا اور بے تکلفی سے اپنا سوٹ کیس اور بستر اٹھا کر بیٹھک میں گھس گیا۔

نورانی خاموش طبع آدمی تھا۔ سارا دن تو چپ چاپ بیٹھا کام میں مصروف رہتا اور یا وہ ہر دوسرے روز دورے پر چلا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کے لئے اس کی موجودگی نہ ہونے کے برابر رہی۔ وہ آپس میں کبھی کبھار بات کرتے تھے۔

"کہیے نورانی صاحب۔" ایلی اس کے پاس جا کھڑا ہوتا۔

"بس دیکھ لیجیے۔" وہ جواب دیتا اور بدستور کام میں مصروف رہتا۔

"آپ تو ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔"

"مصروف رہنا اچھا ہوتا ہے۔" وہ جواب دیتا۔

نورانی کے منہ پر کبھی تبسم نہ آیا تھا۔ قہقہہ مار کر ہنسنا تو گویا اس کی سرشت کے منافی تھا۔ ایک اور تعجب خیز بات تھی کہ نورانی دودھ بہت پیتا تھا۔ ہر وقت اس کی میز پر دودھ سے بھرا ہوا گلاس پڑا رہتا۔ کام کرتے کرتے وہ گلاس اٹھاتا۔ دو چار گھونٹ پی کر پھر رکھ دیتا۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنا دودھ پینے کے باوجود نورانی کے چہرے پر دودھ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چہرے کی کرختگی اور تناؤ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اور ماتھے کی تیوری یوں دکھائی دیتی تھی۔ جیسے لوہے میں مشین کی مدد سے لکیری کھود دی گئی ہو۔

ایک روز غلام آ گیا۔ اس وقت ایلی نورانی کے پاس کھڑا تھا۔ ایلی نے غلام کا

"ہاں۔ حب ہمارے خاندان میں صدیوں سے چلا آتا ہے۔ میں بھی شخصیہ استعمال کیا کرتا تھا۔"

"کیوں۔"

"تم تماش بینی کرتے ہیں۔"

"لیکن تمہارے چہرے پر تو دودھیا دھند ہے۔"

"یہ میرے سرکار قبلہ کی کرم نوازی ہے۔ ان کی دین ہے۔"

ایلی کے لئے سرکار قبلہ اور کرم نوازی ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ ہر موضوع پر بات کر سکتا تھا۔ لیکن سرکار قبلہ اور کرم نوازی پر پہنچ کر گویا اس کے پر جل جاتے اور پھر وہ ایک بے بس کیڑے کی طرح رینگتا۔ اس پر احساس کمتری کا منوں بوجھ پڑ جاتا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح اس مشکل سے مخلصی حاصل کرے۔ اس کا ذہن سرکار قبلہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اسے رد نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے حاجی صاحب آ کھڑے ہوتے۔ ان کا سر روئی کے گالے کی طرح ملتا۔ ان کی روشن آنکھیں چمکتیں۔

"وقت آئے گا۔ وہ مسکرا کر کہتے۔

پھر عربی مولوی کی کرخت آواز گونجتی۔

"اس شعبدہ بازی اور منطق کے تماشوں کی حد ہے کوئی۔ دم مارنے کی گنجائش بھی ہو۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسے۔

ایک روز بیٹھے بیٹھے ایلی نے غلام سے حاجی صاحب کا تذکرہ چھیڑ دیا اور شہزادہ کی بات چھوڑ کر باقی سب کہانی سنا دی۔

غلام مسکراتا رہا۔

جب ایلی بات ختم کر چکا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ ہاں وقت آئے گا۔ تمہارے ماتھے لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تمہیں سرکار قبلہ ملیں گے۔ ضرور ملیں گے۔ میں نے پہلے ہی

دن دیکھیا تھا۔ آؤ اب ان آنے والے حضور کا ذکر کریں۔"

اس نے ستار اٹھا لیا اور مدھم آواز میں گانے لگا۔

"اب ہونے کن دھو تین بھر مائے۔ اب ہونا ہے۔"

اس روز پہلی مرتبہ ایلی کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کوئی سرکار قبلہ اس کی زندگی کو بھی منور کر دیتا۔

چونکہ ایلی کو ان ٹھمریوں اور خیالوں کے بولوں سے بے حد دلچسپی تھی جو غلام گایا کرتا تھا۔

ایک دن اس نے غلام سے کہا کہ یہ گیتوں والی کاپی مجھے دے دو میں نقل کر کے لوٹا دوں گا۔

"کاپی۔" غلام بولا۔ "نہیں یہ تو میرے سرکار قبلہ کی کاپی ہے۔"

"اس میں تو گیت لکھے ہوئے ہیں۔"

"اس میں گیت ہیں۔ مناجاتیں ہیں۔ قوالیاں ہیں یہ سب تو ہیں گیت اور راگ سرکار قبلہ کے ہیں۔ میں جاہل کچھ بھی گاؤں روئے سخن ان کی طرف رہتا ہے۔ اس بات کے وہ ماہر ہی ہیں۔ صرف وہ اور بس باقی سب ہوس۔" غلام نے ایک دمدوز نعرہ لگایا۔

بہرحال ایلی نے وہ کاپی غلام سے لے لی اور گھر چلا آیا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔

سردیوں کے دن تھے۔ اس لئے اس وقت گیت نقل کرنا مشکل تھا۔ اس نے سوچا چلو کل نقل کر دوں گا اور شام کو کاپی لوٹا دوں گا۔ کیونکہ غلام نے تاکید کی تھی کہ گیت نقل کر کے جلد کاپی لوٹا دے۔

رات کے دو بجے کے قریب دروازہ بجا۔ ایلی جاگ پڑا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا۔ نہ جانے کون ہے۔ شاید پڑوس کے دروازے پر ہو۔

دروازہ پھر بجا۔ شاید نورانی کا دوست ہو کوئی۔ یہ سوچ کر وہ خاموش پڑا رہا۔

پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی کوئی باتیں کر رہا تھا۔ پھر پاؤں کی چاپ سنائی دی اور نورانی اور غلام اس کے سرہانے آ کھڑے ہوئے۔

"ارے تم ہو۔" علی چلایا۔

"ہاں۔" غلام مسکرایا۔

"حیرت ہے۔"

"مجھے وہ کاپی دے دو۔"

"کاپی۔ کیا کاپی لینے کے لئے آئے ہو۔"

"ہاں۔"

"اس وقت۔"

"ہاں۔"

"کیوں۔"

"بھئی۔ وہ مجھے سونے نہیں دیتے۔ فرماتے ہیں کہ ہماری کاپی اس پیشاب کے مٹکے میں کیوں پھینک آئے ہو۔"

"ارے۔" علی کا دل ڈوب گیا۔ "تو کیا میں پیشاب کا مٹکا ہوں۔"

"مجھے کیا معلوم۔" غلام نے کہا۔ "وہ جانتے ہیں۔"

غلام کاپی لے کر چلا گیا لیکن علی کو رات بھر نیند نہ آئی۔ جب بھی وہ آنکھ بند کرتا تو اس کے روبرو ایک بڑا سا مٹکا آ جاتا اور اس میں سے بدبو آتی۔ اور اس کا دماغ پھٹنے لگتا۔ وہ دل ہی میں شرمندگی محسوس کر رہا تھا اور حاجی صاحب سے کہہ رہا تھا۔ "آپ تو کہتے تھے وقت آئے گا لیکن اب پیشاب کا مٹکا۔"

علی کو عرصہ دراز سے مسلسل بول کی شکایت تھی۔ اس رات شرمندگی کی وجہ سے ساری رات وہ پیشاب کرتا رہا۔

سپرٹ لیول۔

علی کی یہ سپرٹ لیول کی شناخت بھی ایک عجیب واقعہ تھا۔

جس زمانے میں وہ کالج میں پڑھا کرتا تھا تو اس کی نور محمد سے بڑی دوستی تھی۔ نور محمد ان کا دور کا رشتہ دار تھا اور وہ لاہور پولیس میں نوکر تھا۔ جب کبھی میس فیس کی عدم ادائیگی کی وجہ سے علی کی حاضری بند ہو جاتی اور اسے بورڈنگ میں کھانے سے جواب مل جاتا تو نور محمد اسے اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور اپنے گھر میں اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر اسے کھلاتا۔ نور محمد کی شادی ہوئی لیکن اس کی بیوی مر چکی تھی اور وہ عرصے سے کنوارا رہ رہا تھا۔

نور محمد کو علی سے برادرانہ قسم کی محبت تھی اور علی کو نور محمد سے بڑی عقیدت تھی کیونکہ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود نور محمد سیانا تھا اور اسے زندگی کا بے پناہ تجربہ تھا۔

ایک مرتبہ نور محمد کو نہ جانے کیا تکلیف ہوئی اور وہ چھٹی لے کر رتی پور آ گیا۔ اس زمانے میں علی کو گرمی کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ اور وہ علی پور ہی میں تھا۔ نور محمد آتے ہی علی سے کہنے لگا۔

"بھئی ذرا باہر چلنا ہے۔"

"لیکن کہاں" علی نے پوچھا۔

"ذرا ادھر جانا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

طبعی طور پر نور محمد کھل کر بات کرنے کا عادی نہ تھا۔ وہ بات کو راز رکھتا اور صرف اسی بات کا اظہار کرتا جسے وہ ضروری سمجھتا۔

شہر سے باہر جا کر وہ پرانے مقبرے میں گھومتے رہے اور نور محمد ان مقبروں کی ٹوٹی ہوئی دیواروں سے چونا اکھیڑتا رہا۔

"یہ کس لیے ہے" علی نے پوچھا۔

"یہ بھی ہے۔" نور محمد نے جواب دیا۔

"لیکن کس لیے اکٹھا کر رہے ہو۔"

"کام آئے گا۔"

"کس کام۔"

"دوائی کے طور پر۔"

"یہ دوائی بنائی ہے کیا۔"

"ہاں۔ ہاں۔"

"کس کے لیے۔"

"اپنے لیے۔"

"بیمار ہو۔"

"ہاں۔"

"کیا بیماری ہے۔"

سوزاک ہو گیا ہے۔"

"ارے۔" علی اچھلا۔

نور محمد نے یوں سرسری بات کی تھی جیسے کوئی بات نہ ہو جیسے سوزاک نہ ہو سر درد ہو گئی۔ یہ نور محمد کی بات تھی۔

گھر پہنچ کر نور محمد نے ایک کورا گھڑا لیا۔ وہ پرانا چونا جو ٹوکری میں ڈال دیا اور پھر اسے پانی سے بھر دیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ وہ دونوں سارا دن اکٹھے بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے اور نور محمد ہر دس منٹ کے بعد ایک گلاس مٹکے میں سے بھرتا اور غٹ غٹ پی جاتا۔ علی نے پیاس محسوس کی۔ نور احمد بولا۔

"یہی پانی پیو نا۔" تمہارے لیے بھی بہت فائدہ مند ہو گا۔ جگر کی گرمی گھٹے گا۔"

اس کے بعد ہر دس منٹ بعد وہ دونوں اکٹھے پیشاب کرتے اور پھر ایک ایک گلاس پانی پی کر پھر سے بیٹھ جاتے۔ دس پندرہ دن کے بعد علی نے محسوس کیا کہ اسے سلسل بول کی شکایت ہو گئی ہے لیکن اس نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ دو ایک سال گزر گئے۔

اس کے بعد علی نے محسوس کیا اسے سلسل بول کی بیماری ہو چکی ہے۔

فرضی کیس

ان دنوں اس کا خالہ زاد بھائی جو میڈیکل کالج میں تعلیم پانے کے بعد جس کے ساتھ اٹیچڈ باتھ نہ تھا۔ ولایت میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کرنے چلا گیا۔ وہ واپس وطن لوٹا اس کے ساتھ اس کی انگریز بیوی بھی تھی۔ علی نے ڈاکٹر کو خط لکھا جس میں اس نے اپنی تکلیف کے متعلق فکرمندی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نے اسے لاہور بلا لیا۔

جب علی لاہور پہنچا تو ڈاکٹر نے اسے کہا:

''دیکھو بھائی جو علاج کرنا ہے تو آٹھ روز میرے پاس رہو۔ یہاں تمہیں صرف ایک تکلیف ہو گی۔ ہم لوگ رات کا کھانا پونے آٹھ بجے کھاتے ہیں اور پھر آٹھ بجے لیٹ کر سو جاتے ہیں یہ بندش تم پر بھی رہے گی۔''

ڈاکٹر نے رات کے آٹھ بجے علی کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ جس کے ساتھ اٹیچڈ باتھ نہ تھا۔

''لیکن میں پیشاب کہاں کروں۔'' علی نے پوچھا۔

''تمہارے کمرے میں دو کھڑکیاں ہیں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''باہر باغیچہ ہے۔ جب چاہو باہر نکل کر پیشاب کر لو لیکن۔'' ڈاکٹر رک گیا۔ ''ذرا احتیاط سے باہر باغیچہ میں جانا۔''

''کیوں۔'' علی نے پوچھا۔

''رات کو تنگ ہوتا۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔

علی روز ڈاکٹر سے کہتا کہ وہ اس کا معائنہ کریں لیکن ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتے۔ آٹھویں روز علی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنا سامان باندھا اور علی پور جانے کی تیاری کر لی۔ جب ڈاکٹر نے سنا کہ وہ خفا ہو کر جا رہا ہے تو اس نے جلدی سے کاپی نکالی اور میز لگا کر بیٹھ گیا۔

''ہاں بھئی علی۔'' وہ بولا ''جانے سے پہلے ہسٹری تو بتا جاؤ۔''

علی کا غصہ اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ وہ ڈاکٹر آصفی سے علاج کرانے پر رضامند ہی نہ تھا لیکن اس کی آرٹسٹ بیوی نے آ کر ایسی باتیں کیں کہ وہ کیس ہسٹری دینے پر مجبور ہو گیا۔

''ہاں بھئی علی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ تمہیں دن میں کتنی بار پیشاب آتا ہے۔''

''میں نے کبھی گنا نہیں۔''

''پھر بھی اندازہ۔''

''یہی آٹھ دس بار۔''

''اور پیاس کی کیا حالت ہے؟''

''بار بار پانی پیتا ہوں۔''

''کے بار۔''

''بس ایک چکر ہے۔ ادھر گلاس پانی کا پیا ادھر پیشاب کیا۔ دونوں عمل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔''

''سردیوں میں زیادہ آتا ہے یا گرمیوں میں۔''

''دونوں موسموں میں یکساں۔''

''اچھا تو یہ بتاؤ کہ دن میں کون سے وقت زیادہ پیشاب کرتے ہو۔''

''کیا مطلب۔''

"صبح کے وقت زیادہ یا شام کے وقت۔"

"سونے سے پہلے۔"

"شام کو یا رات کو۔"

"لیٹ جانے کے بعد۔ چاہے جس وقت لیٹ جاؤں۔ جب تک نیند نہیں آتی تب تک۔"

"پھر تو آپ نے گزشتہ آٹھ دنوں کے کوائف لکھوا دیے مجھے۔"

"جی۔"

"کل رات لیٹنے کے بعد سونے تک کے مرتبہ پیشاب گیا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔

"یاد نہیں۔"

"کل تو نہیں گیا۔"

"ہوں۔ پچھلے پرسوں۔"

"پرسوں بھی نہیں۔"

"ایک بار بھی نہیں۔"

سارا دن تو کرتا رہا تھا۔

"دن کی بات چھوڑو۔ بستر پر لیٹنے اور سونے کے درمیان کے وقفے کی بات کرو۔ پچھلے اترسوں۔"

"نہیں۔"

ڈاکٹر آصفی نے قہقہہ لگایا۔ بولا۔ "دیکھو ایلی میں نے تمہیں آٹھ دن انڈر آبزرویشن رکھا ہے۔ گزشتہ آٹھ روز تم نے سوتے وقت پیشاب نہیں کیا حالانکہ یہ وہ وقت ہے جب کہ تمہیں تمہارے بیان کے مطابق بہت زیادہ پیشاب آتا ہے۔ مگر تمہاری اس بیماری کو ایک خیالی کتے کا ڈر روک سکتا ہے تو بتاؤ یہ بیماری جسمانی ہوئی یا

نہیں۔ میری جان! تمہیں کوئی بیماری نہیں۔"

ڈاکٹر آصفی کا قہقہہ دیر تک گونجتا رہا حتیٰ کہ گلی پر جاتے ہوئے گاڑی کو چھپا چکھ
میں بھی وہ ڈاکٹر کے قہقہے کو آواز سنتا رہا۔

آج پھر وہ ڈاکٹر کی آواز سن رہا تھا۔ ی ی ی۔ ایلی بھی تمہارا علاج تو سہل
ہے۔

غسل خانے میں یہ تابا ندھوا دی ی ی۔"

پیشاب کا مٹکا پیشاب کا مٹکا!

"پیو۔ پیو۔" نورمحمد پونے کے گھڑے سے پانی نکال کر اسے دے رہا تھا۔ یہ
تمہارے جگر کی گرمی نکالے گا۔

اگلے روز صبح سویرے ایلی کے سر پر ایک دھن سوار تھی۔ صرف ایک دھن۔

پس پوٹ چور۔

اس روز وہ سکول بھی نہ گیا بلکہ سیدھا ہسپتال پہنچا۔ انچارج ڈاکٹر محمد علی اس کا
اچھی طرح سے واقف تھا۔ وہاں اس نے ایلی کی تمام کیس ہسٹری بڑے غور سے
سنی۔ پیشاب ٹسٹ کیا اور پھر بولا۔

"میاں صاحب، ہمارے کیمیکل امتحان کا سامان تو سب لیس، مائیکروسکوپک
ٹسٹ کا انتظام نہیں لہذا آپ علاج کرانا چاہتے ہیں تو لاہور چلے جائیں۔ وہاں
کے سول سرجن میرے دوست ہیں۔ ان کے نام خط لکھ دیتا ہوں۔ آپ ان سے جا
ملیں وہاں مائیکروسکوپک ٹسٹ کا انتظام ہو جائے گا۔

ڈاکٹر محمد علی کا خط دیکھ کر سول سرجن اسے بڑی گرم جوشی سے ملا۔

"کیا آپ پیشاب ساتھ لائے۔" اس نے پوچھا۔

"میں تو ڈیرہ سے آیا ہوں۔"

"اوہ ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "یہ تو کیس ہی مختلف ہے۔ فریکوئنسی آف یورن کی

شکایت ہے نا۔" انہوں نے ایک اسسٹنٹ کو بلایا۔ "بھئی انہیں پن پاٹ دے دو اور غسل خانہ دکھا دو۔ بیٹھیے صاحب آپ پیشاب لے آئیے۔" انہوں نے گھڑی دیکھی۔ "گیارہ بجے ہیں ابھی بہت وقت ہے۔ آپ شام تک ڈیرہ پہنچ سکیں گے۔"

سول سرجن کے اسسٹنٹ نے اسے پن پاٹ پکڑا دیا۔ وہ غسل خانے میں جا بیٹھا۔ بارہ بج گئے لیکن اسے پیشاب نہ آیا۔ جیسے پیشاب کا سلسلہ ہی موقوف ہو چکا ہو۔ ایک بجے اس کی پریشانی بڑھنے لگی۔ دو بج گئے چار بج گئے۔

باہر ڈاکٹر چلا رہا تھا۔ "ارے بھئی فریکوئنسی آف یورین کا مریض ہے یا ہو۔"

"کچھ پتہ نہیں صاحب۔"

"کیا ابھی تک پیشاب نہیں آیا۔ مسخرہ نہیں کوئی۔"

"کہیں پن پاٹ چرا کر نہ لے گیا ہو۔" کمپاؤنڈر نے کہا۔

"ارے بھئی دیکھنا۔" ڈاکٹر قہقہہ مار رہا۔

ایلی نے چپ چاپ پن پاٹ زمین پر رکھا اور غسل خانے کے پچھلے دروازے سے باہر نکل کر بھاگا۔ گاڑی ڈیرہ کو جا رہی تھی۔ وہ شور مچا رہی تھی۔ پیشاب کا مٹکا!

ڈاکٹر آصفی قہقہہ مار رہا تھا۔ "کتا پاگل تھا۔"

"میری کاپی دے دو کاپی۔۔۔" غلام چلا رہا تھا۔

"مسخرہ مسخرہ۔" سول سرجن ہنس رہا تھا۔

ایلی کی اس ذہنی پریشانی کا کوئی علاج نہ تھا۔ صرف ایک چیز تھی جو اس کی پریشانیوں اور خدشوں کو جذب کر سکتی تھی۔ جذب کر لیتی تھی۔ اور وہ غلام کی ستار تھی۔

وہی غلام جس سے سب ایلی کو پیشاب کا مٹکا سمجھتے تھے لیکن ایلی کے لئے غلام اور اس کے آقا سے دور رہنا ممکن نہ تھا اس لئے اسٹیشن سے وہ سیدھا غلام کے گھر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔

ڈیرہ میں وہ سڑک خاص طور پر مشہور تھی۔ چونکہ شام کے وقت ہندو خواتین پنڈتانیاں سیٹھانیاں اور لالائنیاں اس سڑک پر سیر کرتی تھیں۔ شوقین مزاج لوگوں نے اس سڑک کو پنگھٹ کا نام دے رکھا تھا۔

میں خود کئی بار شام کے وقت بیٹھک سے باہر چبوترے پر حقہ پیا کرتا تھا۔ ہندو خواتین جو ادھر سے گزرتی تھیں عام طور پر خوب صورت ہوتی تھیں لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کے چہروں پر شرم و حیا کی سرخی جھلکتی تھی۔ آنکھیں ہمیشہ جھکی رہتیں اور چھپنے کے لیے کونے تلاش کرتیں۔ اور جسم پر بنا اعلان کرنے کی بجائے سمٹا سمٹا رہتا۔ مجھے انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عصمت و عفت اور شرم و حیا کی پہاڑیوں پر ننھے ننھے چشمے ابل رہے ہوں۔

لیکن نورانی کا رویہ عجیب تھا۔ وہ سڑک سے منہ موڑ کر یوں بیٹھا رہتا تھا۔ اسے اپنی بدصورتی کا احساس تھا کیا واقعی؟

ایک روز میں نے طنزاً نورانی سے کہا، نورانی صاحب آپ سڑک کی طرف منہ کر کے کیوں نہیں بیٹھتے۔ کیا آپ کو یہ ڈر ہے کہ کوئی راہ چلتی آپ کو دیکھ کر آپ کی محبت میں اسیر نہ ہو جائے۔"

نورانی نے کام سے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ "کیا فائدہ۔"

"کیا مطلب۔"

"یہاں سے بیچاریاں گزرتی ہیں۔ خواہ مخواہ کسی کو الجھن میں ڈالوں تو۔"

میں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "کیا واقعی اس خیال سے آپ سڑک کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتے ہیں۔"

"ہاں یہی ڈر ہے۔" وہ بولا۔

"ارے۔" میں چلایا۔ "کیا آپ خود کو حسین سمجھتے ہیں۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔"

"تو پھر۔"

"یہی صاحب کشش وہ چیز ہے حسن اور۔"

"تو کیا آپ میں کشش ہے۔"

"بالکل ہے۔"

"ہمیں تو نہیں محسوس ہوتی۔"

"آپ عورت نہیں ہیں اس لئے۔"

"ارے۔"

نورانی اٹھ بیٹھا۔ ایلی کے قریب آکر کہنے لگا۔ "ایلی صاحب اگر میں کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھوں۔ نگاہیں چار ہو جائیں تو وہ میری تلاش میں آپ کا دروازہ کھٹکھٹائے تو میرا ذمہ۔"

"تو شرط رہی۔" ایلی چلایا۔

"نہ بھئی۔ شرط نہ لگاؤ۔" نورانی پھر سے کرسی پر بیٹھ رہا۔

"ڈرتے ہیں آپ۔"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "خواہ مخواہ آپ ہار جائیں گے۔"

"ارے۔" ایلی چلایا۔ "اس قدر زعم ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ۔" نورانی نے کہا۔

"تو شرط رہی۔"

"اچھا۔" وہ بولا۔ "اگر آپ مصر ہیں تو۔"

"منظور ہے۔" ایلی بولا۔

"لیکن اس میں دو چار شرائط ہوں گی۔ عورت میں خود منتخب کروں گا۔" ایلی نے کہا۔

"منظور۔" وہ بولا۔

"اگر آپ کوئی شرط عائد کرنا چاہیں تو۔" ایلی نے پوچھا۔

جب وہ چکلے میں پہنچے تو نورانی رک گیا۔

"کچھ تو طوائف کا انتخاب کیا ہے آپ نے۔"

"یہ شرط تو نہ تھی کہ یہیں کی نہ ہو۔" ایلی نے کہا۔

"مشکل کام دیا ہے آپ نے۔" نورانی بولا۔ "لیکن پھر بھی چلیے۔"

بنو کے گھر جا کر ایلی نے کمبل اور پگڑی اتاری اور بے تکلفی سے ان سے باتیں کرنے لگا۔

"آئیے۔" وہ بولا۔ "آپ کو اپنے ایک دوست سے ملاؤں۔ یہ آج ہی دن سے آئے ہیں صرف ایک روز کے لئے ٹھہریں گے یہاں ڈیرے میں۔"

"آپ کی تعریف۔" بنو بولی۔

ایلی نے جھٹ جواب دیا۔ "عظمت خاں۔"

"بڑا ٹھاٹھ دار نام ہے۔" گورا ہنسی۔

"خود بھی تو ٹھاٹھ دار ہے۔" ایلی نے کہا۔

"فی الحال تو پگڑی اور کمبل ہی دکھائی دیتے ہیں۔" گورا ہنسی۔

"اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کمبل کہاں ختم ہوا اور عظمت خاں کہاں شروع ہوئے۔" بنو نے کہا۔

"یہی تو کمال ہے۔" ایلی بولا۔

"خود گونگے ہیں شاید۔" گورا بولی۔

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔ "بولنا نہیں جانتے۔ دیکھنا جانتے ہیں۔ تاجر ہیں نا اس لئے۔"

"تاجر ہیں۔" بنو نے کہا۔

"ہاں۔ موٹروں کا کاروبار ہے۔"

وہ سب دیر تک چہلیں بکتے رہے۔ لیکن نورانی اسی طرح گم صم بیٹھا رہا۔

پھر اس نے یلی کو کہنی ماری۔

"کونسی ہے؟"

"یہ ہے۔" یلی نے اعلانیہ بنو کا ہاتھ پکڑ کر نورانی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

بنو نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ نورانی نے بلاتکلف بنو کا بازو کھینچ کر اسے اٹھایا اور گھسیٹتا ہوا ملحقہ کمرے میں لے گیا۔ بنو اور گوری حیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"گھبراؤ نہیں۔" یلی بولا۔ "ابھی آجائیں گے۔ کوئی ایسی بات نہیں۔"

"ایسی ویسی بات سوجھی تو کیا ہوا۔" بنو بولی۔

"ہمیں بھی لے چلے کوئی۔" گوری ہنسی۔

"تمہیں نہیں بہت۔" یلی نے بنو کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے کمرے کی طرف چل پڑے۔

بنو چیخ رہی تھی۔ "یہ کیا مذاق ہے۔"

کمرے میں پہنچ کر یلی نے کہا۔ "مذاق نہیں۔ جمیل نے کہا تھا کہ تم دکھ جذب کر سکتی ہو۔"

"کہا تھا نا۔ میں دکھی ہوں۔ سنو میرا کچھ کرو۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"گورنہ ہو۔" وہ بولا "ہنسی سے دکھ دور نہیں ہوتا۔"

"تو پھر۔" وہ بولی۔

"مجھے بھی تو پتہ نہیں۔" وہ بولی۔

"چلو تمہاری مرضی۔" وہ بولا اور اس نے بنو کے ہاتھ میں بیس روپے تھما دیے۔

"یہ پیسے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"سردیوں کے دن ہیں۔ ریوڑیاں اور مونگ پھلی کھا لینا۔"

غروبِ وطن

چند روز بعد ایک روز جب ایلی نویں جماعت کو تاریخ جغرافیہ پڑھا رہا تھا تو چپڑاسی آیا۔

"جی لالہ جی بلاتے ہیں۔" وہ بولا۔

"لالہ جی۔" ایلی نے اپنے آپ ہی سے پوچھا۔

لالہ جی اگلے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ عمر میں پچپن کے قریب تھے مگر طبیعت کے لحاظ سے ستر سال کے ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک سال کے اندر اندر وہ پنشن پانے والے ہیں لہذا انہوں نے پہلے ہی پنشن کی مشق شروع کر دی تھی۔ سارا دن وہ دھوپ میں یا اندر کمرے میں بیٹھے رہتے۔ نہ کسی استاد سے جھگڑتے نہ کسی کو منہ لگاتے۔ بلکہ جب بھی بن آتی لوگوں کی مدد کرتے تھے۔

ایلی دفتر میں داخل ہوا تو ہنو کو لالہ جی کے روبرو کرسی پر بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھر گیا لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا۔

"جی لالہ جی۔" وہ بولا۔

"یہ آپ کے مہمان ہیں۔" لالہ جی نے ہنو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ پھر ہولے کھنسنے لگا۔

"آپ ذرا دفتر سے باہر باغیچے میں چلیے یہ ابھی آتے ہیں۔"

ہنو اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

لالہ جی نے نگاہیں جھکائیں اور بولے۔ "الیاس صاحب، مجھے آپ سے یہ توقع نہ تھی۔ دیکھئے نا عورت کا سکول میں آنا۔ بچوں پر کیا اثر پڑے گا۔ آپ نے بلانا ہی تھا تو گھر بلایا ہوتا۔"

"لالہ جی۔" ایلی نے جواب دیا۔ "اگر میں بلاتا تو گھر ہی بلاتا۔ اس کا یہاں سکول میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ نہ تو میں نے اسے بلایا ہے نہ میں اسے جانتا

ہوں۔"

ماسٹر جی نے آنکھ اٹھا کر غور سے ایلی کی طرف دیکھا اور بولے۔ "پوچھ تو دیکھئے کہ بات کیا ہے۔"

ایلی باغیچے میں پہنچا تو نوری پر یوں جھپٹی جیسے چیل گوشت پر جھپٹتی ہے۔

"مندا جانے" وہ بولی۔ "نو کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو کئی روز سے تمہارے دوست کی مال جپتی ہے کہتی ہے۔ اسے بلوا دے۔"

"ارے۔" ایلی چلایا۔ "کیا واقعی۔"

"مندا جانے کیا کر دیا ہے اسے میری نو پر۔ بڑی آدم نگلو تیری۔"

وہ تو عام آدمی تھا۔ جادوگر تو نہ تھا۔

"پتہ نہیں۔ کیا ہو گیا ہے۔ بے چاری بیمار ہے۔ آپ آئیں نا آج ضرور آئیں ضرور۔"

"آؤں گا۔" ایلی بولا۔ لیکن حیرت کی شدت سے اس کا دماغ شل ہو چکا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر کیوں۔ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر نورانی۔ لاحول ولا قوۃ۔"

سکول سے فارغ ہو کر وہ گھر پہنچا۔ دروازے میں ایک خط پڑا تھا۔ اس نے بے خبری میں وہ خط اٹھا لیا اور بیٹھک کی طرف چلا گیا۔ بیٹھک مقفل تھی۔

"ہوں۔ تو ابھی تک وہ رہے نہیں آیا۔ لیکن آخر بات کیا ہے۔ نوری نے کیا کیا ہوگا۔ شاید ٹونا کیا ہو۔ شاید تعویذ لے گیا ہو۔ نگاہ میں تو اثر نہیں ہو سکتا۔"

اس نے بے خبری میں لفافہ چاک کیا اور خط پڑھے بغیر ٹہلنے لگا۔ شکیلہ کا یہ خط تو نہیں ہو سکتا۔

"نہیں نہیں۔" وہ چلایا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

دفعتاً اس کی نگاہ خط پر پڑی۔ صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔

"میں جا رہی ہوں ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ مجھے مل جاؤ اللہ کے واسطے۔ شہزادہ۔" اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

نورانی، خوبصورت، خاموش وجود اس کا سب غروب ہو گئے۔ اس کی جگہ ایک چہرہ طلوع ہو گیا۔ منور چہرہ، ماتھے پر بندیا، سانول، شناسا آنکھیں، اداس صورت۔

"میں جا رہی ہوں۔" وہ بولی۔

"لیکن۔۔۔لیکن۔۔۔" علی کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

---- حصہ چہارم ---------- ختم ------------

بھگوڑے

علی پور پہنچتے ہی ایلی نے شور مچا دیا۔ کبھی وہ فرحت کو آوازیں دیتا کبھی رابعہ کو تاکہ اس کی آمد کے متعلق شہزاد کو علم ہو جائے لیکن شہزاد وہ رابعہ کے چوبارے کو چھوڑ کر اپنے چوبارے میں جا چکی تھی۔ اس لئے اس نے ایلی کی آواز نہ سنی۔ پھر وہ اندھیری گلی کے راستے فرحت کی طرف چلا گیا۔

ایلی نے بہانہ بنایا۔ کہنے لگا۔ "میرے افسر نے سرکاری کام سے امرتسر بھیجا تھا۔ میں نے کہا دو روز کے لئے علی پور بھی ہو آؤں۔"

وہ باتیں کر رہے تھے کہ ساتھ والے مکان سے شور اٹھا۔ کوئی چیخ کر رو رہا تھا۔

"کون ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"اے ہے۔ صفدر ہے۔" وہ بولی۔

"روتا کیوں ہے۔"

"کبھی روتا ہے کبھی ہنستا ہے کبھی سر دیوار سے دے مارتا ہے۔" فرحت بولی۔

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔"

"کوئی پردے کی بات ہے کیا؟"

"ہونہہ پردے کی۔" فرحت چلائی۔

"تو پھر بتانے میں کیا حرج ہے۔"

"بس وہ اب بجھنے ہی کو ہے۔"

"کیا مطلب۔"

"ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ اللہ ماری پی پی کر پھیپھڑا جل گیا ہے۔"

فرحت نے کہا۔

"کہاں جا رہی ہو۔" لیلی نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔"

"پھر بھی۔"

"شاید عیسائی ہو جاؤں۔"

"اس سے کیا ہوگا۔"

"مزدوری کر سکوں گا۔"

"مجھے ساتھ لے چلو" لیلی نے کہا۔

"نہیں۔" وہ بولی۔

"کیوں۔"

"بس نہیں بہتر ہو دیے۔" وہ پھر خاموش ہو گئے۔

"ایک بات پوچھوں۔" لیلی نے کہا۔

"پوچھو۔"

"کیوں جا رہی ہو۔"

"اب اس گھر میں رہنا ناممکن ہو چکا ہے۔"

"کیوں۔"

"بے عزتی کی زندگی سے بھیک مانگ لینا اچھا ہے۔"

"شریف آیا تھا کیا؟"

"ہاں۔"

"کب آیا تھا۔"

"جس روز تمہیں دیکھا تھا اسی روز گیا تھا وہ۔"

"کچھ کہتا تھا۔"

"بہت کچھ۔"

"تو پھر اداس کیوں ہو؟"

"اداس نہیں۔" وہ بولی۔

"پھر؟"

"ڈری ہوئی ہوں۔"

"کس سے؟"

"اس شرابی پڑوسی سے۔"

"صفدر سے؟"

"ہاں۔ روز میرا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے کہتا ہے مجھے معاف کر دو تو مروں گا۔ ورنہ نہیں۔"

"تو کر دو معاف۔" ایلی نے کہا۔

"دل نہیں مانتا۔"

"اتنی سخت تو نہیں تم۔"

"عورت ہوں۔" وہ بولی۔

"ہوں۔" اور وہ پھر خاموش ہو گئے۔

دفعتاً شہزاد بولی۔ "تو وہاں کیوں کھڑی ہے یہاں آ جا۔"

ایلی حیران تھا کہ کس سے بات کر رہی ہے۔

فرحت مسکراتی ہوئے دروازے سے نکل کر اندر آ گئی۔ "میں نے کہا دیکھوں تو کیا کر رہے ہیں۔" وہ بولی۔

"یہاں بیٹھ کر دیکھنا۔" شہزاد بولی۔ "چھپ کر دیکھنے سے کیا فائدہ۔"

"میں تو حیران ہوں۔" فرحت بولی۔ "تم دونوں ہی عجیب ہو۔"

"کیوں؟" شہزاد نے پوچھا۔

"یوں بیٹھے ہو۔ جیسے صدیوں سے ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے ہو۔"

"وہ تو ہے۔" شہزاد بولی۔ "صدیوں سے اکٹھے رہتے ہیں ہم۔ کیوں ایلی۔"

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔ "صدیوں سے۔"

"اور میں سمجھتی تھی۔" فرحت ہنسی۔

"تو جو جی چاہے سمجھ لیا کرے۔" شہزاد بولی۔

کیسی یادوں

فرحت چند ایک منٹ ٹھہری اور پھر بہانہ بنا کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔

"دیکھو شہزاد۔" ایلی اٹھ بیٹھا۔ "اگر تم نے جانا ہی ہے تو چلو اکٹھے چلیں۔"

"بڑی بدنامی ہوگی۔"

"پھر کیا ہو۔"

"تم برداشت نہ کر سکو گے۔"

"میری بات چھوڑو۔" وہ بولا "میں مرد ہوں۔ سبھی کچھ برداشت کر لوں گا۔ تم عورت ہو۔ میری تنخواہ بہت قلیل ہے۔ تم غربت برداشت نہ کر سکو گی۔ تم غربت سے واقف نہیں شہزاد اور اگر تم بچے چھوڑ جاؤ گی تو تم ان کی جدائی برداشت نہ کر سکو گی۔"

وہ خاموش رہی۔

"بولو نا۔" ایلی نے اسے جھنجھوڑا۔

"میں تمہیں ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں۔" وہ بولی۔

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔"

"ہاں۔" وہ بولی۔

"ایک بات کہوں۔" ایلی نے پوچھا۔

"کہو۔"

"چلو اس کا فیصلہ نہ تم کرو نہ میں کرتا ہوں۔"

"تو پھر؟"

"دیکھیں قدرت کو کیا منظور ہے۔" ایلی نے کہا۔

وہ ہنسے۔

"آؤ ہم پرچیاں ڈال لیں۔ ایک پر لکھیں دونوں دوسری پر اکیلی۔ تم ایک پرچی اٹھا لو۔ اگر اکیلی نکلا تو میں چپکے سے چلا جاؤں گا اور اگر دونوں نکلا تو تم چپکے سے میرے ساتھ چل پڑنا۔"

وہ خاموش ہو گئی۔

"بولو منظور ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

دیر کے بعد اس نے آہ بھری۔ "چلو ساری عمر جو کھیل ہے تو اب کی بار سہی۔" شہزاد بولی۔

"تو منظور ہوا نا۔" ایلی نے کہا۔

"لیکن میری ایک شرط ہوگی۔" وہ بولی۔

"کیا؟"

"وعدہ کرو اگر اکیلی کی پرچی نکل آئی تو تم شادی کر لو گے۔ میرے جانے کے فوراً بعد اور پھر زندگی بھر مجھ سے نہیں ملو گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"میری خاطر ہمیشہ سب کچھ ہوتا آیا ہے۔" وہ بولی۔ "یہ بھی ہوگا۔ جو بھی میں چاہوں گی ہوتا رہے گا۔" وہ مسکرا دی۔

"کیا مطلب؟"

"میں بھی جیتی ہوں۔" وہ بولی۔ "مجھے مردہ نہ سمجھو۔ مجھ میں بھی کس بل ہے۔ اس

کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

"میری خاطر تم یہ بھی کرو گے۔ دیکھ لینا۔"

"اور نہ کروں تو۔"

"تو میرا آخری فیصلہ تم سن ہی چکے ہو۔"

"یعنی جوا نہیں کھیلو گی۔"

"نہیں۔" شہزادی نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا۔ یہی ہوا۔ مجھے منظور ہے۔"

"وعدہ۔"

"تمہاری قسم۔"

"مجھے تم پر یقین ہے۔"

"لیکن دونوں کا تو میری بھی ایک شرط ہو گی۔ تمہیں وعدہ کرنا ہو گا۔" علی نے کہا۔

"کیا؟"

"اگر بچوں کو ساتھ لے جاؤ گی تو غربت برداشت کرنی پڑے گی اور اگر بچوں کو ساتھ نہ لے جاؤ گی تو ان کا غم نہ کھانا۔ ورنہ تمہاری زندگی تلخ ہو جائے گی۔"

"ہوں۔" وہ سوچنے لگی۔

"میں بتاؤں۔" علی بولا۔

"کیا۔"

"تم لڑکیوں سے سچی بات کہہ دینا اور پھر چھپا لینا۔ انہیں یہ بھی بتا دینا کہ بھوکوں مرنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔

"تو پرچیاں لکھ دو۔"

وہ اٹھی۔ ٹرنک سے کاپی کا ورق پھاڑا۔ پنسل لی اور لکھنے بیٹھ گئی۔

دفعتاً نہ جانے کیا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے پنسل میز پر رکھ دی۔ اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر رونے لگی۔

شہناز شہناز ڈیڈی نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ لیکن وہ جوں کی توں پتھر کی طرح بیٹھی رہی۔

میں نہیں مروں گا

عین اس وقت ملحقہ کمرے سے شور سنائی دیا۔

"نہیں نہیں۔ میں نہیں مروں گا۔ نہیں مروں گا۔ صفدر چلا رہا تھا وہ کمرے میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پھر رہا تھا۔

"نہیں نہیں نہیں نہیں۔ وہ چلائے جا رہا تھا۔

شہناز نے سر اٹھایا اور غور سے سننے لگی۔

"ننھے ننھے بچے ہیں۔ صفدر کی بیوی اس کی منتیں کر رہی تھیں۔ خدا کے لئے ان چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے۔"

"چلی جاؤ چلی جاؤ۔ وہ چلانے لگا۔

"ان بچوں پر رحم کرو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ وہ رو رہی تھی۔

"اپنے آپ پر رحم کرو۔ یہ زہر نہ پیو۔ اس کی بیوی بولی۔

"ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ وہ چیخ رہا تھا۔

"خدا کے لئے خدا کے لئے۔ وہ گڑگڑا رہی تھی۔

پھر ملحقہ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے

"شہناز ڈیڈی بولا۔ کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"میری طرف دیکھو"

شہناز نے سر اٹھایا۔ اس کی گالوں پر آنسو ڈھلک رہے تھے۔

ڈیڈی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے صفدر کے متعلق کونسی بات تھی۔ جو شہناز چھپا رہی تھی۔

وہ تو طبعاً بے نیاز تھی۔ کسی بات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی تھی۔ پھر کیا بات تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے آنسو نہیں رکتے تھے۔ ایلی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"شہزاد۔" وہ بولا۔ "آخر بات تو بتاؤ کوئی۔"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ بولی۔

"اچھا تو یہ پہیلیاں تو سمجھو۔"

"دکھتی ہوں۔" وہ بولی اور ویسے ہی بت بنی بیٹھی رہی۔

ملحقہ کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ صرف بے ہنگم سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔

دیر تک وہ پھر خاموش بیٹھے رہے۔

ملحقہ کمرے سے ٹن ٹن کی آواز آ رہی تھی۔ کوئی دلربا بجا رہا تھا۔ شہزاد کے کان کھڑے ہو گئے۔

"دلربا بج رہا ہے کیا۔" ایلی نے پوچھا۔

"شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کون ہے۔" اس نے پوچھا۔

شہزاد نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

ایلی سمجھ گیا۔ لیکن صفدر دلربا کیوں بجا رہا ہے۔ یہ اسے سمجھ میں نہ آیا۔

"مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔" صفدر کی مدھم آواز سنائی دی۔

شہزاد خاموش بیٹھی رہی۔

"وہی ہے کیا۔" ایلی نے پوچھا۔

شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر اسے معاف کر دیں۔" ایلی نے کہا۔

شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو کہہ دو معاف کر دیا۔" ایلی نے کہا۔

شہزاد نے برا سا منہ بنایا۔ "دل نہیں مانتا۔" وہ بولی۔

"تو جھوٹ موٹ کہہ دو۔" ایلی نے کہا۔

"جب تک میں نہیں مروں گا۔" صفدر با آواز بلند چیخنے لگا۔ حتیٰ کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ "اور کہہ کیوں نہیں دیتی۔" ایلی نے پوچھا۔

"ساری عمر جان کنی کے عذاب میں مبتلا رہے۔" شہزاد بولی۔

ایلی نے حیرت سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ کیا یہ شہزاد بول رہی تھی۔ نہیں نہیں۔ وہ تو اتنی سخت دل نہ تھی۔ پھر کون بول رہی تھی۔ ایلی کے لیے شہزاد کی شخصیت کا یہ پہلو نیا تھا۔ جس سے وہ آج تک واقف نہ ہوا تھا۔

کچھ دیر کے لیے کمرے پر خاموشی چھائی رہی۔ پھر دیوار پر پھر سے ٹک ٹک ہونے لگی۔

"کہہ کیوں نہیں دیتی۔" ایلی بولا۔

شہزاد خاموش بیٹھی رہی۔

"میری خاطر کہہ دو۔" ایلی نے منت کی۔

"جی نہیں مانتا۔" وہ بولی۔

"کہہ دیتی ہوں۔ صرف ہونٹوں سے۔"

"تو کہہ دو۔"

شہزاد نے ٹرنک سے تالا اٹھایا اور اسے دیوار پر مارنے لگی۔ ٹھک ٹھک ٹھک

پھر وہ رک گئی۔

صفدر نے پھر دیوار بجائی۔

شہزاد نے پھر تالا مارا ٹھک ٹھک ٹھک

دفعتاً صفدر چلایا "یہ تم ہو ست ہو۔ بولو۔"

"ہاں" وہ بولا تو زبیدہ بولی۔ "میں نے معاف کیا۔"

ملحقہ کمرے سے عورتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی چیخ رہا تھا۔ ناچ رہا تھا۔ قہقہے مار رہا تھا۔ کسی نے پھر چھیڑ دی۔ پھر وہی قے کرنے کی آواز۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"اب پرچی لکھو نا۔" علی نے کہا۔

"ہاں پرچی۔" شہناز گویا خواب سے بیدار ہوئی۔

پرچیاں لکھتے وقت اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کے ان دونوں پرزوں کو تہہ کیا اور بولی۔ "اب اٹھاؤ۔"

"میں نہیں۔" علی بولا۔ "تم اٹھاؤ۔" علی نے پرچیوں کو مٹھی میں لے کر ہلایا۔

شہناز نے ایک پرچی اٹھائی۔ "کھولو۔" وہ بولی۔

"نہیں تم خود کھولو۔" اس نے کہا۔

شہناز نے اسے کھولا۔ دونوں دیکھ کر مسکرائے۔ لیکن ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

عین اس وقت ملحقہ کمرے میں صفدر کی بیوی کے بین شروع ہو گئے۔

علی چونکا۔ "کیا مر گیا؟" وہ بولا۔

"ہاں۔" شہناز نے جواب دیا۔ "جان چھٹی۔" لیکن اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو رواں تھے۔

علی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آنسو غم کے تھے یا خوشی کے۔

"تم اب جاؤ۔" شہناز بولی۔ "مرگ پر سارے محلے والے اکٹھے ہو گئے۔"

"اچھا۔" علی نے کہا۔ "کل میں چلا جاؤں گا۔ انتظام کرنے کے لیے۔ تنخواہ لے کے واپس آؤں گا۔ تم تیار رہنا۔"

شہزور نے اثبات میں سر ہلایا۔ "دیر نہ لگانا۔" وہ بولی۔

"نہیں۔" علی بولا "جلد آؤں گا۔" وہ دبے پاؤں فرحت کے گھر کی طرف چل پڑا۔

وکیل میم

لاہور پہنچ کر علی سوچنے لگا کہ اسے تیاری کرنی ہے۔ اسے قانون سے چندان واقفیت نہ تھی۔ اور نہ ہی اسے کسی لڑکی کو بھگا کر لے جانے کا تجربہ تھا۔ شہزور نے کئی بار اسے بتایا تھا کہ شریف بیگ تھا اگر ایسی واردات ہو جائے تو وہ قانونی طور پر کوئی قدم نہیں کرے گا۔ میدان میں آ کر لڑنے کی بجائے شاید وہ خود معدوم ہو جائے گا۔

بہرحال اگر اس نے کوئی قدم اٹھایا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ قانونی طور پر وہ کس طرح زد میں آتا ہے۔ علی نے کورٹ روڈ پر چکر لگانے اور وکلاء کے بورڈ پڑھنے لگا۔ میدان میں آ کر لڑنے کی بجائے شاید وہ خود معدوم ہو جائے گا۔

بہرحال اگر اس نے کوئی قدم اٹھایا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ قانونی طور پر وہ کس طرح زد میں آتا ہے۔ علی نے کورٹ روڈ پر دو چکر لگائے اور وکلاء کے بورڈ پڑھنے لگا لیکن اس میں اس قدر ہمت نہ پڑتی تھی کہ کسی وکیل کے پاس جائے۔

ایک کوٹھی کے باغیچے میں ایک [illegible] وکیل کو بیٹھے دیکھ کر اس نے اندر داخل ہونے کی شدید کوشش کی لیکن اس کے قدم رک گئے عین اس وقت وکیل کا منشی آ گیا۔

"کیوں مہاراج!" وہ بولا "آپ لالہ جی سے ملیں گے۔"

"ہاں۔" علی نے مشکل سے کہا۔

"تو آؤ وہ سامنے بیٹھے ہیں۔"

علی کو مجبوراً لالہ جی کے پاس جانا پڑا۔ "آداب عرض۔" وہ بولا۔

"نمستے۔" وکیل نے جواب دیا اور کتاب ایک طرف رکھ دی۔ "کہو کیا بات ہے۔"

"مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے۔"

"ہوں۔" وہ ہنستے کا تنکا لے کر بولے۔

"اغوا کا کیس ہے۔" میں نے بمشکل کہا۔ پھر وہ ٹھہر گیا۔ "میرا مطلب ہے۔

ریپسٹ کا۔ یعنی وہ رک گیا۔ اس کا گلا سوکھ گیا تھا۔

"کیا کیس ہے۔" وہ بولے۔

"اگر ریپسٹ کی جائے۔ تو اس میں قانونی مدد کیا جا سکتی ہے۔"

"یہ تو کوائف پر منحصر ہے۔" لالہ جی بولے۔

"میرا مطلب ہے۔" میں نے بمشکل کہا۔ "کیا کوائف ہونے چاہئیں؟"

"یعنی کیا مطلب ہے۔؟"

"مطلب ہے یعنی۔۔۔"

"دیکھو نوجوان۔" لالہ جی بولے۔ "کیا ارتکاب جرم ہو چکا ہے؟"

"جی نہیں۔" وہ بولا۔

لالہ جی قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

"کیا تم سکے بیر ہو گئے۔" لالہ جی نے پوچھا۔

"جی۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لڑکی کی عمر کیا ہے؟" وہ بولے۔

"عمر۔۔" میرے گلے میں کچھ پھنس گیا۔ "معلوم نہیں۔ وہ۔۔۔"

"پھر بھی اندازاً"

"اس کے چھ بچے ہیں۔"

لالہ جی کی آنکھیں ابل آئیں۔ "نوجوان۔" وہ بولے "تمہیں کسی ڈاکٹر سے ملنا چاہیے وکیل سے نہیں۔"

لالہ جی کی کوٹھی سے نکل کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ پروا نہیں۔ اس نے

گھر جا کر علی نے محمود کو اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ محمود سٹپٹا گیا۔ "ارے چھپکلی کی ماں کو اغوا کر رہے ہو۔ بلکہ وہ تمہیں اغوا کر رہی ہے۔ یار، سرخ مرد نے تو تو علی چارہ جوتی کی تو نذر ہو جاؤ گے۔"

"پھر کیا ہے۔" علی بولا۔ "مجھے ڈر نہیں۔ مشورہ دو۔ مدد کرو۔"

"جتنی مدد ہو سکے کروں گا۔ بشرطیکہ میں قانون کی زد میں نہ آؤں۔" محمود ہنسنے لگا۔

"چھپکلی کی ماں ہے وہ کیا۔" مریم نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی ہاں۔" علی نے جواب دیا۔

"تمہارا رومینس ہے۔" اس نے پوچھا۔

"سو سال سے۔" علی نے جواب دیا۔

"سو سال" اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

"حرام زادی۔" محمود غصے میں چلایا۔ "اس کی آنکھ کی چمک دیکھو۔"

"تم تو خواہ مخواہ بگڑتے ہو۔" مریم نے یوں انداز سے جیسے بچی ہو۔

"ابھی رومینس کی لت نہیں گئی کیا۔" محمود نے اسے پکڑ کر پیار سے اور اندھا دھند کر کے اس کے چوتڑوں پر یوں تھپکے مارنے لگا۔ جیسے سکول کی بچی کو سرزنش کر رہا ہو۔

"ہائے مر گئی۔" مریم چلا رہی تھی۔

"میرے دوست پر چیپ نظریں ڈالتی ہے تو۔" محمود غرا رہا تھا۔

علی حیران تھا۔ اس کے ذہن میں مریم کا تخیل کچھ اور تھا۔ یہ عجب مریم تھی اور محمود عجیب آدمی تھا۔ جو مریم کا خاوند ہونے کے باوجود اسے یوں پیٹ رہا تھا۔ جیسے وہ اس کی ہاؤس میڈ ہو۔

بہرحال محمود سے کوئی خاص طے کرنے کے بعد وہ ڈیرہ آ گیا۔

تیرہ غلط

ڈیرہ پہنچ کر بھی اس کے کانوں میں محمود کا مشورہ گونج رہا تھا۔ محمود نے کہا تھا۔ ایک

بات یاد رکھو۔ پکی ڈیوٹی پر حاضر رہنا۔ روپوش نہ ہو جانا ورنہ مارے جاؤ گے۔"

علی نے ڈیرہ پہنچ کر کسی کے توسط سے ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ تاکہ شہزاد کو وہاں رکھ سکے لیکن انتظام کے باوجود وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔

پہلے روز جب وہ غلام کے گھر گیا تو غلام اسے دیکھ کر بولا۔

"کیوں خیریت تو ہے۔"

"بالکل" علی نے جواب دیا۔

"معلوم تو نہیں ہوتی" غلام نے کہا۔

نہ جانے کیا بات تھی۔ ہر کوئی اس سے یہی سوال پوچھتا تھا۔ کیونکہ واقعی اس کے چہرے پر پریشانی اور تفکر کے آثار اس حد تک نمایاں تھے۔

"سنو بھائی۔" وہ بولا۔ غلام نے پیار سے علی کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "بھائی ایک بات کہتا ہوں۔ جو بھی کرنا ہے کر ڈالو۔ سوچو نہیں ورنہ سوچ کا آرا چلتا ہے۔ بری طرح چلتا ہے۔"

علی کئی بار چاہتا تھا کہ غلام سے ساری بات کہہ دے۔ لیکن اس کی زبان گنگ ہو جاتی تھی۔

ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس روز بھی اس نے بات کرنا چاہی لیکن ہمت نہ پڑی اور وہ وہاں سے چلا آیا۔ پھر جب وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا تو نوری خلاف معمول علی کے کمرے میں آ گیا۔

"علی صاحب۔" وہ بولا "معاف کیجیے میں نے دیکھا ہے کہ آپ سخت پریشان ہیں۔"

علی نے محسوس کیا کہ اسے جھٹلانا بے کار ہے۔ "ہاں ہوں۔" وہ بولا۔

"میں کوئی مدد کر سکتا ہوں کیا؟"

"نہیں۔" علی نے کہا۔

"تو پھر؟"

"بات یہ ہے نورانی صاحب کہ میں مستقبل کے متعلق پریشان ہوں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔" نورانی بولا۔ "ضرور کر سکتا ہوں۔"

"وہ کیسے۔" ایلی نے پوچھا۔

"میں علم جفر سے واقف ہوں۔" نورانی نے کہا۔ "کیا آپ اپنا سوال مجھے بتا سکتے ہیں۔"

"نہیں۔" ایلی نے کہا۔ "وہ ایک راز ہے۔"

"اچھا۔" نورانی نے کہا "تو آپ نہ بتائیے۔ میری ہدایت پر عمل کیجیے۔"

"وہ کیسے؟"

"اپنا سوال تیرہ الفاظ میں لکھ دیجیے۔" نورانی کہنے لگا "شرط یہ ہے کہ الفاظ تیرہ ہوں نہ کم نہ زیادہ مثلاً کیا میں بی اے کے امتحان میں پاس ہو جاؤں گا۔ جو سوال ہو گا۔ دیکھیے اس سوال میں تیرہ الفاظ ہیں اور اس کا متن معانی کے لحاظ سے مکمل ہے۔"

اس کے بعد نورانی نے ایلی کو ایک لمبا چوڑا عمل بتایا۔ ان الفاظ کو ابجد کے ہندسوں میں بدلنا تھا اور اسی طرح تیرہ مرتبہ بدلنا تھا اور پھر ان کا مجموعہ نکالنا تھا۔ نورانی بیٹھ گیا اور اس عجیب و غریب عمل میں ایلی کی مدد کرنے لگا۔ جب مجموعہ نکل چکا تو نورانی بولا۔ "اب ذرا ٹھہریئے۔ میں باہر جا کر ستاروں کی پوزیشن دیکھ لوں۔"

یعنی ایک جملہ آپ لکھیں جس میں پورا مفہوم موجود ہو۔ مجھے بے شک نہ بتائیں۔

ایلی نے تیرہ لفظوں کا جملہ لکھا۔

کیا یہ اغوا میرے اور شہزاد کے لئے باعث خوشی یا پریشانی ہو گا۔

نورانی باہر نکل گیا۔ وہ وہاں تھا، گویا عجیب عجیب منتر پڑھتا رہا۔ مشتری، سعد، زہرہ، مریخ، وہ نہ جانے کیا کیا نام لیتا رہا۔

پھر وہ اندر آ گیا۔ ''ستاروں کے لحاظ سے۔'' وہ بولا۔ ''آپ اس مجموعے میں ۲۱۵ جمع کیجیے۔''

''جی'' میں نے جمع کر کے کہا۔

''اب آپ ان کو حروف میں بدل لیجیے۔''

میں نے ایسا ہی کیا اور وہ حیران رہ گیا۔ اس کے سامنے تیرہ الفاظ کا ایک مکمل جملہ بنا ہوا تھا۔

''یہ فعل آپ کے اور دوسروں کے لیے باعث ذلت و رسوائی ہو۔''

''کیا میں جواب دیکھ سکتا ہوں۔'' نورانی نے کہا۔

میں نے وہ چٹ جس پر جواب لکھا تھا، نورانی کی طرف بڑھا دی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''مجھے افسوس ہے۔'' نورانی بولا۔

''مجھے بھی ہے۔'' میں نے کہا ''لیکن میرا فیصلہ بدل نہیں سکتا۔''

''بہت بہتر صاحب۔'' نورانی بولا ''میں دوست ہوں اگرچہ نہیں چاہتا، پر کبھی میری مدد کی ضرورت پڑ جائے تو آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر نورانی باہر نکل گیا۔

''یہ ہو کے رہے گا۔ ہو کے رہے گا۔ اللہ اچھا کریں گے۔'' حاجی صاحب کی گردن رولی کے گملے کی طرح لرز رہی تھی۔

''بچے آپ سے بڑے۔'' غلام مسکرا رہا تھا۔ ''جو کرنا ہے کر ڈالو۔ کر ڈالو۔''

''تم قید ہو جاؤ گے۔'' محمود چلا رہا تھا۔

''تمھیں ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے۔'' لالہ جی اسے گھور رہے تھے۔

"لیکن کرس نے چارہ جوئی کی تو؟" ایلی نے پوچھا۔

"بڑے کمرے میں بھری کچہری میں جواب دوں گی اسے تم کیوں غم کھاتے ہو۔" وہ بولی۔

انھیں ڈیرہ میں رہتے ہوئے دس روز ہو گئے لیکن کوئی ایسا واقعہ نہ ہوا جو باعث فکر ہوتا۔ گیارھویں دن محلے کے ایک بزرگ سکول میں آ گئے اور ہیڈ ماسٹر کے توسط سے ایلی سے ملے۔ ایلی کو یہ خیال بھی پیدا نہ ہوا کہ وہ شہزاد کے سلسلے میں آئے ہیں۔ ایلی انھیں اپنے گھر لے گیا۔ جب انہوں نے گھر کو غور سے دیکھنا شروع کیا تو ایلی کا ماتھا ٹھنکا۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے ایلی سے بات کی۔

بولے۔ "بھئی بات یہ ہے کہ مجھے شریف نے یہاں بھیجا ہے۔"

"شریف نے؟"

"ہاں۔" وہ بولے۔ "شاید تمہیں علم ہوگا کہ شہزاد اپنے تمام بچے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

"چلی گئی ہے؟" ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

"یہاں ہم صرف اس لیے آئے ہیں کہ تم سے کہیں کہ تم شہزاد کی مدد نہ کرنا ورنہ خواہ مخواہ دقتیں بڑھ جائیں گی۔ چونکہ شریف کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں سخت کارروائی کرے گا۔"

وہ بزرگ کرنے والے دھمکیاں نہیں دیتے کر گزرتے ہیں۔"

بہرحال اس بزرگ کے آنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایلی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ڈیرہ نہیں رہیں گے اور اگلے روز ہی وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر جملہ لوگوں کو ساتھ لے کر امرتسر چلے گئے۔

طوفان

ادھر شریف چھٹی لے کر علی پور آ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ بچے بن ماں کے گھر میں

ڈھول رہ گئی ہے۔ اس کی بیوی، اور بچے تمام اسے چھوڑ کر جا چکے ہیں تو اس میں ایک عجیب تبدیلی واقع ہوئی۔ وہ شریف جس نے کبھی محلے میں سر نہ اٹھایا تھا۔ جسے کسی نے اونچی آواز سے بات کرتے ہوئے نہ سنا تھا۔ جس کی آواز تک کبھی محلے میں نہ گونجی تھی، وہ شریف احاطے کے میدان میں آ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سے کف جاری تھا۔ وہ چلا رہا تھا۔ محلے والوں کے احساس خودداری کو للکار رہا تھا۔ لوگوں کو غیرت دلا رہا تھا۔ اپنی لٹی ہوئی دنیا کا واسطہ دے کر انہیں علی احمد کے گھرانے کی خلاف ابھار رہا تھا۔

شریف کی آواز پر محلے کی عورتیں کھڑکیوں میں آ گئیں انہوں نے ہاتھ چلا چلا کر شریف کی شرافت کو سراہا۔ جو ظلم اس پر ہوا تھا۔ اس میں رنگ بھر بھر کر دے قصے بیان کئے اور شریف کو مزید ابھارا۔ اس محلے کے مرد اکٹھے ہو گئے۔

"ان کا حقہ پانی بند کر دو۔" کسی نے نعرہ بلند کیا۔

"بند کر دو، بند کر دو۔" وہ نعرہ چاروں طرف گونجا۔

عورتوں نے علی احمد کے خاندان کے جملہ لوگوں پر لعنتیں بھیجنا شروع کر دیں۔ مردوں نے ٹھنڈے سانس بھرے تو نوجوانوں نے قسمیں کھائیں۔

"محلے سے نکل جاؤ۔" وہ چلائے "نکل جاؤ۔"

گھر میں ہاجرہ، فرحت، سیدہ سب سہمی بیٹھی تھیں۔ ان کے دروازے پر پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ان کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لیکن علی احمد اطمینان سے گھر میں بیٹھے روز کا حساب کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"میں کہتی ہوں یہ علی ہی کا کام ہے۔" ایک بولی۔

"جو جو یہاں ہوتا رہا ہے، اسے دیکھ کر ہماری تو آنکھیں پک گئی تھیں۔ گند مچا رکھا تھا اس اللہ کی بندی نے۔"

"علانیہ ملتے تھے وہ دونوں ہاں۔"

"بالکل لیلین خود نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ ہم کس منہ سے بات کرتے۔"

"سچ پوچھو تو شریف کی شرافت نے جلتی پر تیل ڈالا۔ ورنہ تمہیں اتنی جرأت نہ ہوتی کبھی۔"

"وہ کہتے ہیں نا کہ برداشتن [illegible]۔"

محلے کے اس طوفان نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ علی محمد اور جرجہ سے متعلق پرانی دشمنیاں جاگ اٹھیں۔ لوگ پرانے انتقال لینے پر آمادہ ہو گئے۔ اور شریف کو خوفناک مشورے دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شریف نے شہر والوں کے بجائے نابالغ لڑکیوں کے اغوا کا مقدمہ دائر کر دیا۔ پھر نہ جانے انہیں کہاں سے خبر مل گئی کہ علی امرتسر میں چھپا ہوا ہے۔ وہ سب لاٹھیاں اٹھا کر امرتسر آ گئے۔

علی جونہی امرتسر پہنچا تو نہ جانے کیا ہوا۔ اس کے چہرے پر پھنسیاں نکل آئیں اور پھر سب پھٹ گئیں۔ ان میں سے پانی رسنے لگا۔ علی کو کسی اچھے ڈاکٹر کا پتہ نہ تھا۔ چونکہ امرتسر کا وہ علاقہ جس میں انہیں مکان ملا تھا بالکل نیا تھا۔ جس سے علی واقف نہ تھا۔ لہذا اس نے گھر سے دور جانا مناسب نہ سمجھا۔ ان کے گھر کے قریب ہی ایک جراح کی دکان تھی وہ جراح کے پاس چلا گیا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے مجھے۔" اس نے جراح سے کہا۔

"یہ کچھ نہیں ہے۔" جراح نے کہا "میرے پاس اس کا خاص علاج ہے۔" جراح نے پرانے کپڑے کا ٹکڑا سا جلایا اور جلے ہوئے کپڑے کو ان سوراخوں میں بھر دیا۔ جو علی کے منہ پر پھنسیوں کے پھوٹنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ علی نے آئینہ دیکھا۔ اس کی ہنسی نکل گئی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سرکس کا کارٹون ہو۔

وہ دکان سے باہر نکلنے لگا تو اس نے دیکھا کہ محلے کے بیسیوں افراد ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے آ رہے ہیں۔

ایک ساعت کے لئے وہ ٹھٹھکا پھر [illegible] ہو گیا۔

قریب آ کر وہ رک گئے پھر ساتھ والے دوکان دار سے کہنے لگے۔ "شیخ عثمان صاحب آپ نے ہمارے محلے کا کوئی شخص تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں تو۔" عثمان نے جواب دیا۔ پھر وہ آگے کی طرف چل پڑے۔

علی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ محلے والے اسے تلاش کر رہے تھے۔ اگر اس کا منہ نہ پھٹیوں پر جمی ہوئی دھجیاں نہ لگی ہوتیں تو نہ جانے کیا ہوتا۔

علی گھر پہنچا تو گھر کا نقشہ ہی اور تھا۔ وہ سب تاش کی گڈی سامنے رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ نفیسہ ناچ رہی تھی۔ صبیحہ اور ریحانہ ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھیں۔ ممی چپ، چپ، کر نہ جانے کیا اعلان کر رہا تھا۔ تاز تالیاں پیٹ رہی تھی۔ اور بیدی چپ چاپ کھڑا دیکھ رہا تھا۔

"واللہ کے بندو مجاہدو۔ کچھ خبر ہے۔ محلے والوں کے جتھے امرتسر کا چپہ چپہ چھان رہے ہیں۔ ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ ہاتھوں میں لاٹھیاں تھامے ہوئے ہیں۔"

"کرنے دو تلاش۔" اشتہ بولی۔ "ڈھونڈ بھی لیا تو کریں گے کیا۔"

"مجھے ملے تھے۔ ابھی۔" علی نے کہا۔ نفیسہ کی نگاہ علی کے چہرے پر طرف ہو گئی وہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ "یہ کیا حلیہ بنایا ہے چچی جان۔"

"یہ حلیہ نہ بنا ہوتا تو وہ گھسیٹ کر لے گئے ہوتے۔" علی بولا۔

لیکن وہ سب موقع کی نزاکت کو سمجھنے سے منکر تھے انہوں نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔ علی محسوس کرنے لگا جیسے وہ کسی زندہ ناچ گھر کا آمجنی کا جوکر ہو۔

صحرا میں نخلستان

اگلے روز بارہ بجے کے قریب دروازہ بجا۔

"یا اللہ یہ کون ہے۔" علی کا دل ڈوب گیا۔

"الیاس صاحب۔" کسی نے آواز دی۔

علی گھبرا گیا۔

شہزادہ اٹھ بیٹھی۔ "میں دیکھتی ہوں کون ہے۔"

"نہ نہ نہ" اس نے شہزادی کو روکا مگر وہ جا چکی تھی۔ کچھ دیر وہ دروازے میں کھڑی باتیں کرتی رہی پھر آ کر کہنے لگی "کوئی ڈیرہ کا ٹیچر ہے کہتا ہے میرا نام شیخ ہے تم سے ملنے آیا ہے۔"

"لیکن اسے ہمارے گھر کا علم کیسے ہوا؟"

"یہ نہیں مجھے معلوم۔" وہ بولی۔

علی ڈرتا ڈرتا باہر نکلا۔

"سلام علیکم۔" شیخ نے دیکھ کر چلایا۔ "بھئی بات یہ ہے کہ میں نے کل تمہیں دیکھا تھا پہلے تو مجھے یقین نہ آیا کہ یہ تم ہو۔ پھر آج میں نے تمہیں پہچان لیا۔ اس لئے ملنے چلا آیا۔"

"لیکن تم یہاں کہاں۔" علی نے پوچھا۔

"بھئی یہ ساتھ والا مکان میرا ہے۔ میں امرتسر کا رہنے والا ہوں۔ آٹھ روز سے چھٹی پر ہوں۔"

"شیخ صاحب کیا کسی اور کو بھی علم ہے کہ میں یہاں رہتا ہوں۔"

"بالکل نہیں۔" وہ بولا۔ "گھبراؤ نہیں۔ میں معاملے کی اہمیت کو سمجھتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی تمہارے متعلق خبر اخباروں میں چھپ چکی ہے۔"

"اخباروں میں؟"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "تم پر تین لڑکیوں کے اغوا کا مقدمہ درج ہو چکا ہے۔"

علی سخت گھبرا گیا۔

"اچھا ہوا تم یہاں آ گئے ہو۔" شیخ نے کہا۔ "یہ میرا اپنا محلہ ہے انشاءاللہ تمہیں کوئی زک نہ پہنچے گی۔ میرے تئے بھائی وکیل ہیں۔ چلو ان سے مشورہ کر لو۔"

سپاہی نے قہقہہ مارا۔ بولا "تم جھوٹ بولتے ہو معلوم ہوتا ہے تم نے اغوا نہیں کیا۔ بلکہ وہ تمہیں اغوا کر کے لائی ہے۔"

"جی ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "ہمیشہ عورت ہی اغوا کرتی ہے۔ لیکن مجرم مرد گردانا جاتا ہے۔ اور سزا مرد کو ملتی ہے۔"

سپاہی نے پھر قہقہہ لگایا۔ "سچ کہتے ہو میاں۔"

وہ سپاہی ایلی کا دوست بن گیا۔

"وہ کیلی چھوکری نئی ہے نا۔ بڑی جرات ہے اس میں۔" سپاہی نے کہا۔

"ان سب میں بڑی جرات ہوتی ہے۔" وہ بولا۔

وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

شہزادی نے کچہری میں حلفیہ بیان درج کرایا۔ لیکن جب وہ باہر نکلی تو آصفی محلے کے ایک جتھے نے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔ شہزادی دیکھ کر پھر سے مجسٹریٹ کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"مجھے دشمنوں سے خطرہ ہے۔ میری حفاظت کا انتظام کر دیجئے۔ مجسٹریٹ نے دو سپاہی ساتھ کر دیے۔ مقبرے پر جا کر وہ تانگے سے اتر گئی۔

محلے والے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ مقبرے میں آ گئے۔ سپاہی نے بڑھ کر ان کا راستہ روک لیا۔ "کسے ڈھونڈ رہے ہو۔" وہ بولا۔

"یہاں ایک عورت اتری تھی۔" انہوں نے جواب دیا۔

"وہ تو ادھر گئی ہے۔" سپاہی نے سڑک کی دوسری طرف اشارہ کیا اور وہ ادھر چلے گئے۔

"آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ سپاہی بولا۔ "یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔"

"ہم خود چلے جائیں گے۔ شہزادی نے جواب دیا۔

"تو تو چلی جائے گی۔ لیکن یہ" سپاہی نے ایلی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے تو ساتھ

رلی ہے۔"

"ایسوں کو ہی ساتھ لایا کرتے ہیں۔" وہ بولی۔

رم پورہ

سپاہی نے قہقہہ لگایا۔ "بھئی وہ بیاجوڑی ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

مہینہ بھر وہ امرتسر میں رہے۔ ایلی باہر نکلتا تو اس کے منہ پر دھجیوں کی سیاہ داڑھی چھپی ہوتی اور سر سے پاؤں تک ایک کمبل لپٹا ہوتا۔ بازاروں میں گھومتے ہوئے کئی بار اس نے محلے والوں کے گروہ دیکھے جاتے اور ڈر کی وجہ سے اس کا دل اچھل کر گلے میں آ گیا تھا۔ چار ایک بار وہ پکڑے بھی گئے تھے لیکن حسب دستور ایلی کو شہزاد نے مقبرے میں چھپا دیا تھا۔

جب ایلی گھر آتا تو گویا نقشہ ہی بدل جاتا۔ وہاں پہنچ کر وہ محسوس کرتا جیسے وہ پکنک پر آئے ہوں اور ان کی زندگی میں خطرے یا مشکل کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو۔

سارا دن وہ بیٹھ کر تاش کھیلتے اور جو ہارتا اسے چور بناتے۔ اس کے لئے نوکھی سزائیں تجویز کرتے اور پھر قہقہے لگاتے۔ لڑکیاں تالی بجا کر چلتیں بات بات پر ہنستیں۔ مل کر گیت گنگناتیں۔ بچے تالیاں بجاتے وہ سب قطعی طور پر اس خطرے سے بے نیاز تھے۔ جو ان کے سر منڈلا رہا تھا ادھر شریف کے ساتھیوں نے سارا امرتسر چھان مارا۔ لیکن انہیں ایلی اور شہزاد کے چھپنے کی جگہ کا علم نہ ہو سکا۔ شیخ نے ہر ممکن طریق سے ان کی مدد کی۔ ان کے بھائی نے انہیں قانونی مشورے دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شریف کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور پھر سے اس پر قنوطیت چھا گئی جو اس کی طبیعت کا بنیادی جزو تھی۔ اور ایک روز وہ چپکے سے روپوش ہو گیا۔ اس پر محلے والے بگڑ گئے۔ انہیں یہ شکایت تھی کہ جب خود شریف میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے تو ہم کہاں اس کی خاطر دنیا بھر کی دشمنی مول لیں۔ اس لئے وہ بھی میدان چھوڑ کر چلے گئے۔

محلے والوں نے ڈیرہ اخباروں میں جو جو خبریں ایلی کے متعلق چھپوائی تھیں۔ انہیں

دیکھ کر وہ بھی خود ڈر گیا تھا۔ سکول کو بدنامی سے بچانے کے لیے اس نے کوشش کر کے علی کا تبادلہ کرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس لمبی رخصت کے دوران علی ڈیرہ سے رام پورہ تبدیل ہو گیا۔ یہ تبادلہ علی کے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔

رام پورہ بنیادی طور پر لاہور کے قریب ایک قصبہ تھا۔ لیکن شہر کے پھیلاؤ کی وجہ سے اب وہ لاہور کی بستی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اگر وہ ڈیرہ ہی میں مقیم رہتے تو علی اپنے مکان کو خفیہ نہ رکھ سکتا۔ لیکن لاہور میں اپنے مکان کے یا جوئے فلوٹ کو صیغہ راز میں رکھنا کچھ مشکل نہ تھا۔

اسی وجہ سے ایک ماہ کی رخصت کے بعد علی نوکری پر حاضر ہو گیا۔ اس نے ایک علیحدہ مکان کرایہ پر لیا جو لاہور کی ایک اور بستی میں، رام پورہ کی مخالف سمت میں واقع تھی۔

اگرچہ طوفان گزر چکا تھا پھر بھی لکیر ابھی تازہ تھی۔ علی ڈرتا تھا کہ نہ جانے کب طوفان پھر سے چلنے لگے۔ اس لیے وہ بے حد محتاط تھا۔ اس کی یہ احتیاط ادراک کی وجہ سے نہیں بلکہ ڈر کی وجہ سے تھی۔ وہ بنیادی طور پر بے حد بزدل واقع ہوا تھا۔

وہ سب مقدمات جو شریف نے ان کے خلاف دائر کر رکھے تھے۔ عدم پیروی کی وجہ سے داخل دفتر ہو چکے تھے۔ لیکن محکمے میں علی کی بے حد بدنامی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ افسر اعلیٰ معروف صاحب نے علی کے والد کو خط لکھ کر متنبہ کر دیا تھا کہ ان حالات کے تحت وہ علی کی امداد کرنے سے قاصر ہیں۔

جب وہ پہلے روز رام پورے کے مدرسے میں حاضر ہوا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے چارج دینے سے انکار کر دیا۔ بولے "ہم نے آپ کا کیس ڈائرکٹر بہادر کو بھیج دیا ہے۔ جب تک وہ کوئی فیصلہ نہ کریں ہم آپ کو چارج نہیں دے سکتے۔"

چار ایک روز کے بعد ہیڈ ماسٹر نے علی کو بتایا کہ مسٹر معروف نے اسے ترو یے سے بلایا ہے لہٰذا اسے بڑے دفتر میں جانا چاہیے۔

معروف اور راغب

مسٹر معروف سے یلی کا دوسرا انٹرویو تھا۔ چند ایک سال قبل جب دفتر میں وہ نوکری کرنے آئے تھے اور یلی اور مسٹر معروف کو دیکھ کر محسوس کرتا تھا جیسے اس کے روبرو ایک خوش مذاق رنگیلی عورت بیٹھی ہو۔ اس کے دل میں ذرہ بھر خوف پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"کیا یہ سچ ہے آپ کے خلاف اخباروں میں خبریں نکلی ہیں۔" معروف بولے۔

"جی مجھے نہیں علم۔"

"کیا آپ نے گزشتہ دنوں میں اخبار نہیں دیکھے۔"

"جی نہیں۔"

"کیوں۔"

"جی میں چھٹی پر تھا۔"

"آپ نے کس سے چھٹی لی تھی؟"

"جی دفتر کے ہیڈ سے۔"

"تو آپ نے چھٹی میں کیا کیا؟"

"گھر بیٹھا رہا۔ منہ ہاتھ نہیں دھویا۔ کوئی کام نہیں کیا۔ تاش کھیلتا رہا۔"

"ہوں۔" وہ بولے "تاش کا کون سا کھیل کھیلتے رہے؟"

"جی چوسر بازی۔"

ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکی۔ لیکن انہوں نے ضبط سے کام لیا۔

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ پر اغوا کا الزام ہے۔"

"جی مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔

"ہم جو آپ کو بتا رہے ہیں۔" وہ غصے میں بولے۔

"کسی عورت نے مجھے بتایا۔ بہرحال۔"

"تو آپ کو کوئی سمن نہیں ملا۔"

"جی نہیں۔"

"آپ کچہری میں حاضر نہیں ہوئے۔"

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔

"تو وہ خبریں یوں ہی چھپیں۔"

"جی مجھے معلوم نہیں۔"

"آپ کو علم ہونا چاہیے" یا ان صاحب کو اس خاتون کے شوہر نے مجھے سب باتیں کہی ہیں۔"

"ممکن ہے۔" وہ بولا "مجھے اس کا علم نہیں۔"

"کیا آپ نے اس کی بیوی کو اغوا کیا ہے۔" وہ غصے میں بولے۔

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ میرے روبرو جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر کون کیا ہے؟ سچ سچ بتائیے ورنہ میں سخت کارروائی کروں گا۔"

"جی حقیقت یہ ہے کہ اس کی بیوی نے مجھے اغوا کیا ہے۔"

معروف صاحب کی ہنسی نکل گئی۔

"آپ عجیب آدمی ہیں۔" وہ بولے۔

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں ایک عام آدمی ہوں۔"

"لیکن آپ بھی مفرور رہے تھے۔ معروف صاحب پھر سنجیدہ ہو گئے۔ "کہ آپ چھٹیوں میں تاش کھیلتے رہے۔"

"سچ عرض کیا ہے میں نے۔"

"کس سے تاش کھیلتے رہے۔"

"جی ان سے جنہوں نے مجھے اغوا کیا ہے۔"

"وہ کون کون ہیں۔"

"جی چھ بچے اور ان کی ماں۔"

"تو کیا یہ سچ ہے کہ وہ چھ بچوں کی ماں ہے۔"

"جی ہاں۔"

"آپ عجیب بے وقوف ہیں۔ اگر اغوا ہی کرنا تھا تو کسی لڑکی کو کرتے خواہ مخواہ آپ نے اتنے بڑے کنبے کا بوجھ اٹھایا۔"

"جی کوئی لڑکی مجھے اغوا کرنے کو تیار نہ تھی۔ سوائے اس چھ بچوں کی ماں کے۔"

"شٹ اپ۔" معروف نیم خفگی نیم مذاق سے بولے۔ "جاؤ اگرچہ آج بچے، یاد رکھیے۔ اگر پھر آپ کی رپورٹ آئی تو آپ کو سسپنڈ کر دوں گا۔"

معروف کے بعد رہ پورے کے ہیڈ ماسٹر راغب صاحب نے اسے اپنے دفتر میں بلایا۔ راغب صاحب ایک دبلے پتلے چلتے آدمی تھے۔ ان کا چہرہ ہنستا تھا مگر ہنستا ہی نہیں تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں ناک یوں ابھری ہوئی تھی جیسے سمندر سے موٹی سی چٹان جھانک رہی ہو۔ ایلی نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ وہ معروف سے برعکس قسم کی شخصیت تھے۔

"آصفی صاحب" وہ بولے "اگرچہ معروف صاحب نے آپ کو اجازت دیدی ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ میرے سکول میں کام کریں۔"

"معروف صاحب نے مجھے اجازت نہیں دی۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" وہ بولے۔

"معروف صاحب نے فرمایا ہے کہ راغب صاحب کی مرضی کے بغیر ہم کچھ نہیں کریں گے۔"

"لیکن۔۔۔لیکن" وہ رک گئے۔ "اچھا مجھے اس کا علم نہ تھا۔"

"معروف صاحب نے صاف کہہ دیا تھا۔" ایلی نے کہا۔ "میں اجازت دینے والا کون ہوں کام رغب صاحب نے لینا ہے۔"

"خوب خوب۔" وہ خوشی سے چلائے۔ "تو ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ آپ اس مدرسہ میں کام نہیں کریں گے۔"

"جیسے بھی آپ مناسب سمجھیں۔" ایلی نے کہا۔

"دیکھئے نا ہم بدنام آدمی کو اپنے سکول میں نہیں رکھ سکتے۔ ہم اپنا ڈسپلن خراب نہیں کریں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی لیکن رغب صاحب بدنام آدمی ڈسپلن خراب نہیں کر سکتا۔"

"آپ کا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ شرارت وہ لوگ کرتے ہیں جن پر شبہ نہ کیا جا سکے۔ یعنی جن کا عمل نامہ صاف ہو ورنہ ان پر حرف نہ آ سکے۔ بدنام آدمی تو اپنا جرم تحفظ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تو کانچ کے گلاس کی طرح ہوتا ہے۔ ذرا ضرب لگی اور ٹوٹ گیا۔"

"کیا آپ مجھے عقل سکھانے آئے ہیں۔"

"جی نہیں۔" وہ بولا۔ "مجھ میں تو خود عقل نہیں میں کیا عقل سکھاؤں گا کسی کو۔"

"کیا مطلب؟" وہ چلائے۔

"جی عقل ہوتی تو کیا چھ بچوں کی والدہ کو اغوا کراتا۔"

"تو کیا یہ سچ ہے؟" وہ بولے۔

"ہاں جی اور یہی میری بے وقوفی دلیل ہے۔"

رغب صاحب بوکھلا گئے۔

اگلے روز رغب صاحب نے معروف صاحب سے شکایات کی وضاحت کی درخواست کرتے ہوئے ٹیلی فون پر انہیں بتایا کہ ایلی آصفی کے بیان کے مطابق انہیں اس بات کا حق دیا گیا تھا کہ اس امر کا فیصلہ کریں کہ آیا رام پورہ کے سکول میں

الیاس کام کرتے ہیں یا نہیں۔

معروف فوراً بھانپ گئے کہ وہ بات جو انہیں کہنی چاہیئے تھی۔ ایلی نے از خود رغبت سے کہہ دی ہے۔ اس بات پر وہ بے حد مسرور ہوئے اور بولے۔ یہ ٹھیک ہے، رغبت میں ہمارا مشورہ ہے کہ آپ الیاس کو اپنے پاس رکھنے پر رضامندی دے دیں وہ ایک قابل شخص ہے۔ آپ کو کام سے تعلق ہے نا عورتوں کے اغوا سے تو نہیں۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی نے رامپور میں کام شروع کر دیا۔

جھوٹ سچ۔

ایلی نے زندگی میں نئی بات سیکھی تھی۔ وہ سچ کے ذریعے جھوٹ بولنا تھا۔ اس نے تجربے کے زور پر اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ سچی بات کہہ دی جائے تو سننے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اسکے دل میں نفرت کی بجائے دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور کبھی کبھار احترام بھی۔ اس کے علاوہ کہنے والے کے دل پر بوجھ نہیں رہتا۔ اور بات کہہ دی جائے تو ہو چھوڑ نہیں سکتی۔ اس میں پیچ نہیں پڑتے۔ بعض وقت تو یہ ہوتا ہے کہ سچی بات کو علانیہ تسلیم کر جائے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ مذاق کر رہا ہے انہیں یقین ہی نہیں آتا۔ شاید ایلی نے یہ انوکھا طریقہ شہزاد سے سیکھا ہو۔

بہر صورت جب ساتھ والوں سے ملے تو اخباری خبروں کی بات چھڑ گئی۔ ایک صاحب خفا ہوئے۔ جی ان اخبار والوں کا کیا ہے۔ جو جی چاہتا ہے الاپ شناپ لکھ دیتے ہیں۔ سچ تھوڑے ہی لکھتے ہیں۔" "کیوں میاں صاحب۔"

"اپنا تجربہ تو مختلف ہے۔" ایلی نے کہا۔

"کیا مطلب؟" ایک اور صاحب بولے۔

"مطلب یہ ہے کہ میرے متعلق آج تک صرف ایک خبر چھپی ہے انہوں نے اور وہ سو فیصد سچی ہے۔"

"رہے۔" وہ چلائے "کیا واقعی؟"

"تو کیا جو خبریں آپ کے متعلق چھپی تھیں۔ وہ درست ہیں۔" ایک صاحب نے پوچھا۔

"بالکل۔" ایلی نے جواب دیا۔

وہ حیرت سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کہیں وہ ایک مسکرا رہے تھے۔ وہ ایک تحسین بھری نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"تو آپ نے چھ بچوں کی ماں کو اغوا کر لیا۔" ایک نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" وہ بولا۔

"ہائیں۔ ابھی تو کہہ رہے تھے ____"

"خبر تو سچی ہے مگر درمیان میں کچھ غلطی رہ گئی ہے۔" ایلی نے کہا۔

"کیا؟"

"یہ کہ چھ بچوں کی ماں نے مجھے اغوا کر لیا ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"ہی ہی ہی ____" ایک قہقہہ بلند ہوا۔

ایلی اچھی طرح جانتا تھا کہ ہر کسی بات پر لوگ قہقہہ مار کر ہنس دیں تو بات پھیکی ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس نے اس موضوع پر ایک لیکچر دینا شروع کر دیا کہنے لگا "بھئی یہ مردوں کی قوم پر عورتوں کی قوم ہمیشہ ظلم کرتی آئی ہے۔ وہ ہمیشہ مردوں کو اغوا کرتی رہیں اور نام بدنام ہوتا رہا ہے۔ مرد کو مجرم گردانا جاتا رہا۔ مرد جیل جاتا رہا مرد قید کاٹتا رہا مرد معصوم ہوتا ہے۔ تعزیرات ہند کی اغوا کی دفعہ لکھتے وقت مصنف کی بیوی بھی پاس بیٹھی تھی۔ اس ظالم نے ساری دفعہ ہی غلط لکھوا دی۔"

مرد و عورت کی بات کرتے وقت ایلی یوں محسوس کیا کرتا تھا۔ جیسے وہ خشکی سے تیر کر پانی میں جا پہنچا ہو۔

"قتل تو نہیں۔" صفیہ ہنستی۔ "کانوں پر صرف بال ڈالے ہوئے ہیں۔"

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"دل تو اچھا ہے نا ای۔" وہ قہقہہ مار کر ہنستیں۔

پھر وہ سب جھرمٹ ڈال کر اس کے گرد آ کھڑی ہوتیں اور تالیاں پیٹتیں گاتیں ہنستیں۔

ایلی کہتا۔

"شور نہ مچاؤ۔ اگر کسی کو ہمارے گھر کا پتہ چل گیا تو۔"

"تو کیا۔" وہ جواب دیتیں۔ "یہی نا کہ وہ چٹھی لکھ دے گا ہمیں اور چٹھی رساں چٹھی لے آئے گا اور ہم پڑھ لیں گے۔"

"اور اگر کسی نے آ کر تمہیں چوٹی سے پکڑ لیا تو۔" ایلی چلاتا۔

"تو چوٹی کاٹ ڈالیں گے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں۔

ان کی زندگی میں ایک مشکل تھی۔ جو روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

ایلی کی تنخواہ صرف سینتالیس روپے تھی۔ ایلی اس زمانے میں جوان ہوا تھا۔ جب پہلی عالمی جنگ کے اثرات رونما ہوئے تھے اور دنیا بھر میں مالی بحران کا دور دورہ تھا۔ بنیادی طور پر ایک گریجویٹ کا گریڈ اسی روپے سے شروع ہوتا تھا۔ لیکن مالی بحران کی وجہ سے گورنمنٹ کے ملازمین کی تنخواہوں میں تخفیف کر دی گئی تھی اور اسی کی جگہ اب پینسٹھ روپے، ایم اے بی ٹی کو دیے جائیں۔ اس سے ایلی کی تنخواہ پینتالیس روپے سے شروع ہوئی تھی۔ اور اب وہ سینتالیس روپے پر رکا تھا۔ سینتالیس روپے اتنے بڑے کنبے کے لیے بے حد ناکافی تھے۔ خصوصاً ایک ایسا کنبہ جو مالی مشکلات کے تصور سے ہی بیگانہ تھا۔

ان کے پاس جو اثاثہ تھا وہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ شدت سے مالی مشکلات کو محسوس کرنے لگے تھے۔ اس امر کو صرف ایلی ہی محسوس کرتا تھا۔ لڑکیاں اس بات سے بے نیاز واقع ہوئی تھیں۔ روایتی ملا کی طرح وہ سوچتی تھیں کہ غریبوں کو اگر

کھانے کو روٹی نہیں تھی تو وہ کیک پیسٹری کیوں نہیں کھاتے۔

بہر حال یہ امر مسلمہ تھا کہ گو رومانی مشکلات کا احساس ان کے گھر میں صدر دروازہ سے داخل نہ ہوا تھا۔ تو عقبی دروازے سے ضرور داخل ہو رہا تھا۔ لاشعوری طور پر جانے بغیر ان کی زندگی میں ان جانی تلخی بڑھنے لگی تھی۔

''ڈاب بات''

لاہور میں صرف ایک آدمی تھا۔ جو ان کے مکان سے واقف تھا۔ وہ تھا محمود۔ کبھی کبھار محمود آ نکلتا اور ایلی کو نیم کی باتیں سناتا اور کالج کے قصے بیان کرتا۔ محمود حرکتوں سے پولک ہونے کے باوجود گھر میں یوں رہتا تھا۔ جیسے الف لیلیٰ میں شہزادیوں کے جھرمٹ میں سلطان رہتے۔ اشارے تالی بجانے پر حبشی جلاد ہاتھ میں تلوار لئے حاضر ہو جاتا۔ لیکن کبھی کبھار ایلی کو شک پڑتا کہ محمود میں بھی ایک ایلی چھپا ہوا ہے۔ جو ممتا بھری گود میں لیٹنے کے لئے بلکتا ہے۔ جسے یہ آرزو ہے کوئی اس کی دیکھ بھال کرے۔ اس کی ناک پونچھے منہ دھوئے اور پچکارے پیار سے جھڑک کر سکول بھیج دے۔ ایلی جذباتی طور پر ڈرا ہوا بچہ تھا اور ذہنی طور پر ایک مفکر۔

ایک روز وہ سب بیٹھے تھے تو محمود آ گیا۔ اس کے ساتھ ساڑی میں لپٹی ہوئی ایک گوری چٹی عورت تھی۔ جسے اس نے اندر بھجوا دیا۔

''ارے یہ کون ہے۔'' ایلی نے پوچھا۔

''یہ بھی ہے۔'' محمود بولا۔

''کوئی نئی پھنسی ہے؟''

''پھنسی ہی رہتی ہیں۔ اب ایک کام کرو۔'' محمود بولا۔

''کیا؟''

''ایک مولوی بلوا دو۔''

''بھئی نکاح پڑھوانا ہے۔''

"اور وہ میم کیا ہوئی؟"

ایلی ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر ایک مولوی لے آیا۔

مولوی صاحب پہلے تو محمود کو کلمے پڑھاتے رہے۔ پھر جب ایجاب و قبول کا وقت آیا تو مولوی صاحب نے کہا۔ "کیا آپ کو محمود ولد محمد سکندر رامپوری کی زوجیت میں آنا قبول ہے؟"

وہ خاتون بولی "ہم کو منظور ہے۔"

اس پر لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

ایلی نے حیرت سے خاتون کی طرف دیکھا۔ "ارے آپ تو میم ہیں۔" وہ بولا۔

میم نے کہا "ہم "ڈول ہاٹ" ہے میم ہاتیں۔"

مولوی کے جانے کے بعد ایلی کے گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ لڑکیاں میم کے سہاگ گانے لگیں۔ اسے چھیڑنے لگیں۔ میم ہنسے جا رہی تھی۔ محمود مسکرا رہا تھا۔ شہزاد کی آنکھوں میں مسرت کی پھوار پڑ رہی تھی۔

محمود اور میم کے نکاح کے پندرہ روز بعد محمود بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا۔ "ایلی۔" وہ بولا "وہ نہیں آئی!"

"کون نہیں آئی۔" ایلی نے پوچھا۔

"آج ایک ہفتہ ہے۔" وہ بولا "ہر ایک اتوار کو وہ آیا کرتی ہے۔ باقاعدہ لیکن اب کی بار نہیں آئی۔"

ایلی نے قہقہہ لگایا۔ "تم تو پاگل ہو۔" وہ بولا "خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو جیسے وہ بچی ہو۔"

"تم نہیں جانتے۔" وہ ہنسنے لگا۔ "واقعی وہ بچی ہے۔"

"بچی ہے۔" ایلی ہنسا۔

"ہاں۔" محمود نے کہا "یہ سب بچیاں ہوتی ہیں۔ ان کی عمر نہ دیکھو شکل نہ دیکھو

صورت نہ دیکھو۔ یہ سب بچیاں ہوتی ہیں اور تبھی تک ٹھیک رہتی ہیں جب تک ان پر بچی حاوی رہے۔"

"لیکن گھبرانے کی کیا بات ہے۔" ایلی بولا "گھبرانے کی بات تو ہے۔" محمود نے کہا "وہ آئی جو نہیں۔"

"مجھے سمجھ میں نہیں آتی بات۔"

ڈر گئیں

"مجھے بھی نہیں آتی نا" محمود نے کہا "میرا دل کہہ رہا ہے کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔"

دو روز محمود میم کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہ آئی۔ پھر وہ نئے شہر چلا گیا۔ وہاں جا کر اپنا آپ ظاہر کئے بغیر اس نے حالات کا جائزہ لیا معلوم ہوا کہ وہ وہاں موجود نہیں۔ اس پر وہ گھبرا گیا۔

مزید پوچھ گچھ پر اسے معلوم ہوا کہ ایک صاحب اسے ساتھ لے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اسے کچھ علم نہ ہو سکا۔

لاہور واپس آ کر وہ سیدھا ایلی کے پاس آیا۔ "غضب ہو گیا۔" وہ بولا۔ "وہ نئے شہر میں بھی نہیں ہے۔ کہتے ہیں کوئی گورا صاحب اسے آ کر لے گیا ہے۔"

"کیا زبردستی لے گیا ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"بھئی۔" وہ بولا "اسے کوئی زبردستی لے جائے تو اس کے لئے اس سے بڑھ کر رومینس کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی ایسی ہوتی ہیں۔ پہلے روتی ہیں۔ چیختی ہیں چلاتی ہیں پھر غم سے نڈھال ہو کر لے جانے والے سے چمٹ جاتی ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

"کس کی بات کر رہے ہو۔" ایلی نے پوچھا۔

محمود خاموش رہا۔ "کیا میموں کی بات کر رہے ہو۔" ایلی نے پھر پوچھا۔

"نہیں۔" وہ بولا "عورت ہمیشہ عورت رہتی ہے۔ چاہے وہ میم ہو دیسی ہو یا حبشن ہو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

محمود کی بات صحیح نکلی چند ہی دنوں کے بعد اسے ایک خط موصول ہوا جس میں درج تھا۔

"مجھے پچھی سے معلوم ہے کہ تم غنڈوں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتے ہو اور تم نے ایک برٹش نیشنل خاتون کو عرصہ دراز سے اغوا کر رکھا ہے اور تم نے اسے زبردستی مسلمان کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور دھوکے سے اس کے ساتھ عقد کیا ہے۔ حالانکہ تعزیرات ہند کے تحت کوئی ہندوستانی کسی برٹش نیشنل خاتون سے شادی نہیں کر سکتا۔ جب تک خاص اجازت نامہ حاصل نہ کرے لہذا تم اور تمہارے دوست دھوکہ دہی اور اغوا کے مرتکب ہوئے ہو اور میں تمہارے خلاف قانونی چارہ جوئی سے گریز نہیں کروں گا اور اگر تم نے اس خاتون سے دوبارہ ملنے کی کوشش کی تو اپنے اختیارات کو کام میں لا کر میں تمہیں کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔

اس کے نیچے لمبے چوڑے دستخط کیے ہوئے تھے۔ نیچے لکھا تھا کمشنر جے پور۔

"ارے۔" گل چلائی۔ "وہ تو کوئی کمشنر ہے۔"

"یہی مصیبت ہے۔" محمود بولا "وہ اسے اغوا کر کے لے گیا ہے۔ اس کی مدت سے آرزو تھی کہ کوئی اسے زبردستی اغوا کر کے لے جائے پھر جب تم ان سب کو لے آئے اور اس نے یہ قصہ سنا تو گویا جلتی پر تیل پڑ گیا وہ بھی بھڑک اٹھی۔ اس کی یہ خواہش اور بھی مچلی اور اب یہ بانکا نہ جانے اسے کہاں سے مل گیا ہے۔"

محمود سخت گھبرایا ہوا تھا۔

محمود کے کہنے پر ایلی جے پور گیا ____ تاکہ وہاں سے کوائف حاصل کرے۔ پہلے تو وہ شہر کا جائزہ لینے میں مصروف رہا۔ پھر اس نے کمشنر کی کوٹھی کا پتہ لگایا اور وہاں پہنچ کر وہ انتظار کرتا رہا کہ کب کمشنر دفتر جائے تو کوٹھی کے کسی نوکر سے ملے آخر کمشنر کی کار کوٹھی سے باہر نکلی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ کوٹھی کے آؤٹ ہاؤس کی طرف گیا اور چوکیدار کو پانچ روپے تھما دیے۔ "بابا صاحب کس قسم کا آدمی

ہے؟"

"تو بابا نے جواب دیا۔ "یہ صاحب تو سمجھ لو آفت ہے آفت۔"

"کیا سخت مزاج ہے۔"

"نہیں بابا یہ تو بد ہے بد۔ سارا دن بیٹھ کر شراب پیتا ہے۔ سارا دن۔"

"کیا عمر ہوگی؟"

"بوڑھا ہے۔ لیکن سخت زندگی ہے۔ شرابی بھی۔"

"ایک بات بتاؤں بابا۔" ایلی نے کہا اور پھر قدرے توقف کے بعد اس نے چوکیدار سے کہا۔

"تمہارا صاحب ایک مسلمان عورت کو بھگا لایا ہے۔ نئے شہر سے۔"

"نہ بابو۔" وہ بولا "یہاں ایسی ویسی عورت کبھی نہیں آئی یہاں تو میمیں آتی ہیں۔ جوان بوڑھی ادھیڑ سبھی آتی ہیں۔"

"لیکن بابا۔" ایلی نے کہا "وہ ہے تو میم مگر مسلمان میم ہے۔"

"بابا قہقہہ مار کر ہنسا۔"

"سچ کہتا ہوں بابا۔" ایلی نے کہا۔

"نہ بھئی۔" وہ بولا "میم مسلمان نہیں ہوتی۔ ان میموں کا اسلام سے کیا مطلب۔"

ایلی نے بابا کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے ذہن میں میم کا مسلمان ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ اس لئے ایلی کی تجویز ناکام ہوگئی۔

"اچھا۔" وہ بولا "بابا ایک کام تو کرو مجھے اس میم کے سامنے لے چلو۔ جو اس وقت صاحب کے گھر میں ہے۔"

"نہیں۔" بابا نے جواب دیا۔ "گھر میں جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔"

"تو چلو باہر سے جھانکوں گا۔"

بابا کو یہ بات بھی منظور نہ تھی۔ بولا "نہ بابو۔ وہ دیکھ لے یا اسے پتہ چل جائے تو کھ

جائے گا۔

"بہت سخت ہے ہو۔"

بہرحال میں نے کوٹھی کے باہر۔۔ ایک چکر لگایا کوٹھی چاروں طرف سے بند تھی۔ اس نے کھڑکیوں کے شیشوں سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن اندر دبیز پردے لٹک رہے تھے۔

ابھی وہیں کھڑا تھا کہ خانساماں کا لڑکا آ گیا۔

وہ مجھ کو گھورنے لگا۔

میں نے اس سے پوچھا "کوٹھی میں کوئی ہے یا؟"

"نہیں بابو۔" وہ بولا "صاحب اکیلے ہی رہتے ہیں۔"

"کوئی مہمان عورت تو نہیں آئی ہوئی؟"

"نہیں۔" وہ بولا۔

"جھوٹ نہ بولو۔" میں نے کہا۔ مجھے معلوم ہے۔"

"ہاں۔" لڑکے نے قبول کرتے ہوئے اشارہ کیا۔ "پر وہ بند ہے۔"

"بند ہے۔" میں بولا۔

"ہاں۔" لڑکے نے ڈرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر کہا "صاحب تالہ لگا کر جاتا ہے۔"

ابھی وہ بات ہی کر رہے تھے کہ موٹر کے آنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سب بھاگ کر آؤٹ ہاؤس کی طرف چلے گئے۔ تا کہ صاحب انہیں دیکھ نہ لے۔ میں نے دور سے چھپ کر دیکھا۔ ڈاکٹر نگینیں ادھیڑ عمر ختم کر چکا تھا۔ اس کا جسم بھدا تھا۔ چہرے پر شراب نوشی کے واضح آثار تھے اور اس کے ساتھ ہی جابرانہ رجحانات مترشح ہو رہے تھے۔ اس کی شکل و صورت ان فلمی غنڈوں کی سی تھی۔ جو ہیروئین کو اٹھا کر لے آتے ہیں اور اسے قلعے کے زیرین کمرے میں مقفل کر دیتے ہیں۔

محمود نے جب یہ سنا تو اس نے سر پیٹ لیا۔ "بس سمجھو قصہ ختم ہو گیا۔ اسے تو دیر سے یہ خواہش تھی کہ کوئی خاص قسم کا جابر آدمی اسے پکڑ کر لے جائے اور کسی قلعہ میں قید کر دے۔" محمود کی بات سچ ثابت ہوئی۔ میم نے اسے ملنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ ممکن ہے اسے کوشش کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا ہو۔ وہ بھی رخصت پر رہی اس کے نئے شوہر نے بھی نہ کی۔ بلکہ وہیں سے ڈارکنیس نے بڑی قلم سے درخواست بھیج دی جس میں تحریر تھا کہ مسٹر فلپ (سابقہ) کو ریٹائر کر دیا جائے اور جو جو تو اس سے واجب ادا ہیں ان کی تفصیل بھیج دی جائے۔

مسٹر ڈارکنیس خود پنشن پا رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ماہ کے اندر اندر وہ دونوں ہندوستان چھوڑ کر ساؤتھ افریقہ چلے گئے اور سنا ہے وہاں لے پالک ہو رہیں ہیں اور بے بس جیف حالات کا منہ تکتا رہا۔

لذتِ مظلومیت

شاید اس لئے کہ وہ جسم بانٹے تھا یا ویسے ہی شریف ایک مظلوم شخص تھا۔ اس نے فطرتاً یا عادتاً اپنی تمام تر ہستی کا انحصار اپنی مظلومیت پر استوار کر رکھا تھا۔ پہلے وہ نور کے عشق میں سرشار تھا۔ اس حد تک سرشار تھا کہ شہزادی رنگیلی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی مظلومیت کی لذت میں کھویا رہا۔ یہ کہنا کہ اسے شہزادے سے محبت نہ تھی غلط ہوگا۔ اسے واقعی شہزادے سے محبت تھی۔ اسے شہزادی پر ناز تھا۔ وہ اس کی رنگینی سے واقف تھا۔ وہ شہزادے کے لئے بھی چھوڑنے کو تیار تھا۔ لیکن مظلومیت کے احساس کو وہ نہ چھوڑ سکتا تھا یہ احساس اس کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ سالہا سال کے عشق نے اسے اور بھی جامد کر دیا تھا۔ اب وہ سمجھتا تھا اپنی مظلومیت اور ناکام عشق کا پرچار کرتا تھا۔ اسے خیال نہ آیا تھا کہ ایک رنگین بیوی کی موجودگی میں کسی اور عورت کے عشق میں آہیں بھرنا اچھے نتائج پیدا نہیں کرتا۔

شریف کو یقین تھا کہ خود شہزادی اس کے عشق میں گرفتار ہے۔ چونکہ اسے رنگیلی کے

مینڈک کی بات نہ بھولی تھی۔

بہر صورت نورے عشق کی ناکامی تو اس کے لیے ایک رنگین غم تھا چونکہ ذہنی طور پر شریف ایک سچا مخلص عاشق نہ تھا۔ بلکہ ایک سچے عاشق کی طرح ہجر پسند واقع ہوا تھا۔ نورے سے محروم ہو جانے پر اسے صدمہ تو ضرور ہوا ___ مگر وہ صدمہ ایسے ہی تھا جیسے بطخ کے لیے پانی کا طوفان ہوتا ہے۔

شہزاد اور بچوں کا اپنی مرضی سے شریف کے گھر سے نکل آنا شریف کے لیے ایک شدید صدمہ تھا۔ ایک ایسا صدمہ جس میں رنگینی کا عنصر نہ تھا۔ لیکن اس میں خفت اور رسوائی تھی۔ ایسی رسوائی جو عشق کی رسوائی سے قطعی طور پر مختلف ہوتی ہے۔ لہذا اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اور اس دورے کے تحت وہ اپنے آپ سے باہر نکل آیا تھا۔ اور محلے میں آکر اس نے غیر معمولی آگ لگا دی تھی۔

کچھ دیر کے بعد جب ہسٹیریا کی شدت مدھم پڑ گئی تو اس نے محسوس کیا کہ اس رویے سے تو رسوائی اور بھی بڑھ رہی تھی۔ اس کی بنیادی [illegible] نے اسے پکارا اور وہ چپ چاپ پٹی پور سے روانہ ہو گیا اور اپنی نوکری پر حاضر ہو گیا۔

اس صدمہ کی شدت کے ختم ہونے پر شریف نے محسوس کیا کہ وہ ٹیس ٹیس درد جو باقی رہ گیا تھا۔ اس کے لئے باعث تسکین ہے۔ ایک غم خور کو گویا ہمیشہ کے لیے غم کی ایک دولت گویا مل گئی تھی۔

اس دولت کو پا کر وہ اپنے پرانے کونے میں گھس گیا اور اس نے اپنی طبیعت قنوطیت کا لبادہ اوڑھ لیا۔

غم خور کے لیے سب سے بڑی ضرورت ایک ایسے ساتھی کی ہوتی ہے۔ جس سے اظہارِ غم کیا جا سکے۔ اپنی محرومیت اور زمانے کے مظالم کا رونا رویا جا سکے اس نے شریف نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی پرانی زندگی کو قطعی بھول جائے گا اور ایک نیا ورق الٹے گا۔ یہ نیا ورق ایک نئی شادی اور نئی بیوی تھی۔ لیکن یہ بات اپنے منہ سے کہہ

دینا یا شعوری طور پر اس پر سوچنا ایک غم خورے کے لیے ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اس نے جلد ہی ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اس کی ہمشیرہ نے یہی تجویز بھائی کے سامنے پیش کر دی اس پر وہ حیرت سے بہن کا منہ تکنے لگا "یہ تم کہہ رہی ہو حمیدی۔" اس نے مذمت سے بہن کی طرف دیکھا اور مجبور ہو کر بہن کی بات مان لی شادی کے روز وہ بہت رو دیا جیسے اسے اپنی طبیعت کے خلاف کسی بات پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حمیدی نے اپنی مرحومہ کی بڑی بیٹی رشیدہ بانو سے شریف کا بیاہ کر دیا۔ رشیدہ کے والدین کو یہ ڈر تھا کہ کہیں شریف کی بیوی شہزاد اپنے چھ بالکوں کو لے کر پھر سے شریف کے گھر نہ آ دھمکے اس لئے انہوں نے صاف کہہ دیا کہ شہزاد کو طلاق دے دو تو مناسب ہے۔ شریف علانیہ شہزاد کو طلاق دینے کے حق میں نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شہزاد قانونی طور پر آزاد نہ ہو سکے۔ اس لئے اس نے چوری چوری طلاق نامے پر دستخط کر دیئے اور اس بات کو مخفی رکھا۔

شریف کے گھر ایک نئی بیوی آ گئی۔ جس کے سامنے وہ صبح و شام اپنی مظلومیت کا قصہ بیان کر سکتا تھا۔ آہیں بھر سکتا تھا۔ حمیت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ سکتا تھا گویا مینڈک کو پھر کیچڑ بھرا جوہڑ مل گیا اور وہ پھر سے اپنے آشیاں میں آ بیٹھا۔

محض اتفاق سے اس خفیہ طلاق کی خبر ایلی اور شہزاد تک پہنچ گئی۔ اس روز وہ یوں محسوس کر رہے تھے۔ جیسے انہوں نے ایک دوسرے کو پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ جیسے وہ از سر نو عشق میں غرق ہو گئے ہوں۔ اگرچہ جہاں تک ظاہر کا تعلق تھا۔ وہ دونوں سمجھتے تھے کہ یہ قانونی نقطہ ایک بے معنی بات ہے۔ وہ دونوں تو عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ بے حد خوش تھے اور ساتھ ہی اس خوشی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

جب وہ دونوں ایک بوڑھے مولوی کے سامنے بیٹھے تو ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔۔۔ ____ شہزاد پھر سے مونگیا گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ پھر جب وہ گھر واپس پہنچے تو

مال کی بھی، وہ دنیا بھی موقع و محل سمجھتے ہیں یا کتی ہے۔"

پھر وہ تڑیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہاں ہاں۔" وہ بولنے لگے۔ یہ تو سب جون ہو گئی ہیں۔ عورت نے دنیا میں دھاندلی مچا رکھی ہے۔"

"وہ کیسے؟" شہزاد بولی۔

"آج دیکھو تو بچی ہوتی ہے کل دیکھو تو جوان اور پرسوں دیکھو تو ماں بنی بیٹھی ہوتی ہے۔ عورت ذات تو بالکل پرسوں ہے ادھر رکھی ادھر گئی۔ یہ کہتا ہے۔ اب تو بھائی جان آپ بھول جائیں وہ زمان کا فکر کر رہے ہیں شہزاد لیکن شہزاد دیکھیں جان آپ بھولی ہے۔ اب بھی آئینہ کے سامنے کھڑی ہو جاؤ تو ـــــــ کیوں۔ ہی ہی ہی۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

"میں نے کہا۔" شہزاد بولی۔ "اب تو آپ پنشن پا چکے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔" وہ بولے۔

"اور محلے ہی میں رہتے ہیں۔"

"وہ رہنا رہنا ہے ہم نے۔"

"تو محلے میں جو ہنگامہ ہوا تھا اس کی وجہ سے آپ بڑے پریشان ہوئے ہوں گے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسے "ہاں۔" وہ بولے۔ "بڑا فساد مچا تھا محلے میں۔ آگ لگ گئی تھی۔ لیکن شور زیادہ تھا اور فساد کم۔ ہمیں بڑی بڑی دھمکیاں دیں۔ میدان میں کھڑے ہو ہو کر ہمیں للکارا لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے۔ "ہم نے بھی ایسی چال چلی کہ سب کو دکھا دیا۔ ہی ہی ہی۔"

"وہ کیسے؟" شہزاد نے پوچھا۔

"جب وہ ہمارے پاس آئے محلے کے معزز لوگ۔ کہنے لگے کہ بتائیے اس معاملے میں آپ کس کا ساتھ دیں گے یا محلے والوں کا تو میں نے کہا۔

''بھئی محلے والے تو شریف کا ساتھ دے رہے ہیں نا؟ ہاں ہاں وہ بولے چونکہ شریف شرافت اور سچائی پر ہے بالکل درست ہم مانتے ہیں کہ شریف بے حد شریف ہے اور علی نے اس سے زیادتی کی ہے بلا ظلم کیا ہے۔ اس پر وہ بولے تو پھر آپ شریف کا ساتھ دیں گے۔ بالکل، میں نے کہا۔ دل و جان سے۔ اس حد تک شریف کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں کہ بھولا علی کو عاق کر دوں اور اس کی والدہ کو طلاق دے دوں۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔ ''کیا ہے؟'' وہ پوچھنے لگے۔

''شرط یہ ہے کہ شریف سب کے روبرو قسم کھا کر کہے کہ میں پورے عزم اور استحکام سے اس معاملے کی پیروی کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''دیکھو شریف ایک سادہ قسم کا آدمی ہے ہٹ دیتے گا۔ نہیں کسی سے دشمنی اس کے دل میں نہیں۔ اس کا کیا ہے نکل کر جھگڑے کو چھوڑ چھاڑ کر چلا جائے اور اعلان کر دے کہ میں نے سب کو معاف کیا تو پھر ہمارا کیا ہوگا۔ دیکھو بزرگو، میں نے کہا۔ ہم دنیادار لوگ ہیں یہ نہ ہونا کہ ہم شریف کا ساتھ دیں لیکن شریف ہمارا ساتھ نہ دے اور ہم اپنے عزیزوں سے بھی محروم ہو جائیں۔'' علی احمد قہقہہ مار کر ہنسے۔

''نتیجہ کیا ہوا۔'' علی احمد بولے۔ ''کہ ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ کچھ لوگوں نے بھی اعتراض کیا اور پھر ہوا یوں کہ ایک روز شریف چپکے سے محلہ چھوڑ کر چلا گیا۔ ہی ہی ہی ہی۔ اس روز ہم نے محلے والوں سے کہا دیکھا ہم نے کہا تھا۔ بس اسی بات کا ڈر تھا۔ پھر تو وہ سب شریف کے خلاف ہو گئے۔'' علی احمد پھر ہنسنے لگے۔

علی احمد کے آنے کے بعد گویا عزیزوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہاجرہ کئی مرتبہ علی اور شہزاد سے ملنے گئیں۔ فرحت نے بھی دوبارہ ان سے ملاقات کی۔ پھر محلے کے لوگ بے تکلف آنے جانے لگے۔

دو طوفان

ایک روز جب ایلی ارم پورہ میں اپنے فرائض سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو اسے

دیکھا کہ لڑکیاں چپ چاپ بیٹھی ہیں اور گھر پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔

"شہزاد کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔ "امی کو ہسپتال لے گئے ہیں۔ وہ بیمار ہو گئی تھیں۔"

نفیسہ بولی۔

"کون لے گئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"پڑوسیوں نے انہیں ہسپتال پہنچا دیا ہے۔"

ایلی ہسپتال پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ معاملہ نازک ہے۔ اور شہزاد کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس کے پیٹ کا بچہ مر چکا ہے اور مردہ بچے کا زہر اس کے جسم میں سرایت کر چکا ہے۔

وہ رات خوفناک رات تھی۔ سردیوں کے دن تھے۔ بارش اور ہوا کا طوفان چل رہا تھا۔ ہسپتال کے چوکیدار کے پاس ایلی کمبل میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔ نرس کی اطلاع کے مطابق اندر شہزاد آپریشن ٹیبل پر پڑی تھی۔ اور ڈاکٹر سوچ رہے تھے کہ آیا وہ آپریشن کی تکلیف برداشت کر سکے گی یا نہیں۔

ایلی آگ کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں بیرونی طوفان سے زیادہ شدید طوفان چل رہا تھا۔ کیا یہی اس قصے کا انجام تھا۔ سالہا سال کی تگ و دو کے بعد جب کہ وہ جیون ساتھی بن چکے تھے کیا قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ پھر جدا ہو جائیں۔ اگر شہزاد کو کچھ ہو گا تو بچوں کا کیا ہو گا؟ وہ سوچ رہا تھا۔

بیتے ہوئے واقعات اس کے سامنے پردۂ فلم کی طرح آ رہے تھے۔ جب وہ شہزاد کو پہلی دفعہ بیاہ کر لائے تھے اور ملحقہ ڈبے میں وہ موٹی سی گٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ حنا مالیدہ ہاتھ گٹھڑی سے نکلے تھے۔ "یہ ہے ایلی۔" کسی نے کہا تھا اور وہ ہاتھ اس کے سر پر منڈلانے لگے تھے۔

پھر جب وہ کہانی سنا رہی تھی اور ایلی نے محسوس کیا تھا کہ اس کے گھٹنے پر ایک

رنگین بوجھ سا پڑ گیا تھا۔ اس کا سر جھن سے اڑ گیا تھا جیسے کسی نے ہوائی کو آگ دی ہو وراں جانے میں اس نے وہ حنا مالیدہ ہاتھ تھام لیے تھے ورنہ جانے جذبے کی شدت میں کیا کہہ دیا تھا۔ "تم ایلی تم ____" شہزاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

پھر بند بیٹھک میں سے مردانہ ہنسی کی دھاک جمانے سے وہ سمندر کی طرح حملہ آور تھا اور پھر پورس کی طرح منہ میں گھاس لیے اس کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔

پھر وہ چلا رہا تھا۔ "تم رذیل کمینی عورت ہو۔ آج پھر میرے روبرو آتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی کیا؟" اور وہ اس کے قدموں میں گڑگڑا رہی تھی "ہاں ہوں ____" پھر صفدر چلا رہا تھا۔ "میں تمہیں مروں گا میں تمہیں مروں گا ____ مجھے معاف کر دو مجھے معاف کر دو ____" اور اب شہزاد آپریشن ٹیبل پر پڑی کسی سے کہہ رہی تھی۔ "مجھے معلوم تھا میں تم سے پہلے مروں گی۔ ہمیشہ سے مجھے اس کا علم تھا۔ میرا دل گواہی دیتا تھا۔ مجھے کوئی غم نہیں صرف میری بچیوں ۔۔"
اس نے آخری ہچکی لی ____ ایلی گھبرا کر چونک پڑا۔ چوہدری جا چکا تھا۔ آسمان پر ہلکی ہلکی سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ طوفان تھم چکا تھا۔ نرس اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ "آپریشن کامیاب رہا۔ تمہیں مبارک ہو۔" ایلی کو یقین نہیں آتا تھا۔ اس کے دل میں کوئی خوشی پیدا نہ ہوئی اور وہ اسی طرح دیوانہ وار بیٹھا رہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ کیا کرے۔

پھر ہسپتال کا جمعدار اس کے روبرو کھڑا تھا۔ "مردہ بچے کی لاش لے جاؤ۔" وہ کہہ رہا تھا۔

لاش، ایلی سوچنے لگا۔ لاش کو کہاں لے جاؤں۔ کیا کروں۔ لاش"

جمعدار اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ "ابھی لے جاؤ۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اس وقت ٹھنڈ ہے۔ وارث ہے کوئی۔" ایلی حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔

شہزاد ہسپتال سے واپس آئی تو ایلی اسے دیکھ کر ڈر گیا۔ یہ شہزاد نہیں تھی۔ جس سے وہ واقف تھا۔ یہ تو کوئی دوسری شہزاد تھی۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ گال بری طرح پچک گئے تھے۔ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ ماتھے کا تل گویا گم ہو گیا تھا۔ اس میں وہ روشنی نہ رہی تھی۔ جیسے کسی نے دیپ بجھا کر اس کی گذشتہ روشنی کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اسے ان طاقوں پر رکھ دیا ہو۔ آنکھوں میں چمک باقی تھی۔ لیکن اس چمک میں مایوسی کا دھندلکا شامل ہو گیا تھا۔ ناک ابھر آئی تھی۔ ہونٹ گویا بھنچ گئے تھے۔ دانت نکل آئے تھے۔

اسے ڈسچارج کرتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا تھا اسے اچھی غذا کی ضرورت ہے اچھی غذا اور کیلشیم لیکن جب وہ گھر پہنچی تھی تو ان کے ہاں بچا آٹا اور تھوڑی سی دال کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

ان کی غربت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ سر پر قرض کا طومار کھڑا ہو گیا تھا۔ جسے ادا کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن اس سے بڑی مشکل یہ تھی کہ قرض حاصل کرنے کے مزید امکانات بالکل ختم ہو چکے تھے۔

لاہور میں ایلی کے ماموں زاد بھائیوں رفیق اور جمیل اور خلیق نے اس کی بے حد مدد کی تھی۔ جمیل ابھی تک خان پور میں تھا۔ رفیق لاہور رہتا تھا چونکہ اس کی تبدیلی ہیڈ آفس میں ہو چکی تھی۔ خلیق اب ڈاکٹر بن چکا تھا اور اکثر لاہور آیا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ اس کے خالہ زاد بھائی یوسف نے ان کے ساتھ بہت ہمدردی کی تھی۔ لیکن انہیں تو آئے دن امداد کی ضرورت رہتی تھی۔ کبھی کبھار کی بات ہوتی تو بھی وقت گزر جاتا۔ روز کی حاجت مندی کا کیا علاج ہو سکتا تھا۔

دوسری مشکل یہ تھی کہ دو لڑکیاں اب جوان ہو چکی تھیں۔ ان میں شہزاد کی بیٹی تو نہ تھی۔ لیکن پھر بھی وہ شہزاد کی بیٹیاں تھیں اور اسی گھر میں پل کر جوان ہوئی تھیں۔

سال بھی ضائع ہو گیا تھا اور شہزادہ کو ڈر تھا کہ کہیں تیسرا سال بھی ضائع نہ ہو جائے۔ بوند بوند غم اس کی روح میں سرایت کر رہا تھا۔

دوپٹہ گم

پھر علی کا تبادلہ شاہ وال ہو گیا اور وہ سب شاہ وال چلے گئے!

شاہ وال ایک بڑا قصبہ تھا جو لاہور سے تیس چالیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ ابھی وہ شاہ وال پہنچے ہی تھے کہ شہزادہ پھر بیمار پڑ گئی۔ اسے خون جاری ہو گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔ بولی۔ "اسے لاہور ہسپتال میں لے جائیے۔ لاہور ہسپتال کے ڈاکٹروں نے معائنہ کرنے کے بعد فیصلہ دیا کہ مریضہ کا اندرونی جسم مردہ بچے کے زہر کی وجہ سے گل گیا ہے۔ آپریشن ہو گا۔

"کیا آپریشن کے بعد مریضہ یقینی طور پر ٹھیک ہو جائے گی۔" علی نے پوچھا۔

"یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔" ڈاکٹر بولا۔ "زیادہ امید نہیں۔"

"اوہ۔" علی سوچ میں پڑ گیا۔

جب وہ شہزادہ سے ملا تو وہ بولی "میں آپریشن نہیں کراؤں گی۔"

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"بےکار ہے۔" وہ بولی۔

"بےکار کیوں"

"وہ کہتے ہیں اندر چھوٹی جھلی تک پہنچ چکی ہے اور خون بند نہیں ہو گا۔"

"تو پھر۔"

"مجھے لڑکیوں کے پاس لے چلو۔"

"اچھا" علی نے سر جھکا لیا۔

جب شہزادہ لیڈی ڈاکٹر سے ہسپتال چھوڑنے کی اجازت طلب کرنے گئی تو ڈاکٹر نے صاف انکار کر دیا۔ "بےوقوف مت بنو" وہ بولی۔ "اگر تم ہسپتال چھوڑ کر چلی

گی تو زیادہ سے زیادہ پندرہ روز جیو گی۔

"مگر میں ہسپتال میں رہوں تو۔"

"تو تو ____ تو شاید۔"

شہزادے نے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائی۔ ڈاکٹر گھبرا گئی۔ "نہیں نہیں" وہ بولی۔

"مجھے کون روک سکتا ہے۔" شہزادے نے کہا اور باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

ڈاکٹر نے ایلی کو دیکھ کر شور مچا دیا۔ "اے مسٹر۔ یہ تمہاری مسز دیوانی ہو گئی ہے۔ جان بوجھ کر خودکشی کر رہی ہے۔ اے مسٹر۔"

ایلی رک گیا۔ "یہ عورت پاگل ہے۔" ڈاکٹر چلائی۔

"ہم دونوں پاگل ہیں۔" وہ بولا۔

"ارے۔" ڈاکٹر بولی۔ "تم پڑھے لکھے نظر آتے ہو۔"

"ہاں۔" ایلی نے کہا "پڑھا لکھا پاگل ہوں۔"

"ارے۔" وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں پاگل باہر نکل آئے۔ شہزاد نے ایلی کا ہاتھ تھام لیا۔ بولی۔ "ایلی۔"

"جان من۔" وہ بولا۔

"پندرہ دن ہیں۔" اس کی آنکھ میں مسرت کی چمک تھی۔

"ہاں۔"

"پندرہ دن ہم اکٹھے رہیں گے۔"

"ہاں۔"

"پندرہ دن بہت ہوتے ہیں۔"

"ہاں ہاں" وہ بولا۔

"تم نے کہیں باہر تو نہیں جانا۔"

"نہیں جاؤں گا۔"

"ہم اکٹھے بیٹھ رہیں گے۔"

"بالکل۔"

"اور پھر ہم بیٹھ کر سب باتیں دہرائیں گے۔"

"ہاں۔"

"جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔"

<u>پندرہ۔ دراہ۔ دن</u>

پٹی ہی دھن میں پاگل پیدل چلے جا رہے تھے۔

"بابو جی تانگہ چاہیے۔" تانگے والے نے قریب آکر پوچھا۔

"تانگے پر چلو گی۔" للی نے پوچھا۔

"کیا کرنا ہے۔" وہ بولی۔

"چلتے ہوئے تمہیں تکلیف ہوگی۔" وہ بولا۔

"تکلیف"____ وہ ہنسی۔ "اب کیا ہے۔"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "اب کیا ہے۔"

"للی" وہ بولی۔

"جی۔"

"ایک بات کہوں۔"

"کہو۔"

"مانو گے؟"

"مانوں گا۔"

"شروع سے ہی مجھے معلوم تھا۔"

"کیا؟"

"کہ میں پہلے مروں گی۔"

"واقعی؟"

"ہاں جب بھی تم میرے پاس آیا کرتے تھے تو کوئی میرے کان میں کہتا۔ تم پہلے مر جاؤں گی۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔"

"کون کہتا تھا؟"

"معلوم نہیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا وہ سچ کہتا ہے۔"

"بس اتنا ہی کہتا تھا؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔

"تو؟"

"ایک بات اور کہتا تھا۔"

"وہ کیا؟"

"کہتا تھا ______ نہیں بتاؤں گی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"نہ بتاؤ۔" وہ بولا۔ "لیکن تم روتی کیوں ہو۔"

"ہاں روتی ہوں۔" وہ بولی۔

"چھن جیسے تمہاری چاہ ہے۔"

"اس لیے نہیں روتی کہ پندرہ دن اور ہیں۔"

"تو کس لیے؟"

"وہ جو دوسری بات کہتا تھا۔ اس پر نہ جانے کیوں اس کی دوسری بات سن کر میں ہمیشہ روتی رہی چھپ چھپ کر روتی رہی۔"

"کیا کہتا وہ ایسی بھی کیا بات ہے؟"

"کہتا تھا ——— بتا دوں؟"

"تمہاری مرضی۔"

"کہتا تھا۔ تمہارے مرنے کے بعد اس کی زندگی شروع ہوگی۔"

"کس کی زندگی؟"

"تمہاری۔"

"زندگی ختم ہو جائے گی یا شروع ہو جائے گی۔"

"شروع ہوگی۔" وہ بولی۔

"اس میں رونے کی کیا بات ہے؟"

"مجھے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے تمہارے راستے کی رکاوٹ ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ تمہاری زندگی شروع نہیں ہو سکتی جب تک رکاوٹ دور نہ ہو۔"

"بے وقوف تم رکاوٹ نہیں زندگی ہو۔ تم چلی گئیں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

"سچ۔" وہ بولی۔

"تمہاری قسم۔"

وہ مسکرا دی۔ "بس مجھے یہی غم ہے۔ میری پہچان۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے

پھر وہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے شاہ ولی جا رہے تھے۔ انجن ہونک رہا تھا۔

"پندرہ دن ——— پندرہ دن۔"

دفعتاً علی کی توجہ سامنے بیٹھے ہوئے مسافروں کی طرف منعطف ہوگئی۔

"پندرہ" "دن" ایک چلا رہا تھا۔ "صرف پندرہ دن۔"

علی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کیا وہ ان کے راز سے واقف تھا۔

"کیوں بھائی" وہ علی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "تم ہی بتاؤ پندرہ دن بھی کوئی حیثیت رکھتے ہیں۔" اس نے چٹکی بجائی۔ "یوں گئے نا۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا

اور پھر اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے بولا۔ "ہم نے تو بس وہی ایک ڈاکٹر دیکھا ہے۔ دو سال میری بیوی میو ہسپتال میں پڑی رہی۔ دو سال آخر انہوں نے جواب دے دیا اور میں اسے دوراہے لے گیا اور اس اللہ کے بندے نے پندرہ روز میں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے پاؤں چل کر گھر آئی اور اللہ اس کا بھلا کرے۔ آج ہم ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

"کون ہے وہ ڈاکٹر؟" ایلی نے پوچھا۔

"دوراہے کا ہومیو پیتھ ہے جی۔"

"کیا نام ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہاشم

"بھئی واہ" وہ بولا۔ "تم ڈاکٹر ہاشم کو نہیں جانتے۔"

"جی ڈاکٹر ہاشم کو کون نہیں جانتا۔" اس کا ساتھی بولا۔

اگلے روز ایلی دوراہے میں ڈاکٹر ہاشم کے مطب میں بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر ہاشم کا مطب ایک وسیع و عریض صحن پر مشتمل تھا۔ جس کے ایک طرف دو تنگ کمروں میں ادویات رکھی تھیں اور دو کمپاؤنڈر بیٹھے تھے۔ دوسری طرف ایک برآمدہ تھا۔ جس کے پیچھے دو وسیع کمروں میں کتابیں پڑی تھیں۔ تیسری طرف ایک دروازے کے پیچھے ڈاکٹر کا مکان تھا۔ صحن میں ایک درخت کے نیچے ایک تخت پڑا تھا۔ جس پر ایک پرانا سا تکیہ لگا تھا۔ نیچے ایک سادہ گدا بچھا ہوا تھا ایک چھوٹے سے ڈیسک کے گرد بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ پاندان، محدب شیشہ، ربڑ کی نلکیاں۔ ڈیسک پر ایک پرانا قلمدان پڑا تھا۔ یہ ڈیسک تخت پر لگا ہوا تھا۔ اور اس کے پاس ہی کاغذ کی پڑیاں سی پڑی تھیں۔ تخت کے ایک طرف بوسیدہ سا کمبل ڈھیر ہو رہا تھا۔

صحن میں کوئی کرسی نہ تھی۔ کتابوں والے کمرے میں بیٹھنے کے لئے فرش کے علاوہ کوئی کرسی یا کاؤچ نہ تھا۔ صحن میں لوگ ادھر ادھر زمین پر چوکیاں رکھے بیٹھے ہوئے

تھے۔ وہ سب یک دوسرے سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ وریوں شور مچ
رہے تھے۔ جیسے وہ ڈکٹر کا معمل نہیں بلکہ منڈی ہو۔ ڈاکٹر بھی زنان خانے سے
باہر نہیں نکلا تھا۔

دفعتاً زنان خانے کا دروازہ کھلا۔ یک لڑکا یک حقہ ٹھائے باہر نکلا۔ سے دیکھ کر
سب خاموش ہو گئے۔ س کے پیچھے پیچھے یک دیوانہ سا آدمی یوں لڑھکتا ہوا آ رہا تھا
جیسے کسی نے سے دھکا دے کر متحرک کر دیا ہو۔ اس نے یک لمبا سا چغہ پہن رکھا
تھا۔ نیچے سیاہ جرابیں تھیں یک پھٹی ہوئی گرگابی۔

س کے بال پریشان تھے۔ چہرہ گویا سوجا ہوا تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔
تخت کے قریب پہنچ کر وہ رکا۔ س نے ہاتھ بڑھا کر کمبل ٹھایا ور سے پرے کر دو چت ہو کر
تخت پر ڈھیر ہو گیا۔

مجمع پر خاموشی طاری تھی۔

یک ساعت کے بعد س نے سر ٹھایا ور مجمع پر چیتی نگاہ ڈالی۔ س کی نگاہ یک
آدمی پر رکی۔ "ہوں۔" وہ بولا۔ "تم۔"

"جی۔" وہ شخص وہ بولا۔

"تمہاری بیوی مر گئی ہے کیا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" وہ شخص بولا۔

"تو اس کا برا حال ہے کیا؟"

"جی نہیں۔ وہ تو صحت مند ہے۔"

"تو پھر تم یہاں آئے ہو؟" ڈاکٹر نے اسے ڈانٹا۔

"جی وہ بیٹے۔"

"کیسی وہ۔"

"جی وہ لی۔ یعنی۔" وہ گھبرا گیا۔

"جب وہ رب صحت بخشے تو دوائی کا مطلب۔ دوائیاں لینے کا شوق ہے کیا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"جی نہیں۔" وہ بولا۔ "میں نے سمجھا کہ مزید دوائی ______۔"

"بے وقوف۔" ڈاکٹر بولا۔ "میں نے سمجھا کہ تم میں سمجھنے کی صلاحیت ہے۔"

"جی نہیں۔" وہ بولا۔

"جی بہت اچھا۔"

"جاؤ مزے کرو۔ اب کسی دوائی کی ضرورت نہیں۔" وہ شخص سر جھکائے چل پڑا۔

"ہوں تم۔" ڈاکٹر کی نگاہ ایک اور شخص پر پڑی۔ "تم۔" وہ بولا۔

"جی۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "میرا نام ماجد ہے۔"

ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔ "نام کو میں کیا کروں۔ تمہیں تپ دق ہے نا۔"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔

"تو جاؤ تمہارے لئے میرے پاس کوئی دوا نہیں جاؤ۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب۔" وہ بولا۔ "میں کہاں جاؤں گا؟"

"تم اللہ کے پاس جاؤ گے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "وہاں سکھی رہو گے۔ جاؤ جاؤ۔"

وہ شخص مایوس ہو کر چل پڑا۔

"ہوں۔" ڈاکٹر نے علی کی طرف دیکھا۔

"جی میں۔" علی بولا۔ "میں شاہ وال سے آیا ہوں۔"

"تو کیا مجھ پر احسان کیا ہے۔" ڈاکٹر بولا۔ "میاں لوگ حیدر آباد سے آتے ہیں۔" وہ رک گیا۔

"میسور سے آتے ہیں۔ تم شاہ وال سے آ گئے تو کیا ہوا۔" اس نے دوبارہ کہا۔

علی گھبرا گیا۔ "جی آپ بجا فرماتے ہیں۔" وہ بولا۔

"کیا فائدہ ہوا شہر وال سے آنے کا؟ یا فائدہ ہوا۔ بے وقوف۔" ڈاکٹر گھورتا رہا۔

علی کو غصہ آ رہا تھا۔

"تو بھائی اس شخص کی طرف دیکھا۔" ڈاکٹر نے جملہ لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ شہر وال سے آیا ہے لیکن بے وقوف مریض کو ساتھ نہیں لایا۔"

"ارے" علی حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

"میاں۔" ڈاکٹر کہنے لگا۔ "اگر تم مریض کو ساتھ لاتے تو کیا میں منہ دیکھتے سے ہوں۔"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔

ڈاکٹر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ "اچھا تو دیکھو۔"

عین اس وقت ایک معزز شخص داخل ہوا اور دروازے میں ہی ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"نمستے ڈاکٹر صاحب!" ڈاکٹر صاحب کی توجہ نووارد کی طرف منعطف ہو گئی۔

"یہ لالہ جی دور سے آئے ہیں تحصیلدار ہیں۔" "قریب سے ہی آ رہے ہیں۔"

لالہ جی قریب آ گئے۔ وہ ایک معزز اور شریف آدمی نظر آتے تھے اور مذہب کا قائل تھا۔ جب وہ قریب آئے تو ڈاکٹر نے بغور ان کی طرف دیکھا۔

"لالہ جی۔" ڈاکٹر بولا۔ "مہربانی کر کے تشریف لے جائیں۔"

تحصیلدار نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"تشریف لے جائیں۔" ڈاکٹر نے دہرایا۔ "پھر سے داخل ہوں اور السلام علیکم کہیں۔"

تحصیلدار حیران ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگے۔

"جب تک آپ ایسا نہیں کریں گے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں آپ کو دوا نہیں دوں گا۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب۔" تحصیلدار نے کہا۔ "میں نے داخل ہوتے وقت ہاتھ

باندھ کر آپ کو نمستے کی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"نمستے کرنے میں کیا برائی ہے؟" تحصیلدار نے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔"

"تو اس میں تو بے حد عجز ہے۔"

"جی۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ اس میں بہت عجز ہے۔ لیکن ذرا کرم فرما کر آپ جاتے ہوئے پھر داخل ہو کر السلام علیکم کہیے۔ تاکہ میں آپ کو دوائی دوں۔"

اس پر تحصیلدار صاحب مسکرائے اور احاطے سے باہر نکل گئے۔ پھر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "فرمایئے کس کے لیے دوائی چاہئے آپ نے۔"

"گھر والی کے لئے۔" وہ بولے۔

"اپنی گھر والی کو اپنی طرح تحمل پسند بنایئے نا۔" ڈاکٹر بولا۔ "وہ اپنی طبیعت کی تلخی کی وجہ سے بیمار رہتی ہے۔"

"یہ میرے بس کا روگ نہیں۔" تحصیلدار نے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"آپ ان کی بیماری کی تفصیلات سن لیجئے۔"

"نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "پہلے ہمیں ایسی دوائی دینا ہوگی۔ جس سے ان کی طبیعت بدل جائے۔"

"دوائی سے طبیعت بدل جائے۔" تحصیلدار نے کہا۔

ڈاکٹر نے قلم نیچے رکھ دیا۔ "آپ دوائی کو کیا سمجھتے ہیں لالہ جی۔" اس نے پوچھا۔ "شاید آپ سمجھتے ہیں کہ دوائی صرف پیٹ کا درد دور کرتی ہے۔ کھانسی کو روکتی ہے۔

سہیل کو بند کرتی ہے۔"

"جی ڈاکٹر صاحب۔" وہ بولے۔

"آپ غلط سمجھتے ہیں، مریض ایک خوراک دینے کے بعد۔" ڈاکٹر نے پرچی پر لکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ دوائی کیا چیز ہے۔"

"مجھے اجازت ہے کہ ایک بات پوچھوں۔" ایلی بولا۔

ڈاکٹر نے مڑ کر ایلی کی طرف دیکھا۔

"ابا جی بھی تو مریض کو ساتھ نہیں لائے۔" وہ بولا۔

"تو پھر" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"تو پھر انہیں کیوں دوائی دے رہے ہیں آپ؟"

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ "اس کا جواب تمہیں اس وقت دیں گے جب تم مریض کو ساتھ لاؤ گے اب جاؤ چھٹی کرو چلے جاؤ۔" ڈاکٹر نے اسے ڈانٹا اور چپ چاپ صحن سے باہر نکل گیا۔

مسل کی گٹھڑی

شہزاد کو دوا پلاتے ہوئے ایلی سوچ رہا تھا۔ ایسا ڈاکٹر تو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ نہ ہی ہومیوپیتھی سے اسے کبھی سابقہ پڑا تھا۔ علاج بالمثل کے تصور سے ہی وہ بیگانہ تھا۔ عجیب ڈاکٹر تھا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیسے معلوم تھا کہ وہ مریضہ کو اپنے ہمراہ نہیں لایا۔ شکل و صورت کی بھی بات نہ تھی۔ چونکہ دیکھنے میں تو وہ ہمیشہ ہی مریض دکھائی دیتا تھا۔ بہر حال عجیب ڈاکٹر تھا۔ ایلی کے دل میں بے حد یقین پیدا ہو چکا تھا۔ کہ شہزاد صحت مند ہو جائے گی۔

جب اس نے شہزاد سے بات کی تو وہ ہنس پڑی۔

"اب یہ چوہدون بھی ضائع کرو گے۔" وہ بولی۔ "ایک دن ضائع کرتے ہو۔" کتنے جائیں گے۔ ایک ہی ڈبے میں ٹھنسیں گے۔ ایلی نے کہا۔ "پھر کیسے دن

ضائع ہوگا ____ تم سمجھ لینا کہ سیر کرنے جا رہے ہیں۔"

"ورنہ ڈاکٹر کو دینے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔"

"اللہ مالک ہے۔" وہ بولا۔ "کچھ ہو ہی جائے گا۔"

شہزاد تیار ہو گئی۔ ایلی نے سوچا کہ رات کو سفر ٹھیک نہیں۔ سارا دن سفر کریں تاکہ شہزاد کو تکلیف نہ ہو۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ ڈاکٹر ہاشم شام کے وقت بھی مطب میں آتے ہیں یا نہیں۔ لیکن سوچا تھا کہ وہ رات کہاں گزاریں گے۔ چھوٹے سٹیشن پر مسافر خانے میں بیٹھ رہیں گے۔ اس نے سوچا اور وہ اسی روز دوپہر کو روانہ ہو گئے۔

شام کو تین بجے کے قریب وہ وہاں پہنچے۔ ایلی شہزاد کو لے کر سیدھا مطب میں پہنچا۔ مطب کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن اندر کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی مریض نہ کمپونڈر۔ اس نے شہزاد کو باہر صحن میں بٹھا دیا اور خود ادھر ادھر جھانکنے لگا۔

دیکھا کہ ایک کمرے میں کمبل کی گٹھڑی سی پڑی ہوئی تھی۔ ایلی واپس ہو کر صحن میں آ گیا اور چپ چاپ تخت پر بیٹھ گیا۔ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔

کمبل کی گٹھڑی کو حرکت ہوئی۔

"ارے۔" ایلی چونکا اور پھر اندر چلا گیا۔

ڈاکٹر کمبل اوڑھے گٹھڑی بنا پڑا تھا۔

ایلی ڈر رہا تھا کہ کہیں بگڑ نہ جائے۔

"کون ہے؟" ڈاکٹر بولا۔

"جی میں ہوں۔" ایلی بولا۔

"میں کون؟"

"میں شاہ وال سے مریضہ کو لایا ہوں۔"

"اچھا۔" وہ بولے۔ "تم شاہ وال والے ہو کیا؟"

"جی۔"

ڈاکٹر نے کمبل سے ہاتھ نکالا۔ اس کا سر اور منہ کمبل ہی میں چھپے رہے۔ "نبض دکھاؤ۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولے۔ "ادھر آؤ مریضہ۔"

علی نے شہزاد کو گھسیٹ کر پاس بٹھا دیا۔ ڈاکٹر نے اس کی نبض ٹٹولی۔

"ہوں۔" ڈاکٹر بولا اور نبض تھامے بیٹھا رہا۔

"دوسرا ہاتھ۔" وہ بولا۔

شہزاد نے دوسرا ہاتھ تھما دیا۔

دیر تک ڈاکٹر نبض تھامے جوں کا توں بیٹھا رہا۔

"جسم سے خون جاری ہے نا۔" وہ بولا۔

"جی۔" علی نے کہا۔

"اندر گل گیا ہے۔"

"جی ہسپتال والوں نے یہی کہا تھا۔"

"ٹھیک کہا تھا۔" وہ بولا۔

"انہوں نے کہا تھا پندرہ روز اور جئے گی۔ ڈایا فرام کو گھن لگ گیا ہے۔" علی نے کہا۔

"ڈایا فرام کو گھن لگ چکا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن یہ کہنے والے وہ کون ہیں کہ پندرہ روز جئے گی۔ وہ کیا خدا ہیں؟" ڈاکٹر غصے میں کہا۔

علی خاموش بیٹھا رہا۔

"بولو۔" وہ ڈانٹنے لگا۔ "بولو۔ وہ کون ہیں۔ صحت اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے پھر وہ کون ہیں؟"

"جی ــــ" علی نے کہا۔

"تم مسلمان ہو؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"جی۔" علی نے جواب دیا۔

میں نے گھبرا کر روپے نکالے۔

"رکھ دو۔" وہ بولا۔ "رکھ دو۔"

میں نے وہیں رکھ دی۔

"گھر کے سے ۔۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" وہ بولا۔ "جاؤ۔ یہی کافی ہے۔"

"کوئی پرہیز۔" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہنسا "بے وقوف کھانے کو ملتا نہیں اور پوچھتے ہیں پرہیز۔ جاؤ۔" وہ چلایا۔ "ٹھہرو۔" ڈاکٹر نے ہمیں جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "پندرہ روز کے لیے تم اس کے خاوند نہیں ہو اور یہ تمہاری بیوی نہیں سمجھے۔"

"جی۔" میں بولا۔

"سولہویں دن کوئی بندش نہیں۔"

میں اور شہزادہ باہر نکلے تو حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"یہ ڈاکٹر ہے کیا۔" شہزادہ نے پوچھا۔

"ہاں ڈاکٹر ہاشم۔"

"مجھے تو پاگل لگتا ہے۔" وہ بولی۔

"مجھے بھی۔" میں نے کہا۔ "میں سمجھا اللہ نے فرشتہ بھیج دیا ہے۔"

"مجھے تو ڈھونگی معلوم ہوتا ہے۔" شہزادہ نے کہا۔

"نہیں خبطی پاگل۔ پاگل پن اور قابلیت ایک ساتھ ملتے ہیں۔"

"قابل آدمیوں کی شکل ایسی ہوتی ہے کیا۔" شہزادہ نے برا سا منہ بنایا۔ شاید [illegible] مگر پندرہ دن شہزادہ اور میں نے گن گن کر کاٹے۔

نئی موت

سولہویں دن میں نے پوچھا۔ "شہزادہ کیا خون ابھی جاری ہے؟"

وہ مسکرا دی۔ "نہیں تو۔" وہ بولی۔ "کب سے ختم ہو گیا۔"

"تم نے مجھے بتایا نہیں۔"

"میں نے کہا۔ شاید پھر جاری ہو جائے۔"

"تو نہیں ہوتا۔"

"نہیں۔" وہ بولی۔

"تو وہ دل کا مر گیا۔"

"پتہ نہیں۔" وہ ہنسی۔

"ایک بات کہوں۔" ایلی نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔

"کہو۔"

"مانو گی؟"

"کہو تو۔"

"نہیں۔" وہ بولا۔ "پہلے کہو مانو گی۔"

"مانوں گی۔" وہ پیار سے بولی۔

"آج ہماری ہنی مون ہے۔" وہ بولا۔

شہزاد نے مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

"آج ہم پرانے زمانے کی یاد منائیں گے۔"

"کیسی یاد۔"

"جب تم مونگیہ گھڑی تھیں۔ تب کی یاد۔"

وہ مسکرا دی۔

"اب کہاں۔" وہ بولی۔ "اب وہ بات کہاں؟"

"اب بھی ہے۔" اس نے کہا۔

"کیسے؟"

"میرے پاس ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

شہزادی نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"یاد ہے وہ زمانہ۔" وہ بولا۔

"ہوں۔" شہزادی ہنسی۔ "بھول سکتا ہے کیا۔"

یلی نے زیر لب کہا۔ "آج میں آؤں گا۔"

شہزادی نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔

یلی نے پھر سرگوشی کی۔ "کھڑکی کھلی رکھنا۔"

شہزادی بامعنی انداز سے مسکرائی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

یلی باہر نکل گیا شام کو وہ ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ حتیٰ کہ نو بج گئے۔ پھر وہ سینما میں جا بیٹھا۔ جب وہ فلم دیکھ کر نکلا تو ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ وہ چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔ شہر وال کی گلیاں ویران پڑی تھیں۔ کتے بھونک رہے تھے۔ یلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے دبے پاؤں چل رہا تھا۔ گھر کے پاس جا کر وہ رک گیا اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر جست بھر کر وہ کھڑکی کے پاس پہنچا۔ پٹ کو آہستہ سے دبایا۔ پٹ کھل گیا۔ دبے پاؤں وہ اندر داخل ہو گیا۔

چارپائی پر شہزادی چادر اوڑھے مشین سامنے رکھے کام کر رہی تھی۔

یلی نے اسے دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ "چپ۔" وہ بولا۔

شہزادی مسکرا دی۔

"چائے پیو گی۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ساری رات وہ ہاتھ میں ہاتھ دیے بیٹھے چائے پیتے رہے۔ جب بھی کوئی کھٹکا ہوتا تو وہ دونوں خاموش ہو جاتے۔

"کون ہے۔" وہ زیر لب کہتا۔

"میں دیکھتی ہوں۔" وہ گنگناتی اور پھر باہر نکل جاتی اور کچھ دیر کے بعد پھر اس کے پاس آ بیٹھتی۔

یونہی صبح ہو گئی اور ایلی اسے الوداع کہہ کر کھڑکی سے باہر نکل گیا اور پھر صدر دروازے سے گھر میں داخل ہو کر اپنے بستر پر پڑ کر سو گیا۔

سراب

شاہوال ایک بہت بڑا قصبہ تھا۔ وہاں کا مدرسہ بھی کافی بڑا تھا اگرچہ عمارت پرانی تھی۔ لیکن عمارت کے ساتھ وسیع و عریض میدان تھے۔ سکول کے قریب ہی بورڈنگ کی عمارت تھی۔ جس میں شاہوال کے گردونواح کے دیہات کے لڑکے رہتے تھے۔ بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ کا کوارٹر بورڈنگ کی عمارت کے اوپر دوسری منزل پر تھا۔

سکول کے ہیڈ ماسٹر کا نام سراب تھا۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ جسم گول مٹول رنگ گورا اور چہرہ فٹ بال کی طرح تھا۔ جس میں اس قدر گوشت بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا کہ سراب کی آنکھیں دکھائی ہی نہ دیتی تھیں۔ کبھی طلوع ہوتیں بھی تو جیسے وہ لکیریں ہوں اور پھر وہ جلدی ہی غروب ہو جاتیں چونکہ سراب کو بات بات پر ہنسنے کی عادت تھی۔ جب وہ ہنستا تو گوشت کا ایک طوفان چہرے پر چڑھتا، بڑھتا، سمٹتا۔ آنکھیں کشتیوں کی طرح لہروں میں ڈوب جاتیں۔ لیکن جب کبھی وہ سنجیدہ ہوتا یا جان بوجھ کر غصے میں آ جاتا تو وہ چھوٹی چھوٹی دھاریاں ابھرتیں حتیٰ کہ وہ کٹوریاں بن جاتیں۔ ان میں وحشت پیدا ہو جاتی اور وہ بری طرح سے کاٹنے لگتیں۔ ایلی سراب کو مل کر بے حد خوش تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اساتذہ کے درمیان گزارا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ اساتذہ زیادہ تر دفتری یا کتابی زندگی بسر کرتے تھے۔ وسعت نظر سے قطعی طور پر بیگانہ تھے۔ چونکہ ان کا مطالعہ محدود تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ زیادہ تر زندگی بچوں میں بسر کرتے تھے۔ ان کی شخصیت ان کے خیالات جذبات اور حرکات کا مجموعہ تھی۔ وہ سب ایک ہی دائرے میں گھومتے تھے اور اپنے خیالات عام اور

نظریت کو ناجر طور پر بے حد اہمیت دیتے تھے۔ باقی دنت کی طرح نہوں نے
خلاقی معیار پال رکھے تھے۔

یلی ساتذہ سے تنگ چکا تھا۔ ان میں نہ تو ذہنی چمک تھی نہ وسعت قلب و رندی
وہ رنگینی جذبات سے واقف تھے۔ لیکن ہیڈ ماسٹر تو بالکل ہی یلی کے نا قابل
قبول تھے۔ وہ ساتذہ سے بھی یوں پیش آتے۔ جیسے وہ بچے ہوں۔ مدرسے میں وہ
یک جزیرے کی طرح لگ تھلگ رہتے۔ ور یا اساتذہ کے قریب آتے تو یہ توقع
رکھتے کہ وہ ن کی ہر بات کو سر ہیں۔ ان کے ہر خیال پر وہ وہ کریں۔

سر ب میں خود ستائی کی شیخ جھلک تو تھی۔ لیکن ان کی طبیعت میں رنگینی کا عنصر
مفقود نہ ہوتا۔ جسے وہ بڑی محنت سے چھپائے پھرتے تھے۔ اس وجہ سے بڑوں کی
نسبت وہ بچوں سے قریب تر تھے۔ ان کے گھر میں نوجوان طلباء کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔
وہ نہیں پڑھاتے تھے۔ چھیڑتے تھے گھورتے تھے ور پیار کرتے تھے۔

نہ جانے کیوں یلی نے پہلے روز ہی محسوس کیا گویا وہ ہیڈ ماسٹر نہیں۔ جیسے کسی میم
نے زبردستی سوٹ پہن رکھا ہو یا کوئی دلہن شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر مردانہ لباس
میں باہر نکل آئی ہو۔

ن کی بیگم یک معزز خاندان کی خاتون تھیں۔ نہ جانے کیوں یہ وہم اس کے گلے
کا ہار ہو رہا تھا کہ ن کا مکان پاک صاف نہیں۔ لہذا وہ بہت سے طالب علموں کو اکٹھا
کر کے گھر کی صفائی میں لگی رہتی تھیں۔ فرش دھلوتی۔ دیواریں جھاڑتی۔ دروازوں
کے تختوں کو پانی سے دھوتی حتیٰ کہ دروازے کی زنجیروں کو پاک کرنے کے لئے ان
پر صابون ملتی۔

گھر کے اندر زنانے میں وہ ہر وقت صفائی میں مصروف رہتی تھی۔

باہر مردانے میں سر ب نوجوان طلباء کے جھرمٹ میں رجبہ اندر بیٹھے رہتے۔
لیکن ن اندر میں رجبہ کی نسبت رنگینی کی زیادہ جھلک تھی۔

سراب کو دیکھتے ہی لاشعوری طور پر ایلی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان سے کسی قسم کا تعلق روا نہ رکھے گا۔

مثلاً سراب اس سے پوچھتے۔ ''آصفی صاحب آج آپ لیٹ کیوں آئے ہیں۔''

''کیا آپ خدائی فرض نہیں کہ آپ وقت پر سکول آئیں۔'' وہ بصد مشکل اپنے آپ پر سنجیدگی طاری کر کے کہتے۔

''خدائی فرض تو نہیں سراب صاحب۔''

''کیوں۔''

''نوکر ہوں نہ۔ وقت پر آنا چاہئے۔''

''یہ تو فرض ہوا نا۔''

''جی خدائی فرض تو نہیں نا۔ دیکھئے سراب صاحب آپ میرے افسر ہیں اور میں آپ کا ماتحت ہوں۔'' ایلی کہتا۔ ''میرا فرض یہ ہے کہ آپ کو خوش رکھوں۔ وہ بس۔''

سراب صاحب کے گال سرخ ہو جاتے۔ چہرے پر گوشت کی لہریں چلنے لگتیں اور آنکھیں غروب ہو جاتیں۔

''بہرصورت آپ وقت پر آیا کریں۔'' وہ کہتے۔

''بہت اچھا صاحب۔''

اگلے روز ایلی پھر لیٹ آتا۔

سراب نے سوچا کہ ایلی کو شرمندہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ انہوں نے خود وقت پر آنا شروع کر دیا۔ آتے ہی وہ ایلی کو تلاش کرتے اور پھر اس کی جماعت میں جا کر خود پڑھانا شروع کر دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ ایلی جو ایک روز صورت حالات کا جائزہ لے گا تو شرمندگی محسوس کرے گا۔ لیکن ایلی نے یہ دیکھ کر کہ سراب صاحب اس کی جماعت کو پڑھا رہے ہیں۔ پہلے پیریڈ میں آنا ہی بند کر دیا۔ اس پر سراب صاحب بہت سٹپٹائے اور اساتذہ کی میٹنگ میں انہوں نے اس بات کا تذکرہ

کیا بولے۔ "شرمندہ ہونے کی بجائے آصفی صاحب نے پہلے پریڈ میں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

ایلی نے کہا۔ "جناب عالی دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ آپ مجھ سے بہتر پڑھاتے ہیں۔ لہٰذا میرا جی نہیں چاہتا کہ اپنی جماعت کو آپ کے درس سے محروم کروں۔"

ارباب صاحب کو جلد ہی پتہ چل گیا تھا کہ ایلی کا برتاؤ باقی اساتذہ سے ہٹ کر ہے۔ مگر وہ دل ہی دل میں اس پر خوش تھے۔

ایک روز ایلی سے ارباب نے پوچھا۔ "آصفی صاحب آپ کا رویہ باقی اساتذہ کا سا نہیں کیا وجہ ہے؟"

"وجہ یہ ہے۔" وہ بولا "کہ آپ کا رویہ باقی ہیڈ ماسٹروں کا سا نہیں۔"

وہ مسکرائے "کیا فرق ہے؟" وہ بولے۔

"وہ فرق جو سوکھے اور ہرے بھرے درخت میں ہوتا ہے۔"

چند ایک روز تو ایلی باتوں کی مدد سے اپنے قدم جماتا رہا۔ پھر جب اس کی خود اعتمادی بڑھ گئی تو ایک روز جب وہ اکیلے تھے۔ ایلی نے نہ جانے کس بات کے جواب میں اپنے دل کی بات ازراہ مذاق کہہ دی۔ کہنے لگا۔ "ارباب صاحب کسی وقت تو میں ایسے محسوس کرتا ہوں جیسے آپ دلہن ہوں۔" دفعتاً ارباب صاحب میں چھپی ہوئی عورت تمام احتیاط اور ضبط کو توڑ پھوڑ کر باہر نکل آئی۔ اس نے لوٹ کر اپنے کپڑے جھاڑ دیئے اور بے بس ایلی کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔

ارباب کے چہرے پر سرخی جھلکی۔ وہ سرخی نہیں جو دوران خون تیز ہونے پر جھلکتی ہے بلکہ وہ سرخی جو دلہن کا گھونگھٹ اٹھنے پر ظاہر ہوتی ہے۔ ایلی حیران رہ گیا۔ اسے اس برجستگی کا خیال نہ تھا۔ توقع نہ تھی۔ وہ گھبرا کر چلا آیا۔ اس کے بعد ارباب اور ایلی کے درمیان ایک حجاب سا دیوار بن کر حائل ہو گیا۔ جیسے وہ دونوں کسی راز سے

واقف ہوں۔

کپور اور ریاض

مدرسے میں سراب کے علاوہ دو شخص پیش پیش تھے۔ ایک تو سکول کے دفتر کا کلرک تھا۔ اس کا نام ریاض تھا۔ اس کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ رنگ کالا تھا اور طبیعت میں حکمرانی کی بو کے علاوہ اخلاق نیکی اور روحانی کی طلب کا جنون تھا۔

دوسرا شخص کپور تھا۔ کپور سینئر انگلش ٹیچر تھا۔ اس کا قد درمیانہ تھا۔ طبیعت میں بلا کا عجز اور مٹھاس تھی۔ کپور اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے جیتا تھا۔ وہ دوسروں کے لئے جیتا تھا۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی شخص کی جائز یا ناجائز امداد پر کمر بستہ رہتا تھا۔ صبح سویرے گھر سے نکلتا اور پھر رات گئے گھر لوٹتا اور سارا دن کسی نہ کسی حاجت مند کے کام میں مصروف رہتا۔ کوئی اسے کچہری لے جاتا تاکہ مقدمے میں اس کی مدد کرے۔ کوئی اپنی بیٹی کی شادی کے جملہ انتظامات سونپ دیتا۔ کوئی کہتا بھائی کپور، تھوڑا سا قرض چاہئے۔ کہیں سے انتظام کر دو۔ کوئی ٹیوشن کے لئے فرمائش کرتا اور اگر کوئی کام نہ ہوتا تو کپور گھر گھر لوگوں سے ملتا "کوئی سیوا بتایئے صاحب۔" وہ کہتا "آپ کا سیوک ہوں۔" بیلی کے لئے ریاض اور کپور دونوں نعمت غیر مترقبہ تھے۔ وہ دونوں بیلی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ کپور اسے ادھار سودا دیتا تھا۔ ریاض لڑکیوں کو خصوصیت سے بغیر فیس سکول میں داخل کرنے کے لئے تگ و دو کرتا رہتا تھا۔ پھر کپور نے ان کی فیس معاف کرانے کا ذمہ لے لیا اور ریاض ان کے لئے کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس طرح وہ دونوں ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتے رہتے۔ سراب کو بھی بیلی کے حالات سے بے حد ہمدردی تھی۔ لیکن سراب کی ہمدردی کو عمل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بیلی کی جملہ مشکلات مالی نوعیت کی تھیں تنخواہ میں اس کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے اس پر قرض کا طومار لگتا جا رہا تھا۔ اس کے قرض خواہ دستگی کے لئے تقاضہ

کرتے اور علی دوڑ کر کپور کو بیٹے کی طرف کھینچتا تاکہ اسے کچھ دیر اور انتظار کرنے پر راضی کرے۔ اگلے روز چڑھے والا آجاتا اور علی ریاض کی طرف دوڑتا۔

کپور اللہ واسطے کام کرنے کا قائل تھا۔ مگر ریاض طبیعت کا سخت تھا۔ وہ کام تو کرتا تھا مگر ساتھ لیکچر بھی پلاتا اور اس بات کا مطالبہ کرتا کہ علی اس کی عظمت اور نیکی کا اقرار کرے۔ اس کے علاوہ وہ علی پر خوش نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آخر یوں کب تک گزر ہوگا۔ اس کا کوئی عملی تدارک کرنا چاہئے۔ ریاض اور کپور چاہتے تھے کہ علی کوئی ٹیوشن کرے اور اس طرح اپنی آمدنی میں اضافہ کرے۔ لیکن علی ٹیوشن کا قائل نہ تھا۔ اس کی زندگی نظم سے خالی تھی۔ وہ باقاعدہ مقررہ وقت پر حاضر ہو کر کام کرنے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ تھی کہ علی محنت سے گریز کرتا تھا اور ریاض کو یہ بات پسند نہ تھی۔

کپور اور ریاض کے علاوہ شاہول سکول میں ایک اور شخص بھی تھا جو جونیئر ٹیچر تھا۔ اس کا نام ثناء اللہ تھا۔ ثناء اللہ میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی۔ جو علی کے لئے جاذب توجہ ہوتی۔ اس کا جسم موٹا تھا۔ سیدھا سادا سا طبیعت میں شوخی یا رنگینی کا عنصر نام کو نہ تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک معزز آدمی تھا۔ البتہ افسروں کے خلاف شکایت کرنے کی عادت تھی۔ کسی کو اکیلا دیکھ پاتا تو اسے پکڑ کر زیر لب افسروں کی شکایت کا دفتر کھول بیٹھتا زندگی میں یہی اس کی واحد دلچسپی تھی۔ ثناء اللہ کی علی سے راہ و رسم صرف اس سے ہوگئی کہ ان دونوں کے مکانات ایک ہی محلے میں واقع تھے۔ علی سکول سے واپس آتا تو ثناء اللہ ٹکتا۔

"یہ سب بڑے حرامی ہیں" وہ ادھر ادھر دیکھ کر زیر لب کہتا۔ "ان کے کارنامے سنو گے۔ بھائی صاحب تو دنگ رہ جاؤ گے۔ بس اندھیر کا کھاتہ بنا رکھا ہے۔ اس سے مدرسے کے بچوں کے اخلاق تباہ ہو رہے ہیں۔

تعلیم تو محض بہانہ ہے۔"

"علی صاحب، پیر کو زیادہ منہ نہ لگاؤ۔ اوپر سے دھرماتما بنا ہوا ہے۔ ویسے اندر سے گندہ ہے۔ ورے بنا متعصب۔ آپ کو علم نہیں۔ آپ تو صرف ظاہر پر جاتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں اور یہ جو سیوا سمتی شروع کر رکھی ہے ______ اس نے یہ محض دکھلاوا ہے۔"

"یہ جو موذی ریش ہے نا۔ مدرسے کا سارا پیسہ کھا گیا ہے۔ لیکن ہے اس قدر چالاک کہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا۔ ایک روز بھانڈا پھوٹے گا تو پتہ چلے گا۔ اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ٹھیک نہیں ورنہ جب بات نکلے گی تو ساتھ دھرے جاؤ گے۔"

علی کو شاء اللہ سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ ہی وہ اس کی باتوں کو غور سے سنا کرتا تھا۔ لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ شاء اللہ سے اپنا پیچھا چھڑاتا۔ اس کے برعکس وہ اس کی باتیں سن کر مجبوری سے تعجب بھری آواز میں کہتا۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔" یا "اچھا وہ بھی۔" یا "ارے کیا معلوم تو نہیں ہوتا۔"

شاہ ولی گنج آ کر زندگی میں پہلی مرتبہ علی محسوس کرنے لگا تھا کہ سبھی اساتذہ اس کے راز سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ چھ بچوں کی ماں کو بھگا کر لے آیا ہے اور وہ اس بات پر شرم محسوس کرنے لگا تھا۔

علی کے لئے سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ لڑکیاں جوان ہو رہی تھیں۔ ان کے قدم گھر سے باہر ہونے لگے تھے۔ ان کی آوازیں سن کر راہ گیر رک جاتے تھے۔ اور کہتے اچھا یہ ہے صفی صاحب کا گھر جب وہ سکول جاتی تھیں تو راستے میں لوگ خصوصاً نوجوان لڑکے ایک دوسرے کو کہنی مارتے۔ مسکراتے اور کوئی عاشقانہ گیت گنگناتے ہوئے بامعنی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے۔

ان باتوں کو دیکھ کر اس کے دل میں شبہات کا ایک طوفان پیدا ہو رہا تھا۔ علی ان لڑکیوں کی معصومیت سے واقف نہ تھا۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ ہر لڑکی بناؤ سنگھار کرنے پر فطری طور پر مجبور ہے۔ اسے اس کا شعور نہ تھا کہ لڑکیوں کی مسکراہٹیں کسی ٹھوس

مقصد کے شعور سے خالی ہوتی ہیں۔ ان کے قہقہے لوگوں کی توجہ جذب کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ لیکن کسی خاص شخص کو لبھانے کے لیے نہیں ہوتے۔ وہ اس امر سے ناواقف تھا کہ عنفوان شباب میں لڑکی کسی تحسین بھری نگاہ کو رد نہیں کر سکتی۔ حالانکہ اس سے اس کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔

ان وجوہات کی بنا پر لیلیٰ کو معصوم لڑکیوں سے شکایات پیدا ہوتی جا رہی تھیں اور یہ شکایات تعصب کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔

اقتصادی مشکلات کی وجہ سے شہزاد میں ایک اداسی اور احساس محرومیت پیدا ہو رہا تھا۔ اس کی وہ رنگینی ختم ہو چکی تھی۔ اس کی طبعی شوخی اب محض روایت سی معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ اس کی صحت پہلے کی نسبت بہتر ہوگئی تھی۔ لیکن اس میں وہی تلخی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ جو ایک ایسی عورت میں پیدا ہو جاتی ہے جو کبھی بہت خوبصورت رہی ہو اور جسے احساس ہو کہ وہ اپنا حسن کھو چکی ہے۔ شہزاد کو لیلیٰ کے خلاف کوئی شکایت نہ تھی۔ اسے اب بھی لیلیٰ سے لگاؤ تھا۔ لیکن اس کے اظہار کے موقعے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جب بھی کوئی بات شروع کرتے تو نہ جانے کیسے وہ بات کسی نہ کسی اقتصادی مشکل پر ختم ہوتی اور بات کی رنگینی تلخی میں ڈوب جاتی۔

کبھی کبھار لاہور سے محمود آ جاتا۔ نیم کے چلے جانے کے بعد وہ تنہا رہ گیا تھا۔ لیکن اس کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی۔ نیم کے جانے کا اس پر اثر ضرور ہوا تھا۔ لیکن وہ اس قدر گہرا نہ تھا۔ کہ اس کی شخصیت کی بنیادوں کو ہلا دیتا۔ لیلیٰ کی دانست میں محمود ذہنی طور پر ایک پہاڑ سے لڑھکتا ہوا پتھر تھا۔ جسے یہ لڑھکن نئی چمک عطا کرتی ہے۔

لاہور سے وہاں آئے بھی انہیں دو مہینے ہی ہوئے تھے کہ لیلیٰ کو معلوم ہوا کہ شہزاد امید سے ہے۔ لیکن شہزاد کو شبہات تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ کہہ رہی تھی۔ لاہور ہسپتال والوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ بچے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی تو ماں کے لیے خطرے کا باعث ہوگا۔ لیکن امید کی تمام علامات واضح

تھیں۔

"نہ جانے کیا ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "یہ علامات شاید کسی آنے والی بیماری کا پیش خیمہ ہوں۔"

دربار یا پاگل خانہ

"تم تو خواہ مخواہ وحشت کرتی ہو۔" للی نے کہا۔

"میری طبیعت تو شکی نہیں۔" وہ بولی۔ "شکی تو تم ہو۔"

"پھر مجھے شک کیوں نہیں پڑتا۔" للی نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔" شہزاد بولی۔

"میں بتاؤں شہزاد۔" للی نے کہا "چلو ایک بار پھر دربار پہ جا کر ہاشم سے ملیں۔

ہاشم کا نام سنتے ہی وہ گھبرا گئی۔ "نہ میں نہیں جاتی۔"

"کیوں۔"

"وہ تو دیوانہ ہے۔"

"پڑا ہو ہمیں اس سے مطلب۔"

شہزاد دربار جانے کے لیے تیار نہ ہوئی تو اسے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے شہزاد کا معائنہ کیا اور پھر مسکرانے لگی۔ "تمہیں بچہ ہونے والا ہے ظاہر ہے کہ تم امید سے ہو ____ لیکن تمہاری صحت اچھی نہیں تمہیں خوراک کی ضرورت ہے۔"

اب بھی شہزاد کو یقین نہیں آتا تھا۔

چھ مہینے بعد وہ پھر بیمار پڑ گئی اور صاحب فراش ہو گئی۔ للی گھبرا گیا اور اس کی منتیں کرنے لگا کہ ایک مرتبہ دربار چلے۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی لیکن جب تکلیف بہت بڑھ گئی تو وہ راضی ہو گئی اور وہ دونوں دربار جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

اس مرتبہ بھی صبح کی گاڑی سے روانہ ہو کر شام کو تین بجے کے قریب دور سے پہنچے
۔ ہاشم کا معمول خود دیکھا تھا۔ ڈاکٹر ہاشم اسی طرح مطب میں پڑا ہوا بیٹھا تھا۔

ایلی نے پچھلی مرتبہ کا اعادہ نہ کیا۔ بلکہ شہزاد کو سمجھا دیا کہ تم پیچھے سے اپنا ہاتھ بڑھا دینا تاکہ ڈاکٹر نبض دیکھے۔ ایلی ڈرتا تھا کہ کہیں ڈاکٹر اپنے خبطی جنون کی وجہ سے دیکھنے سے انکار نہ کر دے۔

"کون ہے۔" ڈاکٹر نے حسبِ معمول پوچھا۔

"مریضہ۔" وہ بولی۔

"اس وقت نہیں۔" وہ بولا۔ "صبح آنا۔"

"بہت دور سے آئی ہوں۔" شہزاد نے کہا۔ ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

"کتنی دور سے؟"

"شاہ دول سے۔" وہ بولی "آج واپس جانا ہے۔"

"ہوں۔" وہ بولا۔ "تو دکھاؤ نبض۔" ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ مطب سے باہر نکالا اور وہ شہزاد کی نبض دیکھنے لگا۔ دفعتاً وہ چونکا۔ "اوہ۔" وہ بولا۔ "معدہ تو خراب ہے۔ بہت خراب ہے۔"

شہزاد خاموش بیٹھی رہی۔

"بچہ تو گل گیا ہے۔" وہ بولا۔ "اور اگر تم بروقت نہ آتے تو ——"

"آپ نے پہلے بھی دوائی دی تھی۔" ایلی بولا۔

"کب؟"

"چھ مہینے ہوئے۔" وہ بولا۔ "آپ نے کہا تھا حمل اندر سے گل گیا ہے۔"

"دی ہوگی دی ہوگی۔" ڈاکٹر چلایا۔ "لیکن معاملہ پھر بگڑ گیا ہے۔" اس نے مطب سے سر نکالا۔ "یہاں روز مریض آتے ہیں۔" وہ چلایا۔ "سینکڑوں آتے ہیں۔ ہمیں کیا یاد رہتا ہے۔ کہ کس کو کیا دوائی دی تھی۔ یہ دیکھو۔" ڈاکٹر نے اس قالین کا کونہ

جس پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کے نیچے خطوط کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ''دیکھو۔'' وہ بولا۔ ''یہ سب مریضوں کو خط ہیں۔ ان سب کو کون جواب لکھے۔ خوامخواہ خط لکھتے چلے جاتے ہیں۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

''میاں۔'' وہ پھر بولا۔ ''ہم کیا خدا ہیں۔ صحت اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے صحت دینی مطلوب ہوتی ہے۔ ہمارے ہاتھ سے شفا دلوا دیتے ہیں۔ ورنہ یونہی ٹاپ شاپ دوائی مل جاتی ہے۔ سب اللہ کی شعبدہ بازی ہے کون حکیم ہے اور کون ڈاکٹر سب ڈھونگ ہے۔ ڈھونگ۔'' وہ پھر خاموش ہو گیا۔

''تم کیا کام کرتے ہو۔'' اس نے ایلی سے پوچھا۔

''جی میں بچے پڑھاتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''تم بچے پڑھاتے ہو۔'' اس نے ایلی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''جی۔'' ایلی نے کہا۔

''تم اس کام کی اہلیت نہیں رکھتے۔''

''جی'' ایلی نے کہا۔

''اور تم یہ کام کر و گے بھی نہیں۔''

''جی ــــــ''

''چھوڑ جاؤ گے۔'' ڈاکٹر نے پھر اپنا منہ کمبل سے ڈھانپ لیا اور پھر بات جاری رکھی۔ ''تمہاری زندگی میں گڑبڑ ہے۔'' وہ بولا۔ ''ذرا نبض دکھاؤ۔'' اس نے ایلی سے کہا اور پھر ہاتھ کمبل سے نکال کر ایلی کی نبض دیکھنے لگا۔ دیر تک نبض ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھا رہا۔

''سب کچھ غلط ہے'' وہ بولا۔ ''سر سے سب کچھ غلط۔ دل و دماغ معدہ سب غلط ہیں۔ سب الٹ پلٹ ہو رہا ہے۔ سودا کی طرف مائل ہو۔ صفر حد تک پہنچ چکا ہے۔ پاگل ہو جاؤ گے۔'' وہ بولا۔ ''یقیناً ہو جاؤ گے۔ بچاؤ کی صرف ایک صورت

ہے۔" اس نے کہا صرف ایک آدمی ادھر نہ پہنچے تو مینٹل ہسپتال میں پہنچ جاؤ گے۔ ور
ویسے مرو گے۔"

"ادھر کدھر۔" ایلی نے پوچھا۔

"وہ بھی ایک سمت ہے۔ ایک ایسی سمت جس سے تم واقف نہیں ہو۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"تو پھر ادھر پہنچنے کا کیا امکان ہو سکتا ہے اگر میں ادھر سے واقف ہی نہیں۔" ایلی نے کہا۔

ڈاکٹر ہنسا۔ "وہی پہنچتے ہیں جو واقف نہیں ہوتے۔ بلائے جاتے ہیں۔ اللہ نے بڑے پھندے رکھے ہیں۔" اس نے سر سے کمبل پھر اتار دیا۔

"تم لڑکی۔" وہ شہزاد کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تمہارا اس کا ساتھ نہیں چلے گا۔ دیر تک نہیں چلے گا۔ تمہاری یہ بیماری ____ تمہیں لے جائے گی۔" "ہاں یہ جائے گی۔ لیکن تمہارے پیٹ میں جو بچہ ہے جو پل چکا ہے۔ انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ معمولی بچہ نہیں۔ بہت کچھ لے کر آئے گا بہت اچھا ظرف ہوگا۔ فنکار ہوگا سبحان اللہ۔"

وہ دفعتاً اٹھ بیٹھا۔ "دو تمہیں پڑیا دیں۔" وہ بولا۔ "دو۔"

ہاشم سے فارغ ہو کر وہ چپ چاپ اسٹیشن پر بیٹھے رہے۔ شہزاد اپنے ہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔

"کچھ سوچ رہی ہو۔" وہ شہزاد سے پوچھنے لگا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ بولی۔

ڈاکٹر کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ ایلی نے کہا۔ "وہ صرف ڈاکٹر ہی نہیں۔ دیوانہ بھی ہے۔ بہت بڑا فلسفی بھی ہے۔ روحانیات سے بھی شغف رکھتا ہے۔ عجیب آدمی ہے۔ شاید تم سوچ رہی ہو کہ واقعی ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں

گے۔"

"وہ تو میں دیر سے جانتی ہوں۔" شہناز بولی۔

"کیا؟"

یہی کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے اور میں چلی جاؤں گی۔ لیکن ایلی ایک بات ہے۔

"کیا؟"

شہناز نے اس کا ہاتھ تھام لیا "میرے جانے سے پہلے کہیں مجھے چھوڑ نہ جانا۔"

"پاگل ہوگئی ہو۔" وہ بولا۔

"بس مجھے یہی ایک فکر ہے۔" شہناز کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں کیا؟"

"ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن پتہ نہیں کیوں یہ خیال بار بار میرے دل میں اٹھتا ہے۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

جب وہ شاہ وال پہنچے تو شہناز کی طبیعت پہلے کی نسبت بہتر تھی۔ پھر روز بروز اس کی طبیعت بہتر ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ صحت یاب ہوگئی۔

صحت یاب ہونے کے بعد بھی وہ اداس رہتی تھی۔ کئی بار بیٹھے بیٹھے جب اس کی نگاہ بڑی لڑکیوں پر پڑتی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ دراصل اسے لڑکیوں کا غم کھائے جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان لڑکیوں کے لئے کوئی رشتہ نہیں ملے گا۔ چونکہ وہ اس کی بیٹیاں تھیں۔ کوئی عزیز یا رشتہ دار ان سے شادی کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ شہناز نے اپنے اس خیال کے متعلق ایلی سے بھی کئی بار بات کی تھی لیکن ایلی اس کی بات پر ہنس دیتا تھا۔ "ابھی سے کیوں فکر کرتی ہو۔" وہ کہتا۔

"میرے پاس زیادہ وقت بھی ہو۔" شہناز جواب دیتی۔

اس پر ایلی چڑ جاتا۔ "کیا واقعی تم یہ خیال دل میں لئے بیٹھی ہو کہ تمہارے پاس

زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"کیا تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا۔" شہزادو پوچھتی۔

"پاگل ہو۔" وہ چلاتا۔ "خواہ مخواہ کے فکر لگائے بیٹھی ہو۔" اسے واقعی اس بات پر غصہ آ جاتا تھا۔ لیکن اس کے غصے نے کبھی لڑائی کی صورت اختیار نہ کی تھی۔

بھارت قیام

ایک روز ثناء اللہ اپنی بیوی کو ان کے ہاں لے آیا۔ اس کی بیوی بڑی لڑکی صبیحہ کو دیکھتے ہی پیار کرنے لگی۔

"ہائے کتنی پیاری بیٹی ہے تمہاری۔ آؤ میں واری جاؤں۔ آؤ میں تجھے پیار کروں۔" اس نے صبیحہ کو اپنے پاس بٹھایا اور اسے پیار کرنے لگی۔

صبیحہ حیران تھی وہ زیر لب ہنسے جا رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک بیگانی عورت اس پر اس قدر مفتون کیوں ہوئی جا رہی ہے۔ شہزادو کو بھی حیرت ہو رہی تھی۔

اگلے روز ہی بھانڈا پھوٹ گیا۔ ثناء اللہ اپنے چھوٹے بھائی کا پیغام لے کر آ گیا۔

"صبیحہ کو تو ہم نے اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔" وہ بولا۔ "میری بیوی تو اسے دیکھ کر اپنا دل دے بیٹھی ہے۔ کل سے اسی کی باتیں کرتی ہے۔ بات بات پر اسی کا تذکرہ۔ اگر آپ ہم غریبوں کا پیغام منظور کر لیں تو بہت کرم نوازی ہوگی۔"

چند ہی روز کے بعد ثناء اللہ نے اپنے دونوں بھائیوں کو وہاں بلایا تاکہ وہ علی سے مل سکیں۔

اس کا بڑا بھائی ذکاء اللہ شکل و صورت اور بات چیت سے خاص فنکار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بال گیسوؤں کی طرح لمبے تھے۔ چہرے سے خوش مذاقی اور ذہانت چھلکتی تھی۔ گفتگو نہایت پر خلوص اور آواز بہت رسیلی تھی۔ ثناء اللہ کے بیان کے مطابق وہ سیکرٹریٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔

چھوٹا بھائی خلیل ابھی نوجوان ہی تھا۔ اس نے ایف اے تک تعلیم پائی تھی اور

علی نے یوں محسوس کیا جیسے ضیا چپ چاپ کھڑا اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہو۔ ایک ساعت کے بعد ضیاء بولا۔

"اس بلاک کے پچھواڑے میں ہے۔ ہمارا گھر۔"

علی اور ضیا شہزاد کو ساتھ لے آئے اور ضیا انہیں اس بلاک کے پچھواڑے کی طرف لے گیا۔ گول کمرے کے قریب پہنچ کر علی نے دیکھا کہ موسیقی بالکل بند ہو چکی ہے اور کمرے میں کوئی بھی نہیں۔

ذکا انہیں بہت تپاک سے ملا۔ "آپ نے آنے کی اطلاع کیوں نہ دی۔" وہ بولا۔

"ویسے ہی آ گئے تھے۔" شہزاد بولی۔ "تو ہم نے کہا آپ کو ملیں۔"

"پھر بھی اطلاع دینا مناسب ہوتا ہے ____ خواہ مخواہ آپ کو کوفت ہوئی۔" ذکاء نے [illegible] بدلی۔

چند منٹ بیٹھنے کے بعد علی اور شہزاد نے اجازت طلب کی۔ "گاڑی چلنے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا ہے۔" علی نے کہا۔

ضیاء اور ذکاء انہیں تانگے تک چھوڑنے آئے۔

جب وہ اکیلے رہ گئے تو شہزاد بولی۔ "ان کے گھر تو کوئی بھی عورت نہیں۔"

"ذکاء کی بیوی تو مر چکی ہے۔" علی نے کہا۔

"مجھے یہ بات یاد ہی نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی عورت ہو گی گھر میں۔" شہزاد بولی۔

ابھی ان کا تانگہ سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ علی تانگے والے سے بولا۔ "بھئی ذرا ٹھہرنا میں ذرا سگریٹ لے آؤں۔"

وہ وہاں کی دکان پر سگریٹ خریدنے چلا گیا۔ جہاں سے انہوں نے پتہ پوچھا تھا۔ پنواڑی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بڑے بامعنی انداز سے کہنے لگا۔

"کیوں بھئی مل گئے تمہیں وہ لوگ۔"

"جی۔" میں نے جواب دیا۔ "مل گئے۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا بھئی۔" وہ بولا۔ "کہ وہی ہوں گے۔"

"نہیں۔" میں بولا۔ "وہ تو پچھلے بلاک میں رہتے ہیں۔"

"جی وہی ہیں نا جو بھی آپ کو تانگے تک چھوڑنے آئے تھے۔" پنوڑی بولا۔

"وہ بھائی ہیں اور ایک بہن بہت اچھا ناچتی ہے۔ وہ بھائی خود سکھاتا ہے۔ ساری عمر مدراس میں رہا ہے نا۔ وہیں سے سیکھ کر آیا ہے۔"

بھرت ناٹیم میرے روبرو گول کمرے کا بورڈ آ گیا۔

"آج ہی شو ہے بھائی جی۔" پنوڑی بولا۔ "ایچ ہاسٹل میں ہوگا۔ ہم بھی جا رہے ہیں شو دیکھنے کے لئے۔"

میں نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔

جب شہزاد کو میں نے پنوڑی کی بتائی تو وہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔

"لوگوں کا کیا ہے۔" وہ بولی "خواہ مخواہ بہتان لگاتے ہیں۔ اگر ان کی بہن ہوتی تو کیا وہ ہمارے سامنے نہ آتی۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے ان کے گھر اور گھر کی صورت ہی سے ظاہر تھا کہ کوئی عورت نہیں رہتی وہاں۔"

اس پر مجھے وہ لڑکی یاد آ گئی جو گول کمرے میں ناچ رہی تھی۔

"کیا وہی ان کی ہمشیرہ تھی۔ کتنی خوبصورت تھی وہ۔" میں سوچنے لگا۔

"تو پھر آج کی رات ہم بھی رہ جاتے ہیں۔" میں نے شہزاد سے کہا۔

"کیوں۔" وہ بولی۔

"وہ کہتا تھا آج شام کو ان کا شو ہے اور ان کی بہن ناچے گی۔ چلو آج دونوں شو دیکھیں گے۔"

شہزاد اس کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن اس کے بغیر انہیں حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا

"نہیں جی۔" وہ بولی۔ "وہ میری صبیحہ کو نچائیں گے۔ اس کے شو کریں گے۔"

"تو کیا ہو۔" ایلی نے کہا۔ "یہ تو بھارت ناٹیم ہے۔ بھارت ناٹیم تو فن ہے۔ عیب تو نہیں۔"

"لیکن لوگ کیا کہیں گے۔" وہ بولی۔

"تم تو لوگوں کی پروا نہیں کیا کرتی تھی۔" ایلی نے کہا۔

"اپنے سے نہیں کرتی تھی نا۔" وہ بولی۔ "بچوں کے متعلق پروا کرنی ہی پڑتی ہے۔"

"تو کیا انہیں جواب دے دو گی۔ مشکل تو ہو گی۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہائے تو کیا ناچوں کو دے دوں اپنی بچی۔" شہزاد نے جواب دیا۔

لاہور سے آنے کے بعد شہزاد پر مایوسی چھا گئی۔ ایک تو صبیحہ کی بندی بات ٹوٹ گئی تھی دوسرے وہ بچے سے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دل کی تہوں میں بیٹھا ہوا غم چڑچڑاہٹ اور غصے میں بدل گیا۔ بات بات پر اس کا غصہ جوش میں آ جاتا اور پھر بھوکی شیرنی کی طرح کچھار میں بیٹھی غراتی رہتی۔ ایلی اس کی اس تبدیلی پر تنگ آ ہو جاتا ہے۔

وہ دن ان کے لئے نہایت تلخ تھے۔ وہ گھر جہاں ہر وقت دھما چوکڑی مچی رہتی تھی۔ تاش اور چوپٹ کی بازی لگی رہتی تھی جہاں لڑکیاں ناچتی تھیں۔ بچے قہقہے لگاتے تھے وہ گھر ویرانے میں بدل چکا تھا۔ حالانکہ ان کی مالی مشکلات کسی حد تک کم ہو گئی تھیں۔ چونکہ ریاض اور کپور کی کوششوں کی وجہ سے ایلی کو بورڈنگ کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا تھا اور اب وہ کرایہ کے مکان کو چھوڑ کر سرکاری کوارٹر میں مقیم ہو گئے تھے اس طرح سے کچھ مالی امداد حاصل ہو گئی تھی۔ ایک تو اسے مکان کا کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا اور دوسرے ایک قلیل رقم الاؤنس کے طور پر ملنے لگی تھی۔

انہی دنوں ڈائریکٹر تعلیم نے ان کے سکول میں ایک جونیئر کلرک کی آسامی منظور کر دی تھی اور ایک نیا کلرک اس آسامی پر مامور ہو کر وہاں پہنچ گیا تھا۔

وہ ایک نوجوان بی اے تھا۔ اس کا نام ناظم تھا۔ اگرچہ دیکھنے میں وہ نہ تو بی اے نظر آتا تھا اور نہ اسے نظم سے کوئی تعلق معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ ناظم شادی شدہ نہ تھا اور شاہ ول میں نو وارد تھا اس لئے اسے بورڈنگ میں قیام کرنے کی وجہ سے ایلی اور وہ روزانہ ملا کرتے تھے۔ پہلے روز جب ایلی نے ناظم کو دیکھا تو اسے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اگرچہ ناظم نے سوٹ پہن رکھا تھا لیکن اس کا سوٹ گویا سوٹ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی شخصیت سوٹ اور بی اے دونوں سے بے نیاز تھی۔ ناظم اے بی کورس کا گریجویٹ تھا۔ جب ایلی کو اس تفصیل کا علم ہوا تو وہ اور بھی حیران ہوا اس کے علاوہ جب اسے یہ علم ہوا کہ ناظم ریاضی پڑھانے میں بڑی مہارت رکھتا ہے تو ایلی بالکل ہی کھو گیا۔ شخصیت کو سمجھنے کے متعلق ایلی کو اپنے اندازوں پر بڑا ناز تھا اس کا خیال تھا کہ وہ شخصیت اور کردار کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ناظم کو دیکھ کر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا شے ہے۔

ناظم کے چہرے سے ذہانت کے آثار مترشح نہیں ہوتے تھے۔ اس کے خدوخال عام سے ہونے کے باوجود یہ احساس دیتے کہ ان کو سمجھنا آسان نہیں۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا فرق تھا اس قدر ہلکا کہ کسی وقت دکھائی نہ دیتا اور نہ محسوس ہوتا لیکن کسی وقت وہ اس قدر شدت سے واضح ہوتا جیسے ڈھول بجا بجا کر اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہو۔

ناظم سے چار ایک مرتبہ ملنے کے بعد ایلی نے محسوس کیا کہ وہ ایک مجموعہ اضداد تھا۔ مثلاً اس کے چہرے پر ذہانت کا فقدان تھا۔ اس کے باوجود وہ اکثر ذہانت بھری بات کرتا اور ایلی حیران سے اس کی طرف دیکھتا۔ ناظم کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مجلسی آدمی نہیں اور سوسائٹی سے دور رہنا پسند کرتا ہے۔ لیکن چند ہی دنوں میں ایلی

"دکھ۔" ایلی نے حیرت سے پوچھا۔ "دکھ لگا ہو تو بھوک نہیں لگتی۔"

"مجھے تو بہت لگتی ہے۔ اتنی لگتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ دنیا بھر کی چیزیں پیٹ میں جھونک دوں۔ اندر ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جو بھرتا ہی نہیں" ناظم نے جواب دیا۔

"کیوں لگتی؟"

"ہمیشہ سے۔"

"عجیب بات ہے۔"

"عجیب کہاں۔" وہ بولا "یہ تو میرا دستور ہے بچپن سے ہی رہا ہے۔"

"تو کیا غم ہے تمہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"میرا دوست بیمار ہے۔" ناظم بولا۔

"دوست بیمار ہے؟ کونسا دوست؟"

"تم بھی خوب ہو ساری دنیا اندھیر ہو رہی ہے۔" ناظم بولا۔

"ارے بس اتنی سی بات پر غم ہے تمہیں۔"

"اتنی سی بات ہے۔" تنا ناظم نے غصے سے ایلی کی طرف دیکھا۔ "دوست کی بیماری بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ کیا دکھ ہو سکتا ہے۔"

ایلی حیران تھا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ ناظم کی آنکھوں کا فرق نمایاں ہوتا جا رہا تھا اور تجربے کی بنا پر ایلی کو علم ہو چکا تھا کہ اس کی آنکھوں کا زاویہ جذبات کی شدت کی وجہ سے بدلتا ہے۔ ایسی صورت میں ناظم سے عقل کی بات کہنا کچھ اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ بہر حال ناظم کے آنے سے ایلی کے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔

نصیر اور شیر

پھر ان کے گھر نصیر اور شیر علی آ گئے۔

شیر اور نصیر ایلی کے بھائی تھے وہ دونوں راجو کے بطن سے تھے فرق صرف یہ تھا کہ شیر علی راجو کے پہلے خاوند سے تھا اور جب وہ علی احمد کے گھر آئی تھی تو اس کی گود میں

تھا۔ ور نصیر علی حمد سے تھا۔

نصیر اس زمانے کی پیداوار تھا۔ جب علی احمد بڑھاپے کے اولین دور میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس سے علی احمد نے غیر معمولی محبت سے پالا تھا۔ گرچہ یہ محبت خصوصی محبت تھی۔ جس میں علی احمدیت کی جھلک تھی۔ لیکن اس کے باوجود نصیر کی جسمانیت یا شخصیت پھل پھول نہ سکی تھی۔ جسمانی طور پر وہ کمزور تھا اور اکثر بیمار رہتا تھا۔ طبیعت کے لحاظ سے وہ جذباتی مزاج اور تخیل کی طرف مائل تھا۔ وہ بڑوں کا ادب کرتا تھا۔ ماں باپ کا احترام کرتا تھا اور ایلی سے بہت متاثر تھا۔

نصیر کے برعکس شیر علی جسمانی طور پر مضبوط تھا۔ اس کے جسم کی ساخت ہی اس بات کو واضح کرتی تھی کہ وہ ہنسیوں میں سے نہیں اور علی احمد کے خاندان سے بہت گہرا ہے۔ وہ طبعاً خاموش تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ دل کی بات چھپا کر رکھتا تھا اور اس کی نظر وہ تھی کہ بڑا آدمی ہے۔ شیر علی میں جنسی پہلو کی شدت تھی اور اس شدت میں پراسراریت کا عنصر تھا۔

دسویں پاس کرنے کے بعد شیر علی ولایت میں ایک ٹیکنیکل کورس کرنے کے لئے چلا گیا تھا اور ایک سال کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد واپس آیا تھا۔

جب وہ واپس آیا تو اس کا قد بہت بڑھ گیا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے جوان ہونے سے پہلے ہی جوان ہو گیا ہو۔ وہ گھر کی کسی بات میں بالکل دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ گھر میں اس کی پوزیشن ایسی نہ تھی۔ جیسے ایلی یا نصیر کی تھی یا شاید طبعاً وہ بات ہمدردی دینے کی صلاحیت سے بیگانہ تھا۔ لیکن ایلی محسوس کرتا تھا اس کے دل کی تہوں میں انوکھی باتوں کا طومار لگا ہے۔ ایلی کو اس کی شخصیت کا یہ پہلو پسند نہ تھا۔

ولایت سے ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد علی پور آتے ہی شیر علی کو ایلی کی پرانی منگیتر ثمرہ کی چھوٹی بہن حاصرہ سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو خفیہ خط لکھ

کرتے تھے اور لب بام کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور اشارے کیا کرتے تھے۔لیکن شیر علی نے اس کے متعلق کبھی کسی سے بات نہ کی تھی۔

شیر علی کو محلے والے ہمیشہ بیگانہ سمجھتے تھے۔چونکہ وہ مستنیوں میں سے نہ تھا۔حالانکہ انہیں میں بیشتر لوگ ایسے تھے جنہیں آصفی خاندان سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔کیونکہ بہت سے لوگ باہر سے آ کر وہاں مقیم ہو گئے تھے۔لیکن انہوں نے اپنے متعلق کبھی صحیح جواز نہ دیا تھا۔

شیر علی کے رومان کی بات باہر نکلی تو ماجدہ کی والدہ غصے سے بھوت بن گئی۔اسے پہلے ہی علی احمد کے خاندان کے خلاف شکایت تھی۔چونکہ ایلی نے علانیہ اس کی بڑی بیٹی ثمرہ سے شادی کرنے کا انکار کر دیا تھا۔حالانکہ وہ دونوں منسوب تھے اور ان کی منگنی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔

اب جب اسے علم ہوا کہ شیر علی جان بوجھ کر ماجدہ کو ورغلا رہا ہے۔تو وہ سمجھی کہ شیر علی کا مقصد صرف اس کے گھرانے کو بدنام کرنا ہے۔

ایلی کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ راجو سے بات کرنے کے بعد خود ماجدہ کی والدہ زبیدہ سے ملا اور اس نے کوشش کی کہ زبیدہ شیر علی اور ماجدہ کی شادی پر رضامند ہو جائے اس پر زبیدہ کو اور بھی غصہ آیا۔ایلی کی اتنی ہمت کہ وہ شیر علی کا پیغام لے کر آئے جب کہ اس نے ثمرہ کے سلسلے میں اس سے اس حد تک بدسلوکی کی تھی کہ آخر وہ ثمرہ کو نور علی سے بیاہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔حالانکہ ثمرہ اور نور علی میں پچیس سال کا فرق تھا اور نور علی کی پہلی شادی سے ایک بیٹی تھی جس کی عمر ثمرہ سے کم نہ تھی۔

نصیر اور شیر علی بہت دیر کے بعد ایلی سے ملے تھے۔کیونکہ شیر اور ایلی تو دن بھر اپنی اپنی زندگی بسر کر رہے تھے اور محلے میں نہیں جا سکتے تھے۔نصیر بڑی محبت سے ایلی کو ملا شیر علی اپنی طبیعت کے مطابق خاموش تھا اگرچہ اس کے اندر وہی رنگی دبی اور اخلاق بدرجہ اتم موجود تھے۔وہ دونوں دو ایک روز شام مل رہے اور پھر واپس چلے

ایک مرتبہ شہزاد اور علی کو لاہور جانا پڑا۔

محمود اور عقیلہ

جب وہ لاہور سے لوٹے تو شاہ ولی میں محمود کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔

ان دنوں محمود بی اے کر چکا تھا۔ اب وہ لاہور میں محکمہ تعلیم کے ہیڈ آفس میں اسسٹنٹ تھا۔ علی محمود سے مل کر ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔ وہ پرانے ساتھی تھے اور جب بھی آپس میں ملتے تھے علم ادب کے علاوہ نفسیات پر بحث کرتے یا پرانی باتوں کو دہرا دہرا کر ہنسا کرتے۔

شام کے وقت محمود اور علی دونوں سیر کے لیے باہر نکل گئے۔ تو محمود نے بات چھیڑ دی۔ کہنے لگا۔ "علی یار تم ان لڑکیوں کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ وہ اس گھر میں خوش نہیں ہیں۔"

شادی کی بات تو خیر ٹھیک تھی۔ لیکن یہ سن کر وہ گھر میں خوش نہیں علی چونکا۔

"خوش نہیں ہیں۔" علی نے محمود کی طرف دیکھا۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ خوش نہیں۔"

محمود اپنے پراسرار انداز سے مسکرایا۔ عورتوں کے معاملے میں اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی پراسراریت تھی۔ وہ بات مکمل نہیں کرتا تھا۔

"انہوں نے مجھے خود بتایا ہے۔" وہ بولا۔

"خود بتایا ہے۔" علی نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" وہ شرماتے ہوئے بولا۔ "جب میں کل یہاں پہنچا اور مجھے معلوم ہوا کہ تم گھر پر نہیں ہو تو تمہاری غیر حاضری میں میں نے تمہارے ہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا لیکن۔" ____ وہ رک گیا۔

پھر وہ خود ہی بولا۔ "انہوں نے خود مجھے ٹھہرنے پر مجبور کیا۔ میرا مطلب ہے۔" وہ مسکرایا۔ "[illegible] دلچسپ ہیں اور پھر رات کو نفیسہ میرے پاس آ گئی اور دیر تک بیٹھی

رہی۔ روتی رہی۔" علی نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ ان کی زندگی تباہ ہو چکی ہے۔ اور ان کا مستقبل تاریک ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ جلد ان کی شادیاں ہو جائیں تاکہ وہ اپنے گھر چلی جائیں۔" محمود نے کہا۔

"لیکن شہزادو رہیں ———" علی نے کچھ بتانا چاہا۔

"ہوں۔" محمود بولا۔ "تم دونوں لڑکیوں کے صرف ایک پہلو سے واقف ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ ان کی زندگی کا ظاہری پہلو ہی حقیقت ہے۔"

"تو کیا ان کی زندگی کا کوئی دوسرا پہلو بھی ہے۔" علی نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔" محمود بولا۔ "دوسرے پہلو کے تحت وہ میرے پاس آئی تھیں۔ صبیحہ اندر دروازے میں کھڑی رہی اور نفیسہ میرے پاس آ بیٹھی اور وہ دونوں باتیں کرتی رہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے۔" علی نے کہا۔ "صبیحہ کے لیے رشتہ آیا تھا۔"

"ہاں وہ جانتا ہوں۔" وہ بولا۔ "مجھے انہوں نے سب بتایا تھا۔"

"تو پھر میں کیا کروں" علی نے پوچھا۔

"نفیسہ کا نکاح کر دو۔" محمود بولا۔

"لیکن کس سے۔" علی نے پوچھا۔

محمود مسکرایا ——— "تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ میں اس کا تمام خرچہ برداشت کروں گا اور جب تک وہ چاہے گی اسے تعلیم دلاؤں گا۔ اسے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔"

"تم ———" علی نے محمود کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "میں۔ اگر مجھ پر تم بھروسہ کر سکتے ہو۔"

"لیکن لیکن۔" علی بولا۔ "کیا وہ رضامند ہو جائے گی۔"

"کون۔" محمود نے پوچھا۔

"نفیسہ اور کون۔" علی نے جواب دیا۔

"نفیسہ رضامند ہے۔" محمود نے کہا۔ "بلکہ وہ خود چاہتی ہے اور میں اسی کے کہنے پر تم سے بات کر رہا ہوں۔"

علی کو دھچکا سا لگا۔ اسے محمود کے خلاف شکایت نہ تھی اسے لڑکیوں پر حیرت تھی۔

"دیکھو محمود" وہ بولا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ اس بات کی خواہاں ہو اور اگر وہ خواہاں ہے تو شہزاد کو میں منا لوں گا۔"

محمود کے جانے کے بعد علی نفیسہ کو ایک طرف لے گیا۔

"نفیسہ" اس نے بات شروع کی۔ "نفیسہ ایک بات بتاؤ مجھے۔"

نفیسہ نے پر اسرار نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

"شرمانے کی کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "جو بھی تمہاری سچی رائے ہو وہ مجھے بتا دو چونکہ میں تمہاری رائے کے بغیر تمہاری رضامندی کے بغیر کچھ نہ کروں گا۔"

نفیسہ نے آنکھیں جھکا لیں۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔"

وہ چپ چاپ بت بنی کھڑی رہی۔

"اگر تمہاری شادی محمود سے کر دی جائے تو تمہیں اعتراض تو نہ ہوگا۔" علی نے پوچھا۔

نفیسہ جوں کی توں چپ چاپ کھڑی رہی۔

"جواب دو نا۔" وہ بولا۔

وہ خاموش رہی۔

"اچھا۔" وہ بولا۔ "اگر تم نے کوئی جواب نہ دیا تو میں سمجھوں گا کہ تم رضامند ہو۔"

وہ جوں کی توں خاموش کھڑی رہی۔

شادی تو تمہاری رضامندی سے کی گئی تھی۔" نغمہ نے چلتے چلتے زور سے دروازہ چھوڑا اور بورڈنگ کی طرف بھاگی۔

طارق

جب وہ گھر پہنچا تو شہزادی یوں کھڑی تھی۔ جیسے شیرنی کچھار میں کھڑی ہو۔ وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ "اگر اپنا بھلا چاہتے ہو۔" وہ بولی "تو ابھی میری بیٹی کو طلاق دلوا دو ورنہ۔"

"تو گویا تم بھی ____" وہ شہزادی کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگا۔

"تم نے میری بچی کو ایک بدمعاش کے ہاتھ بیچا ہے۔" شہزادی بولی۔

"یہ تم کہہ رہی ہو۔" علی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں کہہ رہی ہوں۔" شہزادی بولی۔

"تم نے اپنی بیٹی سے پوچھا ہے کیا۔"

"میں سب جانتی ہوں۔" وہ بولی۔

شہزادی کے عقب میں صفیہ اور ریحانہ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

فرش پہ مالی بیٹھا گنگنا رہا تھا۔ "اوہ اوہ۔"

شہزادی گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ بورڈنگ کی طرف جا رہی تھی۔

"غصہ میں نہ آؤ۔" محمود علی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"تم جاؤ محمود۔" وہ بولا۔ "تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ نہ جانے یہاں کیا ہونے والا ہے۔ تم چلے جاؤ۔"

"کیوں۔" وہ بولا۔

"بات بڑھ جائے گی۔" علی نے کہا۔ "بات بڑھ جائے گی اگر تم یہیں رہے تو۔"

"ہوں یہ تو ٹھیک ہے۔" محمود نے لپک کر اپنا سوٹ کیس اٹھا لیا۔

"میں تمہیں خط ڈالوں گا۔" علی نے کہا۔ محمود چپ چاپ گھر سے نکل گیا۔

علی صحن میں دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ وہ شہزادو کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ سب یک لخت یوں بدل گئے تھے۔ آخر کیا وجہ تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ سب کچھ جو ہو رہا تھا۔ ایک سوچے سمجھے پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کا مقصد کیا تھا؟ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔

باہر محلہ سنسان پڑا تھا۔

دور کتے بھونک رہے تھے۔

کمرے میں لڑکیاں کانا پھوسی کر رہی تھیں۔

چبوتری پر وہ بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ اس کا منہ علی کی طرف تھا۔

دفعتاً شہزادو داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ نفیسہ تھی اور بستی کی ایک ادھیڑ عمر کی مستانی۔

علی انہیں چپ چاپ دیکھتا رہا۔

شہزادو خاموش تھی۔ نفیسہ آتے ہی لڑکیوں کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ انہوں نے اندر سے کنڈی لگا لی۔

مستانی بولی۔ ”بہتر یہی ہے کہ آپ لڑکی کا فیصلہ کر دیں۔“ اس کا روئے سخن علی کی طرف تھا۔

”آپ سمجھتی ہیں کہ لڑکی کی شادی زبردستی کی گئی ہے۔“ علی نے پوچھا۔

”لڑکی یہی کہتی ہے۔“ وہ بولی۔

”وہ ٹھیک کہتی ہے۔“ شہزادو بولی۔ ”لڑکی کو دھوکے سے پھانسا گیا ہے۔“

”لڑکی کو میرے سامنے بلا کر پوچھ لیجیے۔“ علی نے مستانی سے کہا۔

”وہ سامنے نہیں آئے گی۔“ شہزادو دونوں ہاتھ کمر پر دھر کر علی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"کیوں۔" علی نے پوچھا۔

"بس نہیں آئے گی۔" وہ غرائی۔

"کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔" علی نے استانی سے کہا۔ "میں نے یہ رشتہ لڑکی کی منشا کے مطابق کیا ہے۔ بلکہ اس کے اشارے پر کیا ہے۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔"

"بالکل غلط ہے۔" شہزاد بولی۔ "بالکل غلط۔ یہ شادی ایک سازش تھی۔ بہتر یہی ہوگا کہ فوراً سے طلاق دلوا دی جائے۔"

"ورنہ —" علی بولا۔

"ورنہ میں طوفان کھڑا کر دوں گی۔" شہزاد چلائی۔

"ہوں۔" علی بولا۔ "طلاق مل جائے گی لیکن ہمارا آپس میں کوئی سمبندھ نہیں رہے گا۔ تمہیں منظور ہے۔"

اس نے پوچھا۔

"منظور ہے۔" شہزاد نے جواب دیا۔

علی اندر چلا گیا۔ اس نے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے بند کئے اور پھر سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکل آیا۔ "آئیے۔" وہ استانی سے کہنے لگا۔ "میں آپ کو بورڈنگ تک چھوڑ آؤں۔"

شہزاد نے ایک مرتبہ حیرت سے علی کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ علی خالی دھمکی دے رہا ہے۔

"طلاق تمہیں مل جائے گی۔" علی نے دہرایا۔ "خرچ بھی ملتا رہے گا۔ حسب توفیق۔"

"لیکن آپ جائیں گے کہاں اس وقت۔" استانی نے پوچھا۔

"میں ایسے گھر میں نہیں رہ سکتا جہاں اپنی مرضی سے شادی کرنے کے باوجود میں

انجام

کہاں جاؤں

علی چپ چاپ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے باہر اندھیرے کو گھور رہا تھا۔ اس کا ذہن ایک وسیع خلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے کچھ بھی یاد نہ رہا تھا۔

شہر کو خدا حافظ کہنے کے بعد وہ بلا سوچے سمجھے اسٹیشن کی طرف چل پڑا تھا۔ آدھی رات کا عالم تھا۔ اس وقت وہ ریلوے اسٹیشن کے سوا کہاں جا سکتا تھا۔ اس لئے انجانے میں وہ ادھر چل دیا۔ وہ وہاں پہنچ کر پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھ گیا۔

پھر نہ جانے کب گاڑی آ گئی اور ٹکٹ لئے بغیر سوچے سمجھے بغیر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی اور وہ بت بنا بیٹھا رہا۔

اس نے شانے پر دباؤ محسوس کیا۔ وہ چونکا۔ پاس ایک وردی پوش بابو کھڑا تھا۔ علی نے بابو کی طرف دیکھا۔

ٹکٹ بابو نے کہا: "ٹکٹ۔"

"ٹکٹ۔" علی نے تعجب سے دہرایا۔

اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ ریل گاڑی میں بیٹھا ہے۔

"ہاں ٹکٹ۔" علی نے پھر دہرایا اور جیب ٹٹولنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اسے یاد آیا کہ اس کے پاس تو کوئی ٹکٹ نہیں ہے۔

"ٹکٹ تو نہیں۔" وہ بولا۔

"کہاں جانا ہے۔" بابو نے پوچھا۔

"شاہ پول سے آیا ہوں۔" وہ بولا۔

"جانا کہاں ہے۔" بابو چلایا۔

"یہ گاڑی کہاں جائے گی۔" علی نے پوچھا۔

بابو نے تعجب سے علی کی طرف دیکھا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کہاں جانا ہے۔"

"مجھے؟" وہ بولا۔ "مجھے تو کہیں بھی نہیں جانا۔"

اس کے ہمراہی مسافر قہقہے مار کر ہنس رہے تھے۔

"تو گاڑی پر سوار کیوں ہوئے؟" بابو بولا۔

"پتہ نہیں۔" علی گویا اپنے آپ سے کہنے لگا۔

"کرایہ نکالو۔" بابو نے کاپی کھولتے ہوئے کہا۔

علی نے جیب ٹٹولی۔ اس کی جیب میں صرف سات روپے آٹھ آنے تھے۔

"میرے پاس صرف یہ ہیں۔" علی نے کہا۔

بابو نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے تمہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" علی نے جواب دیا۔

بابو اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "تم عادی بے ٹکٹے نظر نہیں آتے۔"

"جی نہیں۔" علی بولا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"اچھا تو پھر اگلے سٹیشن پر اتر جانا۔"

"جی اچھا۔"

بابو نے اپنی کاپی بند کر دی اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ علی پھر اپنے خلا میں کھو گیا۔

اگلے جنکشن پر بابو نے اسے پھر جھنجھوڑا۔ "چلو اترو۔" وہ بولا۔

علی نے سوٹ کیس اٹھایا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

"اب کہاں جاؤ گے؟" بابو نے پوچھا۔

"پتہ نہیں" علی نے جواب دیا۔

"واپس شہر کیوں نہیں جاتے؟"

علی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

پھر وہ پلیٹ فارم پر ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ بابو اسے دور کھڑا دیکھتا رہا۔ گاڑی چل پڑی۔ علی جوں کا توں بت بنا بیٹھا رہا۔ یہ دیکھ کر بابو جھٹ سے گاڑی پر چڑھ گیا۔

دیر تک علی وہیں بیٹھا رہا۔

بچے کے رونے کی آواز سن کر علی چونکا۔ ذہن میں حرکت سی ہوئی۔

"ابو ابو ____" ماں کی طرف ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔

پھر دھندلکے سے ایک شکل ابھری۔ "تم نے میری بیٹی کو بیچا ہے۔" کوئی چیخی۔

علی نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے سینے میں کٹاری گھونپ دی ہو۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور چائے کے سٹال پر کھڑا ہو کر چائے پینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہاں جاؤں میں ؟کہاں جاؤں؟

اس کے روبرو محمود آ کھڑا ہوا۔ "تو نہیں" وہ بولا۔ "غصے میں نہ آؤ۔"

"محمود۔" کسی نے اس کے کان میں کہا۔ "محمود جو ہے۔"

"انہوں۔" علی نے نفی میں سر ہلایا۔

علی پور۔ رفیق۔ خانپور ____ اس کی کانوں میں آوازیں آنے لگیں لیکن وہ نہ تو علی پور جانے کے لئے تیار تھا اور نہ خانپور۔

"کہاں جاؤں۔ کہاں جاؤں؟" گاڑی ہونکتی ہوئی پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔

علی کی توجہ گاڑی کی طرف منعطف ہوئی۔ صبح کا وقت تھا۔ سردی زوروں پر تھی۔ گاڑی کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ اندر دھندلی دھندلی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ مسافر کمبلوں اور چادروں میں لپٹے اونگھ رہے تھے۔

دفعتاً اس کی نگاہ گاڑی کی پلیٹ پر پڑی۔ "راجواڑہ ایکسپریس"۔

"راجواڑہ۔" اس نے محسوس کیا جیسے وہ نام مانوس ہو۔ وہ سوچنے لگا۔ ڈاکٹر خلیق اس کے روبرو آ کھڑا ہوا۔

"علی صاحب۔ کبھی میرے پاس راجواڑہ آؤ۔" وہ مسکرایا۔

"ہاں۔" علی کو یاد آیا۔ اس کا ماموں زاد بھائی خلیق راجواڑے کے ہسپتال میں نو

کر تھا۔ علی چپکے سے باہر نکلا۔ اس نے راجواڑے کا ٹکٹ خریدا۔ اور پھر سے اندر
آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

بوند باندی

علی کو دیکھ کر خلیق حیران رہ گیا۔

"ارے آپ یہاں بھائی جان۔" اسے یقین نہ آتا تھا کہ علی اس سے ملنے راجواڑے
آئے ہیں۔ "بھئی واہ۔" وہ چلانے لگا۔ "یہ تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔ مجھے بے حد
خوشی ہوئی ہے بے حد مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ کسی روز آپ یہاں آئیں گے۔ بڑی مہربانی
کی بڑی عنایت ہے۔"

دیر تک خلیق چلاتا رہا۔ اظہار خوشی کرتا رہا۔ پھر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ علی وہ
علی نہیں۔ نہ جانے کیا بات ہے۔

"لیکن۔" وہ چلایا۔ "خیریت تو ہے۔"

"ہاں" علی نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں۔" خلیق نے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں۔" علی نے ناامیدی اور مایوسی سے کہا۔

"آپ کی طبیعت تو اچھی ہے۔" وہ بولا۔

"ہاں۔" علی نے جواب دیا۔

علی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی آمد کی وجہ نہیں بتائے گا۔ علی کو خلیق پر پورا اعتماد
تھا۔ وہ اس بات سے پوری طور پر واقف تھا کہ خلیق کے دل میں علی کے لئے محبت
ہے۔ اور اس محبت میں احترام کا عنصر شامل ہے۔ اور خلیق کسی قیمت پر بھی علی سے بدظن
نہیں ہو سکتا۔ پھر نہ جانے کیوں بات چھپانا چاہتا تھا کہ وہ شہزادے سے قطع تعلق کر کے
چلا آیا ہے۔ اسے یہ بات کہنے کی جرات نہ پڑتی تھی۔ شاید وہ محسوس کرتا تھا۔ کہ اس
نے ارتکاب جرم کیا ہے۔

خلیق سمجھ گیا کہ کوئی بات ہے جس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا وہ لڑکی ہے۔ چپ لگی ہے۔ اس کے بعد وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے کوئی بات نہ ہو۔ جیسے وہ کچھ سمجھا ہی نہ ہو اور ایلی کا دل بہلانے کے لیے اس نے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں۔

"میاں صاحب۔" وہ بولا۔ "بڑی اچھی جگہ ہے یہ رجوڑہ۔ کیا بتاؤں۔ تاریخی اہمیت کا قصبہ ہے۔ اگرچہ چھوٹا سا ہے لیکن مطالعے کے لیے عجوبہ شہر ہے۔"

پھر وہ ایلی کو شہر لے گیا۔

"یہ دیکھئے یہ رجوڑے کے محلات ہیں۔ منہدم ہو چکے ہیں پھر بھی وسیع آثار ہیں اور یہ ٹیلہ جو ہے اس کے نیچے منوں سونا اور چاندی ہے مرنہ جانے کیا کیا۔ حکومت یہ آثار کھودنے پر غور کر رہی ہے اور یہ دیکھئے یہ پرانے باغات ہیں۔ مغلیہ وقت میں کسی زمانے میں یہاں گورنر رہتا تھا۔ بڑے ٹھاٹھ تھے اس زمانے میں رجوڑے کے۔ بے حد زرخیز جگہ ہے نا اس لیے اتنے باغات تھے یہاں کہ اسے باغ بہشتی کہتے تھے۔ یہ نام تو اب رکھا گیا ہے۔ پہلے اسے باغ بہشتی کہا جاتا تھا۔ یہاں ہر قسم کا میوہ لگتا تھا۔ بس ایک ہی وقت ہے یہاں سانپ بہت ہیں۔"

ایلی خلیق کی باتیں سنتے ہوں ہوں کرتا رہا اور باغات دیکھ کر خیر بہت خوب کہہ دیتا۔ دراصل ایلی رجوڑہ میں ہوتے ہوئے رجوڑہ میں نہ تھا۔ وہ ان دنوں کہیں بھی نہ تھا۔ نہ ہوش میں نہ بے ہوش۔ اس کے ذہن میں ایک خلا چھپا ہوا تھا۔ یوں محسوس کرتا تھا جیسے کوئی خواب میں چل پھر رہا ہو۔ نگاہ میں چاروں طرف ایک دھند کا چھایا ہوا تھا۔ گردوپیش اس دھندلکے

میں ڈگمگاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چیزوں میں وضاحت نہ تھی۔ حرکات بے جان اور نم آلود دکھائی دیتی تھیں جیسے سلوموشن فلم چل رہا ہو۔ بازاروں میں دوکان دار ڈگمگاتے دکھائی دیتے تھے۔ راہ گیر چلتے نہ تھے بلکہ لڑکھڑاتے آہستہ آہستہ بے جان بے غرض قطعی طور پر ایلی کے غم کے کوائف ہی مختلف تھے۔ شدت غم میں اس کا ذہن خد

میں بدل جاتا۔ دفعتاً چاروں طرف دھندلکا چھا جاتا۔ پھر غم بوند بوند اس کے دل کی گہرائیوں میں گرتا۔ بوند بوند۔ بوند بوند۔ اور وہ بوندا باندی لگی رہتی۔ دنوں ہفتوں مہینوں۔

ایلی کو صرف یہ ڈر تھا کہیں خلیق راجواڑہ میں اس کی آمد کے متعلق کسی کو خبر نہ کر دے۔ اگر اس نے خبر کر دی تو مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ شہزاد اسے منانے نہیں آئے گی لیکن ممکن ہے لوگ اسے سمجھانے کے لئے آ جائیں۔ وہ راجواڑے میں صرف اس لئے آیا تھا کہ کسی کو خیال بھی نہ آئے گا کہ وہ راجواڑے میں ہے۔ اس نے پور کو بھی کوئی خط نہ لکھا تھا تاکہ شاہدوں میں کسی کو علم نہ ہو کہ وہ راجواڑے میں مقیم ہے۔ اس نے اپنی چھٹی کی عرضی صاحب کے نام بھیج دی تھی۔ جس میں یہ درخواست کر دیا تھا کہ اس کی تنخواہ اس کے گھر شہزاد کو بھیجوا دی جائے۔ یہ عرضی اس نے آر ایم ایس میں پوسٹ کی تھی۔

خلیق ہر وقت ایلی کے ساتھ رہتا تھا۔ جب وہ ہسپتال جاتا تو ایلی کو ساتھ لے جاتا اسے اپنے کمرے میں بٹھاتا۔ اس کی جملہ ضروریات کا خیال رکھتا اور اگر اسے کسی مریض کو دیکھنے کے لئے جانا ہوتا تو بھی ایلی کو ساتھ لے جاتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایلی کو اکیلے چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں چونکہ چند ہی روز میں خلیق کو یقین ہو چکا تھا کہ ایلی کی کیفیت معمولی سے بہت بڑھ کر ہے۔ ذہنی حالت شدید بحران کی غماز ہے۔

راجپال سنگھ

راجواڑے میں پہلا واقعہ جس نے ایلی کی توجہ کو خارجی دنیا کی طرف منعطف کیا راجپال سے متعلق تھا۔ راجپال سنگھ ایک قومی ہیکل نوجوان تھا۔ وہ راجواڑے کی ایک بستی میں رہتا تھا۔

ایک روز جب ایلی اور خلیق شام کے وقت کوارٹر سے باہر میدان میں بیٹھے تھے تو راجپال سنگھ آ گیا۔ آتے ہی وہ لڑکھڑایا گرا اور پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے

وسان خطا ہو رہے تھے۔

ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں، اور وہ مشکل سے سانس لے رہا تھا۔

رجپال بیٹھا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

"تم بیمار ہو کیا؟" ڈاکٹر نے اس کی نبض ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" رجپال نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "اچھا بھلا ہوں ڈاکٹر صاحب۔" وہ بولا۔

"تو پھر بات کیا ہے۔"

رجپال نے اشارہ کیا۔ "ابھی بتاتا ہوں۔"

دیر تک وہ ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا رہا۔

"ڈاکٹر صاحب۔" وہ کچھ دیر کے بعد بولا۔ "میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔"

"وہ تو کسی کی زندگی کا بھی نہیں۔" خلیق ہنسا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب یہ اور بات ہے۔" رجپال بولا۔ "بات یہ ہے کہ ایک ناگ راج ناگنی مجھے کاٹ کر چھوڑے گی۔"

"ناگنی؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے غلطی سے ایک روز اس کے نر کو مار دیا۔ وہ دونوں نہر کے کنارے کھڑے تھے پر ناگنی اوٹ میں تھی سو مجھے دکھائی نہ دی۔ دکھائی دے جاتی ڈاکٹر تو میں نہیں پچھتاتا۔ ناگ اور ناگنی اکٹھے ہوں تو انہیں اکٹھے مارنا چاہیے۔ جو ایک مر جائے تو دوسرا بدلہ لیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اکیلا ناگ ہو چاہے نر ہو یا مادہ جو چاہے رہے۔ چاہے وہ مر جائے چاہے زخمی ہو جائے۔ کوئی بات نہیں۔"

"ہوں۔" ڈاکٹر بولا۔ "تو پھر۔"

"پھر کیا۔ میں نے موقع پا کر ایک لٹھ ماری۔ نر وہاں چت ہو گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں ڈاکٹر صاحب تو بوٹے کی اوٹ میں مادہ ناگنی ہے۔ بس اسے دیکھتے ہی پسینہ آ گیا۔

بس ڈاکٹر صاحب۔ وہ روح اور آتما کا روگ ہے۔ جب باہر جاؤں تو مجھے پتہ ہوتا ہے کہ
ناگنی دور نہیں۔ کہیں پاس ہی ہے۔ خبردار رہتا ہوں۔ اسی لئے باہر نہیں جاتا۔ ایک
منٹ کے لئے بے خبر ہو جاؤں تو سمجھو معاملہ ختم ہو گیا۔" وہ خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد بولا

"دن کے سمے تو کوئی بات نہیں۔ ناگنی چالاک ہے تو اپنے باجود پر بھی جور ہے
۔ جو پاس آئے گی تو چھوڑتا میں بھی نہیں۔ پر رات جو باہر پڑ جائے تو سمجھو پھر وہ
مجھے شہ چھپنے نہیں دے گی۔ آج پھیر ہوئی تھی۔ قدم قدم پر میرے ساتھ رہی وہ۔
میں بھاگا۔ وہ بھی بھاگی۔ بس سمجھو ڈاکٹر جی کی مہربانی ہے جو سلامت پہنچ گیا ورنہ آج
کوئی صورت نہیں تھی بچنے کی۔" وہ لمبے سانس لینے لگا۔

"تو میں اس بات میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"بس ایک بات ہے۔" وہ بولا۔ "وہ سلائیاں اس سرمے کی دیدو مجھے صرف دو
سلائیاں۔"

"سرمے کی۔" ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ وہ جو کمپنی والوں کے پاس سرمہ ہے سانپ کے کاٹے کا۔"

"سرمہ ہے۔" ایلی نے حیرت سے پوچھا۔ "سانپ کے کاٹے کا سرمہ۔"

"ہاں بابو۔" رجپال بولا۔ "جس کو ناگ کاٹ جائے یا کیڑا سونگھ جائے اس کی
آنکھ میں سرمے کی سلائی لگا دیتے ہیں۔ بس سارا زہر بھسم ہو جاتا ہے۔"

"ارے۔ کیا یہ سچ ہے" ایلی نے خلیق سے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" خلیق نے جواب دیا۔

"بالکل سچ ہے ڈاکٹر جی۔" رجپال بولا۔

"تو پھر تم کمپنی والوں سے کیوں نہیں مانگتے۔"

"وہ نہیں دیتے بابو جی۔ وہ نہیں دیتے۔ ڈاکٹر جی کہیں تو شاید دے دیں۔"

نڈھال سی ہو۔ چند ہی منٹوں میں سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔

"کیا ہوا۔ کیا ہوا۔" محلے والیاں چلانے لگیں۔

"ہائے۔ یہ تو نیلی ہو گئی۔" ایک بولی۔

"لیکن ہوا کیا ہے بہن؟"

"کیا پتہ کیا ہوا ہے۔ بس ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی ہے۔"

"ہائے۔ وہ تو نیلی پڑ چکی ہے۔ سانپ سنپولے نے تو نہیں ڈسا۔"

"پتہ نہیں۔" شمیم بولی۔ "ہم نے تو نہیں دیکھا۔"

"ہائے۔ ابھی تو آئی تھی تہہ خانے سے۔" فرحت روتے ہوئے بولی۔

ایک نے بڑھ کر ہاجرہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ کچھ لوگ ڈاکٹر کی طرف بھاگے۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر آ گیا۔ وہ مریضہ کو دیکھ کر رک گیا اور دور ہی سے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" وہ بولا۔

"کچھ پتہ نہیں۔"

"چیخ مار کر گر پڑی اور پھر نیلی ہو گئی۔"

"ہوں۔" ڈاکٹر بولا۔ "بہت زہریلا سانپ معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے دیکھا ہے کیا؟"

"نہیں۔" سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

"ٹانگ ننگی کرو۔" ڈاکٹر چلایا۔

انہوں نے ہاجرہ کی شلوار کے پائنچے اوپر کر دیے۔ بائیں ٹانگ پر کچھ جگہ یوں ابھری ہوئی تھی۔ جیسے پھوڑا سا نکلا ہوا ہو۔ ڈاکٹر نے ایک تیز چاقو سے وہ پھوڑا کاٹنا چاہا لیکن چاقو لگتے ہی پھوڑا یوں کٹ گیا جیسے کیلا ہو۔ ڈاکٹر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔" وہ چیخنے لگا۔ "کوئی مریضہ کے جسم کو نہ چھوئے۔ اٹھو اٹھو۔" وہ اس عورت سے مخاطب ہوا جو ہاجرہ کا سر گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ "اٹھو اٹھو

ورنہ زہر تمہیں بھی چڑھ جائے گا۔"

اس عورت نے ڈر کر ماجدہ کا سر نیچے دھکیل دیا۔ وہ خود اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کے دھڑ میں سخت کمزوری تھی۔ اس پر لوگوں کی توجہ ماجدہ سے ہٹ کر اس کی طرف ملتفت ہو گئی۔ چار عورتوں نے اسے اٹھایا اور اندر چارپائی پر ڈال دیا۔

ڈاکٹر بولا۔ "اسے فوراً ہٹا دو۔ ورنہ کچھ دیر کے بعد اس کا جسم پھٹے گا اور جہاں جہاں چھینٹے پڑیں گے وہاں وہاں زہر پہنچے گا۔ لے جاؤ لے جاؤ۔" وہ چلایا۔ "سب چلی جاؤ۔ مریضہ کے پاس کوئی نہ ٹھہرے۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد سب عورتیں بھاگ گئیں۔ صرف شہنو، ڈیلی، فرحت، رجب اور جانو رہ گئے۔ وہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ ماجدہ کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا اور اس کے جسم کا گوشت گویا جل رہا تھا۔ عین اس وقت ایک چیچے میاں تیز تیز برآمدے پر آ گیا۔

"کس کو کاٹا ہے کیڑے نے۔" وہ بولا۔

سبھی نے حیرانی سے چیچے کی طرف دیکھا۔ اب کیا کرے گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ چیچے کی نگاہ ماجدہ پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشت بھری مسکراہٹ چمکی۔ "یہ...... وہ دیوانہ وار چلایا۔ اس نے اپنی پگڑی نیچے پھینک دی۔ "آج تو منہ کیڑے کے درشن ہو گئے۔ ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔" وہ چلانے لگا۔

سب سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔

"کوئی سوئی دو۔" وہ بولا۔

"جاؤ۔ دودھ گھی اور کالی مرچ کا انتظام کرو۔ یہاں کوئی مندر ہے۔ اگر وہ چپ ہے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

چیچے نے سب کو چوبارے سے باہر نکال کر اندر سے کنڈی لگا لی اور بیٹھ کر نہ جانے کیا جنتر منتر پڑھنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوئی تھی۔ سامنے دودھ کا بھر

ہوا رکھتا تھا۔ وہ بار بار سوئی سے ماجدہ کو چھوتا۔ اور پھر چند ایک مرتبہ چھونے کے بعد سوئی کو دودھ میں ڈال دیتا۔ اس وقت عجیب سی آواز پیدا ہوتی جیسے میں سرخ کئے ہوئے لوہے کو پانی میں ڈالتے ہیں تو پیدا ہوتی ہے۔ کوئی دو گھنٹے تک وہ ماجدہ کی لاش کے پاس بیٹھا یہی عمل دہراتا اور منتر پڑھتا رہا ___ پھر دفعتاً ایک ہی چیخ سنائی دی۔ ویسی ہی چیخ جیسی ماجدہ نے بے ہوش ہوتے وقت ماری تھی۔ چیخ سن کر وہ سب بھاگ کر کھڑکیوں میں آ کھڑے ہوئے۔ ماجدہ کا رنگ سیاہ نیلا ہو چکا تھا۔ بالکل نیلا۔ اور وہ حرکت کر رہی تھی۔

چیلا چلا رہا تھا۔ "بابا۔ گرو کی دیا سے تندیلا کا جیون مل گیا۔ بابا بابا۔" سامنے پڑا ہوا دودھ کا کٹورہ سیاہ ہو چکا تھا۔ چیلے کے ماتھے کی چھڑی بھی گئے سرے سے بھی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

ناگ دیوی

چار ایک گھنٹے کے بعد ماجدہ نے آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے اسے اٹھا کر اندر چارپائی پر ڈال دیا۔ چیلا اپنی گٹھڑی سنبھال رہا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ پھر اس نے پنجی سے ایک بڑی سی ڈبیہ نکالی اور دو لکڑیوں کی مدد سے ماجدہ کی ٹانگ کا وہ چھوٹا ٹکڑا لیا۔ جسے ڈاکٹر نے قینچی سے کاٹا تھا۔ چیلے نے گوشت کا وہ ٹکڑا جو ابھی تک سیاہ تھا اٹھا کر ڈبیہ میں ڈال لیا۔

"تمہاری کیا خدمت کریں؟" علی نے بالکل چیلے سے کہا۔

"تم کیا سیوا کرو گے بابو۔" وہ بولا۔

"پھر بھی ___" علی نے کہا۔

"نہیں۔" چیلا مسکرایا۔

"کچھ تو لے لو۔" شہزاد نے پانچ دس کے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

"ارے تمہیں تو صرف بڑھیا کا جیون ملا ہے پر مجھے گرو کی دیا سے ساری جیون شکتی

مل گئی ہے۔ تمہیں کیا پتہ یہ کتنی بڑی دولت ہے۔" اس نے اپنی ڈبیا کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اب چلتا ہوں۔"

دفعتاً وہ رک گیا۔ "ارے لڑکی۔" وہ بولا۔

"کیا ہے۔" فرحت نے کہا۔

"تو نہیں۔" وہ بولا۔ "یہ جو میری دوائی ہے۔ ذرا اسے میری طرف کرو۔"

شہزادی نے سپیرے کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ شہزادی کے ماتھے کے تل پر پڑی۔

"ہوں" وہ بولا ـــــ "تیرے تو ماتھے پر تندی بندی ہے۔ تو تو آپ ناگ دیوی ہے۔ یہ لے کیا یاد کرے گی کہ سپیرے نے کیا دان کیا تھا۔" اس نے ایک ڈبیا سے چند سیاہ مرچیں نکالیں اور شہزادی کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ "انہیں کھا لے۔ ابھی کھا۔"

شہزادی نے نفرت سے ان گندی مرچوں اور سپیرے کے غلیظ ہاتھوں کی طرف دیکھا اور پھر ہچکچاتے ہوئے دو مرچیں منہ میں ڈال لیں۔

سپیرے کے جانے کے بعد اس نے باقی مرچیں پھینک دیں۔

ہاجرہ روبصحت ہونے لگی۔ سپیرے کے نسخے کے مطابق ایک ہفتہ وہ اسے دودھ اور گھی پلاتے رہے۔

جب وہ تندرست ہوئی تو خود ہی کہنے لگی پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا۔ اس روز بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے یوں محسوس کیا تھا جیسے کسی نے ایک ٹھیکرے سے سر میں دے ماری ہو۔ پھر پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ پھر جب میں ہوش میں آئی تھی تو بھی میں نے محسوس کیا تھا جیسے کسی نے ٹھیکرے سے سر پر دے ماری ہو۔"

ہاجرہ بالکل صحت مند ہو گئی۔ اس کے بعد کئی ایک سال تک اسے کوئی بھڑ یا کوئی زہریلا جانور کاٹتا تو معاً مر جاتا اور ہاجرہ کے جسم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

پھر ایک روز ان کالی مرچوں کے دانوں کے اثر کا راز بھی کھل گیا جو سپیرے نے

شہزاد کو جو تحفۃً دی تھیں وہ ان میں سے شہزاد نے صرف دو تین چبائی تھیں۔

ایک روز شہزاد کی انگلی پر بھڑ کاٹ گئی۔ شدت درد سے بلبلا اٹھی۔ اتفاقاً اس نے وہ انگلی منہ میں ڈال دی۔ دفعتاً درد غائب ہو گیا۔ وہ بے حد حیران ہوئی۔ اس کے بعد نہ تو انگلی سوجی اور نہ ہی درد ہوا۔

پھر ایک روز ریحانہ کو بھڑ نے کاٹا تو شہزاد نے آزمانے کے لئے اس جگہ پر لعاب لگا دیا۔ ریحانہ کو فوراً آرام آ گیا۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ شاید یہ لال مرچوں کا اثر ہو اور وہ افسوس کرنے لگی کہ اس نے ساری مرچیں کیوں نہ کھائیں۔

علی کو وہ سب واقعات یاد آ گئے۔ اس کی نگاہ تلے شہزاد آ کھڑی ہوئی۔ اس کی پیشانی پر وہ مہر شرعی تل یوں روشن تھا جیسے دیا جل رہا ہو۔ جیسے رک گیا میری طرف دیکھ رہی۔ "وہ بولا۔ "تیرے ماتھے پر تو نند بندی ہے۔ تو تو آپ ناگ دیوی ہے۔"

پھر شہزاد شاہول کے گھر میں کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ ہونٹوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ماتھے کی بندی کھل اٹھی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"میں دیکھوں گی کس طرح تم اسے طلاق نہیں دلواتے۔"

یہ شہزاد اس شہزاد سے کس قدر مختلف تھی۔

شاید وہ محض ایک رنگیلی محبوبہ تھی۔ اس میں بیوی بننے کی صلاحیت نہ تھی۔ علی سوچ رہا تھا۔ اس روز پہلے دن اس نے شہزاد کے متعلق سوچا تھا۔ ورنہ جب سے وہ رجو ڈیرے آیا تھا اگر اسے شہزاد کا خیال بھی آتا تو اس قدر دکھ محسوس ہوتا کہ وہ اس خیال کو دل کی تہہ گہرائیوں میں دبا دیتا۔ اس روز رات کو سونے سے پہلے اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دے لیکن خلیق کی موجودگی مانع تھی۔ اس نے چپکے چپکے چند آنسو بہائے۔ بہر صورت وہ جمود جو اس پر طاری تھا ٹوٹ گیا اور وہ

دینی خدمت سرانجام ہو گیا۔

جادو کا تریاق

اگلے روز جلسے سے فارغ ہو کر وہ دونوں کمیٹی کے سیکرٹری کے گھر چلے گئے۔ رجوڑے کی میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری کا نام حافظ عبدالمجید تھا۔ وہ چالیس برس کے ہو گئے۔ قد درمیانہ خدوخال پر وضع داری کے جملہ نشانات واضح تھے۔ انداز میں روایت پرستی کی واضح جھلک تھی۔ وہ احتیاط سے چلتے۔ احتیاط سے بات کرتے اور احتیاط سے سوچتے تھے۔ خلیق نے کچھ دیر بعد مطلب کی بات چھیڑی۔ بولا:

"حافظ صاحب۔ کیا آپ کے پاس سانپ کے کاٹے کا سرمہ ہے یعنی ______۔" خلیق نے اپنی بات کی وضاحت کرنے کے لئے کچھ اور کہنا چاہا۔

"ہاں ہاں" حافظ بولے۔

"حیرت ہے۔" خلیق بولا۔ "کہ سرمہ لگانے سے سانپ کے زہر کا اثر دور ہو جائے۔"

"جی صاحب۔" وہ بولے۔ "ساری بات ہی عجیب ہے۔ دراصل ہوا یہ کہ آج سے چار سال پہلے ہمیں حکومت کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس کے ساتھ ہی حکیم محمود علی کا اشتہار ملفوف تھا۔ اشتہار میں اس سرمے کے متعلق مرقوم تھا کہ اس کی سلائی لگانے سے سانپ یا بچھو کا زہر یا تو اثر ہی نہیں کرتا اور اگر اثر ہو چکا ہو تو دور ہو جاتا ہے۔ گورنمنٹ نے خط میں لکھا تھا کہ ہم اس سرمہ کو خریدنے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ چونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سرمہ کا اثر فوری ہوتا ہے اور اس کے استعمال کرنے سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا ہسپتالوں، سکولوں اور کمیٹی گھروں کو یہ سرمہ خریدنا چاہئے۔"

"آپ جانتے ہی ہیں ڈاکٹر صاحب۔" حافظ صاحب بولے۔ "کہ ہم سرکاری خط کی تائید کرتے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ ایسے ہی حکیم محمود کا کاروبار چلانے میں مدد

دینا مقصود ہے۔ چونکہ ساری بات ہی مہمل تھی بھلا آنکھوں میں سرمہ لگانے کو سانپ کے کاٹے سے کیا تعلق۔

"ہاں ہاں۔" خلیق ہنسنے لگا۔

"ہے نا" حافظ صاحب بولے۔ "تو صاحب ہم نے گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دو شیشیاں خرید لیں اور وہ عرصہ دراز تک گھر جوں کی توں پڑی رہیں۔"

"ایک رات دو بجے کے قریب بیگم صاحب اٹھیں تو انہیں سانپ نے کاٹ لیا۔ اب اس وقت کیا کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے ناگ تیل بھی لگا دیکھا۔ کچھ فائدہ نہ ہوا۔ پھر مجھے سرمہ یاد آیا میں نے کہا۔ چلو اسے بھی آزما دیکھو۔ سو جناب میں نے اس کی آنکھوں میں ایک سلائی لگا دی۔ سلائی لگانے کی دیر تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ درد گویا کافور ہو گیا۔ اس روز ہمیں سمجھ میں آیا کہ یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔ سو جناب ہم نے کمیٹی کی طرف سے ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ کسی شخص کو بچھو یا سانپ کاٹے تو وہ ہمارے پاس پہنچ جائے صاحب بیسیوں مریض آئے اور ایک ایک سلائی ڈالنے کے بعد یوں اپنے پاؤں پر چل کر گھر لوٹے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔"

"تو کیا اب بھی آپ کے پاس وہ سرمہ ہے۔" خلیق نے پوچھا۔

"اونہوں۔" حافظ صاحب بولے۔ "ختم ہو گیا۔ شاید ایک آدھ سلائی نکل آئے۔ جی ڈاکٹر صاحب ہم نے حکیم محمود علی کو کئی ایک خط لکھے تاکہ اور شیشیاں بھیجے لیکن تمام خط ڈیڈ لیٹر آفس کے ذریعے واپس آگئے۔ ڈاک والے نے ان پر تحریر کیا ہوا تھا کہ اس نام کا کوئی شخص بھاٹی دروازے میں رہائش نہیں رکھتا۔ خدا جانے وہ کہاں چلے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ حکیم محمود علی صاحب کیا ہوئے اور ان کا مطلب کیا ہو۔ ہم نے بڑی تحقیق کی لیکن بے فائدہ۔"

خلیق نے پھر رجب علی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ حافظ صاحب بولے

"ہاں وہ ہمارے پاس بھی آیا تھا لیکن دوائی پہلے دے دینا یہ چیز ہمارے اصول
کے خلاف ہے۔ جب تک سانپ اسے ڈس نہ لے، وہ یہاں پہنچ جائے تو میرا خیال
ہے ایک سلائی سرمہ تو نکل ہی آئے گا۔"

چار ایک روز بعد شام کو تھوڑے قریب راجواڑے کے بازار میں شور مچ گیا۔

"رجپال آ رہا ہے۔ رجپال آ رہا ہے۔"

جب وہ قصبے میں داخل ہوا تو اس کا منہ سوج چکا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نہ
جانے وہ کتنی دور سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کی ہمت ختم ہو چکی تھی۔ دیر تک وہ فصیل
دیوار لگ کر کھڑا رہا۔ پھر کسی عزم سے دوڑنے لگا۔ لالہ رام داس کی دکان پر وہ
گھی کی طرف جھپٹا اور گھی پینے لگا۔ اتنے میں اس کے گرد بھیڑ لگ چکی تھی۔

لوگ چاروں طرف سے دوڑے تھے۔ ایک آدمی حافظ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ دوسرا
ڈاکٹر کے پاس۔ گھی پینے کے بعد اس نے کچھ ہمت کر کے بھاگنا شروع کیا لیکن
چند ہی قدم اٹھانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا اور پھر چکرا کر
دھڑام سے بازار کے عین وسط میں ڈھیر ہو گیا۔ اتنے میں حافظ صاحب بھی عین
موقع پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے سرمے کی ایک سلائی اس کی آنکھوں میں ڈالی۔
رجپال کا جسم یوں تڑپنے لگا جیسے کانٹا لگ گیا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں
اور وحشیانہ انداز سے نعرہ لگایا "واہ گرو۔"

ایلی نے اس وقت محسوس کیا جیسے اس پر بھی سانپ کاٹے کا اثر ختم ہو گیا ہو۔ اس کا
بھی جی چاہتا تھا کہ زور سے نعرہ لگائے۔ "واہ گرو۔"

اگلے روز شفیق نے دیکھا کہ ایلی کی پرانی شخصیت پھر سے استوار ہو گئی ہے اور اس
کا وہ ذہنی جمود ختم ہو چکا ہے تو اس نے بات چھیڑی۔

"شکر ہے اب آپ کی طبیعت پہلے کی نسبت بہتر ہوئی ہے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔"

"وہ ہنسنے لگا۔

صورت حال بڑی خطرناک تھی۔" ایلی نے کہا۔

"اچھا۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "آخر بات کیا تھی؟"

"مجھے بتانے میں تو کوئی حرج نہیں۔"

رسوائی

ایلی کا قصہ سننے کے بعد خلیق خاموش ہو گیا۔ تاہم وہ محسوس کر رہا تھا اس لمبی چوڑی داستان کا یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ خلیق کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

خلیق طبعاً بکنے والا شخص نہ تھا۔ وہ خاموشی سے محسوس کرنے کا عادی تھا۔ اس نے بصد مشکل آنسو پی کر بولا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ اپنے معاملات کو بہتر سمجھتے ہیں۔"

پندرہ روز وہاں ٹھہرنے کے بعد ایلی خلیق سے رخصت ہو گیا۔ وہ ایک ایسی گاڑی میں سوار ہوا جو رات کے ایک بجے شاہوال پہنچتی تھی۔ شاہوال پہنچ کر وہ سیدھا کپور کے گھر گیا۔ حالات کو جاننے کے لئے وہ کسی اور کے پاس نہ جا سکتا تھا۔ ریاض سے وہ گھبراتا تھا۔ ناظم سے ملنا مشکل تھا۔ اور بورڈنگ میں جانا مناسب نہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ لڑکے اسے پہچان لیں گے اور پھر آپس میں باتیں کریں گے۔ کپور اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"کیوں بھائی۔ تم کہاں۔ آؤ آؤ۔" دفعتاً وہ رک گیا۔ "لیکن نہیں۔ یہاں نہیں۔ کوئی تمہیں دیکھ نہ لے۔ ٹھہرو۔ میں ابھی آیا۔"

کپور چند منٹ کے بعد باہر نکلا۔ "آؤ آؤ۔" وہ بولا "باہر جا کر بات کریں گے۔" اور وہ دونوں چپ چاپ سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ ویٹنگ روم میں بیٹھ کر کپور ایلی پر برس پڑا۔

"تم نے یہاں سے جانے میں بڑی شدید غلطی کی ایلی۔ تم نے میدان خالی چھوڑ

دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمہاری بیوی نے واویلا مچایا۔ تمہارے خلاف اس قدر زہر اگلا کہ شہول کا ہر ہرکار تمہارے خلاف ہو چکا ہے۔ ہر شخص کی ہمدردی ان کے ساتھ ہے۔ پولیس کے افسروں نے حکم دے دیا ہے کہ تمہیں حراست میں لے لیا جائے۔ مجسٹریٹ تمہاری بیوی کا قصہ سن کر اتنا متاثر ہوا کہ اس کے آنسو نکل آئے۔ سب تمہارے خلاف ہو چکا ہے۔ ڈپٹی کمشنر تمہارے حق میں نہیں۔ سارے شہر میں تمہارے خلاف آگ لگی ہوئی ہے۔ اگر لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا۔ تو وہ تمہیں مار دیں گے۔ ان سب کو یقین ہو چکا ہے کہ تم نے اپنی بیٹی کا سودا کیا تھا۔ اور اس کی اور اس کی ماں کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کی شادی کر دی تھی ـــــ اور پھر تم بھاگ کر روپوش ہو گئے۔ اس سے ان کا یقین اور بھی پکا ہو گیا۔

''کیا تمہارا بھی یہی خیال ہے۔'' علی نے پیرو سے پوچھا۔

''میری بات چھوڑو۔ میرا کیا ہے۔''

''میں تمہیں حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔'' علی نے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ جانے سے پہلے بتاتے۔ اب کیا فائدہ۔ تو تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ تمہاری گھر گھر رسوائی ہو چکی ہے۔ لوگ وہاں کا تمہیں بدمعاش سمجھتے ہیں۔ تمہارے چیلوں میں جو سے۔ سیں۔ گلی رہتا تھا وہ ان کی مدد کر رہا ہے۔''

''حد ہوگئی۔'' علی نے کہا۔

''حد کی حد ہوئی ہے۔'' پیرو کہنے لگا۔ ''حتیٰ کہ ریاض بھی مخالف پارٹی میں شامل ہو چکا ہے۔ صرف ناظم کو تم سے ہمدردی ہے لیکن وہ بھی کھلے بندوں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔''

''وہ تو پھر ہو گیا۔'' علی نے پوچھا۔

''پھر بھی تم تاریخ پر تو یہاں آؤ گے ہی۔'' پیرو نے کہا۔

"کیسی تاریخ؟" علی نے پوچھا۔

"تمہارے خلاف دو مقدمے درج ہو چکے ہیں۔" کپور بولا۔

"اوہ۔" علی بولا۔

"خبردار رہنا۔ جب بھی تم آؤ گے کسی نہ کسی بہانے تمہیں حوالات میں بند کر دیں گے اور ہم میں سے کوئی شخص اس بارے میں کھلم کھلا تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔"

علی نے محسوس کیا جیسے وہ رجال ہو اور اسے مادہ نے ڈس لیا ہو۔

"ہم تو بس یہی ایک کام کر سکتے تھے سو ہم نے کر دیا۔" کپور نے کہا۔ "اکبر صاحب تمہارے خلاف محکمے میں رپورٹ کرنے والے تھے۔ میں نے ہاتھ جوڑے انہیں نے کہا کہ بیان کیجیے۔ وہ کہنے لگا کہ ہم اسے یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ یہ تو بہت اچھا تھا۔ چونکہ یہاں تمہارا رہنا ممکن نہیں رہا۔ سو بھائی۔ میں نے ان سے کہا کہ رپورٹ نہ کیجیے میں ویسے ہی اس کا تبادلہ کروا دوں گا۔ سو میں ایک روز کے لئے لاہور چلا گیا اور لوگوں سے مل ملا کر میں نے تمہارا تبادلہ کروا دیا ہے۔"

"کس جگہ؟" علی نے پوچھا۔

"قاضی پور۔" وہ بولا۔ "وہاں کا ہیڈ ماسٹر شریف آدمی ہے اور وہ جگہ لاہور کے قریب ہے۔"

"تو میں یہاں چارج کیسے دوں گا؟" علی نے پوچھا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" کپور نے کہا۔ "ہم سب ٹھیک کر لیں گے۔" اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ "یہ لو یہ تمہارا آرڈر ہے اور اس پر ہم نے لکھ دیا ہے کہ تمہیں یہاں سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ میری رائے ہے کہ سیدھے قاضی پور جا کر ڈیوٹی سنبھال لو۔ اگر پیچھے رہے تو معاملہ اور زیادہ بگڑ جائے گا۔"

کپور سے جدا ہونے کے بعد علی گویا بالکل تنہا رہ گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ اکیلا ہے۔ بالکل اکیلا۔ اور کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کا ساتھ دے۔ ایک بار

پھر وہ فکر میں ڈوب گیا۔ لیکن اب کی بار اس کا ذہن خالی نہیں تھا۔ اس میں بیسیوں سوال ابھر رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا اور گاڑی قاضی پور کو جا رہی تھی۔

کوڑھی

قاضی پور پہنچ کر وہ سید حامد ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر پہنچا۔ اس نے وہ آرڈر ان کے سامنے پیش کر دیا اور کہنے لگا۔

"مدرسے میں حاضر ہونے سے پہلے میں آپ کو اپنے حالات سے واقف کرانا چاہتا ہوں۔"

تھوڑی سی تمہید کے بعد اس نے اپنی روداد مختصر طور پر انہیں سنا دی۔

"ہوں۔" اس کا قصہ سن کر انصاری صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ ظاہر تھا کہ وہ علی کے لئے کوئی ہمدردی محسوس نہیں کر رہے تھے۔ لیکن حنفی صاحب" وہ بولے۔ "میں اس بارے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

"آپ میری یہ مدد کر سکتے ہیں کہ کچھ دنوں کے لئے مجھے برداشت کریں۔" علی نے کہا۔

"کیا مطلب۔"

"مجھے یہاں اپنے سکول میں رہنے دیں۔"

وہ ہنسے۔ "اچھا۔" وہ بولے۔ "تو آپ شوق سے ہمارے مدرسے میں کام کریں۔ لیکن دیکھیں صاحب! کسی گڑبڑ سے مجھے بہت وحشت ہوتی ہے۔"

قاضی پور پہنچ کر علی کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ وہ باتیں جن سے وہ لوگوں کی توجہ جذب کیا کرتا تھا ختم ہو گئیں۔ اپنے اردگرد اساتذہ کی بھیڑ لگانے کی بجائے وہ جان بوجھ کر ان سے دور رہتا۔ جماعت میں پہیلی۔ باتیں کرنا بھی چھوٹ گیا۔ وہاں بھی خاموش رہتا اور پڑھانے میں کوئی دلچسپی نہ لیتا۔

اسے شاہ پور سے پُرتشویش خبریں آ رہی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیا ہو

محاذ اس کے خلاف کیوں قائم کیا جا رہا ہے۔ آخر شہزاد کا مقصد کیا تھا۔ اس نے جو احتجاج کیا تھا اس کی بنیاد کسی غلط بات پر استوار نہ تھی۔ شہزاد اچھی طرح جانتی تھی کہ اس نے خلیل کی شادی ذاتیات کی بنا پر نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایلی نے اسے چھوا نہیں تھا۔ پھر وہ کیا چاہتی تھی۔ کیا اس کا مقصد ایلی کو رسوا کرنا تھا۔ یا ڈرا دھمکا کر اپنے تابع کرنا تھا۔ لیکن ایلی کی جرأت ڈر کے جذبے پر استوار تھی۔ جوں جوں خطرہ بڑھتا جاتا اور بچاؤ کی کوئی صورت نہ دکھائی دیتی توں توں وہ نڈر ہوتا جاتا تھا۔

پولیس اور کورٹ اس کے لئے خطرناک مقامات تھے۔ اس وقت اس کے سر پر قید کا خطرہ اتنی وضاحت سے منڈلا رہا تھا کہ ذہنی طور پر وہ اس کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ قید ہو جاؤں گا تو کیا ہو گا۔ وہ سوچتا۔ لیکن ڈر کی وجہ سے کسی کے تابع نہیں ہوں گا۔

جب اسے اپنی رسوائی کا خیال آتا تو وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ اس کے دل پر چوٹیں لگتی۔ شہزاد نے اچھا نہیں کیا۔ وہ سوچتا۔ پھر اس کی نگاہ میں وہ پولیس افسر آ جاتا جو شہزاد کے پڑوس میں رہتا تھا۔ شہزاد اس کے قریب آ بیٹھتی اور آنسو بہاتی۔ لڑکیاں اس کے گرد منڈلاتیں۔ ہنستیں۔ قہقہے لگاتیں اور معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتیں۔ ایلی کو دیکھ کر کہتا۔ شہزاد سے اسے ایسی توقع نہ تھی۔ قاضی پور کا وہ زمانہ ایلی کی زندگی کا بدترین دور تھا۔ وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس کے دل میں کامل یقین تھا کہ سبھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ ہیڈ ماسٹر جس کے روبرو اس نے خلوص سے تمام واقعات ہمدردی حاصل کرنے کے خیال سے دہرائے تھے وہ مصحفی محلے میں لوگ اس کے خلاف آوازیں بلند کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے دوست اور رشتہ دار بھی علانیہ اس کے خلاف ہو چکے تھے۔

اس کے مکان پر وحشت برستی تھی۔ وہ مکان جو قاضی پور میں اسے رہنے کے لئے ملا تھا بہت وسیع تھا۔ اس میں کئی ایک کمرے تھے اور اس کا جملہ سامان ایک سوٹ

کیس پر مشتمل تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی بستر تھا نہ چارپائی۔ خوش قسمتی سے وہ گرمیوں کے دن تھے ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ مکان میں مالک مکان کا ایک ٹوٹا ہوا تخت پوش پڑا تھا جس پر رات کو پڑ کر سو رہتا۔ سارا دن بھی وہ اسی تخت پوش پر بیٹھا سوچتا رہتا۔

دو مرتبہ اس کے نام شاہول سے سمن آ چکے تھے۔ مدرسے کے منتظمین کی مہربانی سے ان کی تعمیل نہ ہوئی تھی۔ لیکن اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک روز اسے شاہول جانا ہی پڑے گا۔

تیسری مرتبہ جب سمن آئے تو ساتھ ہی ایک اور مصیبت رونما ہوئی۔ اس روز جب وہ صبح جاگا تو اس کے دونوں ہاتھوں پر اور بازوؤں پر ایگزیما کے چھالے نکل آئے تھے۔ ایسی ہی پھنسیاں ہر موسم سرما میں اس کے چہرے پر نکلتی تھیں۔ جب وہ پھنسیاں پھٹ گئیں اور اس کے ہاتھوں کی جلد اتر گئی۔ ہاتھوں کے زخموں سے پانی رسنے لگا۔ اس نے حیرت سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر وہ گاڑی میں بیٹھا سمن کی تعمیل کرنے شاہول جا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بیکار ہو چکے تھے۔ ان پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اور اس نے دونوں بازو اوپر اٹھا رکھے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں تک سارا شاہول پلیٹ فارم پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں سونٹے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے اس کے جھگڑے بیٹھے کھڑے تھے۔

"ٹکٹ بابو ٹکٹ۔" ریلوے کا ایک وردی پوش بابو اس کی طرف دیکھ۔ ٹکٹ اس کی جیب میں تھا لیکن اس کے ہاتھ بیکار تھے۔ وہ ٹکٹ نکال نہ سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"بے ٹکٹا ہے۔" بابو مسکرایا۔

"جی نہیں" وہ بولا۔

"تو پھر دکھا دو۔"

اس نے اپنی جیب تھیلی کی طرف کر دی۔ "اس جیب میں ہے۔"

ٹی ٹی نے مخدوش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

ایک اور ہی مسافر نے بات سمجھ کر ایلی کی جیب میں سے ٹکٹ نکالا۔

"کیا ہوا ہے تمہارے ہاتھوں کو۔" ٹی ٹی نے پوچھا۔

"جی ایگزیما ہے۔"

ان جانے بھائی

اس کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر یوں ڈر کر پرے ہٹ گئے جیسے وہ کوڑھی ہو۔ شاہول کا سٹیشن ویران تھا۔ صرف چند ایک مسافر تھے۔ وہ جلدی سے اتر کر پیچھے سے سٹیشن سے باہر نکل گیا۔ اس نے ایک ویران راستہ اختیار کیا تا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ کچہری پہنچ کر وہ مجسٹریٹ کے کمرے کے باہر چند دیہاتیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں اس کا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ پھر وہ آواز کا انتظار کرنے لگا۔ دوپہر ہو گئی لیکن اسے آواز نہ پڑی۔

ایک پولیس والا دور کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ ایلی سمٹ کر بیٹھ گیا۔ وہ دیہاتی جو اس کے پاس بیٹھے تھے سب جا چکے تھے۔ دروازے کے سامنے وہ اکیلا تھا۔ پولیس والا گیا تو اس نے گھبراہٹ محسوس کی۔ ضرور کوئی بات ہے۔ اس نے سوچا۔ پھر کچہری کے پیادے سے ملا۔

"شہنشاہ بنام الیاس کی باری کب آئے گی۔" اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو۔" وہ بولا۔

"میں الیاس ہوں۔"

پیادے نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ "اپنی باری پر حاضر نہیں ہوتے اور پوچھتے ہیں۔"

"لیکن مجھے تو ... نہیں پڑی۔"

"تمہارے تو وارنٹ بھی نکل چکے ہیں۔" وہ بولا۔

"کیوں بھئی۔ کیا بات ہے۔" ایک پولیس والا آگیا۔ "کون ہو تم؟" اس نے علی سے پوچھا۔

"علی آصفی۔" علی نے جواب دیا۔

"صاحب ذرا ادھر آئیے۔" پولیس والا چلایا۔

ایک انسپکٹر نہ جانے کہاں سے آگیا۔

"ادھر آؤ۔" انسپکٹر نے علی کو گھور کر دیکھا۔ "ادھر آؤ ہمارے ساتھ۔"

وہ اسے ساتھ لے کر کمرے میں لے گئے۔ وہاں پولیس افسر کرسی پر بیٹھا تھا۔ انہوں نے اس سے کچھ باتیں دہرائیں۔ پھر وہ افسر کہنے لگا اسے حوالات میں بند کر دو۔

"کس لئے؟" علی نے بصد مشکل کہا۔

"وجہ بعد میں بتائیں گے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"میں نے کیا جرم کیا ہے؟" علی نے پوچھا۔

"تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔" انسپکٹر بولا۔

کرسی پر بیٹھے ہوئے افسر نے علی کی طرف دیکھا اور بولا: "تمہارے وارنٹ ہیں۔ یا تو ابھی پانچ ہزار کی ضمانت کرا دو ورنہ حوالات جاؤ۔"

"کہاں ہے تمہارا ضامن۔" انسپکٹر نے پوچھا۔

علی نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا۔

وہ اسے لے جانے لگے تو پولیس کا ایک اور اے ایس آئی داخل ہوا۔ "السلام علیکم۔" وہ علی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آصفی صاحب۔ آپ یہاں کہاں؟"

علی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ اسے قطعاً نہ جانتا تھا۔

پہنچنے اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اور وہ خوش پوش خوبصورت جوان ضرور اس کا پڑوسی پولیس والا نسیم تھا۔ وہ علی کو اپنے گھر میں لے گیا۔ شہزادی نے برقعہ اتار دیا۔ اس کے چہرے سے نفرت اور غصہ ٹپک رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے کولہوں پر رکھے اور اسی طرح علی کے روبرو تن کر کھڑی ہوگئی جس طرح اس روز کھڑی تھی جب وہ اپنے گھر سے نکلا تھا۔

نسیم نصیب نے مسکرا کر شہزادی کی طرف دیکھا۔ اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"دیکھئے میاں صاحب۔" وہ بولا۔ "بہتر یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے کوئی سمجھوتہ کرلیں ورنہ اس کے نتائج آپ کے حق میں بے حد نقصان دہ ثابت ہوں گے۔"

علی خاموش بیٹھا رہا۔

"آپ کو علم ہونا چاہیے۔" نصیب بولا۔ "کہ شاہ ولی کے لوگ اور حاکم سب آپ کے اس فعل پر لعنت بھیج رہے ہیں اور محتسب علی قلی خان تو اعلان کر دینے کو ہے کہ آپ کو نذرِ دار کر دے گا۔" نصیب خاموش ہوگیا۔

علی جوں کا توں بیٹھا رہا۔

"آپ کے ڈائریکٹر کو تمام تفصیلات معلوم ہیں اور آپ نوکری سے برطرف ہونے والے ہیں۔" وہ پھر خاموش ہوگیا۔

"آپ کا ان لوگوں کو ان کے گھر سے نکال کر یوں بے یار و مددگار چھوڑ جانا ایک قبیح فعل ہے۔" نسیم نے کہا۔

"بے یار و مددگار تو میں ہوں۔" علی نے کہا۔

نصیب مسکرایا۔ "جو لوگ ایسے فعل سرزد کرتے ہیں ان کے عزیز اور دوست بھی ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میں بطور رعایت آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ

ان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں۔"

"میرا ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔" علی نے کہا۔

"تو پھر آپ انہیں کیوں چھوڑ گئے ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"یہ طلاق کا مطالبہ چھوڑ دیں۔ لڑکی اپنے گھر جا بسے تو میں واپس گھر آ جاؤں گا۔" علی نے جواب دیا۔

"تمہیں لڑکی کو طلاق دینی پڑے گی۔" شہزاد غرایا۔ "تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم نے میری بچی کا ایک بدمعاش کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔"

نصیب نے پھر اشارہ کیا "آپ فی الحال نہ بولیں۔" اس نے شہزاد سے کہا۔

"یہ الزام ہیں۔" علی بولا۔

"چوہدری جی۔" نصیب نے کہا۔ "لیکن واقعات کا رخ یہ ہے کہ آپ پر جرم ثابت ہو جائے گا۔ قانون آپ کے حق میں نہیں۔"

"نہ ہو۔" علی نے کہا۔

"آپ کو سزا ہو جائے گی۔" وہ بولا۔

"ہو جائے۔" علی نے کہا۔

"آپ کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔" علی بولا۔

"وہ تو ڈھیٹ ہے۔" شہزاد چلایا۔

"آپ خاموش رہئے۔" نصیب نے کہا۔

"آپ سوچ لیں علی صاحب۔"

"میں نے سوچ لیا ہے۔" علی نے کہا۔

"دیکھئے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

شہزادے نے نفرت سے منہ بنا کر کہا۔

"آپ کو چاہیے کہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔" نصیب بولا۔

دفعتاً علی کو نہ جانے کیا ہوا کہ ملحقہ گھر سے لڑکیوں کی آوازیں سن کر یا شاید شہزادی کی نفرت بھری "ہونہہ" سن کر وہ بالکل نڈر ہو گیا۔

"دیکھئے انسپکٹر صاحب مجھے معلوم ہے کہ مجسٹریٹ اور پولیس کے افسران لوگوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ قدم آپ کے مشورے سے اٹھایا جا رہا ہے۔ مجھے علم ہے کہ ڈائریکٹر کو شکایات پہنچ رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں قید کر دیا جاؤں گا۔ میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ لیکن آپ کو علم نہیں کہ میں نے جو کچھ کیا وہ ایک باعزت خاوند کے شایان شان ہے۔"

"باعزت خاوند۔" انسپکٹر چلایا۔

"میں حق بجانب ہوں۔" علی نے کہا۔ "مجھے ان لوگوں کے خلاف غصہ نہیں۔ میں ہمیشہ انہیں خرچ دوں گا۔ ہر طرح سے مدد کروں گا۔ لیکن میں ان کے ساتھ نہ رہوں گا۔ جب تک یہ لوگ باعزت لوگوں کی طرح زندگی کا احترام نہیں کریں گے۔ آج اگر لڑکی اپنے خاوند کے پاس چلی جائے تو کل میں خود اپنے گھر آ جاؤں گا۔"

"ہوں۔" نصیب سوچ میں پڑ گیا۔

"ورنہ پولیس قید اور ملازمت سے برطرفی کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔" علی نے کہا اور اٹھ کر چل پڑا۔

"علی صاحب۔ علی صاحب۔" نصیب نے آوازیں دیں لیکن وہ نصیب کے گھر سے باہر نکل چکا تھا۔

اندر شہزادی چیخ رہی تھی "اس کے مزاج ٹھیک نہ ہوئے تو میرا نام بھی شہزادی نہیں۔ میں دیکھوں گی کیسے نہیں دیتا طلاق!"

باہر محلے میں لوگ کھڑکیوں میں کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ عورتوں نے ہونٹوں

پر انگلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بچے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ راہ گیر اسے رک کر دیکھتے
تھے۔ لیکن اسے اس وقت کسی کا ڈر نہ تھا۔ کسی کی پروا نہ تھی۔ وہ سینہ تانے چل رہا
تھا۔ وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ اسے ہاتھوں پر کوڑھ چھا گیا ہے۔

محلے سے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ سامنے سکول کے باہر ناظم کھڑا ہے۔

"ارے تم۔" علی چلایا۔ "تم کہاں۔"

ناظم کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں کا فرق بے حد نمایاں تھا۔ اس نے ہاتھ میں
ہاکی سٹک تھامی ہوئی تھی۔

علی کو دیکھ کر اس نے چار ایک گالیاں دیں

"تم کیسے نہیں ہو۔" وہ چلایا۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں دیکھوں گا یہ کیا
کرتے ہیں۔ ان کی ایسی کی تیسی۔" اس نے ہاکی سٹک جھلاتے کہا۔ اور پھر گالی
دے کر بولا۔ "انہوں نے تمہیں کیا سمجھ لیا۔ میں جان سے مار دوں گا جو میرے
یار کو کسی نے انگلی سے چھوا بھی تو۔ پولیس افسر ہیں تو بڑے ہوں۔ ہم بھی غنڈے
ہیں۔" اس کے منہ سے تھوک کے فوارے چل رہے تھے۔

"میں صبح سے تمہارے ساتھ ہوں۔" ناظم بولا۔ "جب تم گاڑی سے اترے
تھے۔ پھر جب تم گھوم کر پیچھے قلعے کے راستے پہنچ گئے تھے اور پھر جب قلی کی
عدالت کے باہر زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سب دیکھ رہا تھا۔"

"لیکن یار۔" علی نے کہا۔ "وہ مجید کون تھا۔ اس نے تو حد کر دی۔"

ناظم قہقہہ مار کر ہنسا۔ "وہ میرا یار ہے۔ میں نے ہی اسے بھیجا تھا ورنہ انہوں نے
تمہیں اندر کرنے کی سکیم مکمل کر رکھی تھی۔"

علی نے حیرت سے ناظم کی طرف دیکھا۔

"دیکھتے کیا ہو۔" وہ بولا۔ "ہم مرتے دم تک یار ہوتے ہیں۔ ریاض، پیدو اور سب
کی طرح چوتیے نہیں ہوتے جو ڈر گئے۔ پیچھے ہٹ گئے۔" اس نے غصے میں

کہ وہ اس کی خبر جھٹ نہ پڑ جائے۔ چونکہ ان حالات میں اسے نفیسہ کو طلاق دینے
میں کوئی اعتراض نہ تھا چونکہ وہ نفیسہ کی مرضی کے خلاف اسے اپنے گھر میں رکھنے کے
حق میں نہ تھا۔ لیکن جب اس نے یہ سنا کہ نفیسہ کا نکاح شیر علی سے ہو گیا ہے تو اس
کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ تو کیا یہ سب فساد شیر علی کا پیدا ہوا تھا اور اس کے
اپنے بھائی نے شہزاد کو اس بات پر مجبور کیا تھا۔ علی کو یہ خبر سن کر اس قدر تکلیف ہوئی
کہ اس کا دل زندگی سے بالکل اچاٹ ہو گیا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ تن
تنہا شخص ہے۔ ایک سوکھا ہوا درخت جو صحرا میں اگا ہوا ہے۔ اور ارد گرد چاروں
طرف ریت ہی ریت ہے۔ ریت اور ویرانی۔

لیکن کبھی کبھار اس ویرانے سے آواز آتی۔ ”ابو ابو“ اور علی دونوں ہاتھ اٹھا کر
اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا۔

علی کا جی چاہتا کہ چوری چوری شہزاد کے گھر جائے اور کسی سے بتائے بغیر اُس کے
جانے بغیر عالی سے ملے اور اسے کہے:

”عالی! تم تو جانتے ہو۔ تم تو گواہ ہو کہ اس میں میرا قصور نہیں۔ انہوں نے مجھ
سے دھوکا کیا ہے۔ تمہیں تو علم ہے جبھی تم مجھے بلاتے ہو۔ ابو ابو پکارتے ہو۔ کوئی میرا
نام نہیں لیتا۔ صرف تم ہو عالی۔“

آخری بار

وہ ایک مرتبہ وہ چوری چوری لاہور گیا بھی تھا۔

شام کے جھٹپٹے میں وہ اس مکان کے باہر انتظار کرتا رہا تھا۔ اور جب ایک ننھا گول
مٹول سا بچہ باہر نکلا تھا تو علی نے دوڑ کر ایک بڑا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔
لفافے کو دیکھ کر عالی سہم گیا تھا لیکن مٹھائی اور پھل دیکھ کر اس کی آنکھ میں چمک بھر لی
تھی ____ اور پھر علی اس سے بات کیے بغیر وہاں سے بھاگ گیا تھا۔

ایک مرتبہ جب علی ایک بڑا سا لفافہ اٹھائے وہاں گیا تھا تو شہزاد دونوں کوٹھے

ہونکتی ور کھانستی ہوئی سامنے آکھڑی ہوئی ـــــ وہ شہز دکو دیکھ کر گھبر گئی۔

“ے ہو س۔” وہ بچے سے بہ رہی تھی۔ “اچھے ہو سے خاف لے ہو۔” س حیر نی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یں نے خافہ بڑھا دیا ور چلنے لگا۔

“و۔” وہ بولی۔ “چائے کا پیالہ پی لو۔”

“میں جوں کا توں کھڑا رہا۔

“جو ب کیا ہے۔” وہ کھانستے ہوئے بصد مشکل بولی۔ “ب تو تھیں ہی ختم ہو گئے۔”

میں چپ چاپ س کے پیچھے چل پڑا۔

شہز دکو دیکھ کر میں کون جانے کیا ہوا۔ اس نے بڑھ کر شہز د کے کندھے پر سر رکھ دیا ور اس کی چیخیں نکل گئیں۔ شہز د سے تھپکنے لگی۔

میں نے س کا ہاتھ پکڑ لیا۔ س کے ہاتھ میں گویا کسی مر د کا پنجر تھا۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ اور گوشت گویا تھا ہی نہیں۔ وہ بار بار کھانستی تھی۔

“ب کیا رونا ہے۔” وہ بولی۔

“کیوں۔” وہ چلایا۔

“ب کہانی ختم ہو گئی۔” وہ بولی۔

“کیا ہو ہے تمہیں۔” میں نے پوچھا۔

“ٹی بی ہے۔” شہز د نے مسکرانے کی کوشش کی۔

“دو لی چلتی ہو۔”

“دو لی۔” وہ ہنسی۔ “اب تو صرف چند روز اور ہیں۔”

میں کے دل پر جیسے چھری سی چل گئی۔

”لڑکیاں کہاں ہیں؟“ اس نے بات بدلی۔

”ادھر گئی ہیں عیسیٰ کی طرف۔“ وہ کھانستے ہوئے بولی۔

”اور تم اکیلی ہو۔“

اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ ”وہ ہوں بھی یہاں تو اکیلی ہوں۔“ وہ بولی۔

”ہوں۔“ وہ خاموش رہا۔

”اب اکیلے پن کے سوا کیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”اب تو ______۔“

”شہزادے۔“ وہ بولا۔

”ہاں ______“ وہ کھانسنے لگی۔

”تم نے یہ کیوں کیا۔ کیوں؟“

”چھوڑو اب۔“ وہ بولی۔ ”جو ہونا تھا ہو گیا۔“

”بڑا ظلم ہوا۔“ وہ بولا۔

”ہاں۔ ہو گیا بس۔“

”چلو میں تمہیں دور لے چلوں۔“ علی نے کہا۔

”بے کار ہے۔“ وہ بولی اور کھانسنے لگی۔

”کیوں۔“

”کیا فائدہ۔“

”شاید تم صحت مند ہو جاؤ۔“

”اب کیا فائدہ۔“ وہ بولی۔

”کیوں۔ صحت اچھی ہو جائے تو ______۔“

”تو کیا ہو گا۔“ اسے پھر کھانسی چھڑ گئی۔

علی اس کی بات سن کر کانپ گیا۔

”کیا حرج ہے۔“ وہ بولا۔ ”چلو تو۔“

"نہیں۔" وہ بولی۔ "اب میں نہیں جاتی۔"

"ضد کرتی ہو نا۔" وہ بولا۔

"چھوڑو اب ان باتوں کو۔ اتنی دیر کے بعد ملے ہو۔ کوئی محبت کرو۔"

"صرف ایک ہی بات ہے میرے پاس۔"

"کیا؟"

"کہ آج بھی تم میرے لئے وہی شہزادی ہو جو پہلے تھی۔ وہی سبز نکھری۔"

"سچ۔" اس نے لیلی کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔

"میرا خیال تھا۔" وہ کہنے لگی لیکن اسے کھانسی چھڑ گئی۔

"کیا خیال تھا۔" لیلی نے پوچھا۔

"کہ تم بدل گئے ہو۔"

"نہیں۔" وہ بولا۔ "تمہارے ساتھ میں کبھی نہیں بدل سکتا۔"

"سچ۔" اس نے لیلی کا ہاتھ دبایا۔ "پھر مجھ سے اس قدر ضد کیوں کی۔"

"وہ محبت تھی۔" وہ بولا۔ "میرے دل نے اس بات کو گوارا نہ کیا لیکن میرے دل میں تمہارے لئے کبھی غصہ یا نفرت پیدا نہیں ہوئی۔"

"سچ۔" اس نے پوچھا۔

"تم بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔" وہ بولا۔

"چھوڑو چھوڑو اس بات کو۔" وہ بولی اور کھانسنے لگی۔

وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

"کیا کرتی ہو آجکل۔" اس نے پوچھا۔

"کیا کرنا ہے۔ پڑی رہتی ہوں۔"

"سارا دن۔"

"ہاں۔ ڈاکٹر نے مجھے بیٹھنے سے منع کر رکھا ہے۔"

"پھر تم باہر کیوں آئی تھی۔"

"جی چاہتا تھا آخری بار مل لوں۔"

"کیوں تھی۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں" وہ ہنسی۔ "دعائیں مانگتی تھی کہ ایک بار تم آؤ۔"

"میں تو آتا ہی رہتا تھا۔"

"مجھے پتہ نہ چلتا تھا۔" وہ کہنے لگی۔

"ہوں۔"

"پھر جب ماں شور مچاتا تو پتہ چلتا۔ پر تم جا چکے ہوتے۔"

"اور اب کی بار۔" ایلی نے پوچھا۔

"پتہ نہیں" وہ بولی۔ "سوئی ہوئی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر ایسے ہوا جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑا۔"

"کس نے؟"

"پتہ نہیں کسی نے میرے کان میں کہا۔ اٹھ لو۔"

"ہوں۔" ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

"میں نے ماں کو سوتے دیکھا اور باہر نکل آئی۔"

"تم سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔"

"نہیں جاتا۔" وہ بولی "پر تم سے ملنا تھا اس لیے۔"

ایلی نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے گال پر رکھ لیے۔ وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

"تو تم مجھے بھول نہیں سکتے۔" ایلی نے کہا۔

"نہیں" وہ بولی۔

"ان دنوں تو بہت غصہ تھا۔"

"تھا۔ لیکن یہ بھی مجھے بھولنے دیتا ہے۔"

"کون؟"

"یہ سانس۔" کھانستے ہوئے بولی۔

"سانس؟"

"ہاں۔ سارا دن بیٹھا اکھڑا اکھڑا سا رہتا ہے۔"

"مجھے دیکھ کر سہم جاتا ہے۔"

"ہوں۔" وہ بولا۔

پھر کھانسنے لگی اور پھر خون تھوکا۔

ساری رات دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ صبح کے قریب لیلیٰ کی آنکھ لگ گئی۔

جب وہ بیدار ہوئی تو سات بجے تھے۔

"شہزادی۔" وہ بولا۔

"جاگ پڑے۔ شہزادے" وہ بے بسی سے مسکرائی۔

"تم نہیں سوئیں کیا؟" اس نے پوچھا۔

"اب تو دیر ہوگئی۔"

"یعنی؟" اس نے پوچھا۔

"دیر سے سونا چھوٹ گیا۔" وہ کھانسنے لگی۔

"کیوں؟"

"نیند نہیں آتی۔"

"ساری رات بیٹھی رہتی ہو۔"

"ہاں۔"

"وقت نہیں گزرتا۔"

"باتیں یاد آتی ہیں۔"

"کونسی؟"

"ایک ایک۔" اسے پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

"اچھا۔" وہ بولا۔ "میں آ جاؤں گا۔"

"کہاں۔" اس نے پوچھا۔

"تمہارے پاس۔"

"سچ۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "آج چھٹی لے آؤں ایک مہینے کی۔"

"ایک مہینے کی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ اکٹھے رہیں گے۔"

"اچھا۔" اس نے میرا ہاتھ دبایا۔ "کب تک مل جائے گی؟"

"ہفتے کے اندر۔"

"ہفتہ۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔ اسے پھر کھانسی چھڑ گئی۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہفتہ نہیں۔" وہ بولی۔ "جلدی۔"

"اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔ اب جاتا ہوں۔"

"اچھا۔" شہزادی نے بیٹھنے کی کوشش کی۔ "گھر جانے سے پہلے کوٹھے پر چھوڑ دو۔"

"کیا مطلب۔" میں نے کہا۔

"میں سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتی۔ دھوپ میں پڑی رہوں تو آرام رہتا ہے۔"

"اٹھا کر لے چلوں؟"

"ہاں۔" وہ بولی اور کھانسنے لگی۔

ایلی نے اسے دونوں بازوؤں سے اٹھا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ وہ یوں اس کی چھاتی سے چمٹی ہوئی تھی جیسے کوئی بچہ ماں کی چھاتی سے چمٹا ہو۔

"روں گا۔" وہ بولا۔ "تو روز تمھیں کوٹھے پر لے جایا کروں گا۔"

"ہاں۔ دھوپ میں مجھے آرام رہتا ہے۔" وہ بولی۔

"کتنے دھوپ میں بیٹھا کریں گے۔"

"ہاں۔" وہ بولی۔ "پر جلدی آنا۔"

ایلی اسے چارپائی پر لٹانے لگا تو شہزاد کا سر پلنگ کے پائے سے ٹکرا گیا۔

"اوہ۔" وہ بولا۔ "تمھیں چوٹ آئی ہے۔"

"اچھا ہوا۔" وہ بولی۔

ظاہر تھا کہ شہزاد کو چوٹ لگی ہے۔

"مجھ سے غلطی ہوئی۔" ایلی نے کہا۔

"اچھا ہوا۔" وہ بولی۔ "تمہارے ہاتھوں چوٹ لگنی ہی تھی مجھے۔"

"کیوں۔"

"بس۔ اچھا ہی ہوا۔" وہ کہنے لگی۔

وہ دیر تک اس کا سر ہاتھوں سے ملتا رہا اور پیار سے سہلاتا رہا۔ وہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اچھا میں اب جاتا ہوں۔" وہ بولا۔

شہزاد نے چپ چاپ اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

قاضی پور پہنچ کر وہ سیدھا سکول پہنچا۔

دھندلکا

اس روز اس نے محسوس کیا کہ قاضی پور کے سکول کی عمارت بہت بڑی اور خوبصورت تھی۔ اور ملحقہ پارک بڑے سلیقے سے بنایا گیا تھا اور اس کے وسط میں سفید

کے درخت بہت خوبصورت لگتے تھے۔

سکول میں ابھی چھٹی ہو چکی تھی۔ اساتذہ حسب معمول باغیچہ میں بیٹھے تھے۔ پہلی مرتبہ وہ اساتذہ کے پاس جا حاضر ہوا۔

"آئیے آئیے الیاس صاحب" ایک صاحب نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

"آپ تو لگتا ہے تنگ رہتے ہیں۔" دوسرے صاحب بولے۔

"کبھی صورت ہی نہیں دکھائی۔" تیسرے صاحب بولے۔

"آپ جیسی صورت ہو تو مجھے بھی دکھانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو۔" ایلی نے کہا۔

انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگے۔

"واہ صاحب۔" ایک صاحب ہنسنے لگے۔ "آپ تو بولنے لگے۔"

"میرا قصور نہیں۔" ایلی نے کہا "موسم ہی ایسا ہے۔"

"تو آپ دید رکھتے ہیں۔" دوسرے صاحب نے کہا۔

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

اس روز دیر تک وہ اساتذہ سے باتیں کرتا رہا۔

شام کو وہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملا اور چھٹی کی درخواست پیش کر دی۔

"دیکھئے الیاس صاحب۔" انصاری بولے۔ "میں ایک دن کی چھٹی تو منظور نہیں کر سکتا۔ ہاں سفارش کر کے افسر کو بھجوا دیتا ہوں۔ منظور ہو جائے تو آپ شوق سے چھٹی پر چلے جائیں۔"

"کب تک منظور ہو جائے گی۔" اس نے پوچھا۔

"ایک ہفتہ لگے گا۔" وہ بولے۔ "کم از کم"

"بہت خوب۔"

جب وہ گھر پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ اسے چند ایک چیزیں خرید کر گھر میں رکھنی

چاہئیں۔ یہ خواہش نبیل نے اس شدت سے محسوس کی کہ وہ اسی وقت بازار چلا گیا تا
کہ پتہ لگائے کہ کتنے روپیہ سے چند ایک چیزیں خریدی جا سکتی ہیں۔ دیر تک وہ بڑے بازار
میں گھومتا رہا۔

"کیا فرنیچر کرایہ پر دیتے ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔" لڑکے کے والد نے کہا۔ "آپ فرمائیے آپ کو کیا
چاہئے۔"

رات کو دیر تک مکان میں فرنیچر کی چند چیزیں سجاتا رہا اور پھر سو گیا۔ اس روز گویا
اس کی دنیا ہی بدل ہوئی تھی۔

نبیل کے بدلے ہوئے رویہ کو دیکھ کر سبھی حیران تھے۔

جماعت میں وقت کاٹنے کی بجائے اس نے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ نویں
جماعت کے لڑکے تو اس کے دو ایک سبق سن کر بے حد خوش ہوئے تھے۔

اساتذہ بھی اس میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ انصاری صاحب نے بھی اس تبدیلی
کو محسوس کیا تھا۔ انہوں نے نبیل کو بلا کر اس سے بات بھی کی تھی۔ بولے،

"نبیل صاحب۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی لمبی چھٹی کو ملتوی کر دیں۔"

نبیل نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"دیکھئے نا۔" انصاری بولے۔ "امتحانات بالکل قریب ہیں۔ اگر آپ چھٹی پر
چلے گئے تو نتیجہ پر برا اثر پڑے گا۔"

"جی۔" نبیل نے کہا۔ "میری مجبوری ہے۔"

"آخر آپ کس کے لئے چھٹی لے رہے ہیں۔"

"جی میری بیوی بیمار ہے۔"

"آپ انہیں یہاں کیوں نہیں لے آتے۔" انصاری نے کہا۔

"جی وہ بہت بیمار ہے۔"

"اگر میں موٹر کا انتظام کر دوں تو۔"

"شاید۔" میں نے کہا۔ "شاید یہ ممکن ہو۔"

"آپ کوشش کریں گے۔"

"جی۔" وہ بولا۔ "کروں گا۔ اگر ممکن ہوا تو۔"

ابھی وہ ہیڈ ماسٹر سے بات کر رہا تھا کہ ڈاکیہ آ گیا۔ اس نے ایک لفافہ اٹھایا ہوا تھا۔

"جی۔" وہ بولا۔ "الیاس آصفی۔"

میں نے وہ ہاتھ میں تھام لیا اور بدستور ہیڈ ماسٹر صاحب سے باتیں کرتا رہا۔ "انصاری صاحب میرے حالات میرے بس میں نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں۔ میں کوشش ضرور کروں گا۔ لیکن ــــــ۔"

"ارے بھائی۔" انصاری بولے۔ "اس تار کو پڑھ لو پہلے۔"

"تار۔" میں نے ہاتھ کے لفافے کی طرف دیکھا۔

اس نے جلدی سے تار کھولا۔

"کیوں۔ خیریت تو ہے؟" ہیڈ ماسٹر نے پوچھا۔

"جی۔" میں چونکا ــــــ وہ پھر کھو چکا تھا۔ اس نے تار ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ تھما دی۔ لکھا تھا:

"شہزاد کل رات کو فوت ہوئی۔ جنازہ صبح نو بجے ہوگا۔"

سامنے گھڑی گیارہ بجا رہی تھی۔

گردوپیش پر دھندلکا چھا چکا تھا۔

انصاری کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

باغیچے میں ایک بڑے سے پلنگ پر ایک لاش پڑی تھی۔

پاس ہی ایک بچہ دونوں ہاتھ اٹھائے چلا رہا تھا۔ "بو۔ بو۔" پھر وہ بھاگ رہا تھا۔

بھاگے چلے جا رہے تھے۔

"اب آیا ہے۔ اب آیا ہے۔" لاش منہ سے چادر اٹھا کر گہری تھیر ستے کی

رکاوٹ۔ ریل ہونک رہی تھی۔ انجن چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔

تانگے والے چلا رہے تھے۔

پھر بہت سے لوگ دوڑ آئے، موٹر گاڑیوں میں جھکے اسے گھور رہے تھے۔

"وہ آگیا۔ وہ آگیا۔"

"ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔"

"اب آیا تو کیا آیا۔"

یہ ہو کے رہے گا۔" حاجی صاحب مسکرا رہے تھے۔

"تم آگئے۔" شمیم اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ابو۔ ابو۔" وہ ننھے منے ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔

ایلی نے ایک بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔

پر وہ جا رہا تھا۔ نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔

چاروں طرف قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔

ایک بڑی سی قبر سامنے آ گئی۔ اس پر تازہ پھول پڑے ہوئے تھے۔

وہ قبر پھیلنے لگی۔ پھیلتی گئی۔ حتیٰ کہ سارا قبرستان اس کی اوٹ میں آ گیا۔

پھر وہ ابھرنے لگی۔ ابھرتی گئی۔ زمین سے آسمان تک پھیل گئی۔

"تم آگئے۔" ایک جانی پہچانی آواز آئی۔

پھر ایک سیلاب امنڈ آیا۔ پانی ہی پانی۔ وہ قبر اس پانی میں بہہ گئی پھر وہ بچوں

۔پھر وہ بچوں کی طرح جبہ کی چیخیں مار رہا تھا۔ اس سیلاب میں ڈوب رہا تھا۔

دفعتاً اس کی نگاہ بچے پر پڑی جو اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ "ابو ابو۔"

وہ اٹھ بیٹھا جیسے دفعتاً اسے سہارا مل گیا ہو۔ جیسے زندگی میں پھر مفہوم پیدا ہو گیا ہو۔

"سان سان" ______ اسے کوئی جھنجھوڑ رہا تھا۔

سے سان کو س یا ب سے بچانا تھا۔

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ دیو نہ وار بھاگ رہا تھا۔

"ہو۔ ہو۔" ریل گاڑی چیخ رہی تھی۔ "ہو۔ ہو۔"

سامنے شہز ھڑی مسکر رہی تھی۔

پاکستان

مہینے کی چھٹی گزارنے کے بعد گویا اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک نیا آدمی ابھر آیا تھا۔ ایک ایسا آدمی جسے اپنے ماضی سے ننگ تھا نہ لگاؤ۔ جو اپنی گزشتہ زندگی پر نہ تو شرم محسوس کرتا تھا اور نہ بیتے ہوئے واقعات کو ذہن میں دہرانے کا شوق رکھتا تھا۔ اسے اپنے گزشتہ فعل پر پشیمانی نہیں تھی نہ ہی وہ اس پر فخر کرتا تھا۔ جو بیت چکا تھا۔ وہ اپنے گزشتہ عشق کو حماقت نہیں سمجھتا تھا۔ اسے اب بھی عشق کی عظمت کا اعتراف تھا۔ وہ حماقتوں کی اہمیت کا معترف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان حماقتوں نے اس کی زندگی میں رنگ پیدا کیا ہے۔ وہ حماقتیں زندگی تھیں انسانیت بخش تھیں۔ وہ انہیں دہرانے کا بھی شوقین نہ تھا۔ اس کی گزشتہ زندگی اس کے مستقبل پر تاریک سایہ نہیں ڈال رہی تھیں۔

یہ محض حسن اتفاق تھا کہ اس کی گزشتہ زندگی کے چوڑے اور پچیسوں نے اس کی طبیعت شخصیت اور خیالات محسوسات پر کوئی داغ نہ چھوڑا تھا۔ اسے اس حسن اتفاق کا شدت سے احساس تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی سے عشق کر بیٹھتا اور شریف کی طرح باقی زندگی آہیں بھرنے اور چھت کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے میں بسر کر دیتا۔ یا اپنی گزشتہ زندگی کو قابل نفرین قرار دے کر ان ناکردہ شاہد رنگین کا پرچارک بن جاتا۔

اسے یہ بھی احساس تھا کہ یہ زاویہ نگاہ اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں اس بات پر اس نے اللہ کا شکر بھی تو نہ کیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ گزشتہ زندگی سے خود کیے گئے الگ یادوں سے بچے رہنا ایک بہت بڑی نعمت ہے لیکن اسے یہ علم نہ تھا کہ یہ نعمت کس کی دین ہے۔

محسوسات کے لحاظ سے وہ ابھی تک بچہ تھا۔ ذہنی طور پر اس کی پختگی اور بڑھ گئی تھی۔ جذباتی پہلو کے تقاضے زندگی نے اسے کچھ نہ سکھایا تھا۔ ذہنی لحاظ سے ہر

تجربہ ہر مشاہدہ اس کے فکر میں ایک نئی کلی بن کر رہ جاتا تھا۔ اور اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا تھا۔

زندگی کے دریا کے بہاؤ کی منجدھار گزر چکی تھی۔ اب وہ پایاب پانی میں چل رہا تھا۔ لیکن پایاب پانی میں پہنچ کر الیاس آصفی نے دفعتاً محسوس کیا کہ وہ آزاد ہے۔ قطعی طور پر آزاد۔ پچھتاووں کی بندشوں سے آزاد۔ اس کی آنکھوں سے ذاتیت کے چشمے اتر گئے تھے۔ اب وہ دنیا کو دیکھ سکتا تھا۔

دنیا بے حد وسیع تھی۔ مگر وہ اتنی کی وسعت اور اتنی پیچیدہ نہیں ڈر رہی تھی۔ اس میں ایک عجیب سی عظمت تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ دوسروں کو دیکھا۔ اس کے روبرو بیشتر وہ لوگ تھے جو جذبات کے بھنور میں ڈبکیاں کھا رہے تھے۔ وہ انہیں قابل نفرین نہیں سمجھتا تھا۔ ان کا مذاق نہیں اڑاتا تھا۔ اسے ان سے ہمدردی تھی اس کے دل میں ان کی عزت تھی۔

زندگی کے میلے سے وہ واپس آ رہا تھا۔ لیکن جو میلے کو جا رہے تھے ان پر خندہ زن نہ تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ بھرپور شوق سے میلے کو جانا بھی ضروری ہے۔ اور بے لگاؤ وہاں سے لوٹنا بھی ضروری ہے۔

اس کے خیال میں محبت ایک عظیم تجربہ تھا۔ اور اس عظیم تجربے کے چار ضروری دور تھے۔ پہلا یہ کہ شدت سے محبت کرے۔ دوسرے اسے محبت میں عظیم کامیابی حاصل ہو یعنی تخت پر بیٹھے اور مورچھل ہلائے۔ تیسرے یہ کہ محبوب اس کی تذلیل کرے اور دھکا دے کر تخت سے نیچے پھینک دے۔ ذلت اور رسوائی چاروں طرف سے گھیر لیں اور چوتھا یہ کہ وہ عشق کامیابی تذلیل اور رسوائی سب سے بے نیاز ہو جائے —— بے لاگ بے لگاؤ۔

اس کا یہ نظریہ جسمانی عشق کے متعلق تھا۔ افلاطونی یا روحانی عشق کے تخیل سے وہ واقف ہی نہ تھا۔ افلاطونی عشق تو محض ایک قصہ تھا۔ البتہ روحانی عشق کے وجود سے

وہ منکر نہ تھا۔ لیکن اسے کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ روحانی عشق کا مطلب کیا ہے۔ ایک انسان کس طرح اللہ سے محبت کر سکتا ہے۔ اس نے کئی ایک مرتبہ مرشد کا نام سنا تھا۔ لیکن بیعت اور مرشد کے متعلق ابھی تک اس کے وہی خیالات تھے جن کا کسی زمانے میں دلی کی جامع مسجد میں اس نے حاجی صاحب کے روبرو اظہار کیا تھا۔

گرومٹن

قاسم پور سے علی کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ اور اب وہ گرومٹن میں مقیم تھا۔ گرومٹن ایک چھوٹا سا خوبصورت سا قصبہ تھا۔ اس میں دو ایک کشادہ سڑکیں تھیں جن پر بنگلے اور کاٹیج بنے ہوئے تھے دو ایک تنگ و تاریک بازار تھے شہر کے باہر چند ایک صاف ستھری آبادیاں تھیں کچھ حصہ نیا نیا سا تھا جیسے پرانے شہروں میں ہوتا ہے۔ گرومٹن میں طرز کہن اور طرز جدید دونوں پہلو موجود تھے۔

بازاروں میں بھیڑ تھی سول لائنز نما علاقے میں خوبصورت ویرانی تھی۔ علی کو ویرانی پسند تھی۔ اور اس کا مکان بھیڑ اور ویرانی بھرے علاقوں کے سنگم پر تھا۔ گھر میں مانی تھا اور علی کی ماں ہاجرہ۔ اب علی اکیلا نہیں رہ سکتا تھا اس لیے کہ مانی سے الگ رہنا تکلیف دہ تھا۔ پھر بھی اس کی تمام تر توجہ مانی پر مرکوز تھی غالباً گزری ہوئی تلخی کو بھلانے کے لیے اس نے مانی کا سہارا لے لیا تھا۔

مانی ایک بھدا سا لڑکا تھا۔ اس کے نقوش موٹے تھے۔ چہرے پر بے حسی چھائی ہوئی تھی۔ حرکات خاصی حد تک بے ربط تھیں۔ اس کے خدوخال میں قطعی طور پر شہزادی کی جھلک نہ تھی۔

ہاجرہ کا علی کے پاس رہنا ناگزیر تھا۔ چونکہ چار سال کے بچے کو پاس رکھنا علی کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ اکیلا نہ تو اس کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ اور نہ اسے گھر میں اکیلا چھوڑ کر خود نوکری کے فرائض ادا کر سکتا تھا۔

علی نے پھر سے مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ زندگی میں اس نے پہلی مرتبہ چند و۔ طے

کتاب تھوڑی تھی اس سے پہلے اس نے کئی شدت سے مطالعہ کیا تھا۔ لیکن اس کی حیثیت محض فراری وہی تھی۔ تلخ واقعات کو بھولنے کے لیے اس نے کئی بار کتاب کا سہارا لیا تھا۔ لیکن اب پہلی مرتبہ اس نے کتاب کے لیے مثبت شدت سے محسوس کی تھی۔

سارا دن یا تو وہ ہنستا رہا یا مانی سے کھیلتا رہتا اور کبھی اس کا جی چاہتا کہ شام کو کسی طرف نکل جائے اور پھر کسی غلام کے پاس جا بیٹھے۔ اور ستار کی لرزشیں سے چاروں طرف سے گھیر لیں اور وہ ان میں ڈوب جائے۔

ایلی کے کردار کی شدت اگرچہ بہت کم ہو چلی تھی پھر بھی وہ مٹھاس بھرے تاثرات کا محتاج تھا۔ ایسے تاثرات جو اس کی شخصیت کے کونوں کو تراش کر ہموار کر دیں۔ پچھلی تلخیوں کو میٹ لیں۔ اس کے نزدیک موسیقی سے بڑھ کر کوئی چیز نہ تھی۔ جو اسے سکون سے ہم آہنگ کر سکتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی شخصیت میں سے پید کرے۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا کیوں نہ میں طبلہ بجانا سیکھوں۔

اس نے اس سلسلے میں تحقیق کی۔ لیکن ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملا۔ سارے روشن پور میں صرف ایک ہی فرد تھا جو طبلہ بجانے اور رنگین محفل کے لیے مشہور تھا۔ ورنہ جانی پہچان سے سب لوگ اسے رنگی کہتے تھے۔

رنگی کسی سرکاری دفتر میں انسپکٹر تھا ______ ایلی کو یقین نہ آتا تھا کہ کوئی انسپکٹر طبلے میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ اس لیے اس نے انسپکٹر سے ملنے کا خیال ہی ترک کر دیا۔ اسے ایک بڑے عہدے دار سے راہ و ربط پیدا کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔

روشن پور میں جو مکان انہیں ملا اس کے پڑوس میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور دو لڑکیاں رہتی تھیں وہ وقت بے وقت ان کے گھر آ جاتی تھیں۔ اور بے جواب ایلی کی طرف دیکھ کر پر اسرار طور پر مسکراتی رہتیں۔

ایلی نے پہلے تو ان سے دور رہنے کی کوشش کی۔ وہ گھر میں داخل ہوتیں تو ایلی کمرے میں گھس جاتا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے کمرے میں پہنچ جاتیں تو وہ باہر صحن کی طرف بھاگتا۔ ایک روز جب وہ صحن کی طرف جانے لگا تو بڑی لڑکی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بامعنی انداز سے مسکرا رہی تھی۔ ایلی کو اس کی مسکراہٹ بہت بری معلوم ہوئی۔ اب وہ ان جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اسے عورت میں وہ خصوصی دلچسپی نہ رہی تھی جو کسی زمانے میں محسوس کیا کرتا تھا۔ جوانی میں وہ عورت سے ڈرتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی طرف بری طرح کھنچا جاتا تھا۔ ڈر اور دلچسپی۔ عورت اس کے دل میں یہ دو جذبات پیدا کرتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ عورت کو اس نے بے حد اہمیت بخش رکھی تھی۔

پھر عورت کے متعلق اس کے خیالات تلخی سے بھر گئے۔ وہ بے وفا تھی۔ اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ مردوں کو کھلونا بنا کر ان سے کھیلتی تھی۔ وہ ایک سفلہ جنس تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کا مقام عظیم تھا۔

اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ عورت ایک کمزور اور بے بس مخلوق ہے۔ اور اس کی جاذبیت میں گہرائی نہیں۔ اس کی شخصیت عظمت سے خالی ہے۔ قدرت کی طرف سے وہ تسلیم پر مجبور ہے۔

شاید اسی وجہ سے اسے ان دونوں لڑکیوں سے قطعاً دلچسپی پیدا نہ ہوئی بلکہ اس نے سوچا کہ وہ اس کی آزادی میں مخل ہو رہی تھیں۔ اس لیے اس نے کوشش کر کے اپنا مکان بدل لیا۔ اور وہ شہر کے کونے پر ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے۔

رنگی

پہلے روز ہی رات کے وقت اس کے کان کھڑے ہوئے کوئی شخص طبلہ بجا رہا تھا۔ پھر کسی نے گانا شروع کر دیا۔ اسے شام یاد آ گیا۔

اگلے روز شام کے وقت ایلی نے پھر طبلے کی آواز سنی۔ وہ چپکے سے گھر سے باہر نکل

گیا۔ قریب ہی پردوں میں ایک بیٹھک سے طبلہ بجانے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے دور کھڑے ہو کر بیٹھک کی طرف دیکھا۔

ایک خوش پوش نوجوان سوٹ پہنے بو لگائے فرش پر بیٹھا طبلہ بجا رہا تھا۔ اس کا بال خوبصورت تھا۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی رہنو ریمٹ ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے میں بلا کی جاذبیت تھی اس کی شخصیت سے مٹھاس کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

علی قریب چلا گیا۔

”آئیے آئیے۔“ وہ مسکرایا ”بیٹھیے۔“

”نہیں نہیں۔“ علی بولا۔ ”آپ شغل جاری رکھیے میں یہیں سے سنوں گا۔“

”آئیے بیٹھیے نا۔“ وہ بولا ”آ بھی جائیے۔“ وہ پھر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بے حد دلنواز تھی۔

”اب آ بھی جائیے۔“

علی اندر داخل ہو گیا۔

دیر تک وہ طبلہ بجاتا رہا۔ علی چپ چاپ سنتا رہا۔

پھر اس نے طبلہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور بولا ”اچھے میں ذرا سستا لوں۔ اجازت ہے نا؟“

وہ یوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا جیسے عرصہ دراز سے اسے جانتا ہو۔

”آپ کو اس میں دلچسپی ہے کیا؟“ اس نے طبلے کی طرف اشارہ کیا۔

”سننے کا شوق ہے۔“ علی نے جواب دیا۔

”یہ تو کان کا رس ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”جس کے کان میں رس ہے اس کی روح میں مٹھاس ہے۔“

”جی ہاں۔“ علی نے جواب دیا۔ ”کان میں رس نہیں لیکن روح میں مٹھاس پید

کرنے کی آرزو ہے۔"

"سب رنگ رس کا کھیل ہے۔" وہ بولا۔

"آپ کی تعریف؟" ایلی نے پوچھا۔

"مجھے رنگی کہتے ہیں۔"

"رنگی؟"

"بدساطر کہتے ہیں۔" "بے رنگ ہوں نا اس لیے۔"

"بے رنگ ہیں آپ۔" ایلی نے کہا۔ "کیا اچھا طبلہ بجاتے ہیں۔"

"نہیں۔" وہ بولا۔ "زندگی صرف رس کی کھیلن سمجھ لیجیے تھوڑی۔ بات پیدا نہیں ہوئی۔"

"نہیں ہوئی۔"

"بالکل نہیں ہوئی۔" وہ بولا۔ "رس پیدا نہیں ہوا۔ صرف ڈب ڈب کرنا سیکھ لیا ہے۔ صرف فارمولوں میں شعور نہیں ہے، کچھ نہیں۔"

ایلی حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس قدر رنگین شخصیت۔ اس کی ہر بات میں رنگ تھا رس تھا۔ طرز بیان میں چھوٹی چھوٹی حرکات میں۔ نگاہ میں تکلم میں گردن کے خم میں وہ پیارا نخلستان تھا۔

رنگی پھر سے طبلہ بجانے میں مصروف ہو چکا تھا۔ طبلہ بجاتے ہوئے اس کی بیٹھ بھی عجیب تھی چھاتی نکلی ہوئی سر اٹھا ہوا۔ کتنا وقار تھا اس بیٹھک میں۔ ایلی اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً وہ مسکرایا۔ "تکلیف نہ ہو تو ذرا آگے سے ہٹ جائیے۔ ذرا ادھر کو۔" "نہیں تکلیف ہوتی ہے اس لیے کہتا ہوں۔" رنگی پھر مسکرایا۔

"کسے تکلیف ہوتی ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"موسیقی کو۔" وہ مسکرایا۔

ایلی نے مڑ کر دروازے سے دیکھا۔

دور سے ایک بڑی سی کوٹھی کی چاردیواری پر ایک رنگ دار گٹھا سا رکھا ہوا تھا۔

"مجھو یہ فول ہے۔" رنگی بولا۔ "ادھر اماں یہ دیکھنا فول ہے۔ ماں اندر بیٹھ کر چھپ کر شوق سے دیکھتی ہے۔ میرے سارے دوست دیکھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ شریمتی یہ سمجھیں کہ ان کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ حالانکہ میرے سبھی دوست جانتے ہیں اور شریمتی جانتی ہے کہ وہ جانتے ہیں۔ اور چھپ چھپ کر سے دیکھتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتی ہیں کہ اس راز کو صرف ہم دونوں جانتے ہیں وہ خود اور میں۔ کیا پیارا دھوکا ہے۔ ساری شریمتاں ہی پیارے دھوکے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان پیارے دھوکوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ساگر ہے۔ اور میں اس میں ڈوبا رہوں۔" ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ ایلی کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "میں نہیں دیکھوں آپ مجھے دیکھیں۔"

کچھ دیر تک وہ دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ "لیجیے شریمتی چلی گئیں خان بہادر جی آگئے۔"

"وہ کون ہیں ان کا پتاجی؟"

رنگی نے جھرجھری لی۔ "پتاجی وہ ہیں جو چاہیں تو مجھے تمام عمر کے لیے اندر کر دیں۔"

"یعنی۔" ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

"مجسٹریٹ ہیں خان بہادر روز دعائیں مانگتے ہیں کہ میں کبھی ان کے پنجے میں پھنس جاؤں۔"

"ارے۔" وہ چلایا۔ "میں آپ سے باتیں کرنے میں وقت گنوا رہا ہوں اور ادھر منتظر کر رہے ہیں۔" وہ دوڑ کر باہر نکلا اور بیٹھک سے باہر کھڑا ہو کر دوسری سمت

دیکھنے لگا۔

ایلی جوں کا توں بیٹھا رہا۔

کچھ دیر کے بعد رنگی فارغ ہوا، وہ مسکرا رہا تھا۔

"یہ کون تھے؟"

"اپنے ایک مہربان دوست ہیں۔ اپنی زندگی میں اور ہے ہی کیا۔ انسپکٹری کی بک بک۔" ہونٹنے لگا۔

"انسپکٹری؟" ایلی نے رنگی کی طرف دیکھا۔

"تو اور کیا۔" وہ بولا۔

"تو کیا آپ انسپکٹر ہیں؟"

"ہاں۔" "بڑی ذلیل چیز ہے یہ انسپکٹری۔ دم گھٹتا ہے۔"

تو یہ وہی انسپکٹر تھے جنہیں ملنے سے ایلی ہچکچاتا تھا۔

"جی چاہتا ہے،" رنگی بولا، "کہ آج ہی استعفیٰ دے دوں پر گزر اوقات کیسے ہوگا۔ دال روٹی سے بھی جواب مل جائے گا۔ مجبور ہوں۔"

رنگی کی شخصیت میں رنگ اور رس کے علاوہ عجیب تضاد تھے۔ طبعاً وہ ایک محبوب تھا۔ لیکن اس کے وجود میں عشق کرنے کے لیے بے پناہ تڑپ تھی۔ عشق میں وہ ایک بھنورا تھا جو پھول پھول بیٹھ کر رس چوستا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں نسائیت کی جھلک تھی۔ لیکن جسم مردانہ خصوصیات کا حامل تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک عظیم مرد کی جھلک تھی۔ کردار میں بھی مردانہ رنگ تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ وہ پیدائشی رشوت خور تھا مگر اس کے خیالات اور جذبات میں عوام سے بے پناہ ہمدردی تھی اور وہ خود کو ہمیشہ عوام میں سمجھتا تھا۔ اور آخری بات یہ تھی کہ اسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ بہرحال رنگی کی بے پناہ شخصیت نے ایلی کو جذب کر لیا اور وہ گہرے دوست بن گئے۔

رضی

پھر ایک روز رضی آ گیا۔

رضی رنگی کا دوست تھا لیکن اس میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔

رضی ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ بدن فربہی پر مائل تھا۔ چہرے پر اکتاہٹ برس رہی تھی۔ بال سفید ہو رہے تھے۔ اس کی طرف دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اپنی زندگی بیت چکا ہو اور اب کنارے پر بیٹھ کر نظارہ کر رہا ہو۔ گزشتہ زندگی کی جھلک اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھی۔

رضی کی آنکھیں بھری بھری تھیں جیسے نہ جانے کیا کیا جذب کر چکی ہوں۔ ان میں دنیا آباد تھی۔ ایک شوخ شنگ دنیا۔ جیسے ان آنکھوں سے کبھی رنگ کی پچکاریوں کے فوارے چلے ہوں جیسے وہ کبھی سرخ چیونٹیوں کے مسکن رہی ہوں۔ وہ اب تک چھپر اب بھی بھرے ہوئے تھے لیکن اب نہ تو ان میں تلخی تھی نہ شدت۔ مٹھاس کی پھلجھڑی چل رہی تھی۔ مسکراہٹ اس مٹھاس کو ہوا دیتی تھی۔

"ان سے ملیے یہ میرے دوست علی ہیں۔ نام تو یاں آفاقی ہے۔ لیکن مجھے علی پسند ہے۔ یہ رضی اور رنگی کیا گڑبڑی ہے۔"

"یہ وہ رضی ہیں۔" رنگی نے علی کی جانب لگا۔ "جو اس مردے میں جان ڈالتے ہیں۔" اس نے ستار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ہاں تو رضی صاحب آج کچھ ہو جائے۔" رنگی نے اپنی ستار رضی کی طرف بڑھا دی۔ "آج تو رضی یمن سے آگ لگا دو۔ آگ آگ۔ چاروں طرف شعلے اٹھیں۔ آپ مہربان بھی کیا یاد کریں گے۔ انہیں بھی پتہ چلے کہ ترپ کسے کہتے ہیں۔"

رضی مسکرایا اور پھر بغیر کچھ کہے اس نے ستار بجانی شروع کر دی۔ رنگی نے طبلہ اٹھا لیا۔

رضی گانے لگا۔ اے رنگی سائیں پیا آن۔

اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ اکتاہٹ بھری اداسی چھلک رہی تھی۔ وہ تانیں اور بڑھ

رہی تھیں۔ خلا قریب تر آ رہا تھا۔ خاموش ویران خلا۔

"اپنے رنگ والی پیا ملنا۔"

ایک روز جب رضی اور ایلی اکیلے تھے تو شریمتی آ گئیں۔

"آپ بھی درشن کر لیں۔" ایلی نے رضی سے کہا۔

رضی مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں عجیب سی بے نیازی تھی۔

"آپ کو دلچسپی نہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"بہت ہے بے حد۔" رضی مسکرایا۔

"تو پھر؟"

"تھی ——— اب نہیں۔" وہ بولا۔ "پہلے وہ چلتی سی تھی۔ چاہے وہ چلتی ہو چاہے منڈیر پر کھڑی ہو۔ کہیں ہو۔ کیسی ہو۔"

"کیسی ہو۔" ایلی نے دہرایا۔

"ہاں" رضی نے کہا۔ "ہر عورت حسین ہوتی ہے ہر عورت۔"

"کیا واقعی۔"

"ہاں۔" رضی بولا۔ "لیکن اب تو سب بیبیاں بن گئی ہیں۔ کوئی عورت رہی ہی نہیں۔"

"کیوں۔" ایلی نے پوچھا۔

"پھر میاں دیکھیے۔ بس ہم پھر میاں چھوڑنے کے قابل ہیں۔" رضی مسکرایا۔

"کوئی تلخ رکاوٹ بن گئی کیا؟" ایلی نے پوچھا۔

"نہیں۔" رضی نے جواب دیا۔ "البتہ اب تو مٹھاس ہی مٹھاس ہے۔" اس نے ایک مٹھاس بھری مسکراہٹ چمکائی۔

"زندگی تو مصروف کا نام ہے۔" ایلی نے کہا۔

"اچھا ہے۔" رضی بولا۔ "جو مصروف ہے وہ مصروف ہے۔"

"نصیحت کرنے کو جی نہیں چاہتا کیا؟" ایلی نے پوچھا۔

رضی پھر ہنسا۔ "وہ لوگ نصیحتیں بہت کرتی تھیں۔"

"کیا۔"

"پھر۔"

"وہ بے وقت ضائع کرتے تھے۔ ہم نہیں کرتے کیوں کریں۔ یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔" رضی مسکرایا اور پھر چھوٹی آواز میں گانے لگا۔

"گردھر کی مرلیا باجے رے ____ مدھوبن میں رادھکا ناچے رے۔"

گردھر کی مرلیا باجے رے۔

ایلی کے لیے یہ ایک نیا نظریہ تھا۔ کتنا رنگین تھا۔ کتنا پیارا تھا۔

ساری رات وہ سوچتا رہا۔ اور گردھر کی مرلیا باجتی رہی۔ مرلیا کے بول فضا میں گونج رہے تھے۔ اس کی تانیں ان سروں میں ڈوبی جا رہی تھیں۔ شہزاد کے ماتھے کی بندی چمک رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ بھی گردھر کی ایک رادھکا ہو۔ اس کے دل میں نہ محبت تھی نہ نفرت۔

ماشاءاللہ

ایک روز جب ایلی چپ چاپ دالان میں بیٹھا تھا تو ہاجرہ بولی "ایلی۔"

"کیوں اماں!" اس نے اماں کی طرف دیکھا۔

"تجھے چھٹی مل سکتی ہے کیا؟"

"کیوں نہیں۔"

تو چار دن کی چھٹی لے لے۔ وہ بولی۔

"کیوں اماں۔"

"سنا ہے دلی سے حاجی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ چل ان سے ملیں۔"

ایلی علی پور جانے کا خواہشمند تھا کیونکہ جب بھی وہ وہاں جاتا تو محلے والیاں اس

پر گلیوں میں ٹھٹھک کہتیں، اسے ایلی دیکھ پاتا تو اسے ان باتوں کا نتیجہ سمجھ کر دہول سی پڑتی ہے۔

بوڑھے اسے دیکھ کر توبہ توبہ چلاتے تھے۔ نوجوان سرگوشیاں کرتے۔

لیکن حاجی صاحب کا نام سن کر وہ تیار ہو گیا اور وہ چار روز کے لیے علی پور چلے گئے۔ حاجی صاحب ایلی کو دیکھ کر مسکرائے۔ ”آیئے الیاس صاحب۔“ وہ بولے۔

”بسم اللہ۔ خیریت تو ہے۔“ ویسے تو اچھے ہیں آپ؟“

”جی شکریہ۔“ وہ بولا۔

”کہیے وہ طوفان گزر گیا نا۔“

”جی“ ایلی نے کہا۔

”جن طوفان کو چلنا ہوتا ہے وہ چل کے رہتے ہیں۔“ وہ بولے۔

”جی ہاں۔“

”اللہ نے آپ پر کرم کیا۔“ وہ بولے۔ ”آپ بھیگے نہیں۔“

ایلی کی سمجھ میں نہ آیا اس لیے وہ خاموش رہا۔

”ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے۔“ حاجی صاحب مسکرائے۔

”کیوں ہمشیرہ صاحبہ۔“ وہ ہاجرہ سے مخاطب ہوئے۔ ”وقت سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”جی۔“ ہاجرہ بولی۔ ”اب تو وقت آ گیا نا۔“

”انشاءاللہ آئے گا۔“ وہ بولے۔

”آئے گا“ ہاجرہ نے دہرایا۔

”زیادہ دیر نہیں۔“ وہ بولے۔ ”دھوپ نکلنے سے پہلے بادلوں کو صاف کرنا ہوتا ہے۔ محفل سجنے سے پہلے صفائی ہوتی ہے۔ فرش بچھایا جاتا ہے۔ گھبرایئے نہیں ہمشیرہ صاحبہ اللہ کے فضل سے اچھا ہو گا۔“

"ابھی تو وہی حال ہے۔" وہ زیرِ لب بولی۔ "ایک قدم نہیں اٹھایا۔"

"ہوں۔" وہ مسکرائے۔ "کوئی چل کر آتے ہیں۔ کوئی تلاش کرنے کے بعد پہنچتے ہیں کسی کو اٹھا کر لایا جاتا ہے۔"

"سبحان اللہ۔" وہ مسکرا دیے۔

"شادی کا نام نہیں لیتا۔" وہ زیرِ لب بولی۔

"وقت کی بات ہے۔"

"کوئی لڑکی بھی ہے۔" ہاجرہ نے کہا۔

"پہلے ہی خیال میں رکھا ہوتا تو آج بات کی شکل ہی اور ہوتی۔" حاجی صاحب مسکرائے۔

ایلی ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ لیکن اسے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

حاجی صاحب کی باتیں بے حد سادہ تھیں اس کے باوجود وہ انہیں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ ہاجرہ مسکرا رہی تھی ظاہر تھا کہ سمجھ رہی تھی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ ہاجرہ تو سمجھے مگر وہ نہ سمجھ سکے۔

اس روز ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ایسی باتیں بھی ہیں جنہیں سمجھنے کے لیے ذہن کے علاوہ کسی اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ مگر وہ قابلیت کیا تھی اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

بہرحال ایک بات تو مسلم تھی کہ حاجی صاحب کو ہر بات میں خلوص تھا۔ وہ پیر نہیں تھے۔ شیخ مرشد تھے یا نہیں اس کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکتا تھا لیکن ان میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

حاجی صاحب دراصل اپنے کسی مرید کی سفارش کرنے کے لیے علی پور آئے تھے۔ وہ مرید خود جا کر انہیں ساتھ لایا تھا۔ وہ آصفی محلے کا فرزند تھا۔ اور حاجی اس کے گھر ٹھہرے تھے۔

دو ایک مرتبہ وہ صوفی محلے میں آئے تھے تاکہ لوگوں سے مل سکیں۔ صوفیوں کی مسلسل منتوں کے باوجود نبیوں نے ان کے پاس ٹھہرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اندریں حالات ان کا وہاں رہنا مناسب نہیں۔

حاجی صاحب کے ایک مرید نے اپنے مکان میں ایک کمرہ ان کے لیے خالی کر دیا تھا۔ کہ وہ وہاں اطمینان سے رہ سکیں۔

ان دنوں رمضان شریف کے دن تھے حاجی صاحب سے ملنے کے لیے رفیق اور یوسف بھی آئے ہوئے تھے۔ یوسف نے اتنی لمبی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ رفیق پکا نمازی تھا۔ دونوں روزے رکھتے تھے۔ لیکن ایلی نے کبھی روزہ نہ رکھا تھا۔ صبح آٹھ دس بجے کے قریب وہ تینوں حاجی صاحب کی طرف چلے جاتے اور سارا دن ان کے ساتھ باتیں کرتے رہتے۔ پھر تین چار بجے کے قریب وہاں سے گھر آ جاتے۔

ایلی رفیق اور یوسف کی باتیں سن کر حیران ہوتا تھا۔ یوں باتیں کرتے اور مسئلے مسائل پوچھتے جیسے کوئی بڑے مولانا ہوں۔

ان کی باتیں سن کر ایلی کو وہ دن یاد آ جاتے جب وہ تینوں مل کر جمیل کی طرف جایا کرتے تھے۔ اور جمیل مست آنکھیں بنا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ جو اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں جھاڑو دیتے ہوئے باہر گلی میں نکل آتی اور ساری گلی میں جھاڑو دینے لگتی تھی۔ اس وقت بار بار رفیق کھڑکی سے باہر جھانکتا اور اس کے منہ سے "سی سی" کی آواز نکلتی۔ جیسے سے بہت کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہو۔ سامنے صحن میں یوسف قدم زمین پر لگاتا اور بندروں کی طرح ناچتا۔

اب وہ دونوں معززے بنے بیٹھے تھے اور شرع کے مسائل پر بڑی سنجیدگی سے بحث کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ جمیل تو بالکل ہی نمازوں اور وظائف میں کھو گیا تھا۔ نہ جانے لوگ کیسے بدل جاتے ہیں۔ ایلی سوچتا۔

ایلی محسوس کرتا تھا کہ ذہنی طور پر وہ وہی ایلی ہے جو اس زمانے میں تھا۔ اس کے

خیالات بالکل وہی تھے۔ ان کی بنیاد اور تانے بانے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس کے
خیالات کی لکیریں کچھ اور گہری ہو گئی تھیں لیکن ان کے پھیلاؤ کی سمت وہی تھی۔ رخ
وہی تھا۔ کوسوں دور۔ ان میں انسانیت تھی۔ برابری کا احساس تھا۔ اور ان کے دل
میں ہر شخص کے لیے ہمدردی تھی۔

بڑا انسان

ایک روز جب میں ان کے پاس اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔
"میاں صاحب اب کی بار آپ نے ہم سے کچھ پوچھا نہیں۔"
"جی۔" میں نے ان کی طرف دیکھا۔
"دن میں تو آپ نے ہم سے بڑی باتیں پوچھی تھیں۔"
"جی" وہ ہنسنے لگا۔
"وہ مرہم کی بات یاد ہے آپ کو؟" انہوں نے پوچھا۔
"جی ہاں۔" وہ بولا۔ "وہ زمانے گئے مرہم کی بات پوچھنے والے۔"
"ہاں۔" وہ بولے۔ "یہ زمانہ بھی گزر جائے گا۔"
"جی۔" وہ بولا۔
"انشاءاللہ بہتر زمانہ آئے گا۔"
"جی۔" مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہے
"وہ پریشانی تو نہیں رہی نا۔"
"جی نہیں۔" وہ بولا۔ "پشیمانی بھی نہیں۔"
وہ مسکرائے۔ "پشیمانی بھی گناہ کی دلیل ہوتی ہے۔"
میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ نفسیات کا وہ باریک نقطہ ایک سادہ آدمی
سے سن کر مجھے حیرت ہوئی۔
"تو آپ آزاد ہو گئے۔" حاجی صاحب بولے۔

"جی ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"ڈھونڈ رہی۔" "کبھی منزل کی طرف بھی لے جاتی ہے۔"

"جی ہاں۔" وہ بولے۔ "لیکن کوئی منزل ہو بھی۔"

"کبھی منزل خود ہی سامنے آجاتی ہے۔" انہوں نے کہا۔ "یہاں سبھی ڈھونڈ رہی ہیں۔ کسی کو منزل کا شعور ہے کسی کو نہیں ویسے ڈھونڈ سبھی رہی ہیں۔"

"منزل کو کرنا کیا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"سبحان اللہ۔ اچھا خیال ہے۔" وہ بولے۔

ایلی نے پھر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ عجیب مرد ہے اس کی بات رد بھی کرو تو بھی سبحان اللہ کہتا ہے۔

"انشاءاللہ وہ دن بھی آئے گا۔" حاجی صاحب بولے۔

"کون سا دن؟" ایلی نے پوچھا۔

"آئے گا ضرور آئے گا۔" وہ بولے "ہم تو شاید نہ ہوں گے۔" وہ مسکرائے۔

اسی شام چار بجے کے قریب جب حاجی صاحب لیٹے ہوئے تھے اور رفیق یوسف اور ایلی آپس میں باتیں کر رہے تھے تو نہ جانے کس بات پر انہوں نے حاجی صاحب کی رائے پوچھنے کے لیے انہیں پکارا۔

حاجی صاحب چپ چاپ پڑے رہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"سو گئے ہیں۔" رفیق نے کہا۔

"ارے یہ ان کے دانت تو دیکھو" ایلی نے کہا۔

وہ سب حاجی صاحب پر جھک گئے۔ حاجی صاحب کے دانت یوں نکلے ہوئے تھے جیسے مقفل ہو گئے ہوں۔

"ارے۔" ایلی چلایا "یہ تو بے ہوش پڑے ہیں۔"

رفیق نے انہیں جھنجھوڑا لیکن وہ جوں کے توں پڑے رہے۔

وہ سب گھبرا گئے۔

رفیق نے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔

حاجی صاحب کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی لیکن وہ پھر بے ہوش ہو گئے۔ رفیق ڈاکٹر کی طرف بھاگا۔

ڈاکٹر نے آ کر ٹونٹیاں لگائیں، اور پھر ایک بوتل منگوائی۔

حاجی صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔

جب وہ ان کے منہ میں دوا انڈیلنے لگے تو حاجی صاحب نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔ غالباً وہ روزہ توڑنے کے حق میں نہ تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "مریض کو بے حد نقاہت ہے ____ ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

ڈاکٹر کے جانے پر تین ایک محلے دار بیٹھک میں آ گئے اور مریض کی صحت کے متعلق پوچھنے لگے۔ وہ مرید جس کے حاجی صاحب مہمان تھے کارخانے میں کام پر گیا ہوا تھا۔ اس کے گھر سے ایک بوڑھی عورت آ کر حاجی صاحب کو دیکھتی رہی پھر رفیق سے کہنے لگی۔ "بے ہوش نہ ہو تو بیچارہ کیا کرے۔"

"کیوں اماں۔" یوسف نے پوچھا۔ "بات کیا ہے۔"

"اسے تین دن سے یہاں پڑا ہے یہ اور نہ سحری نہ افطاری۔"

"کیا مطلب۔" علی نے پوچھا۔

"گھر والا تو کام پر رہتا ہے اسے کیا خبر کہ مہمان کی کیا حالت ہے۔" بڑھیا نے کہا۔ "اور گھر والی کہتی ہے۔ میں تو نہ بھیجوں گی کھانا۔ میں کیا نوکر ہوں کہ اس کے دوستوں کی خدمت کرتی پھروں۔"

"کیوں۔" رفیق نے پوچھا۔

"بس ضد ہو گئی۔ بڑی بدمزاج ہے۔"

علی یہ سن کر حیران رہ گیا چار روز سے وہ روز یہاں سارا سارا دن گزارتے تھے

لیکن حاجی صاحب نے ان سے نہیں کہا تھا کہ وہ سحری اور افطاری کے بغیر روزے رکھ رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو کہ وہ اپنے کام سے وہاں نہیں آئے تھے بلکہ مرید کی سفارش کرنے آئے تھے جس کی بیوی انہیں بھوکوں مار رہی تھی۔

اس روز وہ تینوں افطار کے وقت وہیں رہے۔ رفیق اور یوسف افطار کے لیے کچھ پھل لے آئے اور انہوں نے حاجی صاحب کی منتیں کیں کہ وہ صوفی محلے میں جا کر ٹھہریں مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ بولے "یہ ٹھیک نہیں۔ ان کے ہاں میں مہمان ہوں وہ برا مانیں گے ان کا دل دکھے گا۔" ایلی اس بڈھے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ بڑا انسان تھا۔

چوٹ

جب ایلی روچتن وہاں پہنچا اور رنگی سے ملا تو اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس بیٹھا ہے۔

"یہ ہانی ہے۔" رنگی بولا۔ "ویسے میرا بھتیجا ہے لیکن ہر بات میں مجھ سے چار قدم آگے ہے۔" وہ مسکرایا۔

ہانی ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا رنگ رنگی کی نسبت بہت گورا تھا خدوخال ستواں تھے جسم موزوں تھا۔ بال گھنگھریالے تھے اور طبیعت میں البڑ پن اور ساتھ ہی محبوبانہ بے نیازی تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے بیٹھا ہوا کچھ گنگنا رہا تھا۔

"آپ سے مل کر مسرت ہوئی۔" ہانی نے کہا اور پھر اس کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر گیت گنگنانے اور سارنگی کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

"آپ کالج میں ہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" وہ بولا۔ "اب تو نوکری کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا۔"

"کیا ملازمت کرتے ہیں؟"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔

"نوکری کیا ہے۔"

"پوئٹ ہوں۔" اس نے بے پرواہی سے کہا۔

"پوئٹ" ایلی نے حیرت سے دہرایا "نظمیں لکھتے ہیں کیا؟"

"نظمیں لکھتا ہوں ڈرامے سٹیج لکھتا ہوں۔ شعر کا اہتمام کرتا ہوں کبھی کبھی۔" اس نے بے پروائی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"لا جواب نوکری ہوئی نا۔" ایلی نے کہا۔

"بے کار۔" وہ بولا۔ "یہ تم آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہے۔ لڑکیاں مسکاتی ہیں صاحب گھورتا ہے۔ کسی روز جان سے مار دے گا۔"

"تم تو رہتے ہی رہتے ہو۔" رنگی مسکرایا۔

"رونق سے کون منکر ہے۔" مانی بولا۔ "رونق کا تو میں بھی قائل ہوں۔"

"تو پھر۔" ایلی نے پوچھا۔

"جان کا روگ نہ بنے تو۔" مانی نے کہا۔

"نہ بناؤ۔" رنگی بولا۔

"کون بناتا ہے۔ زبردستی بنتی ہیں۔" مانی نے بے نیازی سے کہا۔

اتنے میں شریمتی آ گئی۔ رنگی دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔ "لو بھئی۔" وہ بولا۔

"اب تو خاموش ہو جاؤ۔ شریمتی پہلے ایکٹ کا پہلا سین شروع ہو گیا۔"

"یار۔" مانی بولا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں۔"

"تمہیں کیا پتہ یہ خانم تو بے جی ہے۔" رنگی نے جواب دیا۔

"بے جی تو نہیں خود رونق سی ہے۔" مانی نے کہا۔ "جتنا وہ دوسری والی پتلی جو ادھر رہتی ہے۔ وہ ہے کچھ کچھ۔"

"وہ وہ تو شہزادی ہے شہزادی۔" رنگی نے کہا۔

"شہزادی تو نہیں خیر۔" مانی بولا۔ "خاصی ہے۔"

"شہزادے کو جو بھی میسر ہو وہ شہزادی ہوتی ہے۔" رنگی مسکرایا۔

شہزادہ تو جھومتا رہتا ہے۔ مانی ہنسا اور پھر دھوپ میں بیٹھ کر گیت گنگنانے لگا۔

یلی ساری باتیں حیرانی سے سن رہا تھا۔ عجیب لوگ تھے۔ ذہنی چمک تھی۔ رنگینی تھی اور جوانی بھی۔

یلی ہمیشہ ان شخصیتوں کو پسند کرتا تھا جن میں ذہنی چمک ہو جو [illegible] خوبی سے آزاد ہوں۔ لیکن حال میں وہ سوچنے لگا تھا کہ صرف ذہنی چمک ہی کافی نہیں۔ وہ حاجی صاحب تھے ان کی شخصیت میں اس قدر جاذبیت پیدا کر رہی تھی۔ ان میں ذہنی چمک قطعی طور پر مفقود تھی۔ رنگین باتیں یا رنگ کی پچکاریاں نہیں تھیں۔ پھر وہ شخصیتیں دوسرے کو گود میں کیوں لے لیتیں تھیں۔ وہ جاذبیت اس کی ذہنی چمک کی جاذبیت سے کہیں زیادہ پر اثر تھی بے شک ذہنی چمک میں لطف تھی۔ چھپا [illegible] تھا حرارت نہیں تھی۔

کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ رنگی میں بھی چھپا ہوا حرارت ہے۔ اگر مانی اور رنگی کی باتوں کی رنگینی تھی تو رنگی [illegible] کی خاموشی رنگین تھی۔ رنگی میں حرارت تھی رنگی میں پیار بھری گود تھی۔ مانی چاند کی طرح ہر رنگ میں چمکتا تھا۔ کبھی ہلال بن جاتا کبھی چاند لیکن رنگی میں پیار بھری گود تھی۔ مانی چاند کی طرح ہر رنگ میں چمکتا تھا۔ کبھی ہلال بن جاتا کبھی چاند لیکن رنگی مسلسل سورج تھا جن میں سے ہر وقت شعاعیں نکلتی تھیں اور گرماتی تھیں۔

مانی اور رنگی کی گفتگو صرف شعروں تک ہی محدود نہ رہتی تھی کبھی وہ راگ ودیا پر بحث چھیڑ دیتے اور مختلف راگوں کے تاثرات پر گرمجوشی سے باتیں ____ سیاست میں ان کی دلچسپی محض اخباری قسم کی تھی۔ یلی خود سیاست میں کورا تھا۔ سیاسی مسائل سے قطعی طور پر لگاؤ نہ تھا۔

کے قصے سنتے حتیٰ کہ رات کے دس گیارہ بج جاتے۔ پھر وہ گھر لوٹتے تو ہاجرہ چپ چاپ بیٹھی ہوتی۔ علی کو ہاجرہ پر ترس آتا تھا۔ وہ بیچاری بڑھاپے میں گھر سے قید میں پڑ گئی تھی۔

ایک روز ہاجرہ نے ڈرتے ڈرتے بات چھیڑ ہی دی۔ "علی زندگی کس طرح بسر ہوگی۔"

"کیا بات ہے ماں؟"

"دیکھو نا۔" وہ بولی۔ "آخر میں ساری عمر تو تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"تو پھر؟"

"تم شادی کر دیتا ورنہ یہ لڑکا کس طرح پلے گا۔"

"تو کر دو۔" علی نے بے پروائی سے کہا۔

ہاجرہ کا خیال تھا کہ علی شادی کے نام پر بدک جائے گا۔ شاید وہ ساری عمر دوسری شادی کے لیے تیار نہ ہوگا۔ علی کے منہ سے یہ بات سن کر وہ حیران رہ گئی۔

تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں نا۔" اس نے پوچھا۔

"ہو جائے تو بھی اعتراض نہیں۔ نہ ہو تو بھی نہیں"

"تو کہاں کرو گے؟"

"کہیں بھی۔" وہ بولا۔

"مجھے وہ تو نہیں دیں گے اپنی لڑکی۔"

"ظاہر ہے۔" وہ بولا۔

"تو کہیں سے خود ہی تلاش کر لونا۔"

"نہ ماں۔" وہ بولا۔ "یہ جھنجھٹ مجھ سے نہ ہوگا۔"

"تو تمہاری پسند کیسی ہوگی؟"

"کوئی بھی ہو تو منظور کر لو گے؟"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "صرف ایک بات ہے۔"

"وہ کیا؟"

"جس روز اس نے ماں سے بدسلوکی کی میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔"

ہاجرہ ہنس پڑی۔ "تم اپنے دوست سے کیوں نہیں کہتے۔"

"کس سے۔" وہ بولا۔

"اس رنگی سے۔"

"میں تو شرمندہ ہوں گا۔"

"تو پھر میں کہوں۔" ہاجرہ نے کہا۔

"کہہ دیکھو۔"

"یہ تو اچھے لوگ دکھتے ہیں۔"

"ہاں اچھے ہیں۔"

"شاید کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈ دیں۔"

"شاید۔" وہ بولا۔ اور پھر ماں کی خاطر رنگی کی طرف چلا گیا۔

ایلی کو رنگی کی بیوی سے ملنے کا اتفاق یوں ہوا کہ اس روز جب چائے کا وقت ہوا تو خلاف معمول بیٹھک میں چائے پینے کی ____ بجائے رنگی اسے گھر کے اندر زنانے میں لے گیا۔ اور بیوی نگہت سے اس کا تعارف کرا دیا۔ نگہت کو دیکھ کر ایلی گھبرا گیا۔

نگہت خوبصورت تھی۔ اس میں ایک عجیب سا وقار تھا۔ نگاہ بے نیازی سے لبریز تھی۔ ہونٹوں میں رنگی کی جھلک تھی۔ ٹھوڑی میں دبی ہوئی ضبط تھی۔ جوانی تھی۔ بے تکلفی تھی۔

ایلی اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران نہیں ہوا تھا۔ بلکہ نگہت میں رنگی اور رضی کی آمیزش دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس میں وہی برداشت تھی جو رضی اور ماں میں تھی

وہی مشہور تھی اور اس کے باوجود نسائیت کی تمام تر رنگینی اور شوخی بھی تھی۔ یہ متضاد خصوصیات ایک جگہ کیسے اکٹھی ہو سکتی ہیں، وہ حیران تھا۔

نگہت کو دیکھ کر ایلی کو رنگی کی شرارتوں پر غصہ آنے لگا۔ رنگی کیوں جھک مار رہا تھا۔ کیوں پھول پھول اڑ رہا تھا۔ جب کہ اس کے اپنے گھر میں بہار آئی ہوئی تھی۔ چند ایک روز اس نے رنگی سے اشارۃً یہ بات کہہ بھی دی۔ رنگی کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ وہ بولا۔ "دیکھنا نگہت۔ وہ تو میری زندگی کی بہار ہے۔ اس کے بغیر دنیا سونی ہے۔ جبھی تو مجھے اس سے اس قدر عشق ہے، والہانہ عشق۔"

ایلی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ دیکھ کر رنگی چلایا۔ "تمہیں یقین نہیں آیا۔ نگہت میری روح کی روشنی ہے۔ جسم کی بات چھوڑو۔"

"اور یہ جو ان گنت فیروزے ہیں تمہاری۔" ایلی نے پوچھا۔

"جی ان کی کیا حیثیت ہے۔" رنگی نے کہا۔ "اگر نگہت کو زکام ہو جائے اور اگر ان تمام فیروزیوں کا بھرتا بنا کر کھلانے سے اس کا زکام دور ہو سکتا ہو تو میں ذرا تامل نہ کروں۔"

رنگی بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ لیکن ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح متضاد باتیں کیے جا رہا تھا۔ عین اس وقت مانی نے شور مچا دیا۔ "بھئی ادھر بھی خبر ہو۔ بیچاری دھوپ میں کھڑی ہے۔ تمہارے لیے۔"

"تتلی ہے کیا؟" رنگی اچھل کر بولا۔

"ہاں ہاں۔" مانی نے چہچہایا۔

رنگی نے دو چھلانگیں ماریں اور بیٹھک سے باہر نکل گیا۔

"کیا نگہت برا نہیں مانتی۔" ایلی نے مانی سے پوچھا۔

"بہت۔" مانی بولا۔ "کڑھتی ہے۔ لیکن بھئی گلاب کے ساتھ کانٹے تو ہوں گے۔"

"وہ بھی تو نگہت ہے۔" ایلی نے کہا۔

"ہاں۔" وہ بے پرواہی سے بولا۔ "نگہت کی کیا بات ہے۔ وہ ہم سب کی محبوبہ ہے۔ جنت محبوبہ ہے۔ ہم سب اس سے پیار کرتے ہیں۔ تم بھی کرو گے۔ اسے بغیر پیار کرنے کے کوئی نہیں رہ سکتا۔ وہ میری محبوبہ ہے ایلی ہے۔ راز دان ہے۔ اور وہ میری ماں ہے ماں۔ آؤ ہم چل کر اس سے عشق لڑائیں۔" مانی اندر جا کر نگہت کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ "مانی۔" وہ بولا۔ "ہم تو تباہ ہو گئے۔"

"کیوں۔" وہ بولی۔

"بس برباد ہو گئے۔"

وہ مسکرا دی۔"

"کوئی خاطر میں نہیں لاتی۔"

"تت تت۔" اس نے مذاق سے منہ بنایا۔

"اچھی ماں کسی ایسی لڑکی کا پتہ دو کہ مزا آ جائے۔ بے حد خوبصورت ہو۔ رنگیلی ہو۔ طرحدار ہو ______ تمہاری طرح۔" پھر مانی کچھ سوچنے لگا۔

"یہ ہمارا ایلی ہے اس کی بات بنا دو نہیں۔"

"کیسی بات؟"

"اسے اچھی سی بیوی دلا دو۔"

"اچھا۔"

"بس یہ کام کر دو۔ ساتھی تلاش کر دینا۔ بیوی نہیں۔" مانی نے کہا۔

"بیوی کیوں نہیں؟"

"بیوی بڑی بھدی شے ہوتی ہے۔" وہ بولا۔

"پھر لوگ کیوں کرتے ہیں؟"

"لوگ کے بچے ہیں۔" وہ بولا۔

"اور تم۔"

"میں بھی ہوں۔ الو کا پٹھا۔"

"کیوں ہو؟" وہ ہنسی

"ماں باپ نے بنا دیا بس۔"

"نہ بنتے۔"

"زبردستی بنا دیا۔ اب تمہیں بیٹی کو الو کا پٹھا نہ بنا دینا۔ خیال رکھنا۔"

"ہٹ۔" رنگی چلاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ "میری پیاری کو دق نہ کرو۔"

نگہت رنگی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"بس تمہارے من میں وہم بیٹھا ہے۔" رنگی نے پیار سے نگہت کی طرف دیکھا۔

"ہم تو بس تمہارے بغیر یتیم ہو جاتے ہیں۔"

"اچھا۔" وہ مسکرائی اور وہ ایک دوسرے میں کھو گئے۔

پاک بابا

ایک صبح ہاجرہ بولی آج میں نے خواب میں پاک بابا کی زیارت کی۔

"پاک بابا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا۔"

"کیوں؟"

"دیر سے ان سے ملنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔"

"تو پھر۔"

"جانا ہی نہیں ہوا۔"

"کیوں۔"

"بس جھنجھٹوں میں پڑی رہی۔"

"ہوں۔" میں بولا۔

"حاجی صاحب کیا پاگل بابا کی زیارت کر آؤں۔" میں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔

"تو وہ کیا کہنے لگے۔"

کہنے لگے "اللہ کے بندوں کی خدمت میں حاضری دینا اچھا ہوتا ہے۔" میں نے پوچھا تو ہوں "تو کبھی کہنے لگے ہاں ہاں کیا حرج ہے۔"

"تو پھر ہو آؤ کہاں ہیں وہ۔" ایلی نے کہا۔

"اکیلی کیسے جاؤں۔"

"تو کسی کو ساتھ لے جاؤ۔"

"تم کیوں نہیں چلتے۔" اس نے پوچھا۔

"میں جا کر کیا کروں گا۔"

"حرج بھی کیا ہے۔ تم بھی کر لینا۔" ہاجرہ بولی۔

"کیا فائدہ۔"

"وہ ہنسی۔" اللہ کے بندوں سے ملنے کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔"

"کیا ہوتا ہے۔؟"

"تقدیر بدل جاتی ہے۔"

"اب تقدیر بدل کر کیا کرنا ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

وہ ہنسنے لگی۔ بولی۔ "ابھی تو ساری زندگی پڑی ہے تیری۔"

"اماں تو میری زندگی کی بات چھوڑ۔" ایلی نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتا ہے۔" وہ بولی۔ "چل اپنے لیے نہ سہی۔ میری خاطر چل۔"

"کیا کروں گا وہاں جا کر۔"

"تو چل تو سہی۔"

پاگل بابا امرتسر کی پوری روڈ پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر ایک

بہت بڑی پگڑی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پگڑی باندھی ہوئی نہ ہو بلکہ گٹھڑ سا بنا کر سر پر رکھ دی گئی ہو۔ اس کے جسم پر ایک لمبا سا چغہ لٹکتا تھا۔

ایک درخت کے نیچے ایک چھوٹا سا بستر، ایک ٹین کا پیالہ، ایک لوٹا، اور ایک تھیلی پڑی تھی۔ یہ بابا کا جملہ سامان تھا۔ اسے کبھی کسی نے بیٹھے نہ دیکھا تھا۔ ہمیشہ سڑک پر ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر گھومتا رہتا۔ چھاتی ابھری رہتی، گردن تنی رہتی۔ اسے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے نپولین جہاز کے تختے پر روحیش کا جائزہ لے رہا ہو۔

پھر وہ نماز پڑھنے میں مصروف ہو جاتا۔ لیکن نماز پڑھنے کے لیے وہ سڑک سے ہٹ کر قریب ہی کھیتوں میں چلا جاتا تھا۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ پھر سڑک پر آ جاتا۔ بابا کو کبھی کسی نے سوتے، کھاتے پیتے نہ دیکھا تھا۔

اللہ سے بیوہ

رتی پور کے گاؤں میں ایک روز جب لوگ مسجد میں گئے تو بابا وہاں بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا اور اس کا مختصر سا سامان جس میں ایک چھوٹا سا بستر بھی شامل تھا، حجرے میں رکھا ہوا تھا۔ گاؤں والوں نے سمجھا کہ مسافر ہے۔ شاید سستانے کے لیے وہاں رک گیا ہے۔ دو ایک روز تو لوگ اسے ساگ روٹی بھیجتے رہے۔ تیسرے روز رتی کا نمبردار غصے میں آ گیا کہنے لگا۔ "دیکھ بابا یہ مسجد ہے۔ اللہ کا گھر ہے۔ ہوٹل یا سرائے نہیں ہے۔ تو اب اپنا راستہ لے۔ یہاں ڈیرہ جمانا غلط ہے۔" چوتھے روز وہ پھر مسجد میں گیا۔ تو بابا جوں کا توں بیٹھا تھا۔

نمبردار کو طیش آ گیا۔ اس نے بابے کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اور دھکے دے کر مسجد سے باہر نکال دیا۔

بابے نے اپنی پگڑی سر پر رکھی سامان اٹھایا۔ اور رتی پور کی مسجد سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر جا کر سڑک پر بیٹھ گیا۔

اس شام نمبردار کی بھینس بیمار پڑے بغیر مر گئی۔ سارا گاؤں حیران تھا کہ بھینس کو کیا ہوا۔ کچھ لوگ کہنے لگے "تم نے بابا کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔"

نمبردار چلانے لگا۔ "میں نے کیا برا کیا تھا۔ کیا شریعت کے خلاف بات کی تھی۔ سیدھی بات ہے میاں کہ مسجد اللہ کا گھر ہے۔ وہاں جا کر نماز پڑھو۔ میلاد کرو۔ عبادت کرو اور اگر کوئی مسافر ہو تو بے شک دو دن کے لیے وہاں ٹھکانہ بھی بنا کر رہے۔ یہ کیا ہوا کہ اسے گھر بنا کر بیٹھ جائے۔" نمبردار نے بھینس کی موت کو بابا کی بددعا کا نتیجہ سمجھنے سے صاف انکار کر دیا۔

اگلے روز جب وہ حویلی میں گیا تو ایک اور بھینس مری پڑی تھی۔ "ارے۔" وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ تیسرے روز جب اس کی تینوں بھینسیں بے وجہ مر گئیں تو وہ گھبرا گیا اور اس نے گاؤں میں کھڑے ہو کر لوگوں کی منتیں کیں "میں تباہ ہو گیا۔" "یہ کیا مصیبت آپڑی ہے مجھ پر خدا کے لیے میری مدد کرو۔ ضرور یہ اس بابا کی بددعا ہے۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔ میری توبہ ہے۔ میں اس کے پاؤں پڑنے کے لیے تیار ہوں مجھے اس سے معافی دلوا دو ورنہ تباہ ہو جاؤں گا۔"

وہ سب مل کر بابا کے پاس گئے۔ لیکن بابا چپ چاپ بے نیازی سے سڑک پر ٹہلتا رہا جیسے اسے ان لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہو۔ دیر تک وہ چیختے چلاتے رہے لیکن وہ اپنی ہی دھن میں ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر سڑک ناپنے میں مصروف رہا۔

اسی شام وہ پھر بابا کے پاس گئے۔ انہوں نے منتیں کیں۔ کہ وہ پھر مسجد میں آبیٹھے۔ وہ اسے گاؤں میں ایک مکان دینے کے لیے تیار تھے۔ اس کی خدمت کرنے کے لیے بے تاب تھے بشرطیکہ وہ گاؤں والوں کو معاف کر دے ____ لیکن بابا نے ان کی طرف دھیان نہ دیا۔

اگلے روز انہوں نے گاؤں کے دارے میں بیٹھ کر مشورہ کیا۔ ہر کسی نے اپنی اپنی تجویز پیش کی۔ لیکن دولے چمار کی بات سب کو پسند آئی۔ اور انہوں نے اس پر

عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک آدمی سڑک پر جا بیٹھا کہ بابا پر نگاہ رکھے۔ گاؤں کے دس ایک آدمی وضو کرکے انتظار میں بیٹھ رہے۔ جب بابا نماز پڑھنے کے لیے کھیت میں گیا اور نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب بھاگے اور بابا کے پیچھے قطار بنا کر نماز پڑھنے لگے۔

جب بابا نماز پڑھ کر فارغ ہوا اور اس نے پیچھے دیکھا کہ گاؤں والے اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ چلانے لگا۔ "جاؤ جاؤ۔ اٹھو میرے پیچھے مت اٹھو۔ تم نے اللہ سے بیوپار نہیں کیا۔"

گاؤں والوں میں سے ایک بولا۔ "ہم تمہارے پیچھے نماز پڑھنا نہ چھوڑیں گے۔ جب تک تم ہمیں معاف نہ کرو۔"

"مت پڑھو مت پڑھو۔" بابا چلایا۔ "تم نے اللہ سے بیوپار نہیں کیا۔"

"تو کہہ دو گاؤں والوں کو معاف کیا۔" وہ بولے۔

"اللہ معاف کرے گا۔" وہ بولا۔ "جاؤ جاؤ۔"

"اللہ نہیں کرے گا۔ جب تک تم نہ کرو۔" گاؤں والوں نے کہا۔

"جاؤ جاؤ۔" بابا بولا۔ "میں کون ہوں۔ میں کچھ نہیں میں کچھ نہیں۔ جاؤ۔"

"چاہے تم کچھ نہیں۔" گاؤں والوں نے کہا۔ "جب تک تم یہ نہ کہو گے کہ جاؤ معاف کیا ہم نہیں جائیں گے۔"

"بابا اٹھ بیٹھا۔ وہ کھیتوں میں گھومنے لگا۔ "پگلے پگلے تنگ کرتے ہیں۔ تنگ کرتے ہیں۔" گاؤں والے وہیں بیٹھے رہے۔

"جاؤ۔ جاؤ۔" بابا بار بار ان کے قریب آکر چلاتا۔

"کہو معاف کیا۔" وہ جواب دیتے۔ بابا پھر گھومنے لگتا۔ "میں کون ہوں میں کون ہوں۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔"

دیر تک وہ یوں ہی چلاتا رہا۔ پھر بولا۔ "جاؤ معاف کیا جاؤ جاؤ۔ اللہ سے بیوپار

تم سب اللہ سے پیار کرلو جاؤ۔"

اس کے بعد کئی لوگوں نے کئی بار کوشش کی کہ بابا گاؤں میں آ رہے لیکن بابا نے ان کی بات نہ مانی اور وہیں سڑک پر گھومتا رہا۔

بابا کی یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دور دور کے علاقے کے لوگ بابا کے پاس آنے لگے۔ لیکن جلد ہی ان سب کو معلوم ہو گیا کہ بابا نہ بیٹھے گا نہ بات کرے گا۔ چند لوگوں نے آ آ کر بابا کو سلام کرنا شروع کر دیا۔ بات کرنی ممکن نہ تھی مگر وہ سلام تو کر سکتے تھے اور یہ رسم اس قدر عام ہو گئی کہ سڑک پر چلتی ہوئی بسیں اور ریلیں اور موٹریں بابا کے ڈیرے کے پاس آ کر رک جاتیں ڈرائیور انجن بند کر دیتے اور پھر زور لگا کر گاڑی سٹارٹ کر کے چل پڑتے۔ یہ ان کی سلامی تھی۔

بسیں رک جاتیں۔ چند انگریزی فینشل ہارن بجاتے اور سلام کے بعد خاموشی سے چل پڑتے، راہگیر رک جاتے۔ سلام کرتے اور پھر چل پڑتے۔

اور بابا تنی ہوئی پگ سر پر رکھے سڑک پر ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر چکر لگاتا رہتا۔ اس کی چھاتی ابھری ہوئی۔ گردن تنی ہوئی۔ سر اوپر کی طرف اٹھا ہوتا اور وہ ادھر ادھر یوں دیکھتا جیسے جہاز کا کپتان ہو۔ حالات کا جائزہ لے رہا ہو اور جہاز کو کھینچ کر پار لے جانے کے متعلق ملاحوں کو احکامات صادر کر رہا ہو۔"

میں کیا کروں

جب ہاجرہ اور ولی وہاں پہنچے تو بابا کھیت میں بیٹھا نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ ہاجرہ چپکے سے بابا کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگی۔ ولی ماں کو اٹھا کے قریب ہی بیٹھ کر تنکے سے زمین کریدنے لگا۔

نماز سے فارغ ہو کر بابا نے مڑ کر دیکھا۔ "تم نے اللہ سے پیار کیا ہے؟" وہ چلایا۔

"کیا ہے بابا جی۔" ہاجرہ نے جواب دیا۔

"اچھا کیا۔" وہ بولا۔ "اچھا کیا۔"

"بابا جی یہ میرا بیٹا ہے۔" وہ ایلی کی طرف اشارہ کرکے بولی۔ "ادھر آ ایلی۔ ادھر آ۔ بابا کے سامنے۔"

ایلی بت بنا چپ چاپ بیٹھا رہا۔

بابا نے ایلی کی طرف دیکھا۔ غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"تمہارا بیٹا ہے۔" دفعتاً وہ بولا۔

"جی بابا۔" ہاجرہ بولی۔

"تمہارا بیٹا ہے۔ تو پھر میں کیا کروں۔"

"دعا کریں آپ۔" وہ بولی۔

"میں کون ہوں۔" وہ چلایا۔ "میں کون ہوں کہ دعا کروں۔"

"آپ اللہ والے ہیں۔" ہاجرہ بولی۔

"اللہ جانے آپ جانے۔ وہ سب جانتا ہے۔ اللہ اپنے کام آپ کرتا ہے۔ وہ سب کرتا ہے۔ میں کون ہوں۔"

"آپ اللہ والے ہیں۔" ہاجرہ نے پھر دہرایا۔

"سبھی اللہ کے ہیں۔ میں بھی ہوں پھر میں کیا کروں۔" پھر وہ خود جیسے وجد میں کھیت میں چکر کاٹنے لگا۔

"وہ سب کرتا ہے۔ وہی کرتا ہے کون کرتا ہے کچھ کون کرتا ہے۔ وہی جانے۔ اس کے کام ہیں وہی جانے۔ میں کیا کروں۔" دیر تک وہ میں کیا کروں کی رٹ لگاتے ان کے سر پر منڈلاتا رہا۔

پھر وہ ایلی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کیا نہیں کیا؟ ______" بابا چلایا۔ "کیا نہیں کیا؟" "جب تم نے ڈیرہ میں ڈیرہ لگایا تو حضرت شاہ غور نے تم پر ترس کھایا اور تم کو حفاظت میں لیا تھا نہیں لیا تھا؟"

پھر میں کیا کروں۔ کیا کروں بیٹی۔"

وہ پھر کھڑا ہو۔ "اس بڈھے نے سب کچھ بتایا تمہیں بتایا پچھو۔ اس نے تمہارا ناؤں لکھا ہے وقت وقت کی بات ہے۔ وقت پر ہوتا ہے وقت پر نہیں ہوتا۔ اس بڈھے نے کہا وقت آئے گا۔ تم نے پرواہ نہ کی۔ اندھے ہیں اندھے اندھے ہی اندھے۔" وہ پھر چیخنے لگا۔

علی حیرت سے اس بڈھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے حاجی صاحب کھڑے تھے۔ ہاجرہ سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ سامنے سڑک پر لوگ کھڑے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بابا نے کبھی کسی کو پاس نہ بٹھایا تھا۔ وہ ہاجرہ اور علی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ماں انگلیوں سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔

وہ پھر آ گیا۔ "پھر میں کیا کروں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم وہاں جاؤ نہ جاؤ۔ جہاں تمہارا ناؤں ہے۔ دور بہت دور رہتی ہوئی والی بڑھیا بیٹھی ہے۔ وہ تم سیوں سے نپٹ لے گا۔ کنوئیں کے پاس۔ مسجد کے پاس ندی کے پاس۔ وہ بڈھا بڑا جبردست ہے اور اس کا باپ کا وہ لمبا ہی لمبا اور وہ نیچے قد والا دونوں بیٹھے ہیں جہاں تم نے پہنچنا ہے۔ جاؤ۔ جاؤ۔ وہ چلایا۔ "میں کیا کروں جاؤ جہاں تم نے جانا ہے ان سے ہو کر پھر تم نے وہاں پہنچنا ہے۔ جہاں تمہارا ناؤں لکھا ہے یہیں سے ہو کر جانا ہے۔" اس نے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ "جاؤ جاتے کیوں نہیں جاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔"

دفعتاً بابا کو غصہ آ گیا۔ "جاؤ جاؤ جاتے کیوں نہیں جاؤ۔" اس نے ہاجرہ اور علی کو دھمکایا۔

"اس کو بھی لے جاؤ۔" اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ "اس کو جنگل گیا تھا۔ پیٹ میں نگل گیا تھا۔ اسے بھی لے جاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ" وہ غصے میں چلایا۔

"نہیں جاتے؟ نہ جاؤ نہ جاؤ۔ تم جانو اور بڈھا جانے۔ میں کیا کروں۔ میں کیا

کروں۔" یہ کہتا ہوا وہ رتھ کی طرف چل پڑا۔

وہ تینوں چپ چاپ بیٹھے رب باجوہ کے چہرے پر عجز اور تشکر کے تودے لگے ہوئے تھے سادی ایلی کا منہ تک رہا تھا۔ اور ایلی خاموش بیٹھا تھا چاروں طرف سے دھندلکا اس پر یورش کر رہا تھا۔

دھندلکے میں کھڑی شہزاد مسکرا رہی تھی۔ "جاؤ۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "رکاوٹ تو دور ہو گئی۔" حاجی صاحب کا سر ہل رہا تھا۔ "آئے گا وقت ضرور آئے گا۔" وہ مدھم آواز گنگنا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے انہوں نے کسی سرمے کی سلائی لگا رکھی ہو۔

غلام مسکرا رہا تھا۔ اللہ ہی اللہ۔ اللہ ہی اللہ اس کی ستار سر دھن رہی تھی۔

"ارے ری مو پیا نا۔" ارشاد کی آنکھوں سے مٹھاس بھرے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ پپیہا کوئل چیختی ہوئی اڑے جا رہی تھی۔

اس دھندلکے میں ایک بڈھا میلی سی رومی ٹوپی پہنے فضا کو گھور رہا تھا۔ اس کے قریب ایک اونچا سا دبلا پتلا انسان چپ چاپ بیٹھا تھا۔ کنواں ایڑیاں اٹھائے ان کی طرف جھک رہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی مسجد کے مینار گم صم کھڑے دیکھ رہے تھے چھوٹے چھوٹے درخت باادب کھڑے تھے۔

جب ایلی گھر واپس پہنچا تو وہ دھندلکا بدستور قائم تھا۔

اس کے بعد ایلی کے احساسات میں نہ جانے کیا ہوا۔ جب بھی وہ رضی ماں اور رنگی کے پاس بیٹھا ہوتا اور رضی کوئی نہ کوئی راگ چھیڑتا۔ "ہری رے سے ندیا" تو اس کے روبرو ایک وسیع میدان پھیل جاتا۔ ہری ندی کے قریب ایک کنواں ابھر آتا اور پھر پاس ہی ایک مسجد سفید چادر اوڑھے بیٹھی اور ایک مختصر سی چار دیواری کے اندر سفید داڑھیوں پر رومی ٹوپی اوڑھے ایک بڈھا اپنے ہی دھیان میں مگن بیٹھا ہوتا۔ پاس ہی ور نقد باادب کھڑا ہوتا۔

"پوٹ چت پر دیتا۔" رضی گویا آئینہ بھرتا۔ "مری دنیا۔" وہ چادر میں لپٹی ہوئی مسجد بن کر آپ سمٹتی۔ دور ہو سیٹیاں بجاتی۔ وہ ستیں اور پھل جاتیں۔ کائنات گنگنا دیتی پتے سرگوشیاں کرتے درخت جھلتے ندی اور گہری ہو جاتی۔

ایلی رضی رنگی اور مانی کے درمیان بیٹھ کر بھی اسی منظر میں کھویا رہتا۔

"خوش قسمتی ہے تمہیں۔" رنگی مسکرایا۔

ایلی کی نگاہ تلے ایک ننھی روشنی ٹوپی ابھری۔

"یہ بونا سا قد تھا۔" مانی تتلی کو دیکھ کر مسکرایا۔

ایک بونا ایلی کی نگاہوں میں ابھرتا۔ اور ادھر دراز قد ایلی کی طرف دیکھتا۔ اور پھر پگ بابا چیختا۔ "جاؤ۔ چلے جاؤ تم جانو اور وہ جانیں میں کون کون ہوں۔"

ورتاجی صاحب کا سر جھولتا۔ "اللہ کا کرم ہے جس پر ہو جائے۔"

پگ بابا نے نہ جانے ایلی کو کیا کر دیا تھا۔

لیکن ایلی کا ذہن جوں کا توں تھا۔ وہ ایک مضبوط قلعے کی طرح اس کے گرد حصار کیے ہوئے تھا۔ یہ ٹھیک ہے۔ بابا نے اس کے ماضی کے متعلق تمام ساری باتیں بتا دی تھیں۔ ضرور بابا میں کوئی طاقت کام کر رہی تھی۔ لیکن ایلی سوچتا اس شعبدہ بازی سے مجھ سا سمجھدار آدمی کیسے متاثر ہو سکتا ہے۔ شعبدہ بازی ایلی کو حیران کن ضرور کرتی تھی مگر شعبدہ بازی سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ معجزات یا اس قسم کی غیر مرئی طاقتیں اس کے لیے حیران کن ضرور تھیں۔ لیکن وہ اس کے ایمان کو تقویت نہ دیتی تھیں۔ نہ ہی اس کے دل میں خدا یا مذہب کے لیے جذبہ پیدا کرتی۔ اور نہ ہی وہ ایسے لوگوں کو اللہ والے تسلیم کرنے پر تیار تھا جن سے ایسی طاقتوں کا ظہور ہوتا۔

غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ وہ بے حد ڈرپوک تھا لیکن اللہ پر اس کا ایمان ڈر کی بنیاد پر قائم نہ تھا۔

اللہ کا تخیل جو اس کے دل میں قائم ہوا تھا وہ تیم تیمور کی قلقیات یا دین کے سلسلے کے

"سائنس کا معجزہ" سے متعلق مضامین پڑھ کر دل کے فزکس سے تیاگ کے جذبات کا
ونٹ رمیمین کے مشاہدات اور رچرڈ۔ جی ولز کی سائنس فکشن کتابوں سے غذا مل رہی
تھی۔

ڈرکی بچے اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کے جذبات سے معمور تھا۔ اسے اللہ
کے بندوں کی حاتور کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ اور ہوتا بھی تو اسے اس سے کوئی سروکار
نہ تھا۔ چونکہ اسے اللہ کی طلب نہ تھی احترام تھا فقط احترام۔ ویسے وہ اللہ کی محبت سے
کورا تھا۔ اللہ سے محبت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اللہ سے محبت صرف اسی صورت
میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جب وہ اپنی مرلی اٹھا کر نیچے اتر آئیں۔ اسے بچ کیں اور
کائنات وحدتوں میں رادھکاں کی طرح ناچے اور ان کی مرلی کے حرکت ہوتے
گا گئیں پھول کھل جائیں اور کومل جالے پیدا ہوں۔

ہندو ویت اور عیسائیت کے مطابق اللہ کی محبت کا تخیل اس کے لیے قابل قبول تھا۔
اسلام کے مطابق تو صرف اللہ ہو اللہ ہو تھا۔ عظمت عظمت عظمت عظمت۔ محبت کا
سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور اس بے پناہ عظمت کا اسے کچھ کچھ احساس تھا۔ جو اس
نے مغربی سائنسی تحریروں سے اخذ کیا تھا۔ اسلام سے نہیں۔

ہند معجزات کو خاطر میں لاتا یا اللہ کے ان بندوں کے سامنے جھکنا بے کار تھا۔ علی
کی ذہنی دنیا بے حد مستحکم اور محفوظ تھی۔

لیکن اس کی جذباتی دنیا ذہنی خیالات سے دور اپنے ہی رنگ میں بستی تھی۔

شاید اسی لیے اسے جھریوں سے محبت تھی چونکہ جھریوں کے زیر اثر مردے
لٹک گئے نیچے اتر آتے۔ اور رچھت پر اسے گھیر لیتے۔ اس کی ذہنی چولیں ٹوٹ
جاتیں۔ اس کے فلسفے کی گاڑی چھوٹ جاتی اور وہ اس ٹوٹ پھوٹ سے بے نیاز ہو کر
رادھکاں بن کر ناچتا۔

لیکن یہ روحی تو پلی واہ بڑھا اور دراز قد کون تھے۔ جو اس کی پرائیوٹ زندگی میں

"کیوں بھئی۔" تمہارا جی لگ گیا وہاں۔ بڑا اچھا مدرسہ ہے۔ خوبصورت شہر ہے۔" پھر معروف صاحب کی بات چل نکلی بولے "دراصل تم تقدیر کے لحاظ سے خاصے بدقسمت واقع ہوئے ہو۔ ورنہ محکمہ تعلیم کے کئی افسر اپنے دوست ہیں اگر تمہارے خلاف شکایات نہ ہوتیں تو نہ جانے ان کی مدد سے تم کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔"

اپنے اثر و رسوخ پر ناز کرنے کی علی احمد کی پرانی عادت تھی۔ وہ خود بڑے عہدے پر نہ پہنچ سکے تھے۔ اور اپنی تمام تر زندگی میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکے تھے۔ اس لیے عادی طور پر وہ اپنی اہمیت ان دوستوں سے اخذ کرتے تھے۔ جنہیں کوئی نہ کوئی مرتبہ حاصل نہ کر سکے تھے۔ اس لیے عادی طور پر وہ اپنی اہمیت ان دوستوں سے اخذ کرتے تھے۔ جنہیں کوئی نہ کوئی مرتبہ حاصل تھا۔ ایلی ان کی اس عادت سے پورے طور پر واقف تھا لیکن اس میں اس قدر فراخدلی نہ تھی کہ ان کی اس چھوٹی سی کمزوری کو برداشت کرتا۔

ان کے منہ سے اپنے دوستوں کی عظمت کا تذکرہ سن کر وہ جل کٹ جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ علی احمد کا کوئی دوست نہیں۔ لوگ صرف ان کی بذلہ سنجی کی وجہ سے ان سے ملتے اور انہیں برتتے تھے۔ دراصل وہ علی احمد کے لیے کچھ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس کی وجہ علی احمد کی اپنی طبیعت تھی۔ چونکہ وہ بڑے آدمیوں کو ہوا دینے کے قائل تھے۔ ان کا ادب لحاظ ملحوظ خاطر رکھتے۔ وہ کسی بڑے آدمی سے برابری کے احساس سے نہیں مل سکتے تھے۔

بہرصورت ایلی میں اس قدر وسعت قلب نہ تھی کہ علی احمد کی اس چھوٹی سی خوشی میں ان کا ساتھ دیتا۔

"دیکھیے اباجان۔" وہ بولا۔ "آپ کے دوست آج تک میرے لیے کچھ نہ کر سکے چھوڑیئے اس بات کو۔"

اس پر علی احمد کو غصہ آ گیا۔ غصہ تو آنا ہی تھا۔ چونکہ ان کا بیٹا ان کی تمام تر اہمیت کو یوں یک قلم رد کر رہا تھا۔

''اگر معروف صاحب ڈائریکٹر نہ ہوں۔'' وہ جلال میں آنے لگے۔ ''یا تم میرے بیٹے نہ ہو تو تم ایک روز بھی اپنی نوکری پر قائم نہیں رہ سکتے۔''

''آپ کا مطلب یہ ہے نا کہ انہوں نے آپ کی وجہ سے میرے خلاف شکایت پر کوئی ایکشن نہیں لیا۔'' علی نے کہا۔

''بالکل۔'' وہ بولے۔

''یہ میں تسلیم کرتا ہوں اور شکر گزار ہوں۔'' علی نے کہا۔ ''لیکن اس کی مدد مثبت قسم کی نہیں۔''

''کیا مطلب۔'' علی احمد بولے۔

''انہوں نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ صرف نوکری پر بحال رکھا ہے۔'' علی نے جواب دیا۔

''جی میاں۔'' علی احمد چلائے۔ ''اگر وہ نہ ہوں تو تم ایک دن کے لیے بھی نوکری نہیں کر سکتے۔'' علی کو غصہ آ گیا۔ ''یعنی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ میں اتنی قابلیت ہی نہیں کہ دفتر کی نوکری بھی کر سکوں۔'' وہ ہنسے۔ ''میاں تم اپنی قابلیت کے زور پر دفتر کی نوکری بھی نہیں کر سکتے صرف میری وجہ سے تم اتنے بڑے عہدے پر فائز ہو بیٹا۔ تم نے نصیب کی ماں کیا کہا تھا ہم نے۔ کیا کہتی ہے۔ کیا غلط کہا ہے۔ ہی ہی ہی۔'' وہ ہنسے۔ ''یہ علی کیا نوکری کرے گا اپنے بل بوتے پر۔ وہ ہم ہی تھے جو بغیر کسی کی مدد کے کسی وسیلے کے اتنے سال نوکری کی اور عزت سے کیے۔ کیا کہتی ہے۔''

علی کے دل میں ایک عزم پیدا ہو رہا تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ خاموش عزم تقویت پکڑتا گیا۔ علی کی تمام تر انا گویا

احتجاج میں کھڑی ہوئی تھی وہ ایک مظلوم حبشی کی طرح تن گئی تھی۔ حبشی کی آنکھیں اپنے خانوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ گویا سوچا ہوا تھا۔ بازو تنے ہوئے تھے۔ توڑ دو توڑ دو۔ یہ زنجیر توڑ دو۔ اس کے جسم کے بند بند سے نعرے بلند ہو رہے تھے۔

ایلی نے اب تک اپنی اہمیت شہزاد سے اخذ کی تھی۔ اسے وہ محبوبہ حاصل تھی جس کے لیے عشقی محلے کے تمام افراد چشم براہ تھے۔ لیکن اب اس کی موت کے بعد ایلی کے لیے کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر وہ اپنی اہمیت کو استوار کرتا تھا۔ علی احمد کی اس سرسری بات نے ایلی کی توجہ کو اس بات کی طرف منعطف کر دیا تھا۔ اسے اپنی قابلیت پر بڑا ناز تھا۔ وہ جملہ اساتذہ کو کمتر سمجھتا تھا۔ اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ کہ اساتذہ کے جھرمٹ سے نکل جائے۔ ان کی زندگی کھوکھلی تھی۔ ان کی شخصیتیں بناوٹی تھیں۔ انہوں نے اخلاقیات کا خول پہن رکھا تھا۔ ان کا علم کتابی تھا۔ تدبر و فکر کی ان میں صلاحیت نہ تھی۔

ایلی کا ارادہ پختہ ہوتا گیا۔ کہ وہ محکمہ تعلیم کو چھوڑ دے گا۔ جہاں علی اصغر علی احمد کے دوست تھے۔ وہ اپنا راستہ خود پیدا کرے گا۔

رام گوپال

چند ایک روز کے بعد ایلی لاہور چلا گیا۔

لاہور میں اس نے محمود سے بات کی۔ "یار کوئی نوکری تلاش کر رہا ہوں۔ میری مدد کرو۔" وہ بولا۔ "میں سکول نوکری نہیں کروں گا۔"

"نوکری تلاش کرنے آئے ہو۔" محمود بولا۔ "تو مہربانی کر کے تلاش کرو۔ میں بھی اس محکمے سے تنگ آیا ہوں۔"

محمود نے بات مذاق میں ٹال دی۔ اب ایلی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے کس طرح کوشش کرے۔ اتفاق سے اس کی توجہ میز پر پڑے ایک اخبار کی طرف منعطف ہوگئی۔ اس نے ورق گردانی شروع کر دی۔ وہ چونک پڑا۔ اخبار میں لکھا تھا

ایک نئے محکمے کے لیے چند آسامیاں پر کرنے کے لیے ریکروٹوں کی ضرورت ہے۔

"یہ دیکھو۔" اس نے محمود سے کہا۔ "تم تو کہتے تھے نوکری ڈھونڈنے سے ملتی نہیں۔"

محمود ہنسا۔ "خالی تو بیسیوں ہوتی ہیں روزانہ نکلتی ہیں۔"

"میں عرضی دوں گا۔" وہ بولا۔

"دینے کا کیا مطلب ہے۔" محمود چلایا۔ "انہوں نے تو لکھا ہے کہ عرضی لے کر خود آ جاؤ۔ وہاں سینکڑوں سفارشیں ہوں گے۔ تمہیں کون پوچھتا ہے۔"

ایلی نے عرضی لکھی اور اسے لے کر خود اس محکمے میں جا پہنچا۔

محکمہ کا ڈائریکٹر ایک نوجوان بندہ تھا۔ اس نے ایلی کا خیر مقدم کیا۔ "آئیے۔" وہ بولا۔

"تو آپ الیاس آصفی ہیں؟"

"جی۔" ایلی نے کہا۔

"اور آپ محکمہ تعلیم میں ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"کتنی نوکری کر چکے ہیں آپ محکمہ تعلیم میں۔"

"پندرہ سال۔"

"پندرہ سال کافی لمبا عرصہ ہے۔"

"جی۔" وہ بولا۔

"لیکن آپ اس نوکری کو چھوڑنا کیوں چاہتے ہیں؟"

ایک ساعت کے لیے ایلی نے سوچا اور پھر فیصلہ کر دیا کہ وہ سچی بات بتائے گا۔ بولا۔

"جناب محمد نعیم میں میرے والد کا اثر و رسوخ ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔" وہ بولا۔

"جی۔" میں نے کہا۔

"تو آپ وہ محکمہ چھوڑنا کیوں چاہتے ہیں؟"

"میں ایسے محکمے میں نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ جہاں بلا واسطہ چلے بل بوتے پر ترقی حاصل نہ کر سکوں۔"

"کیوں۔" ڈائریکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کیا آپ کو معلوم ہے۔" ڈائریکٹر نے کہا" کہ یہ اسامی جس کے لیے آپ نے درخواست دی ہے مستقل نہیں۔"

"جی۔" وہ بولا۔

"اس میں پنشن نہیں۔"

"جی" وہ بولا۔

"آپ کی پندرہ سال کی نوکری بے کار جائے گی۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ایلی نے کہا۔

"معاف کیجئے گا۔" وہ بولا۔

"میں آپ کو یہ اسامی دے کر آپ کا نقصان نہیں کرنا چاہتا۔"

"معاف کیجئے گا" ایلی نے کہا۔

"میں فائدہ و نقصان میں بہتر سمجھتا ہوں۔"

"اچھا۔" ڈائریکٹر نے کہا۔ "تو آپ امتحان میں شامل ہو جائیے۔"

"امتحان۔" ایلی نے دوہرایا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔

"ہم انٹرویو لیں گے۔ اگر آپ پاس ہو گئے تو میں آپ کا کیس رکمنڈ کر دوں گا۔"

انٹرویو کے بعد ڈائریکٹر نے ایلی کو بلایا۔ اور ایک ٹائپ شدہ کاغذ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "یہ آفر ہے۔" وہ بولے۔ "اگر آپ کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ منظور ہے۔ تو آپ مجھ سے بات کر سکتے ہیں۔ تب جب آپ یہاں جوائن کرنے کے لیے آئیں۔"

"آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں بے حد شکرگزار ہوں۔" ایلی نے جذبے کی شدت سے اٹک اٹک کر کہا۔

"میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔" ڈائریکٹر نے کہا۔

"میں تو سمجھتا ہوں۔" ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

"آپ غلط سمجھتے ہیں۔"

"اتنے میں ایک چپڑاسی کچھ کاغذات لے کر آ گیا۔"

"ذرا ٹھہریے۔" ڈائریکٹر نے ایلی سے کہا۔

"تشریف رکھیے۔ ایک منٹ۔"

کاغذات پر دستخط کر کے وہ ایلی کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں نے آپ پر احسان نہیں کیا۔" وہ بولا۔ "ان بچوں پر احسان کیا ہے جنہیں آپ پڑھاتے ہیں۔" ایلی حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ بچوں کو پڑھانے کے لیے بے حد ناموزوں ہیں۔" وہ بولے۔ ایلی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہے۔

"یہ درست ہے۔" وہ بولا۔ "کہ آپ ان میں فکر کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ آپ ان میں تحقیق کی چاٹ پیدا کر دیتے ہیں۔"

"جی میں ______" وہ گھبرا کر بولا ______

"سن لیجئے۔ ڈائریکٹر نے کہا۔

ایلی خاموش ہو گیا۔

"لیکن آپ کی تعلیم ان کے لئے سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ ورنہ تمام دنیا حریف بن کر ان کے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔" وہ ہنس دیا۔

پھر مسکرا کر بولا۔ "آپ کی تعلیم کی وجہ سے میری زندگی میں بہت مشکلات پیدا ہوئیں۔ ہاں میری بیشتر مشکلات کی وجہ آپ ہیں آپ۔"

ایلی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

ڈائریکٹر بھی کھڑے ہو گئے۔ اس نے ایلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرا نام رام گوپال ہے۔ میں آپ کا شاگرد ہوں۔

ڈائریکٹر نے تپاک سے ایلی سے ہاتھ ملایا۔

ایلی کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔

"یہ بھی صحیح ہے۔" رام گوپال بولا۔ "میں نے آپ سے پڑھا بھی بہت کچھ ہے۔ بہت کچھ۔ خدا حافظ۔"

ایلی کے استعفیٰ پر ایک شور مچ گیا۔ لالہ جی نے جو ان کے ہیڈ ماسٹر تھے پنشنر ہو چکے تھے۔ وہ ایلی کو بار بار سمجھاتے کہ پندرہ برس کی نوکری کو یوں ٹھوکر مار کر چلے جانا عقل مندی نہیں۔ اساتذہ بھی حیران تھے۔ علی احمد نے تو فوراً ایک خط لکھا۔ "برخوردار ایسی حماقت نہ کرنا ورنہ زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ تمہیں مسٹر معروف سا افسر کہیں نہیں ملے گا۔ اس محکمے کو نہ چھوڑو۔ چونکہ محکمہ تعلیم کا وزیر بھی میرا پرانا لنگوٹیا ہے۔ ایسی آسانیاں تمہیں دستیاب نہ ہوں گی۔"

لیکن ایلی نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔

صرف رضی، رنگی اور دولی تھے جنہوں نے اس کی ہمت بندھائی۔

رضی نے کہا۔ "بھئی دانہ پانی کی بات ہے۔"

رنگی بولا۔ "یار میں بھی اس محکمے کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ لیکن آج تک بات نہیں بنی۔

وہاں جاؤ گے تو میرے لیے بھی کوشش کرنا۔"

"بڑا اچھا کیا تم نے۔" مانی بولا۔ "شاباش اپنا راستہ خود بناؤ۔ چاہے ناکامی ہی کیوں نہ ہو۔"

لاہور میں ایلی کی زندگی یکسر بدل گئی۔ محکمہ بدلنے کی وجہ سے ماضی کی تمام تلخیاں گویا اس کے نامہ اعمال سے دھل گئیں۔ محکمہ تعلیم میں اس کے افسران اور رفقائے کار کسی حد تک اس کے گزشتہ کارناموں سے واقف تھے۔ اس کی ہر بات کا مفہوم اس کی گزشتہ زندگی کے تار پود کے حوالے سے اخذ کیا جاتا تھا۔ اس کے خیالات اور جذبات بذاتِ خود کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔

اس محکمے میں وہ ماضی کے حوالے سے قطعی آزاد ہو گیا۔ اس کے علاوہ یہاں اس کے ہمکار رجعی خیالات اور کٹھ ملاؤں کے تمدن سے بے نیاز تھے اگرچہ وہ آزاد ہو کر سوچ نہ سکتے تھے لیکن آزاد خیالات کے خلاف ان میں تعصب نہ تھا محکمہ تعلیم کو چھوڑ کر ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ کیچڑ بھرے جوہڑ سے نکل کر دریا میں آ پہنچا تھا۔ وہاں روانی تھی وسعت تھی اور جمود نام کو نہ تھا۔

نئے محکمے میں آ کر چند ہی روز میں اس نے محسوس کیا جیسے وہ پرانا ایلی نہ تھا۔ جیسے بیتی ہوئی زندگی محض ایک خواب ہو۔

"میں نے کہا تھا۔" شہزاد مسکرائی۔ "تمہاری زندگی پھر سے شروع ہو گی۔" لاہور پہنچ کر اس نے پہلی مرتبہ شہزاد کو یاد کیا۔ شہزاد کی یاد اب اس کے ذہن میں گزشتہ تلخیوں سے بے تعلق تھی۔ جب بھی شہزاد کی یاد آتی تو وہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھتا۔ اور اس کے دل میں عجیب سی خوشی پیدا ہوتی۔

لاہور میں اس کا ماموں زاد بھائی رفیق تھا۔ بہن فرحت بھی وہیں تھی۔ چونکہ اس کا خاوند جمیل لاہور کے ایک دفتر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور حکومت کی وساطت سے انہیں دھو محلہ میں ایک مکان مل گیا تھا۔ جہاں وہ رہتے تھے۔ ایلی فرحت کے پاس

ٹھہرا تھا۔ اور ایک بار پھر سے بھرے گھر میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ فرحت نے ایک بڑا سا کمرہ ایلی اور راجرہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

راجرہ سے جب فرحت نے سنا کہ رنگی اور مانی ایلی کی شادی کے لئے کوئی رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ فرحت کو ایلی کی زندگی سے بے حد دلچسپی تھی۔ لیکن اس نے ایلی اور شہزاد کے تعلقات کو کبھی اچھی نگاہ سے نہ دیکھا تھا۔

ابھی ایلی کو لاہور آئے چند ایک روز ہی ہوئے تھے کہ مانی اور رنگی لاہور آ گئے۔ رنگی کے لئے لاہور ایک عظیم نعمت تھی۔ وہ وہاں آ کر بے حد خوش ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خوبصورت ماحول اس کے نزدیک سب سے بڑی نعمت تھی۔ لاہور میں جان بسی ہوئی تھی۔ رنگ تھا۔ شوخی تھی۔ اور رنگی کے لئے یہی بہشت تھا۔

دو ایک روز وہ اکٹھے سڑکوں پر گھومتے رہے۔ راگ ودیا کی باتیں کرتے رہے۔ پتلی اور شریکتی کے قصے دہراتے رہے۔ جب رنگی اور مانی جانے لگے تو دفعتاً رنگی بولا "ایلی تمہارے لئے ایک ایسی بیوی تلاش کی ہے۔ جس کا جواب نہیں۔ وہ تمام خصوصیات اس میں ہیں جن کی تمہیں اشد ضرورت ہے۔ شکل و صورت سے تو تم بے نیاز ہو۔ باقی رہی طبیعت تو جناب ایسی نیک لڑکی ہمارے قصبے میں تو ہے نہیں کوئی۔ اور اس کا باپ ایک ایماندار مرد ہے۔ اس قدر شدت کی نفاست شاید ہی کسی میں ہو۔ جو منہ سے کہہ دیا پتھر کی لکیر سمجھ لو۔ اور دیانتداری کی تو حد نہیں کوئی۔ بات کا پکا قول کا پورا اور رسمیت سے بیگانہ بالکل بیگانہ۔ وہ لوگ آ کر تمہیں دیکھیں گے جیسے عام طریقہ ہے ورنہ یہ بھی محض رسم ہے چونکہ لڑکی محبت کی بچپن کی سہیلی ہے وہ اسے ذاتی طور پر جانتی ہے۔ بہر حال بات پکی سمجھو۔

"دیکھو بھائی۔" ایلی نے کہا "چاہے جو جی چاہے کرو مگر میری مرضی کے متعلق کوئی بات چھپا کر نہ رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں کہیں ہم سے دھوکا کیا گیا۔"

"یہ بات تم ہم پر چھوڑ دو۔" مانی بولا۔

"نہیں یہ غلط ہے۔" ایلی نے کہا۔

"تم ہمارے رشتہ داروں اور برادری والوں کو نہیں جانتے۔" مانی نے کہا۔ "بے حد خفیف لوگ ہیں۔ پشت در پشت دوکانداری کرتے رہے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر روپیہ تک محدود ہے جس کے پاس روپیہ ہے وہ بڑا آدمی ہے۔ سب لکیر کے فقیر ہیں۔ ہر بات قابل قبول ہے جس میں سے رسم کی بو آتی ہو۔ نئی بات خود ہے۔ نیا چلن قابل تف ہے۔" مانی شدت میں نہ جانے کیا کہتا گیا۔ رنگی مسکرا رہا تھا۔

ایلی سوچ رہا تھا کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ جس قصبے نے رنگی نگہت اور مانی جیسے کردار پیدا کیے ہوں۔ وہ قصبہ اس طور پر رنگ سے خالی ہو یا زندگی سے محروم ہو۔ مانی بڑھا کر بات کر رہا تھا۔ چونکہ مانی میں توازن مفقود تھا۔ اس میں جذبہ تھا۔ خلوص تھا خودپسندی کی ہلکی ہلکی جھلک تھی اور بے پناہ جرأت تھی۔

شادی کے متعلق ایلی سب سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کا قائل نہ رہا تھا۔ زندگی میں بہت سی باتیں جو اس نے سوچ سمجھ کر کی تھیں ان کا انجام پچھتانا ہوا تھا۔ عورت کے متعلق تو اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ چاند کی طرح ایک مخصوص پہلو آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ ورنہ عورت میں کئی ایک پہلو ہیں۔ متبسم پہلو۔ متذبذب پہلو "مجھے کیا۔" اور وہ پہلو جس کے تحت شہزاد نے اس شادی کے متعلق کہا تھا۔ "نہیں میں اسے معاف نہیں کروں گی۔ میرے سامنے بلک بلک کر گھسٹ گھسٹ کر مرے۔"

عورت کو پرکھنا ایلی کے خیال کے مطابق ناممکن تھا۔ عورت میں یہ صلاحیت تھی کہ سال ہا سال تک ایک مخصوص پہلو پیش کرے وہ سالہا سال متبسم پہلو پیش کرتی تھی کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر وہ ضرورت محسوس کرے تو متبسم ہی دکھائی دے گی۔ اور جب وہ سمجھے کہ اب ضرورت نہیں رہی تو حالات کے تقاضے سے بے نیاز ہو کر گھورنا شروع کر دے گی۔ یا بے پروائی اور بے نیازی کا جامہ اوڑھ لے گی۔ اس لئے عورت کو جانچنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا

تھا یہ سمجھنے کا حق شادی کے بعد ہی ہوتا ہے۔ چاہے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں یا آنکھیں بند کر کے۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس نے یہ خواہش محسوس نہ کی تھی کہ ہونے والی بیوی کو ایک نگاہ دیکھ لے یا جائزہ لینے کی کوشش کر کے اس کے ذریعے معلومات حاصل کرے۔

تاٹن پور

تاٹن پور ایک پرانا قصبہ تھا۔ جو لاہور سے تقریباً ۔۔ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ تاٹن پور مغلوں کے زمانے میں آباد ہوا تھا۔ قصبے پر مغلوں کی چھاپ تھی۔ قصبے کے گرد چھوٹی اینٹ کی بنی ہوئی چار دیواری تھی۔ جس میں آٹھ دروازے کھلتے تھے۔ چار دیواری کے اندر تنگ و تاریک گلیوں اور چھوٹے چھوٹے تنگ گلی نما بازاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان تنگ گلیوں کے ارد گرد اونچی اونچی پرانے طرز کی عمارتیں تھیں حویلیاں تھیں۔ ادھر ککے زیوں کا احاطہ تھا ادھر سیدوں کا پرلی طرف دیونوں کا۔

قصبے کے شمال مغرب میں ہندوؤں کا سیٹھ کنبہ آباد تھا۔ جن کی وجہ سے تاٹن پور مشہور تھا۔ سیٹھوں کا یہ کنبہ تاٹن پور کا قدیم ترین کنبہ تھا۔ تاٹن پور کے گرد و نواح کے کھیت انہیں کی ملکیت تھے۔ سیٹھ حسین تھے۔ متحمل مزاج تھے اور دولت کی حفاظت کرنا جانتے تھے۔ سیٹھوں کے بعد تاٹن پور کے جو مسلم مشہور تھے وہ سب ویش تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ اور وہ قدیم زمانہ سے دکانداری کرتے آئے تھے۔ ان ویشوں کی کئی ایک قومیں تاٹن پور میں آباد تھیں۔ شالا کا پڑ تھے تاروڑ تھے بنگا تھے چالیہ تھے۔ تاٹن پور اور اس کے قریب کے قصبوں اور شہروں میں ان کی دوکانیں تھیں۔ جہاں وہ چھوٹے چھوٹے کاروبار کرتے۔ ان میں چند ایک لوگ ہندوستان کے دور دراز کے شہروں میں جا کر پنجاب کی مصنوعات بیچتے تھے۔ چند ایک وہ شہروں کے چکر لگاتے اور پھر تاٹن پور میں لوٹ آتے تا کہ اگلے چکر کے لیے اشیا فراہم کریں۔

ن میں سے کتنی کے لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ جنہوں نے کاروبار چھوڑ کر ملازمت
اختیار کر لی تھی ان کی تعداد بہت کم تھی۔

چاچا گوش کے ویشیوں کا سب سے بڑا گھرانا آصف تھا۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے
باوجود آصف صاحب فکر تھے۔ ان کے فکر میں انفرادیت تھی۔ مگر یہ انفرادیت
صرف فکر کی حد تک محدود نہ تھی۔ وہ سوچتے تھے اور اسے فوراً عمل میں لانے کے قائل
تھے۔ فکر کی اس عادت کی وجہ سے انہوں نے زندگی میں چند ایک اصول مرتب کیے
تھے۔ ان پر شدت سے پابند ہونے کے باوجود وہ اس بات کا احساس رکھتے تھے کہ
زندگی اصول سے زیادہ اہم ہے۔

ناگن پور میں لوگ آصف کی عزت کرتے تھے اور ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ ہندو
پنچ منتیں آصف کے پاس آ کر دیتے ولش اپنے جھگڑوں کے تصفیے کے لئے آصف کو
جج بنانے پر خوشی محسوس کرتے تھے۔ آصف کے اپنے گھر میں ان کے خیالات کا مذاق
اڑایا جاتا تھا۔ ان کی بیوی کو ان کی رائے مشورے یا فیصلے پر کبھی اعتماد نہ تھا۔ گھر میں
ہر بات پر انہیں جھاڑ جھپٹ ہوتی تھی۔ گو وہ ہر جھاڑ سننے کے عادی ہو چکے تھے
لیکن اس کے باوجود وہ اپنے خیال اور رائے پر قائم رہتے اور وہی کرتے تھے جو ان
کے خیال میں درست ہوتا۔

آصف نے زیادہ تر زندگی جنوبی ہندوستان کے ایک شہر میں گزاری تھی۔ جہاں
ان کا ایک عالی قسم کا ہوٹل تھا۔ جس میں بڑے بڑے اہل کار اور یورپین آ کر ٹھہرتے
تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ دوسروں کی بات غور سے سننے کے عادی ہو چکے تھے ان کی
طبیعت میں خلاف توقع تحمل تھا۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی وہ دمہ کی بیماری میں مبتلا
تھے۔ جو کافی شدت اختیار کر چکی تھی۔

تین بیٹوں کے علاوہ آصف کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جس کا نام بلند بخت تھا۔ بلند
بخت نے چند ایک جماعتوں تک مدرسے میں تعلیم پائی تھی اور پھر آصف نے اسے

مدرسے سے اٹھا لیا تھا چونکہ دستور کے مطابق تاشن پور کے لوگ بچیوں کو زیادہ پڑھانے کے قائل نہ تھے۔ صرف خود تعلیم کے حق میں تھے ممکن ہے ان کی بیگم نے زبردستی بلند بخت کو مکتب سے اٹھا لیا ہو۔

بلند بخت ابھی عنفوانِ شباب میں ہی تھی کہ اسے ایک قریب رشتہ دار کے بیٹے سے منسوب کر دیا گیا۔ اور جلد ہی بڑی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔

لڑکے نے دولہا بننے سے پہلے بار بار اپنے علاء الدین کو جتلایا تھا کہ اس کی شادی نہ کی جائے چونکہ وہ شادی کے قابل نہیں۔ لیکن علاء الدین نے اس کی بات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ لڑکا ویسے ہی ہچکچاتا ہے اس کے ذہن پر عورت کا ڈر حاوی ہے۔ آہستہ آہستہ مانوس ہو جائے گا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سامان کو دیکھ کر جو صرف جہیز کے مشتاق تھے لڑکا چاہے قابل ہو یا نہ ہو۔ سامان پر قبضہ جمانے کے تو وہ قابل تھے۔ لہٰذا انہوں نے لڑکے کی بات نہ سنی۔

بلند بخت شبِ عروسی میں دولہا کا انتظار کرتی رہی۔ دولہا کے والدین اسے ڈھونڈتے رہے۔ آخر بات کھل گئی کہ دولہا غائب ہے۔ بلند بخت نے سنا تو اسے ایک دھچکا لگا۔ اس کی حیات منجمد ہو گئی۔ نسائی تقاضوں کے راستے مسدود ہو گئے۔ نسیں ایک زبردست ہیجان سے ٹکرائیں اور حسیات کا وہ فیوز ہمیشہ کے لئے اڑ گیا۔ جو اس کی نسائی زندگی میں تحریک پیدا کرتا تھا۔

اگلے روز اس کے والدین بلند بخت کو اپنے گھر لے گئے۔

پہلے تو موہوم سی امید باقی تھی۔ کہ شاید دولہا کسی روز گھر واپس آ جائے پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ دھندلی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ سات سال گزر گئے۔

دیش لوگوں میں طلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان کے نزدیک طلاق کا لفظ گالی کے مترادف تھا۔ وہ اسے منہ پر لانے والا برادری میں ہمیشہ کے لئے اپنی عزت کھو دیتا تھا۔ لہٰذا بلند مترادف تھا۔ وہ اسے منہ پر لانے والا برادری میں ہمیشہ کے

سے اپنی عزت کھو دیتا تھا۔ لہٰذا بلند بخت کی دوسری شادی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

بلند بخت نگہت کی سہیلی تھی اور نگہت رنگی اور رمانی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے یہ شاید فطری طور پر ان پوری عورتوں سے ہٹ کر تھی۔ ساحرہ کی بات سن کر سب سے پہلے فوراً بلند بخت کا خیال آیا تھا۔ رنگی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اور رمانی عملی طور پر اس سلسلے میں کوشش کرنے کے لئے بے تاب ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مل کر برادری میں بات چلا دی۔ اور کچھ حیرت کچھ تعجب اور عورتوں کے ناک بھوں چڑھانے کے بعد بلند بخت کو طلاق ہو گئی ایک مختصر سی رسم کے بعد بلند بخت کا ایلی سے عقد ہو گیا۔ اور وہ ایلی کے گھر آ گئی۔ اور ایلی نے دیکھا کہ اس کے گھر ایک لاش پڑی ہے اور زندگی بھر اسے یہ لاش اٹھائے پھرنا ہے۔

بلند بخت کو دیکھ کر ایلی کو ایک دھچکا لگا۔

اگرچہ وہ اس بات پر مصر تھا کہ کسی نوجوان لڑکی سے اس کی شادی نہ کی جائے۔ بظاہر وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی بیوی حسین نہ ہو۔ رنگین نہ ہو۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ شدت بھری زندگی بسر کرنے کے بعد وہ تھک چکا تھا۔ اکتایا ہوا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش سکون و طمینان تھا۔ اس کے علاوہ اسے یقین تھا کہ وہ دوسروں کے لئے شادی کر رہا ہے۔ اگر اس کے گھر میں بیوی آ گئی تو ممکن ہے وہ اپنی بیوی میں اس حد تک کھو جائے کہ قریب ہی دوسرا بچہ کسی کی گود میں پڑا بلکتا رہے اور اسے خبر بھی نہ ہو کہ وہ بلک رہا ہے۔ رو رہا ہے۔ پریشان حال ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود بلند بخت کو دیکھ کر ایلی کو ایک دھچکا لگا۔

لیکن جلد ہی اس نے سوچ لیا کہ شاید یہی مناسب تھا کہ بلند بخت اس کی بیوی بنے۔ جیون ساتھی نہ بنے۔ ورنہ ایلی مارا جاتا۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ ضرور اس میں قدرت کا ہاتھ ہے۔

وقت یہ تھی کہ بلند بخت اس گزشتہ سانحے کی وجہ سے بالکل ہی مایوس ہو چکی تھی۔

بلند بخت کے خیالات بے حد پاکیزہ تھے لیکن یہ پاکیزگی رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کے شانوں پر سر نہیں بلکہ ایک پھوڑا تھا جس میں مسلسل درد رہتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ خاندان سے دور رہے۔ بلند بخت کی آمد پر ایلی نے ایک مکان کرائے پر لے لیا اور ایلی دونوں فرحت کا گھر چھوڑ کر اپنے گھر منتقل ہو گئے۔

مشمولات

ایلی کو سیاست سے قطعی طور پر اُچاٹ تھی۔ اخبار تو وہ پڑھتا تھا لیکن سیاسی خبروں سے متعلق سے دلچسپی نہ تھی۔ صرف سرخیاں پڑھ کر مطمئن ہو جاتا۔

جب ہندوستان کی آزادی کی آواز بلند ہوئی تو ایلی کو بے حد خوشی ہوئی تھی وہ چاہتا تھا کہ اس کا ملک آزاد ہو جائے۔ اور کوئی بیرونی طاقت اس ملک پر مسلط نہ رہے۔ ایلی کے دل میں ان مجاہدوں کے لئے احترام تھا جو آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ ہندوستان کے لیڈروں پر ناز کرتا تھا۔ مثلاً مہاتما گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو محمد علی جناح۔ اس کے باوجود اس نے کبھی کسی سیاسی مجلس میں حصہ نہ لیا تھا۔ اور نہ ہی ان محبوب لیڈروں کو کبھی دیکھا تھا۔ حالانکہ اس زمانے میں سیاسی بیداری بڑھ چکی تھی۔ اور لوگوں کے دلوں میں سیاسی جذبہ یوں لہریں لے رہا تھا کہ ذاتی مسائل بھی پس پشت پڑ چکے تھے۔

پاکستان کے قیام کا سوال ان دنوں پیش پیش تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی دھوم مچی ہوئی تھی یوپی کے مسلمان پاکستان کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے بیٹھے تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں علم و ادب کی جگہ سیاسیات کا ابال آیا ہوا تھا۔

لیکن ایلی اس جھگڑے سے بالکل بیگانہ تھا۔ وہ پاکستان کے حق میں نہ تھا۔ وہ پاکستان کے خلاف بھی نہ تھا۔ اس نے کبھی اس مسئلے کو اہمیت ہی نہ دی تھی۔ وہ چاہتا

تھا کہ ہندوستان کو آزادی مل جائے۔ اور لوگوں کی اور ملک کی اس میں بہتری ہے تو پاکستان کا قیام عمل میں آجائے۔ بہرحال وہ ہر اس بات کا طرفدار تھا۔ جو عوام اور ملک کی بہتری کے لئے تھی۔ لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ ملک کی بہتری کس بات میں ہے۔

پنجاب کے مسلمان پاکستان کے حق میں تھے۔ اس وجہ سے کبھی کبھار اس کے دل میں بھی پاکستان کے لئے جذبہ پیدا ہوتا۔ لیکن وہ جذبہ محض وقتی ہوتا۔ یہ کبھی کبھار بیٹھے بیٹھے اس کے روبرو دھرم سالہ کا سکول ابھرتا۔ چھٹی جماعت کا لڑکا رام لال اس کے سامنے کھڑا ہوتا۔ "رام لال مجھے ایک گلاس پانی دو۔" ایلی کہتا۔ اور رام لال کی گردن جھک جاتی۔ اور وہ چپ چاپ جوتوں کی طرف گھورتا رہتا۔ "رام لال۔" ایلی چلاتا۔ "تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔" "جی میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔" رام لال جواب دیتا۔ "بے وقوف لڑکے۔" ایلی ہنستا۔ "اگر تم میرے ہاتھ کا پانی پیو تو دھرم بھرشٹ ہوگا نا۔ اگر تم مجھے پانی لا دو تو تمہارا دھرم بھرشٹ ہو سکتا ہے۔" رام لال اسی طرح گردن جھکائے کہتا۔ "جی میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔"

پھر اس کے روبرو دھرم سالہ کا پڑوسی آ کھڑا ہوتا۔ "جی میرا نام رام دین ہے۔"

"رام دین؟"

"جی میں بھگوان کی دیا سے مسلمان ہوں۔"

"مسلمان۔"

"جی جی۔"

پھر ایلی کی نگاہ میں رام دین کی کٹیا ابھرتی۔ وہ چونکتا۔ وہ چبوترہ گوبر کا ڈھیر کارنس پر دھری ہوئی مورتیں۔

"جی میں مسلمان ہوں۔" رام دین چلاتا۔ اور پھر تمام ہندوستان کے مسلمان اس کے سامنے قطار باندھ کر کھڑے ہو کر چلاتے۔ "جی میں بھگوان کا ہوں۔ جی میں

اگر شکر اللہ ہوں۔جی میں غلام سرور ہوں۔ہم مسلمان ہیں۔" وہ چیختے۔" پاکستان زندہ باد پاکستان زندہ باد۔" اس کے دل میں کوئی نعرے لگاتا۔لیکن جلد ہی علی چونکتا۔" نہیں نہیں" وہ چیختا۔"اگر رام لال اس قدر تنگ خیال توقع ہوئے ہیں کہ کسی کو پانی پلانے سے ان کا دھرم بھرشٹ ہوجاتا ہے۔یا وہ بچے درمیان رہنے والے کے دکھے مسلمان کو مرید بنا دیتے ہیں۔تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوؤں کے خلاف بغض پال کر میں رام لال بن جاؤں۔نہیں نہیں وہ چیختا۔ان باتوں پر ہندوؤں کے خلاف تعصب پال لینا اچھا نہیں۔

اگرچہ اسلام کے اصولوں کا وہ مداح تھا اور فلسفہ مذہب کے مطابق اسلام کی عظمت کا قائل تھا۔لیکن یہ احساس محض ذہنی تھا۔جس کا عکس اس کے جذبات پر نہیں پڑتا تھا۔

ایک روز جب وہ لاہور کی مال روڈ پر گھوم رہا تھا تو دفعتاً ایک شور بلند ہوا۔وہ رک گیا۔مال روڈ پر چلنے والے سبھی لوگ چونک پڑے۔ہندو اور سکھوں کا ایک جم غفیر مال روڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں جنہیں وہ لہرا رہے تھے۔عورتیں سر پیٹ رہی تھیں۔بین کر رہی تھیں۔وہ سب اسمبلی چیمبر کی طرف بھاگ رہے تھے اور پاکستان مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔

اس جلوس میں ایک شدت تھی اشتعال تھا۔ایک وحشت تھی جس میں تشدد کی دھمکی تھی لوگ حیرت سے اس دوڑتے ہوئے تشدد بھرے مجمع کو دیکھ رہے تھے۔پھر دیکھتے دیکھتے لوگوں کے دلوں میں ایک خوف ابھرا اور وہ اپنے اپنے گھر کی طرف بھاگے۔

علی چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔

" جی صاحب میری بیٹی تو ہندوؤں کے محلے میں رہتی ہے۔" کوئی اس کے قریب کہہ رہا تھا۔

" یہ تو جلس میں چنگاری ڈالنے والی بات ہے۔"

"ظاہر ہے کہ سب کچھ پلان کے مطابق ہو رہا ہے۔"

"نہ جانے کس وقت خون کی ندیاں چل نکلیں۔"

"بھئی میں جا کر بیٹی کی خبر لیتا ہوں۔ حالات نازک ہیں۔"

حالات نازک ہیں۔ حالات نازک ہیں۔ ایلی کے سر پر ہتھوڑے سے چل رہے تھے دفعتاً اسے فرحت کا خیال آیا۔ ارے فرحت بھی تو مادھو پورہ میں رہتی ہے جہاں ہندوؤں کا گڑھ ہے وہ بے سوچے سمجھے مادھو پورہ کی طرف بھاگا۔

مادھو پورے کے بڑے بازار میں لوگ یہاں وہاں گروہوں میں کھڑے تھے ان کے تیور اچھے نہ تھے۔

پیشانیوں سے تشدد بھرے ارادے ظاہر ہو رہے تھے گزرتے جاتے کو مخدوش اور مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایلی آنکھ بچا کر چوبارے پر چڑھ گیا۔

"چلو فرحت۔" وہ بولا "یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں چلو میرے گھر چلو۔"

ابھی وہ تیار بھی نہ ہوئے تھے کہ نیچے بازار میں شور مچ گیا۔ پکڑو۔ پکڑو۔ جانے نہ پائے۔ انہوں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ بازار میں ایک تانگہ کھڑا تھا زمین پر تانگے والے کی لاش تڑپ رہی تھی۔۔ پاس ہی ایک ہندو بڑھیا چلا رہی تھی۔ "اے تمہیں بھگوان کا ڈر نہیں کیا بیچارا مجھے بچا بچا کر لایا تھا۔ کہتا تھا ماں جی میں لے جاتا ہوں چاہے میری جان جائے پر تم پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے گا۔ ہائے جا مویو یہ کیا کیا تم نے۔" وہ رو رہی تھی بین کر رہی تھی۔

فرحت گھبرا گئی جمیل باہر دورہ پر گیا ہوا تھا۔ گھر میں صرف عورتیں اور بچیاں تھیں۔ اکیلا ایلی انہیں سنبھال نہیں سکتا تھا۔ ایلی کا اپنا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ نہ جانے نہیں جانا چاہئے یا نہیں ممکن ہے وہ یہیں گھر میں محفوظ ہوں۔ لیکن شام پڑ چکی تھی۔ اور پھر رات کے وقت نہ جانے کیا ہو۔ اسے اسی وقت ایک فیصلہ کرنا تھا۔

عین اس وقت دروازہ بجا۔

ہوتا۔"

"یہ مسلمان ہے یہ۔" ایک بولا۔

"نہیں نہیں بچنے کے لیے اللہ کا نام لیتا ہے۔" دوسرا بولا۔

"کلمہ پڑھ" ایک چلانے لگا۔

"اللہ کا نام نہ لیتا تو اب تک ڈھیر ہوتا۔ میرا ہاتھ رک گیا۔" ایک غنڈہ بولا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کمانی دار چاقو ہے۔

اس روز میں نے محسوس کیا کہ وہ مسلمان تھا۔ سیاسی خیالات کا سوال نہ تھا۔ مسلم لیگی اور کانگریسی کا سوال نہ تھا۔ یہ سوال نہ تھا کہ آیا وہ اسلام سے واقف ہے۔ آیا وہ شریعت کا پابند ہے یہ سوال نہ تھا کہ آیا رام دین سا مسلمان ہے یا محمد علی سا۔ سوال صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو۔ اس روز جب وہ ماتو پورہ سے باہر نکلے تھے تو ہندوؤں کے گروہوں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ آیا وہ نیشنلسٹ نقطہ نظر کے حامل تھے یا مسلم لیگی۔ آیا وہ پاکستان کے حق میں تھے یا پاکستان قیام کے خلاف تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ صرف مسلمان تھے۔ تانگے والے کے پیٹ میں چھرا گھونپتے وقت بھی ہندو بڑھیا کے چلانے کے باوجود انہیں یہ احساس نہ ہوا تھا کہ تانگے والا ہندو ماتاجی کو مسلمان غنڈوں سے بچا بچا کر ماتو پورہ میں لایا تھا۔ اور اس نے ماتاجی کو یقین دلایا تھا کہ وہ ماتاجی کو بچانے کے لئے اپنی جان تک دے دے گا۔ چاہے وہ ماتاجی کو بچا کر لایا تھا۔ چاہے ہندوؤں کی خدمت کی تھی ____ لیکن وہ مسلمان تھا اس لیے انہوں نے اس کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ مسلمان ہی نہیں وہ بذات خود پاکستان ہے۔ چاہے وہ پاکستان کے حق میں تھا۔ یا خلاف چاہے وہ اسلام سے بیگانہ تھا چاہے وہ مذہبی تعصب سے بے نیاز تھا۔ وہ بذات خود پاکستان تھا۔ اس کے دل میں کوئی چلا رہا تھا پاکستان زندہ باد۔

باب

ایلی کے تمام تر خیالات درہم برہم ہو رہے تھے۔ اس کا ذہن گویا ازسرِ نو ترتیب پا رہا تھا۔ پرانے خیالات کی اینٹیں اکھڑی جا رہی تھیں۔ نئی اینٹیں نہ جانے کہاں سے آ گئی تھیں اور اس کے ذہن میں آپ ہی آپ لگی جا رہی تھیں۔

اسی روز شام کو دفتر سے آتے ہوئے وہ انجانے میں انارکلی کی طرف گھوم گیا۔ حالانکہ اسے ادھر کوئی کام نہ تھا۔ اور ان دنوں بے کار گھومنے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا چونکہ شام میں چھرا بازی کی وارداتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور ادھر ادھر گھومنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

کچھ دیر وہ انارکلی میں گھومتا رہا پھر سرکلر روڈ کی طرف چل پڑا اور آخر کار اس نے دیکھا کہ وہ داتا صاحب کے مزار کے باہر کھڑا ہے۔

داتا کے مزار پر وہ کئی مرتبہ گیا تھا چند بار وہ مزار کے اندر بھی داخل ہوا تھا لیکن جب وہ اندر جاتا تو اس کی توجہ ان عورتوں کی طرف منعطف ہو جاتی جو ان گنت تعداد میں داتا دربار میں حاضر ہوتی تھیں۔ اور وہاں پہنچ کر اپنی نمائش کرنے کے خیال سے ادھر ادھر گھوما کرتی تھیں ہیرا منڈی کی طوائفیں ان دنوں داتا کی بڑی معتقد تھیں۔ کیوں نہ ہوتیں۔ وہاں جانے سے ان کا حلقہ احباب وسیع تر ہوتا تھا۔

یہ درست ہے کہ ایلی عورتوں کو دیکھنے کی غرض سے وہاں کبھی نہ گیا تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اسے عورتوں کے علاوہ کچھ وہاں ملنگ تھے جو طوائف کی طرح اپنی نمائش کرنے میں مصروف رہتے تھے مزار کی جالی کے گرد کھڑے لوگوں کو ہاتھ اٹھائے دیکھ کر ایلی کے ہونٹ نفرت سے بھنچ جاتے ضعیف الاعتقاد لوگ۔!

اس روز داتا صاحب کے مزار کے باہر اس کے خیالات کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔

پگ بابا سامنے محراب کے نیچے کھڑا تھا۔ ”کیا تمہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔“ وہ چلا رہا تھا۔ ”سب کچھ کیا سب کچھ کیا۔ کیا نہیں کیا۔ اور تمہیں داتا کے قدموں میں لا کھڑا

"تم یہاں کیسے؟" علی نے پوچھا۔

"میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔" وہ بولا۔ "بڑے دفتر میں۔"

"اچھا۔"

"اب میرے ساتھ چلو۔" وہ بولا۔

"ارے کہاں؟"

"بس آ جاؤ۔ آج تو شاید وہ مل جائے۔" ناظم بولا۔

"کون مل جائے؟"

"بھئی وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

"کون انتظار کر رہی ہے۔"

"تم آؤ تو۔" وہ بولا۔

"پھر بھی۔" علی نے اس کی منت کی۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ لیکن کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"بھئی وہ ندھرے فلم کمپنی کی مالک ہے۔"

"ارے اسے مجھ سے کیا کام؟"

"میں نے کہا تھا اس معاملے میں میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ بہت میرا ایک دوست ہے علی۔"

"تو اس نے کہا مجھے اس سے ملا دو۔"

علی حیران تھا ناظم کیسی باتیں کر رہا ہے۔

"اب اس سے بات کر لو چل کر۔" ناظم مسکرایا۔

"لیکن کس سلسلے میں۔" علی نے چڑ کر کہا۔

"بھئی اسے نئی فلم کے لیے ایک آئیڈیا چاہیے۔" وہ بولا۔

"آئیڈیا۔" علی کا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا۔

ناظم زیدی اسے بریگنزا ہوٹل میں لے گیا۔ جہاں پریتماں ٹھہری تھی۔ انہوں نے اندر اپنا کارڈ بھیجا اور انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد پریتماں نے انہیں اندر بلا لیا۔

وہ ایک بنی سنوری ہوئی عیار عورت تھی۔ جیسے چینی کی گڑیا ہو۔ ان کے روبرو بیٹھے ہوئے وہ فلمی ستارے کی مانند کم عمر دکھائی دیتی تھی۔ عورت زیادہ علی کی طرف دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھر آیا۔ جس میں طنز کی جھلک تھی۔

"آپ یہاں صحافی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" علی نے جواب دیا۔

"کیا آپ کو فلم سے دلچسپی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"دیکھتا ہوں۔" وہ بولا۔ "صرف۔"

"فلم سازی سے واقفیت ہے کیا؟" وہ بولی۔

"جی نہیں۔"

"فلمی کہانی لکھی ہے کبھی؟"

"جی نہیں۔"

"ناظم صاحب آپ کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔" پریتماں طنزیہ انداز سے مسکرا دی۔

"ان کا حسن ظن ہے۔"

ناظم نے غصے سے بھری نگاہ ڈالی۔

آئیڈیا

"مجھے ایک آئیڈیا کی تلاش ہے۔" پریتماں بولی۔

"جی۔" وہ بولا۔

"ممکن ہے آپ میری مدد کر سکیں۔"

"اس وقت شاید یہ ممکن نہ ہو۔" علی نے جواب دیا۔

"کیوں" وہ بولی۔ "اس کی وجہ ہے۔"

"اچھا۔" وہ بولی۔ "گزشتہ دو روز سے میں چار ایک صاحب سے ملی ہوں لیکن بات نہیں بنی۔"

"کیا وہ لوگ آپ سے ملے تھے" علی نے کہا۔

"ہاں ہاں وہ مجھ سے ملے تھے۔"

"مگر وہ آپ کو آئیڈیا نہیں دے سکے؟"

"بالکل نہیں دے سکے۔"

"وجہ ظاہر ہے" علی نے کہا۔

"کیا مطلب" وہ بولی۔ "میں سمجھی نہیں۔"

"دیکھئے شریمتی" علی نے کہا۔ "آپ موجود ہوں تو کوئی دوسرا آئیڈیا نہیں آتا۔"

پرنیتا کے چہرے پر رنگ پھیل گیا۔ ایک چمک لہرائی۔ "کیا مطلب؟" وہ بولی۔

"مطلب یہ" علی نے کہا کہ "آپ مرکز بن جاتی ہیں۔"

"عجیب بات کی ہے آپ نے۔" وہ مسکرائی اور پہلی مرتبہ طنز و تحقیر کے بغیر اس کی طرف دیکھا۔

"دراصل" وہ بولی۔ "مجھے اپنے نئے فلم کے لئے ایک آئیڈیا چاہئے۔"

"کس قسم کا آئیڈیا"

"میں عورت اور مرد کی زندگی کا کمپیریزن کرنا چاہتی ہوں۔"

"آپ کا مطلب ہے موازنہ" ناظم نے کہا۔

"ہاں ہاں" وہ بولی ____ "موازنہ"

"تو کیجیے۔" میں نے کہا۔ "آئیڈیا تو آپ کے پاس موجود ہے۔ آئیڈیا تو آپ ہی کا ہو۔"

اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ "لیکن کس طریقے سے پیش کیا جائے؟"

"اس میں تو کوئی مشکل نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"مثلاً۔" وہ بولی۔

"مثلاً" ایک ساعت کے لئے اس نے توقف کیا۔ "دنیا میں تبدیلی جنس کے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک لڑکی کے خیالات اور جذبات پیش کیجیے۔ پھر لڑکی کی جنس تبدیل کر دیجیے اور بحیثیت مرد اس کے خیالات اور جذبات پیش کیجیے۔"

"واہ واہ، ایکسیلنٹ۔" وہ اچھل پڑی۔ "واہ آصفی صاحب۔"

ناظم نے تعریفی انداز سے ایلی کی طرف دیکھا۔

"ایک صورت اور بھی ہے۔" ایلی بولا۔

"کہئے۔" وہ پھر سے بیٹھ گئی۔

"ایک ڈاکٹر تبدیلی جنس کا راز پا لیتا ہے۔ پھر وہ باری باری عورت اور مرد بن کر جیتا ہے۔ تجربے ______ اس طرح موازنہ بہتر ہوگا۔"

"بہت خوب۔" وہ بولی۔

"پھر اسے ایک مشکل میں ڈال دیجیے۔ اور اسے فیصلہ کرنا پڑے کہ آیا اسے ہمیشہ کے لئے عورت بن کر جینا ہے یا مرد۔"

"ایکسیلنٹ۔" وہ مسکرائی۔

اس کے بعد دیر تک وہ بیٹھے چائے پیتے رہے۔

چائے کے دوران میں پرستان نے اپنے بیگ میں سے ایک فارم نکالا۔ اس کے نیچے دستخط کئے اور ایلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ آفر ہے۔" وہ بولی۔ "جب بھی آپ چاہیں میرے سٹوڈیو میں آ جائیں۔ فی
حال میں آپ کو پانچ سو روپیہ ماہوار دے سکتی ہوں۔"

ناظم خوشی سے جھوم اٹھا۔

"میری رائے مانیے تو یہ آفر منظور کر لیجیے۔" پرستاں نے کہا۔ "آپ کی آمد کا
کرایہ میرے ذمے رہا۔" اس نے سو سو کے پانچ نوٹ بٹوے سے نکال کر اس کے
سامنے رکھ دیے۔

"جب بھی آپ کا جی چاہے تو آ جائیے۔" وہ نہایت دلنواز انداز سے مسکرائی۔
"ہم آپ کا انتظار کریں گے۔"

پرستان کی آفر نے ایلی کی زندگی میں ہلچل پیدا کر دی۔ اسے یہ خیال بھی نہ تھا کہ
فلم میں کام کرنے کا موقع ملے گا۔ پانچ سو۔ اسے یقین نہیں آتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا
تھا کہ وہ ملاقات محض ایک خواب تھی۔ ابھی اس کی آنکھ کھلے گی اور وہ دیکھے گا کہ وہ
کاغذ جو پرستان نے اسے دیا تھا ایک سادہ ورق ہے۔

ناظم اسے کہہ رہا تھا:

"تمہیں جانا چاہیے۔ فوراً چلے جانا چاہیے۔ بمبئی کے سٹوڈیو میں کام کرنے کا
چانس ہاتھ سے کھونا عقلمندی نہیں۔"

مانی اس کے ساتھ جانے پر تیار تھا۔ وہ یونٹ کی نوکری سے استعفیٰ دے چکا تھا
چونکہ اسے فرعلی کی بیگم اور بیٹیوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔

مانی نے ایک سکیم مرتب کر لی تھی۔ ایک ناشر سے معاملہ طے کر رہا تھا۔ کہ بمبئی جا کر
وہ علمی بنیاد پر ایک فلمی رسالہ جاری کرے گا۔

بلند بخت اس آفر اور اس کے نتائج سے متعلق بے پروا تھی۔ اسے احساس نہ تھا
کہ اس آفر کا مطلب کیا ہے؟

ہاجرہ خوش تھی "تم وہاں چلے جاؤ۔ سنا ہے بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ اگر کام چل نکلا

تو بڑی تنخواہ پاؤ گے۔"

ایلی تیار ہو گیا۔

اس نے بلند بخت کو امین پور بھیج دیا۔ ہاجرہ اور اماں کو علی پور چھوڑا۔ ان دنوں تقسیم کی بات زبان زد خلق تھی۔ پنجاب کے مسلمانوں کو خدشہ تھا کہ کہیں لاہور ہندوستان کا حصہ نہ بن جائے کیونکہ علی پور ضلع گورداسپور میں واقع تھا اور گورداسپور میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس لئے علی پور ایک محفوظ مقام تھا۔ ہاجرہ اور اماں کو علی پور چھوڑنے کے بعد وہ لاہور پہنچا اور اپنی اسامی سے استعفے دے کر ایلی کو ساتھ لے کر بمبئی روانہ ہو گیا۔

بمبئی

بمبئی کو دیکھ کر ایلی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنا بڑا اتنا خوبصورت شہر اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ چند روز وہ بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھائے ماڈرن سربلک عورتوں کو دیکھتا رہا۔ عورتوں کی عظمت، سمندر کی وسعت اور بمبئی کے حسن کو دیکھ کر اس کی اپنی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بے حد حقیر سمجھ رہا تھا۔ [illegible] کو ریڈیو دینے سے جو اس میں خود اعتمادی اور فخر پیدا ہوئے تھے، بمبئی پہنچ کر صابون کے بلبلوں کی طرح اڑ گئے۔

دوسرے روز شام کے وقت جب وہ میرین ڈرائیو کے قریب ایک باغیچہ میں بنچ پر بیٹھا ہوا تھا تو دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے اس کے روبرو حاجی صاحب کھڑے تھے۔ ان کا سر ہل رہا تھا۔ آنکھیں روشن تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"یہی بنچ تھا وہ۔" وہ بولے۔

"بنچ" ایلی نے دہرایا۔

"اسی بنچ پر بیٹھے تھے ہم۔" وہ مسکرائے۔

"ایلی کو یاد آگیا ــــــ "ہاں جب سرمہ لگا کر وہ گھر سے نکلے تھے تو

ان دنوں وہ بمبئی میں مقیم تھے۔

یہ کہہ کر حاجی صاحب اس کے قریب آ بیٹھے۔ انہوں نے مسکرا کر ایک راہ گیر حسینہ کی طرف دیکھا۔ وہ حسینہ ان کے قریب آ بیٹھی۔ وہ دیوانہ وار حاجی صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

پھر ایک اور طرحدار عورت وہاں آ بیٹھی۔ پھر ایک میم آ گئی۔ وہ تینوں حاجی صاحب کی طرف یوں دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اپنا آپ ان کی بھینٹ چڑھا رہی ہوں۔

پھر وہ اٹھ بیٹھے اور ایلی کے روبرو آ کھڑے ہوئے

"بیکار ہے۔" وہ بولے۔ "بیکار۔ سب بیکار ہے۔"

انہوں نے نفرت سے عورتوں کی طرف دیکھا اور چل پڑے۔ ایلی چونکا۔ اس نے گردوپیش پر نگاہ دوڑائی۔

"بے کار ہے۔ کھوکھلے۔" حاجی صاحب نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

ایلی نے پھر ان خوبصورت عمارتوں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ تلے گتے کے رنگدار ڈبے نیچے اوپر سجا کر رکھے ہوئے تھے۔ سڑک پر چلتی ہوئی خوبصورت عورتیں گویا کپڑے کی دکانوں کی شو ونڈوز سے بھاگی ہوئی پتلیاں تھیں۔

اس نے سمندر کی طرف نگاہ دوڑائی۔

سمندر نے بڑھ کر اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

سامنے مغرب میں افق پر ایک روشن ٹوپی ابھر رہی تھی۔

اس روز جب وہ رات کو چائے قیام پر پہنچا تو وہ سوچ رہا تھا۔ حاجی صاحب کے خیال نے آ کر اس کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ عجیب بات تھی۔ اس عظیم الشان شہر کو اور ان خوبصورت عورتوں کو بدل دیا تھا۔ یہ کیا جادو ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا نقطۂ نظر انسان کے اپنے بس کی بات نہیں۔ یا یہ ایک عام سا آدمی تھا

طاقت رکھتی ہے کہ وہ کسی کے زاویہ نظر کو بدل کر رکھ دے۔ زندگی بھر تنکے تنکے چن کر جو خوشیاں بنایا تھا اسے ایک نگاہ سے تاراج کر دے۔ یہ کیسی طاقت تھی۔ علی سوچ رہا تھا۔

حاجی صاحب نے اپنا کاروبار جس کی شاخیں کلکتہ، بمبئی اور دلی میں تھیں ایک قلم چھوڑ دیا تھا۔ آخر کیوں۔ کیا یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا یا ایسے ہی کسی مرد خدا نے ان کا زاویہ نظر بدل دیا تھا؟

علی کو اس سوال کا کوئی جواب نہ سوجھتا تھا۔ شاید ان عالموں کے پاس اس کا جواب تھا ہی نہیں۔ جن کے علم و فکر پر اس نے اپنے ذہنی نظریوں کی بنیاد استوار کی تھی۔ برٹرنڈ رسل کھڑا سوچ رہا تھا۔

دلشاد مسکرایا۔

"بچہ روتا ہو،" وہ بولا۔ "تو اس کی توجہ کسی اور طرف کر دو۔ وہ خاموش ہو جائے گا۔"

دستوفسکی مسکرا رہا تھا۔ سبھی بچے ہیں۔

دستوفسکی کہہ رہا تھا: "اگر انسان میں بچے کا عنصر نہ ہو تو وہ عفریت بن کر رہ جائے۔"

علی سوچ رہا تھا کہ کیا وہ سبھی بچے تھے۔ کیا نقطہ نظر اور زاویہ نگاہ قدرت کی دین تھی۔ کیا زاویہ نگاہ میں معمولی تبدیلی اتنا عظیم فرق پیدا کر سکتی تھی۔ اس کے روبرو پاگل بابا کھڑا چلا رہا تھا: "میں کون ہوں۔ کوئی بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔"

علی کے دل میں عجیب و غریب خیالات تھے۔ کسی وقت تو اس کی وحشت اس حد تک بڑھ جاتی کہ وہ خود کو کائنات کا محور سمجھنے لگتا۔ پھر وہ سوچ میں پڑ جاتا۔ کیا میں پاگل ہو رہا ہوں۔ اس خیال پر وہ بالکل گھبرا جاتا۔

بمبئی میں علی کے دھندلکے میں صرف مائی دھوپ کی ایک شعاع تھی۔ مائی میں

زندگی تھی۔ چمک تھی۔ جوش تھا۔ شوق تھا۔ اس کے نقطۂ نظر میں صحت تھی۔ بے پروائی تھی۔

وہ بمبئی کو شوق سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ میں خوبصورت عورتیں سٹے کے ڈبے نہ تھے حسین عورتیں درزیوں کے ماڈل نہ تھے۔ اس کی نگاہ میں عورتیں عورتیں تھیں اور اس قدر حسین بھی نہ تھیں کہ انہیں دیکھ کر وہ اپنی حیثیت کھو دیتا۔ حسین عورتیں خوب تھیں۔ اچھی خاصی تھیں ___ اس قابل تھیں کہ ان سے دل بہلایا جا سکے۔

مانی جوان تھا۔ اس کی طبیعت میں بلا کی رنگینی تھی۔ وہ اپنی حیثیت کو کمتر نہیں سمجھتا تھا اور عملی طور پر کچھ کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس میں جھجک نہ تھی۔ ایلی بھی جوانی سے واقف نہ ہوا تھا۔ احساس کمتری کا مارا ہوا۔ زندگی کی راہ پر تھکا ہارا ہوا۔ گزشتہ تلخیوں کی وجہ سے اس کی طبیعت ڈر اور گھبراہٹوں سے اٹی پڑی تھی۔ اس کے جذبات اور ذہن میں قطعی طور پر ہم آہنگی نہ تھی۔

مانی اور ایلی کو بمبئی میں رہنے کے لئے ایک ایسی جگہ ملی جہاں شاعر اور مصنف رہتے تھے۔ ایلی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسے ادیبوں کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔ وہ عجیب لوگ تھے۔ بات کرنے سے پہلے سوچتے نہ تھے۔ بات کرنے کے بعد بھی انہوں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ اس بات کا کیا اثر ہوا ہے۔ وہ ردعمل سے بے نیاز تھے۔ انہیں یہ خیال نہ تھا کہ دوسرا کیا کہے گا۔ کیا سوچے گا۔ کیا اسے بات بری لگے گی۔ وہ دوسروں کے احساسات سے بیگانہ تھے۔ دل کی بات کو چھپانے کے قائل نہ تھے۔ وہ خود شعوری سے بیگانہ تھے۔ ایلی نے محسوس کیا کہ وہ زندگی سے ہم آہنگ ہیں۔ ان میں بہاؤ ہے۔ رکاوٹ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ خود پسند ہیں۔ اپنی اہمیت کے چراغ جلانے کے شوقین ہیں اور دنیا کو اپنے مقابلے میں ہیچ سمجھتے ہیں۔

ان دنوں بمبئی میں بھی ہندو مسلم فسادات جوبن پر تھے۔ چھرا گھونپنے کی وارداتیں عام تھیں۔ اس کے علاوہ آتش زدگی کی وارداتیں بھی ہوتی تھیں۔ مسلمان اور ہندو علاقوں میں علانیہ وارداتیں ہوتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی سول لائنز کے علاقے میں بھی کوئی واردات ہو جاتی اور کچھ دیر کے لیے وہ علاقہ ویران دکھائی دیتا۔ پھر جلد ہی لوگ اسے بھول جاتے اور پھر سے آمد و رفت شروع ہو جاتی۔

بیلی خوف کے مارے کبھی ہندو علاقوں میں نہیں گیا تھا۔ سول لائنز میں گھومتے ہوئے بھی اس پر خوف مسلط رہتا۔ لیکن مانی بے نیاز تھا۔ اس نے چلتے ہوئے کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں چلے جاتا۔ چلتے ہوئے کوئی گیت گنگناتا رہتا۔ بیلی کو اس کی بے پروائی پر غصہ آ جاتا اور وہ ہر وقت مانی سے بحث کرتا۔ اسے گھورتا۔

ابھی انہیں بمبئی پہنچے میں دو ماہ ہی گزرے تھے کہ پرستان کے نگار خانے کے دروازے پر چار ایک وارداتیں ہو گئیں۔ غنڈوں نے دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ کہ وہ نگار خانے کو آگ لگا دیں گے چونکہ پرستان کا خاندان مسلمان تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نگار خانہ بند کر دیا گیا۔

اس کے بعد مانی اور بیلی کی تمام تر توجہ فلمی پرچے کی طرف مبذول ہو گئی۔ جو وہ شائع کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ مانی انٹرویوز میں مصروف تھا چونکہ وہ بے دھڑک ہر علاقے میں جا سکتا تھا اور لوگوں سے مل سکتا تھا۔ اس سلسلے میں بیلی کا خوف معدوم تھا۔

یونہی چھ مہینے گزر گئے۔

ریڈیو پاکستان

اگست سینتالیس میں مانی کے پبلشر نے انہیں بلا بھیجا تاکہ وہ چند امور کا تصفیہ کر جائیں۔ اس بلاوے پر بیلی مسرور تھا چونکہ اس کا جی چاہتا تھا کہ ماں سے ملے۔

سے خیال تھا کہ ماں اس کی غیر حاضری پر متعجب ہو گا۔ سوچتا تھا کہ پہلے ابو چلے گئے۔
پھر امی چلی گئیں اور بوا آ گیا۔ اور اب دونوں نہ جانے کیوں اسے چھوڑ کر چلے گئے
ہیں۔ مانی نثر و یوز کے چکر میں ایسا پھنسا تھا کہ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ لاہور
جائے۔ اسے فلمی زندگی سے بے حد دلچسپی تھی۔ فلمی ستاروں، ناقدوں اور فنکاروں
سے مل جل کر اس نے اپنی ایک حیثیت پیدا کر لی تھی۔ اس لیے مانی ایلی کے ساتھ
لاہور جانے پر رضامند نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایلی لاہور جا کر بات چیت طے کر لے۔
جب تک وہ خود بمبئی میں کام جاری رکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی لاہور آ گیا۔

ابھی ایلی نے لاہور میں قدم رکھا ہی تھا کہ لاہور اور امرتسر کے درمیان آمد و رفت
کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ گاڑیوں کی آمد و رفت ختم ہو گئی۔ بسوں کا چلنا موقوف ہو گیا۔

ایلی نے اس خبر کو کوئی خصوصی پریشانی محسوس نہ کی۔ ماجرہ، فرحت اور علی احمد
کے کنبے کے تمام افراد علی پور میں محفوظ تھے اور علی پور محفوظ ترین مقام تھا بجز لاہور
کے متعلق مسلمان پریشان تھے اور ریڈ کلف ایوارڈ کا بے تابی سے انتظار کر رہے
تھے۔

لاہور شہر میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ سڑکیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے
گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ رات کے وقت گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتیں اور
پھر موت کی سی خاموشی چھا جاتی۔ پھر کسی مجمع کا شور بلند ہوتا۔ لوگ چنگھاڑتے
چلاتے چیختے اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ صبح سڑکوں پر یہاں وہاں لاشیں دکھائی دیتیں
۔ انہیں دیکھ کر راہگیر اپنے قدم اور تیز کر دیتے تھے۔ سپاہی واردات کو اپنی آنکھوں
سے دیکھ کر منہ موڑ لیتے جیسے انہیں علم ہی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کی بے تابی بڑھ رہی تھی۔ بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ ۱۴ اگست کا دن قریب
آ رہا تھا۔ اس روز پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا تھا اور ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان ہونے والا
تھا۔

اس شہر پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بازار سنسان پڑے تھے۔ سڑکیں ویران تھیں۔ لوگ گھروں میں سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ بازاروں میں مسلح فوج ہاتھوں میں مشین گنیں لیے گھوم رہی تھی۔ سڑکوں پر فوجی ٹرک کھڑے تھے۔

علی ریڈیو کھول کر بیٹھا تھا۔

گھڑی نے بارہ بجا دیے۔ علی کا دل دھک سے رہ گیا۔ بارہ بجے اعلان ہونے والا تھا۔

آج وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اعلان اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہو۔ جیسے اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ مذہبی تعصب سے بلند و بالا ہے۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ قیام پاکستان سے بیگانہ ہے۔ وہ ہندوستانی عوام کی بہتری کے فلسفے کو فراموش کر چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ بذات خود پاکستان ہے اور اس روز حدود طے ہونے والی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ ایک بادشاہ ہو اور پاکستان کے قیام کا اعلان دراصل اس کی رسم تاجپوشی کا اعلان تھا۔ اس روز سے معلوم ہونا تھا کہ اس کی قلمرو کہاں سے کہاں تک ہوگی۔ لیکن وہ خوش نہ تھا۔ ایک انجانی ڈر اور پریشانی اس پر مسلط تھی جیسے اسے یقین نہ ہو کہ اس کی قلمرو اسے مل جائے گی۔ وہ مضطرب تھا۔ بے حد مضطرب۔

دفعتاً حاجی صاحب اس کے روبرو آ کھڑے ہوئے۔ ان کی گردن ہل رہی تھی۔

"وقت آ گیا۔" وہ مسکرائے۔ "انشاء اللہ۔" وہ بولے۔

یکایک وہ چلانے لگا "وہی کرنے والا ہے۔ وہی کرتا ہے۔ اسی کا کام ہے۔ وہی جانے۔ میں کون ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔"

پھر ایک رومی ٹوپی ابھر رہی تھی۔ ابھر رہی۔ ان کے پیچھے کوئی گڑگڑا رہا تھا۔ سفید چادر میں چھپی ہوئی مسجد سجدے میں پڑی تھی۔

رومی ٹوپی والے نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ اس

پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھ کر دراز قد نے آنکھیں بند کر لیں۔

"الحمد للہ۔ الحمد للہ۔" مدھم سی سرگوشی ابھری۔

ریڈیو نے مہر سکوت توڑ دی۔

طبل بجنے لگا۔

جیسے دور بہت دور ایک دل دھڑک رہا ہو۔

وہ مدھم دھڑکن قریب آ رہی تھی۔ اور قریب۔ اور قریب۔

"ہم ریڈیو پاکستان سے بول رہے ہیں۔"

اعلان دلی کے بند بند میں گونجا۔

پھر دھڑکن بن کر اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اس کا سر فخر سے اٹھ گیا۔

جیسے کسی نے بارود کو آگ دکھا دی ہو۔

پھر اس کے بدن پر چیونٹے رینگ رہے تھے۔ چیونٹے ہی چیونٹے۔

پھر کسی نے اس کے سر پر تاج رکھ دیا۔

"پاکستان زندہ باد۔" کوئی چلایا۔

اس کے روبرو دنیا بھر کے مسلمان قطاروں میں کھڑے تھے اور ہر مسلمان کے سر پر تاج تھا۔

عالی عالی

اگلے روز جب اسے معلوم ہوا کہ ضلع گورداسپور ہندوستان میں شامل ہو گیا۔ تو اس کا دل دھک رہا گیا۔

اسے یقین نہ آتا تھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟" وہ آپ ہی آپ چلا رہا تھا ____ "نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟"

پھر وہ باہر نکل گیا۔ سیٹھ بازار میں دکانوں پر کھڑے لوگ گورداسپور گورداسپور چلا رہے تھے۔

نکڑ پر حلوائی دودھ کے کڑاہے میں چمچہ ہلاتے ہوئے آپ ہی آپ گنگنا رہا تھا "بھائی جی ______ گورداسپور آیا ہوگا؟"۔

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگے جا رہا تھا۔

"بھوں بھوں۔" کار چیخ رہی تھی۔ وہ رک گیا۔

"کیوں جی۔" ڈرائیور نے سر نکالا۔ "گورداسپور کا کیا بنے۔"

"کیا بنا۔" ایلی نے دہرایا۔

"وہاں میرے بچے ہیں۔" ڈرائیور نے ایک عجیب سی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

کار چل پڑی۔ اس کے پیچھے مالی بیٹھا تھا۔ "بو۔ بو۔" وہ ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔ "بو۔ بو۔" پھر بہت سے لوگ اس کے گرد آ کھڑے ہوئے۔

"کون ہے تو بول۔" وہ چلائے۔ وہ غنڈے تھے۔

ایلی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"کہاں جا رہا ہے تو؟" وہ اسے گھورنے لگے۔

"علی پور۔" وہ بولا۔ "وہاں میرے بچے ہیں۔ میری ماں ہے۔ میری بھی ہیں۔"

وہ پیچھے ہٹ گئے۔

"پیدل جائے گا۔" ایک لڑکا چلایا۔

"ارے ہٹ جا۔" اس نے تڑاخ سے لڑکے کے منہ پر تھپڑ مارا۔ "جانے دے۔" غنڈہ چلایا۔

ریلوے اسٹیشن ویران پڑا تھا۔ چند ایک لوگ پلیٹ فارم پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ دیر تک وہاں گھومتا رہا۔ گھومتا رہا۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا۔ "بابو جی بابو جی۔" وہ وردی والے بابو کو دیکھ کر بولا۔ "بابو جی بابو جی۔ امرتسر کو گاڑی جائے گی نا۔"

بابو رک گیا اور چونکتے ہوئے انداز سے بولا۔ گاڑی؟“

”جی۔“ بیلی نے کہا۔ ”امرتسر گاڑی جائے گی نا؟“

”وہ۔“ بابو چونک کر بولا۔ ”مطلب ہے گاڑی۔“

”جی ہاں۔“ بیلی بولا۔ ”امرتسر کو۔“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں جائے گی۔“

”نہیں جائے گی؟“

بابو نے سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

دو روز وہ ریلوے اسٹیشن اور بسوں کے اڈوں پر گھومتا رہا۔ بسوں والے اس کے سوال کا جواب نہیں دیتے تھے۔ کوئی بھی اس کے سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔

”میں تمہیں کرایہ دوں گا۔ جو مانگو گے دوں گا۔“ وہ چیختا۔

وہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے اور سر ہلاتے۔

بسوں کے اڈے سے وہ پھر اسٹیشن پر جا پہنچا۔

حتیٰ کہ ایک روز گاڑی آ گئی۔

”یہ گاڑی امرتسر جائے گی۔“ وہ چلایا۔

”بابو غور سے اس کی طرف دیکھا۔“ ”یہ امرتسر سے آئی ہے۔“

”کیا یہ واپس جائے گی“ وہ چلایا۔

بابو نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جا کر دیکھ لو۔“

بیلی گاڑی کی طرف بھاگا۔ شاید گارڈ اسے بتا سکے۔

وہ ڈبے کی طرف لپکا۔

ڈبے میں چاروں طرف خون کے چھینٹے لگے ہوئے تھے۔ سرخ گٹھڑیاں دھر دھر پڑی تھیں۔

بیلی کی چیخ نکل گئی۔

"یہ گاڑی امرتسر سے آئی ہے۔ یہ گاڑی امرتسر سے آئی ہے۔" چاروں طرف شور مچ گیا۔

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگا جا رہا تھا۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ علی پور ٹرک لے جانے کے لئے اسے دفتر پرمٹ حاصل کرنا ہے۔

جب وہ پرمٹ دفتر پہنچا تو وہاں بہت بھیڑ تھی۔ لوگ دیوانہ وار دفتر کے گرد گھوم رہے تھے۔

سارا دن وہ وہاں گھومتا رہا لیکن کسی نے اس کی بات نہ سنی۔ جب دفتر بند ہوگا تو وہ ایک بابو کے سامنے چلانے لگا۔

"پرمٹ چاہتے ہو؟" بابو نے پوچھا۔

"جی۔"

"کہاں کا؟"

"جی علی پور کا۔"

"ہوں۔ ٹرک ہے تمہارے پاس۔"

"جی نہیں۔" وہ بولا۔

بابو قہقہہ مار کر ہنسا۔ "تو پرمٹ کس کا لوگے؟"

"لیکن ـــــ" علی بولا۔

"بھائی صاحب۔" بابو کہنے لگا۔ "پہلے ایک ٹرک حاصل کرو جو ادھر جانے کے لئے تیار ہو۔ پھر یہاں آ کر پرمٹ لو۔ اور علی پور لے جاؤ۔ بیٹے غم نہ کھاؤ۔ علی پور ابھی تک محفوظ ہے۔"

پھر کئی ایک دن وہ ٹرکوں کے پیچھے گھومتا رہا۔ ادھر جانے کے لئے کوئی ٹرک رضامند نہ ہوتا تھا۔

دیکھا۔

"میں یہاں ملازم ہوں۔" وہ بولا۔

"اور وہ سب وہ ____" ایلی نے پوچھا۔

"وہ سب علی پور ہیں۔" شیر علی بولا۔

"پرمٹ نہیں ملا۔" ایلی نے مایوسی بھرے انداز سے کہا۔

"مجھے ایک ٹرک مل گیا ہے۔" شیر علی بولا۔ "آج ہی محکمہ والوں نے دیا ہے۔"

"مل گیا ہے۔" ایلی چلایا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں مل گیا ہے۔ صرف ایک بندوق والا سپاہی اور ایک ڈرائیور۔"

"وہ ____" ایلی سمجھ بیٹھا۔

اسی روز وہ فوجی ٹرک میں بیٹھے علی پور جا رہے تھے۔

ٹرک کے پردے بند تھے۔ ڈرائیور گاڑی چلاتے ہوئے زیر لب قرآن کی آیات پڑھ رہا تھا۔ سپاہی نے بندوق کی نالی پردے سے باہر نکال رکھی تھی۔ اور وہ سڑک کا جائزہ لے رہا تھا۔

شیر علی چپ چاپ ڈرائیور کے پاس بیٹھا تھا۔ ایلی ٹرک کے اندر پچھلی سیٹ پر گٹھڑی بنا ہوا تھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"اللہ اپنا فضل کرے۔" ڈرائیور چلایا۔ "بسم اللہ۔" اس نے ایکسیلیٹر دباتے ہوئے کہا۔

"ہم امرتسر میں داخل ہو رہے ہیں۔ ذرا دھیان سے کوئی باہر نہ جھانکے پردے کے پیچھے بیٹھو۔ گولی سے بچاؤ نہ ہوگا۔"

"روکنا نہیں۔" سپاہی بولا۔ "چاہے کچھ بھی ہو۔"

"روکنا۔" ڈرائیور بولا۔ "ہم چالیس کی سپیڈ پر چلیں گے۔ چاہے کوئی بھی سامنے ہو۔"

"اللہ مالک ہے۔" سپاہی بولا۔

ٹرک جھول رہا تھا۔ ربڑ کے گیند کی طرح اچھل رہا تھا۔

دور بہت سے لوگ چلا رہے تھے۔ نعرے مار رہے تھے۔ مدھم سنسنی خیز چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ وقت رینگ رہا تھا۔

دفعتاً سپاہی چلایا۔ "وہ دیکھو۔ ریل کی پٹری کے دونوں طرف سکھوں کے جتھے ہیں۔"

"وہ دیکھو۔" وہ پھر چلایا۔ "وہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔"

"مذہبی ہو گئے ہیں مذہبی۔" ڈرائیور بولا۔ "یہ سکھ۔"

"مرپر خون سوار ہے۔" سپاہی نے کہا۔

"لیکن ریل کی پٹری پر کیوں۔ سڑک پر کیوں نہیں۔" شیر علی نے پوچھا۔

"ضرور کوئی بات ہے۔" سپاہی نے کہا۔

پھر سپاہی اور ڈرائیور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ شیر علی اور ایلی خاموش بیٹھے تھے۔

"دو چار میل رہ گیا علی پور۔" ڈرائیور بولا۔

"چار میل۔" سپاہی بولا۔ "ذرا روکو۔" وہ چلایا۔ "روکو۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔" ڈرائیور بولا۔

سپاہی نے بندوق کی نالی ڈرائیور کی طرف پھیر دی۔ "میں کہتا ہوں۔ روکو۔ سنا تم نے۔" اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آواز تھرا رہی تھی۔ "روکو۔"

گاڑی رک گئی۔ سپاہی نے بندوق اٹھا اور باہر چھلانگ لگاتے ہوئے بولا۔ "میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آیا جاتا ہوں۔" اور وہ بھاگتا ہوا درختوں میں غائب ہو گیا۔

ڈرائیور نے بے بسی سے ایلی اور شیر علی کی طرف دیکھا۔ دونوں خاموش بیٹھے

تھے۔ بیلی کے ذہن میں وہی خلا کھل رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ساری چیخیں مدھم پڑ چکی تھیں۔ اس کی شکل دھندلا گئی تھی۔ ہر چیز دھند کا حصہ بنے جا رہا تھا۔

"یہ تو سمجھو ہینڈز اپ ہو گیا۔" ڈرائیور بولا۔

نہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ سپاہی انہیں چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا۔ کہاں چلا گیا تھا۔ کہیں وہ سکھوں کے ساتھ تو نہیں مل گیا تھا۔ ان کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جانا ایسی جگہ جہاں چاروں طرف دشمن تھے۔

"چھوڑو چھوڑو۔" شیر علی نے ڈرائیور سے کہا۔ "اب تو علی پور بھی قریب ہے۔"

"نہیں۔" ڈرائیور بولا۔ "اس کو یہیں چھوڑ جائیں ______ وہ مسلمان ہے بھئی۔ کیسے چھوڑ جائیں۔"

سامنے ایک ویران گاؤں تھا۔ گاؤں کے دو ایک مکان جلے ہوئے تھے۔ ان میں سے دھواں نکل رہا تھا۔

اس کے ارد گرد کچھ سائے سے حرکت کر رہے تھے۔ دفعتاً ڈرائیور اٹھا۔ اس نے لوہے کی دو بڑی بڑی سلاخیں اٹھائیں۔

"یہ لو۔" وہ بولا۔ ایک سلاخ ایک کے ہاتھ میں تھما دی۔ "یہ لو یہ۔" اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے پردے سے باہر نکال رکھو۔"

پھر اس نے دوسری سلاخ شیر علی کے ہاتھ میں تھما دی۔ "وہ سمجھیں گے کہ بندوقوں کی نالیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں پتہ چلے کہ ہم نہتے نہیں۔"

"جو اللہ کو منظور ہو گا۔" اس نے ٹرک کی جالی مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لی۔

"انشاء اللہ وہ چار کو مار کر مریں گے۔"

دیر تک وہ بیٹھے رہے۔ صدیاں بیت گئیں۔

"وہ آ رہے ہیں۔ خبردار۔" ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ "خاموش"

سامنے چار سکھ ہاتھوں میں لٹھ اٹھائے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ٹرک کے قریب آکر وہ رک گئے۔

"قریب آئیں تو گولی مار دو۔" ڈرائیور چلایا۔ "گولی مار دو سارجنٹ۔" وہ چلایا۔

"ایلی نے ووب کی سدرج کو باہر نکال دیا۔

"سارجنٹ۔" ڈرائیور چیخنے لگا۔ "سنتے ہو سارجنٹ۔"

یہ سن کر سکھ بھاگ گئے۔

ڈرائیور ہنسنے لگا۔ "بزدل بھڑوے۔" وہ بولا۔ "ڈر گئے۔"

ایلی کی پیشانی پسینہ میں شرابور تھی۔

دفعتاً دور سے سپاہی کی آواز سنائی دی۔ "آ گیا میاں آ گیا۔ اللہ اکبر۔" اس نے نعرہ مارا۔ وہ بندوق اٹھائے بھاگا آ رہا تھا۔ "اللہ ہو اکبر۔" اس کا نعرہ دور تک گونج رہا تھا۔ "جلدی جلدی۔ سٹارٹ کرو۔ وہ قریب آ رہے ہیں۔ وہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔"

ٹرک چل پڑا۔

"کیا بات تھی؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"گیا تھا رپورٹ کرنے۔"

"کہاں گیا تھا۔"

"باؤنڈری فورس کا ہیڈکوارٹر ہے یہاں۔ وہاں گیا تھا۔"

"کہاں ہے ہیڈکوارٹر۔"

"یہاں سے تین میل دور۔" سپاہی نے کہا۔ "وہ سامنے کی جھنڈی سے پرے۔"

"کیوں گئے تھے۔"

"میں نے سوچا۔ یہ سکھ جو ریل کی لائن پر کھڑے ہیں۔ ضرور فوجیوں کی گاڑی آنے والی ہے تو میں نے سوچا مسلمانوں کی ساری گاڑی کٹ جائے گی۔"

"تو پھر۔۔۔" ڈرائیور نے پوچھا۔

"پھر مجھے پتہ تھا کہ یہاں بانڈری فورس فرنٹیئر فورس کی ہے۔ سب مسلمان ہیں۔ اس لیے میں نے کہا۔ یہ جو گاڑی کو اللہ کے حکم سے بچاؤں گا۔ فورس کا صاحب انگریز ہے۔ میں نے جھوٹ مارا۔ میں نے کہا حضور ریل کی پٹڑی پر فوجی گاڑی کو سکھوں کے جتھے روک کر مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں۔"

"گاڑی تو ابھی آئی ہی نہیں۔" علی بولا۔

"تمہیں کیا معلوم ہو۔" سپاہی بولا۔ "ایسا نہ کہتا تو وہ سپاہی کیسے بھیجتا۔ جو یہ کہتا گاڑی آنے والی ہے تو کون سنتا میری بات۔"

"تو پھر؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"صاحب بھی سوچ رہا تھا کہ جوانوں نے سن لیا اور وہ حکم ملنے سے پہلے ہی رائفلیں لے کر بھاگے۔ وہ سب آ رہے ہیں سکھوں کے جتھے بھاگ رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو گاڑی بچ جائے گی۔"

"انشاء اللہ۔" ڈرائیور بولا۔

"اگر ہم پر یہاں حملہ ہو جاتا۔" شیر علی نے پوچھا۔

"یہاں تو صرف تین مرتے۔" سپاہی بولا۔ "وہاں تو سینکڑوں کی بات تھی۔"

"اللہ مالک ہے۔" ڈرائیور بولا۔

علی نے حیرانی سے سپاہی کی طرف دیکھا۔ "اور اگر تمہیں گولی مار دیتے تو؟" اس نے پوچھا۔

"ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے بابو۔ مار دیتے۔" وہ مسکرایا۔ "بچا لیا ہے۔ ایک نہ ایک دن گولی سے ہی مرنا ہے۔ پر وہ مسلمان رفیوجی کی گاڑی ______" وہ

رک گیا۔

علی کی نگاہ سے گویا ایک پردہ سا ہٹ گیا۔

جان پیچھے ہٹ گیا۔

اس کی جگہ بیسیوں چھوٹے چھوٹے بچے اس کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے ابو ابو۔ بیسیوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سینکڑوں بوڑھی عورتیں اس کی طرف امید بھری نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔

جاؤ جاؤ

انہوں نے محلے پر آخری نگاہ ڈالی۔

وہ صوفی محلے کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہے تھے۔

محلہ ویران پڑا تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ دیواریں چپ چاپ ایستادہ تھیں۔

محلے کا میدان خالی پڑا تھا۔ کچھ لوگ جا چکے تھے۔ کچھ دروازوں میں کھڑے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ محلے والوں کی زبانیں گویا تالو سے چمٹ گئی تھیں۔ ان کی قوت گویائی آنکھوں میں ڈوب رہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے علی احمد کے گھرانے کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

علی نے آخری نگاہ ڈالی۔ اوپر چوبارے میں شہزاد کھڑی تھی۔ پھر وہ سب ٹرک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ علی احمد چپ چاپ سر کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے نہ جانے کدھر دیکھ رہے تھے۔

ہاجرہ کا چہرہ جیسے نکھر رہا تھا۔ جانی حیرانی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ شمیم اور اس کی بیٹیاں چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ صرف راجو کے چہرے پر مسرت اور امید کی جھلک تھی۔ نصیر دانتوں میں تنکا چبا رہا تھا۔ رابعہ ہاتھ مل رہی تھی۔ فرحت کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اس کے بچے سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔

ٹرک چلے جا رہا تھا۔

وہ سب سہم گئے۔ شاید حملہ ہو گیا۔ شاید ٹرک خراب ہو گیا۔

سپاہی نے بگل کا نعرہ مارا، بندوق اٹھائے باہر چھلانگ لگا دی۔

وہ پردے ہٹا کر دیکھنے لگے۔

سڑک پر یہاں وہاں لاشیں پڑی تھیں۔ چاروں طرف خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان پاگل بابا چھاتی نکالے گردن اٹھائے بے پروائی اور بے نیازی سے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر یوں ٹہل رہا تھا جیسے جہاز کا کپتان ردگرد کا جائزہ لے رہا ہو اور جہاز کے ملاحوں کو احکامات جاری کر رہا ہو۔

"بابے ___" ڈرائیور چلایا۔

سپاہی بابا کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

"بابا" ڈرائیور پھر چلایا۔

بابا دور نہ جانے کہاں دیکھ رہا تھا۔

"بابا چلیں" سپاہی چلایا۔ "پاکستان چلیں۔"

بابا نے سپاہی کی طرف دیکھا۔ "چلیں" وہ بولا۔ "سب نے چلے جانا ہے۔ سب نے۔ ہاں تو جاؤ۔ جانا ہے تو جاؤ۔ جس نے جانا ہے جائے۔"

"تم جاؤ بابا" ڈرائیور چلایا۔

بابا اپنی ہی دھن میں چلا رہا تھا "جانا ہے تو جاؤ۔ چلے جاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔ وہی کرنے والا ہے۔ وہی کرتا ہے۔ وہی مارتا ہے وہی زندہ کرتا ہے۔"

"لیکن بابا" سپاہی چلایا۔ "وہ تمہیں مار دیں گے۔"

"مار دیں گے ___ وہ ___" بابا کے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی۔ "وہ کہاں ہیں۔ کہاں ہیں وہ کہاں ہیں وہ۔ کوئی بھی تو نہیں صرف وہی ہے۔ صرف وہی۔ یہاں وہاں ہر جگہ ہر جگہ اور کون ہے؟"

"اسے زبردستی اٹھا لو" ڈرائیور چیخنے لگا۔ "اٹھا لو ٹرک میں ڈال دو۔"

بابے نے ایک غضب ناک نگاہ سپاہی پر ڈالی۔

"مت کرو۔ مت کرو۔" ہاجرہ بولی۔ "بابا کو کچھ نہ کہو۔"

بابے نے علی کی طرف دیکھا۔ علی نے جھک کر سلام کیا۔

حضور حضور

بابے نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ٹرک کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"کیوں کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔" وہ چلایا۔ "سب کچھ کیا سب کچھ کیا۔ کہاں کہاں حفاظت نہیں کی۔ کہاں کہاں خیال نہیں رکھا۔ کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔ بولو بتاؤ۔"

"وقت آ گیا ہے۔ وقت آ گیا ہے۔" وہ کچھ بولنے لگا۔ "جاؤ جاؤ تم جاتے کیوں نہیں۔ وقت آ گیا۔ دور دور۔ جاؤ جاؤ۔ مسجد کے پاس کنوئیں کے پاس دونوں بیٹھے ہیں۔ اللہ نے معاملہ اس کے ہاتھ میں دے دیا وہ جس کے ہاتھ میں چاہے دے دے۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں وہ جانے اور وہ جانے۔ وہ دونوں وہ دونوں بیٹھے والے۔ جاؤ جاؤ۔"

ڈرائیور نے ٹرک سٹارٹ کر دیا۔ سپاہی پھدک کر اوپر چڑھ گیا۔

"آ جاؤ بابا" سپاہی آخری مرتبہ چلایا۔

بابے نے قریب ہی سے ایک لاٹھی اٹھائی اور دوسری طرف منہ پھیر کر سے مارنے لگا۔

"ہٹ جاؤ ___ ہٹ جاؤ۔" وہ کچھ لاٹھی پٹخنے لگا۔ "تجھے کیا ہے مجھے کیا ہے کرنے دو۔ تم ہو تم جاؤ۔ میں کیا ہوں۔ میں کیا ہوں" وہ چلا رہا تھا۔

ٹرک روانہ ہو چکا تھا۔

دفعتاً علی کے روبرو حاجی صاحب آ کھڑے ہوئے۔ "وقت آئے گا۔ وقت آئے گا۔" وہ مسکرائے۔ "الحمد للہ۔ اللہ اچھا کرے گا۔ وقت آئے گا۔"

شہزاد کھڑکی سے چلا کر بولی "میں رکاوٹ تھی۔ میں دور ہو گئی۔ میں دور ہو گئی۔"

دن کا عام مولوی ہنس رہا تھا۔ "سب اس کا چکر تو ہے۔ سب اس کی شعبدہ بازی ہے۔ وہ بڑا شعبدہ باز ہے۔ سب اسی کا کھیل ہے۔ وہ بڑا کھلاڑی ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"خبردار۔" ڈرائیور چلایا۔ "امرتسر آ گیا۔ کوئی باہر نہ جھانکے۔ کوئی آواز نہ نکالے۔"

"اللہ مالک ہے۔" سپاہی بولا۔

ایلی چونک پڑا۔

اس نے سامنے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔

سامنے چوک میں ایک فوجی کھڑا تھا۔

"اگر اس نے روکا۔" سپاہی بولا۔ "تو رکنا نہیں۔"

"جو اللہ کرے۔" ڈرائیور نے ٹرک تیز کر دیا۔

چوک میں کھڑے فوجی نے رکنے کا اشارہ کر دیا۔

"جاؤ جاؤ۔" دور سے پاگل بابا کی آواز سنائی دی۔

"ٹھاں ـــــ" ایک آواز سنائی دی۔

چوک میں کھڑا فوجی ڈھیر ہو کر گر پڑا۔

ایلی نے دھڑکتے ہوئے دل سے سامنے دیکھا۔

"جاؤ جاؤ۔ چلو میں۔" پاگل بابا چلا رہا تھا۔ "سڑک سے نہیں۔ کھیتوں سے۔ کھیتوں سے۔"

ڈرائیور نے ٹرک سڑک سے اتار کر کھیتوں میں ڈال دیا۔

"نیو جیون۔ نیو جیون۔" کھڑکی میں شہزاد گا رہی تھی۔

"آنے دو۔" وہی ٹوپی والا کھیتوں میں ہاتھ دیے کھڑا تھا۔

"رستے کی رکاوٹ تو میں تھی۔" شہزاد۔

"جانے دو۔ جانے دو۔" دراز قد اشارے کر رہا تھا۔

ٹرک دوڑ رہا تھا۔ دوڑ رہا تھا۔

"جاؤ۔ جاؤ۔" سپاہیوں کی آواز چاروں طرف گونج رہی تھی۔

"دستور دستور۔" ہرن خوشی سے چیخ رہا تھا۔

"پاکستان۔ پاکستان۔" بلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

علی پور کا ایلی

(ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)

"علی پور کا ایلی" کے پہلے ایڈیشن کی ہر جلد کے ساتھ ایک چٹ چپکی ہوئی ہوتی تھی۔ جس پر لکھا ہوتا تھا۔ "اسے آدم جی انعام بھی ملا۔" اور کچھ ہی عرصہ بعد اس کے بابت ابن انشا صاحب نے کہا۔ "اسی لئے مشہور ہے کہ اس پر آدم جی انعام نہیں ملا" اور جملہ کا یہ حصہ اس کے ہر ایڈیشن کے ساتھ چھپا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب ۱۹۶۱ء کا آدم جی انعام ملنے والا تھا تو یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ اس ناول کو انعام ملنا چاہیے یا ملے گا یا ضرور ملے گا۔ مگر انعام "تلاش بہاراں" کو دیا گیا۔ مولوی عبدالحق بقید حیات تھے اور میں ان کی خدمت میں جایا کرتا تھا۔ ان کے ناول کے سلسلے میں ذوق پر مجھے کبھی اعتماد نہیں ہوا۔ جب پہلا آدم جی انعام "خدا کی بستی" کو دیا گیا تو میں نے مولوی صاحب سے کہا تھا۔ "آپ نے ترازو سے تول کر انعام دیا ہے۔" اور ان سب کتابوں کو جو مولوی صاحب کے کمرے میں ایک پلنگ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ دیکھ کر اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا۔ "آخر ان سب کتابوں سے تو وزن میں یہ سب سے بھاری ہے۔" مولوی صاحب ہنس دیئے تھے۔ پھر آئندہ سال "تلاش بہاراں" کو انعام ملنے کے بعد میں ان کے پاس گیا۔ وہ قریب المرگ تھے۔ مگر باتیں کرتے تھے میں نے کہا۔ "اب کی انعام دینے کے سلسلے میں "علی پور کا ایلی" اس قدر زیادہ بڑی کتاب تھی کہ ترازو ہی ٹوٹ گئی لہٰذا اس کا وزن نہ ہو سکا اور اس کم وزن کی کتاب "تلاش بہاراں" کو آپ نے انعام دے دیا۔" مولوی صاحب تھوڑی دیر کے بعد غش میں آجاتے تھے۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے یہ بات پوری سنی یا نہیں لیکن میں یہ سب انہی سے کہتا رہا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ ایک ناول کی سب سے بڑی تعریف یہ ہو کہ "اسے آدم جی انعام ملا" اور دوسری کی تعریف یہ کی جائے کہ اسے "آدم جی انعام نہیں ملا۔" انعام ملنا یا نہ ملنا بے معنی ہو گیا اور ایک حد تک

ڈرے۔'' میں نے اسے پھر پڑھا اور اس پر مضمون لکھنا شروع کیا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ رسالہ نقوش سو گیا ہے۔ مجھے بھی نیند آ گئی اور وہ رہ گیا۔ مگر اب جب اس تصنیف کو مقبول ہوئے بارہ برس ہو گئے میں نے اسے پھر پڑھا اور اس پر مضمون لکھنا شروع کیا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ رسالہ نقوش سو گیا ہے۔ مجھے بھی نیند آ گئی اور وہ رہ گیا۔ مگر اب جب اس تصنیف کو مقبول ہوئے بارہ برس ہو گئے میں نے اسے پھر پڑھا اس پر مضمون لکھ ڈالنے ہی کا فیصلہ کیا۔ نقوش نہ معلوم اب نکلے گا مگر مضمون تو تیار رہنا چاہیئے۔ لکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اب ان تمام ناولوں پر مسلسل لکھنے کی ٹھان لی ہے جو ۱۹۴۷ء سے اب تک وجود میں آئی ہیں اور جو ہماری ناول نگاری میں ایک نیا ہنگامہ والے سلسلوں میں پہلے دور کے نقوش جاری ہیں میری رائے ہے کہ ''علی پور کا ایلی'' ان آدھے درجن ناولوں میں ہے جو ہمیشہ اہم مانی جاتی رہیں گی۔

ممتاز مفتی صاحب ناول کا صحیح شعور رکھتے ہیں اور اس لئے ان کے سلسلے میں انعام کی کوئی اہمیت نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انعام تو بیشتر ایسے لوگوں کو ملتا ہے۔ جن کو ناول کا کوئی شعور نہیں ہوتا اور وہ اپنی ناول کے بابت یہ نہیں بتا سکتے کہ اس میں ہے کیا۔ برخلاف اس کے مفتی صاحب انکسار کے ساتھ فرماتے ہیں۔

''اپنی دانست میں میں نے ناول بلا ایلی کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایلی کی شخصیت کا ارتقا پیش کروں۔ اس لئے چند ایک بظاہر غلیظ تفصیلات پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ وہ بات ہے کہ ایلی ایسا کردار ہے جو مشاہدات کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا ہے۔ لیکن جب کنارے لگتا ہے تو بطخ کی طرح پر جھاڑ کر پھر سے جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے ____''

بہر حال اردو ادب میں کوئی طویل کہانی ایسی نہ ملے گی۔ جس کی تفصیلات براہ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور رچاؤ کے بغیر ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہوں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ بیتی ہے۔

اور یہی مقصد آج بھی تمام ادبی ناول نگاروں کا ہوتا ہے۔ مگر وقت کے ساتھ اس
مقصد میں اور بھی مقاصد شامل ہو گئے۔ خاص طور سے بیسویں صدی میں تجربہ یا
زندگی کے حادثات کو نظریہ یا تخیل کے اثر سے بدل کر پیش کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا
تھا۔ اسی سے ناول نگار مفکر کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ اور ناول متاثر کرنے
کے علاوہ ذہنی غذا کا مواد بہم پہنچاتی ہے۔ مفتی صاحب اس جھنجھٹ میں نہیں پڑ رہے
ہیں۔ وہ نہایت غیر جانبداری سے ایک سرگزشت ایک روداد کو بے کم و کاست
بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے یہاں ناول کا ارتقا عجیب رہا ہے۔ ابتدا کے ناول
نگار اسے فسانہ سمجھ کر رغبت سے فرضی خیالی اور مبالغاتی چیزیں اس میں داخل کرتے
رہے اور آج کل کے ناول نگار جدید تجربوں کی راہ پر چل پڑے ہوئے۔ اس سے
ہمارے یہاں ایسی ناول جسے ناول کا NORMA کہا جائے ڈھونڈھے نہیں
ملتے۔ مفتی صاحب اس فارم اس "خالص ناول" کی راہ پر چل رہے ہیں اور "علی
پور کا ایلی" اپنے نام سے اور اپنے مواد سے بھی زندگی کی اس طرح ترجمانی ہے جیسی
واقعیت پسندوں اور قدامت پسندوں نے کی تھی۔ جدید دور میں اس راہ پر چلنا اور
قدم میں لغزش نہ آنا۔ بھی ایک کمال ہی کے دائرے میں آتا ہے اور ہمیں یہ دیکھنا ہوگا
کہ وہ اسے کہاں تک حاصل کر سکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ واقعیت پورے طور پر ہمکنار رہنے کی کوشش سے اس ناول میں دو
خصوصیات پیدا ہونا لازمی تھیں اور انہیں مفتی صاحب نے نہایت فراخدلی سے پیدا
ہونے دیا۔ اول یہ کہ تجربوں کا ڈھیر لگتا چلا گیا اور اس میں سے انہوں نے چھانٹنے کی
کوشش نہیں کی۔ ناول کو آج انتخاب اور ارتقا کے اصولوں کے ماتحت لانے کی
کوشش کی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی تفصیلات غائب ہو جاتی ہیں اور
بہت سی مختصر کر دی جاتی ہیں۔ قاری کو ناول نگار کے اشاروں سے خود بہت کچھ اپنی
طرف سے شامل کر لینا پڑتا ہے۔ اس طرح ناول فنکار اور صاحب ذوق دونوں کی

تخیل کے ساتھ ساتھ چلتے رہنے سے بچتی ہے۔ وہ اکثر لوگوں کے لئے مبہم اور مشکل
بھی ہو جاتی ہے۔ اور بیشتر لوگ مبہم اور مشکل بھی ہو جاتی ہے۔ اور بیشتر لوگ سے اچھی
اچھی طرح پر سمجھتے ہوئے سے پڑھ جاتے ہیں۔ مفتی صاحب اس کے قائل نہیں ہیں اور
ہر اس معاملے میں بھی وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ناول نگاروں کے ساتھ
ہیں جو تفصیلات کو زیادہ سے زیادہ واضح طریقہ پر پیش کرنے کے قائل تھے۔ اور
زندگی کا صحیح نقش پیش کرتے تھے۔ اس لئے "علی پور کا ایلی" میں ہمیں
جدید ناول نگاری سے نگار بلکہ اختلاف ملتا ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پرانا طریقہ اب بھی
کتنا زوردار ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس وجہ سے اس کی ضخامت بڑھ گئی ہے۔
جس پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہے۔ ناول کے سلسلے میں ہمارے یہاں کوئی واضح نظریہ
نہ ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ اسی تصنیف کو ناول کہتے ہیں جو کم از کم ایک ہزار صفحوں کا
ہو مگر زیادہ تر لوگ ضخامت سے گھبرا جاتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ناول حد سے حد
چار سو صفحوں کی ہو۔ "علی پور کا ایلی" کی ضخامت زیادہ تر لوگوں پر بار ہے۔ میں
اسے ایک قسم کی بدمذاقی سمجھتا ہوں اصل میں ضخامت موضوع اور فن پر مبنی ہوتی ہے اور
مفتی صاحب کا جو موضوع ہے اور جس طرح وہ اسے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ اتنی
ضخامت کے بغیر ادا ہی نہیں ہو سکتا تھا جتنی کہ ناول کی ہے۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ
بھی نکلتا ہے کہ مفتی صاحب بغیر سوچے سمجھے روانی کے ساتھ ناول سر کرتے گئے ہیں
اور انہیں ناول نگاری سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ سب تفصیلات اور
طوالت کیا محض بے پروائی کی وجہ سے ہے یا اس کے پیچھے کوئی مستقل فنی صورت چھپی
ہوئی ہے اور ہے تو وہ کس حد تک دلکش ہے۔

تیسرے یہ کہ تخلیق کار کی حیثیت سے وہ تمام قوت کردار نگاری پر صرف کرنا چاہتے
ہیں اور خاص طور پر ناول کے ہیرو اور اس کی حد سے زیادہ نارمل نوعیت کو ذہنی
حقیقت بنا دینا چاہتے ہیں۔ جدید ناول نگاری کے سلسلے میں بھی باغی ہے۔ اور

بالکل وقوعاتی کردار پیش کرنے کے بجائے اشاریت وغیرہ پر عمل کرتی ہے۔ مفتی صاحب اس کے بھی خلاف ہیں اور ان کی وہ راہ ہے جو ''ڈون کا ہوٹے'' سے شروع ہو کر ''پکوک پیپرز'' تک چلی آتی ہے اور آج بھی سومرسٹ ماہم وغیرہ کی راہ ہے۔ غرض اس معاملے میں بھی وہ ناول نگاری کے تمام الجھاووں کو الگ کر دیتے ہیں۔ ضخامت اور وسعت کے لحاظ سے اس کتاب میں کردار کا ابھرنا اور نئے کردار کا ہر موڑ پر سامنے آتے رہنا لازمی ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ کس قدر زندہ ہیں اور کیسے مل جل کر ایک دنیا تخلیق کرتے ہیں اور یہ دنیا کس حد تک دلکش ہے۔ پھر ناول کا مرکزی کردار ہی سب سے زیادہ مصنف کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس کے بہت چند بنیادی باتیں وہ پیش لفظ ہی میں کہہ دیتے ہیں۔ یہ باتیں نہایت معمولی ہیں مگر معمولی ہونے ہی کی وجہ سے تعجب انگیز بھی اور اس مثل کی مصداق ہیں کہ حقیقت مجاز سے زیادہ تعجب انگیز ہوتی ہے۔ غرض یہ ناول صاف صاف طور پر اس قسم کی ناول ہے جسے کرداری ناول کہا جاتا ہے اور اس کی کامیابی یا ناکامی آخر کار اس کے ہیرو کی تخلیق کی کامیابی یا کمال سے وابستہ ہونا چاہیے اور اگر اعلیٰ دنیائے ناول نگاری کے ان کرداروں سے ایک ٹھہرتا ہے جس کو حقیقت سے زیادہ حقیقی اور ایک معاشرے کا مکمل نمائندہ کہا گیا ہے تو ناول کو عظیم درجہ میں جگہ دینا ضرور ہو جاتا ہے۔

غرض ہم اس ناول کو یہ جان کر اور مان کر شروع کرتے ہیں یہ ناول کی بنیاد۔ روح یا سیدھی ضرور راہ سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان جدید ضروری یا غیر ضروری شوں سے پاک ہے جو تجربے کی طرح تھوپی جا رہی ہیں۔ ہمیں پیش منظر میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اسے ناول کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہانی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دینا چاہتے۔ یہ لوگ ناول میں رومان دیکھنا چاہتے ہیں اور ''ٹس پورکا یلی۔'' ٹیس بس اس حد تک ہے جتنا کہ یلی کے کردار سے ممکن تھا۔ اس کو رنگ دینا واقعیت سے غداری کے مترادف ہوتا اس سے مفتی

ہے ناول کے بعد شاہد اور مفتی علی احمد اور صفیہ کے نقوش ابھر کر ہمارے سامنے
آنے جاتے ہیں۔ فرحت بھی دبے پاؤں اس گھر میں آ جاتی ہے۔ صفیہ اور جمیلہ
کے بچپن میں تحقیقات تو تھا، قیام اور نزاع امتحان کے۔ تحقیقات کے ذریعہ روشن ہو
جاتے ہیں۔ پہلا باب ''گرد و پیش'' اس طرح مکمل ہو جاتا ہے۔ ہر باب کی ایک
سرخی ہے اور اس کے ہر حصہ کی ماتحت سرخی ہے جو حاشیہ میں چھپی نظر آتی ہے۔
بظاہر یہ تاثر ہوتا ہے ناول کی قاشیں اور اس پر چھوٹی قاشیں کر دی گئی ہیں مگر یہ سب
قدرتی اور منطقی تسلسل سے جڑی ہوئی ہیں۔ سرخیوں پر سرخیوں کا استعمال وضاحت
میں اور دلچسپی پیدا کرنے میں خاص مدد کرتا ہے۔ کتاب ایک ڈھیر ہے اور معمولی ڈھیر
بھی نہیں بلکہ بڑے سائز کے قریب بارہ سو صفحوں کا چوڑا اور اونچا ڈھیر ہے۔ ایک
پہاڑی کہیے مگر اس پر چڑھنے کا راستہ چکر کاٹتا مگر صاف ہے۔ ہر چوٹی اور موڑ
پر نشان کے تختے لگے ہوئے ہیں اور سفر کرنے والے کی رہنمائی کرتے ہیں اور ہر
ہر گوشے کی نوعیت کا علم بہم پہنچاتے ہیں۔ ''علی پور کا ایلی'' قدرتی طور پر ایک بے
ڈھنگی پہاڑی ہے مگر مفتی صاحب نے پورے شعور کے ساتھ اور فنکارانہ سلیقے اور
جدت کے ساتھ اس پر چڑھنے والے کے لئے ہر ہر قدم پر دلچسپ رہبر کے فرائض ادا
کئے ہیں۔ سرخیوں میں یہ مان لینا ممکن ہے ناول کا کوئی پلاٹ نہیں ہے مگر غور سے
دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک بے ہنگم ڈھیر کو ناول نگار نے نہایت دلچسپ چھوٹے
حروف میں لکھی ہوئی سرخیاں ایک عظیم ڈھیر کو جو قدرت کا بنایا ہوا ہے ان کے
ذہن نشین کرنے اور موڈ کو ایک فارم دینے میں خاص طور پر ممد ثابت ہوتی ہیں۔
اس سے یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ ناول کا کوئی خاص فارم نہیں ہے۔ ناول زندگی کی
طرح بے ہیئت ہے مگر اس پر مصنف نے ایک فارم عائد ضرور کیا ہے۔ یہ عام طور
سے جو فارم ناولوں میں نظر آتے ہیں ان سے مختلف ہی نہیں بلکہ ان کا متضاد ہے مگر
غور کرنے والوں پر روشن ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل نئی چیز ضرور ہے اور مفتی صاحب کا

شعور کے قابل ہے کہ انہوں نے فارم کو بھی خوبی سے چھپایا ہے یا موضوع بھی وہ اس خوبی سے چھپ گیا ہے کہ ناول نگاری میں ایک بالکل نئی اور چھوٹی ہیئت کا اضافہ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس ہیئت کو قدم بقدم طے کرنا ایسا طویل عمل ہوگا کہ تنقید بھی کتاب کے برابر ضخیم ہو جائے گی۔ ہر چھوٹی سرخی ایک دلچسپ واقعہ سامنے لاتی ہے اور بڑی سرخی ان کا ایک مستقل ترتیب میں آجانا دکھاتی ہے۔ واقعات نئے اور دلچسپ ہیں اور ہر ایک سے یا تو کوئی نیا اسرار ابھرتا ہے یا جانا پہچانا ہوا کردار کوئی نئی چھب دکھاتا ہے۔ تفصیل سے ہٹ کر ہم دیکھتے ہیں تو علی احمد۔ ایلی اور پھر آگے چل کر شہزاد کے قصے پاروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ علی احمد کے معاشقوں کے قصوں کا تار جس سے ایلی ضمنی طور پر وابستہ ہے ایک دلچسپ لکیر بناتا ہے۔ پھر ایلی اور شہزاد کے عجیب و غریب معاشقوں کا پلاٹ اس طرح آتا ہے کہ وہ ناول کا مرکزی پلاٹ ہو جاتا ہے۔ مگر اصل پلاٹ ایلی کی سرگزشت کا ہے۔ یہ ناول کو پورے دور سے جوڑتا ہے۔ لاہور اور امرتسر کے واقعات اس میں شامل کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کا وہ علاقہ جو علی پور کو مرکز مان کر امرتسر کو حد مان کر دائرے میں بدل جاتا ہے۔ ناول کا ماحول ہے۔ ایلی دلی اور بمبئی کی بھی خبر لیتا ہے مگر جب بھی جائے یہ ماحول اس کے ساتھ ہے اور ساتھ نہیں تو اس کے دل اور اس کے گرد رچا بسا ہے۔ پنجاب اور اس کا وہ مخصوص حصہ جسے علی پور کہتے ہیں۔ ایک واقعاتی نگری اور عجیب کائنات کی طرح پوری ناول پر حاوی رہتا ہے۔ اور مختلف بلکہ گوناگوں قصوں اور کرداروں کو ایک وحدت میں لاتا ہے۔ اس طرح اس وسیع پلاٹ پر چھائے ہوئے موڈ میں ایک تخمینی وحدت صاف طور پر موجود نظر آتی ہے۔ ناول کی سرخی ''علی پور کا ایلی'' نہایت سادہ۔ نہایت سیدھی۔ سپاٹ اور اردو میں سرخی دینے کی رسم کو دیکھتے ہوئے نہایت درجہ بلکہ ممکن حد تک بے مزا ہے مگر یہ انگریزی اور یورپی ناولوں کی

ورتی پورے صوفی محلے سے سب سے خاص مکان یا محل میں آ کر رہنے لگتی ہے۔ وہ لیلی سے کافی بڑی ہے اور پھر جلد ہی چھ بچوں کی ماں ہو جانے کی وجہ سے اس سے اور بھی دور ہو جاتی ہے۔ مگر وہ خوب ہے۔ شہزادوں کی طرف بھی توجہ دکھاتی ہے۔ جیسے کوئی چاہنے والی بھاوج چھوٹے دیور کی طرف دکھائے اس معاملے میں اگر عشق بھی آ جاتا ہے تو وہ ایک قسم کا ہے۔ دونوں کا تعلق جنس سے بالاتر ہے۔ لیلی کے جنسی رجحان کو یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اسے دوسری عورتوں کی طرح نہ سمجھے۔ لیلی اس کی طرف اکثر پلنگ پر پڑے رہتا ہے۔ اسے مشین چلاتے ہوئے یا اور کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے بازوؤں پر لیلی کی خاص نظر رہتی ہے۔ شہزاد بھی جب دیکھو ''چھن سے۔'' اس کی طرف آ جاتی ہے۔ اس معصوم مگر دلچسپ محبت میں جنس دخل ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ایک دفعہ جب شہزاد سامان کی تنگ کوٹھری میں ہے تو لیلی اس پر حملہ کر دیتا ہے مگر ناکامیاب رہتا ہے۔ اس سے ان دونوں کے تعلقات میں فرق نہیں آتا اور آگے چل کر ایک دن طے ہو جاتا ہے کہ لیلی شہزاد کو بھگا لے جائے گا۔ وہ اس کام کے قانونی پہلو پر ایک مشہور وکیل سے رائے لیتا ہے۔ اور وکیل یہ سن کر کہ محبوبہ چھ بچوں کی ماں ہے، لیلی کو کسی دماغ کے ڈاکٹر سے رائے لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عشق میں دماغی خلل کو بہت دخل ہے۔ شہزاد لیلی کے ذہن میں بس جاتی ہے اور ہر وقت اس کے تصور میں ''چھن سے۔'' آ جاتی ہے۔ وہ لاہور میں تعلیم کی غرض سے آ کر رہتا ہے اور قریب کے گھر میں رہنے والی ایک اونچے خاندان کی لڑکی سے اس کی پینگ کافی بڑھتے ہیں۔ اس لڑکی کو سائیکل پر لے ہوئے وہ لاہور کے مختلف مقامات پر جاتا ہے۔ دونوں بہت قریب آ جاتے ہیں اور یہ بھی امکان نظر آتا ہے کہ دونوں کی شادی ہو جائے مگر اس عشقیہ معاملے کے دوران بھی شہزادی اس کے تصور میں آتی رہتی ہے۔ لیلی کی ماں اس کی ایک جگہ منگنی کی رسم بھی پوری کر دیتی ہے۔ مگر اس سے بھی لیلی کی شہزادی کی طرف توجہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔

علی احمد جس کا خاص مشغلہ عورتوں سے لگاؤ کرتے رہنا ہے لیلیٰ کو رنڈیوں سے بھی متعارف ہونے کا موقعہ دیتا ہے۔ اور لیلیٰ کو ایک رنڈی بچہ جننے کی بھی ناکام کوشش کرتی ہے۔ لیلیٰ خود بھی ایک دن ایک گندے رنڈی خانے کی گندگی میں کودی پڑتا ہے۔ مگر آخر میں یہ ہوتا ہے کہ لیلیٰ اپنی تعلیم ختم کر کے سکول کی ملازمت پکڑتا ہے اور شہزاد سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ دونوں کی زندگی بڑی خوشگوار نظر آتی ہے مگر آگے چل کر شہزاد کو اپنی پہلی شوہر کی لڑکی کی غلط شادی کی بنا پر لیلیٰ کی توجہ اپنے شہزاد سے لڑکے ماں کی طرف رہتی ہے۔ وہ بمبئی میں صحافی کی حیثیت ملازم ہوتا ہے اور جب تقسیم ہند کے سلسلے میں لاہور میں فسادات ہوتے ہیں تو "سالی سالی" کرتا ہوا لاہور بھاگ آتا ہے۔

یہ خاص پلاٹ کا بہت ہی زیادہ مختصر خلاصہ ہے اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے پلاٹ معاون کی طرح شامل ہوتے رہتے ہیں۔ علی احمد کے بچپن کا پی من کر متعدد معشوقے کرنے کا ایک طویل قصہ ہے۔ لیلیٰ کے تعلیم اور اس کے بعد ملازمت حاصل کرنے کا بھی ایک الگ پلاٹ ہے۔ اس کے مختلف عزیزوں کے بھی قصے ضمناً ساتھ ہو جاتے ہیں۔ ہر پلاٹ مناسب تفصیل کے ساتھ سامنے آتا رہتا ہے۔ ہر حصے میں ڈرامائی تحسین بڑی مناسب اور موزوں مقاموں کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ کتاب کی ضخامت میں اضافہ رہتا ہے مگر کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی جملہ یا لفظ بھی باضرورت ہے اور اسے ناول سے خارج کر کے ناول کو بہتر قرار دیا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر ناول کرداری قسم کی ہے یعنی اس کا مقصد ہر فرد کو مختلف وقتوں سے گزرتے ہوئے دکھانا ہے مگر اس میں ڈرامائی ناول یعنی ایسی ناول کے جو مختلف لوگوں کے درمیان کشمکش دکھائے اور وقت کے ساتھ اس کشمکش کے درجے طے ہوں۔ عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں اور یہ کہتے بنتا ہے کہ یہ ناول زور کے ساتھ ڈرامائی بھی ہے۔ مقامات بھی بدلتے ہیں مگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ علی پور اور اس

کا صحیح محلہ اور اس میں بھی ایلی کا خاندانی محل ایک سٹیج ہے اور اس پر سارا قصہ دکھایا جا رہا ہے۔ امرت سر، لاہور اور دوسرے مقامات پر کچھ ضمنی سین ضرور دکھائے گئے ہیں مگر یہ مرکزی سٹیج سے اس قدر متعلق ہیں کہ اتحاد تاثر میں کسی طرح فرق نہیں آتا۔ آخر میں قاری کے تصور میں جو زیادہ رہ جاتی ہے اس میں علی پور کے خاص قسم کے مکانات۔ صحیح محلہ اور اس کے خاص محل کے رہنے والے بڑے دلکش طریقہ پر زندہ نظر آتے رہتے ہیں۔ اتحاد کے ساتھ تنوع کو ہم آہنگ کرنے کی بڑی اچھی مثال قائم ہوتی ہے۔ مفتی صاحب فنکاری سے زیادہ زندگی کی طرف متوجہ ضرور ہیں اور اس کو اہمیت دیتے ہیں اور ناول کو ایک ڈھیر بنا دینے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کرتے مگر ان کا ناول شعوری اور قدرتی طور پر مواد کو اس طرح سمیٹتی اور ایک مستقل شکل و ہیئت میں تبدیل کرتی جاتی ہے کہ ان کی غیر معمولی فنکارانہ صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ضخامت ڈرا دینے والی چیز ضرور ہے۔ اور بیشتر ضخیم ناولوں کا مواد ناول نگاروں کی گرفت سے نکل ہی جایا کرتا ہے اس لئے سطحی نظر رکھنے والے لوگ ضخامت اور بے ترتیبی کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ ''علی پور کا ایلی'' کا سرشار کے فسانۂ آزاد سے مقابلہ کیا ہے۔ ''علی پور کا ایلی'' فسانۂ آزاد کا سا جنگل کا جنگل ضرور سامنے لاتا ہے مگر اس جنگل کی ایک بڑی اہم اور فنکارانہ ترتیب بھی ہے جو فسانۂ آزاد کی بے تکان چیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ آتی اور اردو ناول کو ایک زبردست جھٹکے سے ایک دلکش تعمیر میں رکھتا کرکے پہنچ جاتی ہوئی دکھاتی ہے۔ فسانۂ آزاد کو اس سے مقابلہ میں لایا جا سکتا ہے تو تضاد کے لئے یعنی یہ واضح کرنے کے لئے کہ محض ناول نما فسانہ اور صحیح معنوں میں ناول کے درمیان کیا فرق ہے۔ ''علی پور کا ایلی'' کے بعد شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ناول اپنے پورے رنگ و روپ کے ساتھ اردو ادب میں کھپ گئی۔ مفتی صاحب اس کے لئے داستان، سرگزشت، ڈھیر وغیرہ کے الفاظ استعمال کریں۔ یعنی نقاد کی حیثیت سے اس کی بابت ناول کا لفظ استعمال

کرنے سے بچتے نہیں مگر ان کے اندر جو فن کار ہے وہ تنقیدی شعور سے بالاتر ہے۔ اور اس کی سوچ خام سے عمل کرتے ہیں اور ایک بالکل نیا منظر دیتی ہوئی دلکش چمن پیچ و تاب کر دیتا ہے۔

(۳)

مفتی صاحب کی تخلیقی قوت کا عمل ان کے افسانوں ہی سے ہم چکا تھا مگر "علی پور کا ایلی" اس کے بڑے پیمانے پر عمل اور کامیاب عمل کی مثال سامنے آتا ہے۔ تخلیق قصہ گوئی کے ذریعہ بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔ مگر ان کا خاص میدان باوجود کچھ جدید ناول نگاروں کے تحت اختلاف کے کردار نگاری ہی رہا۔ "علی پور کا ایلی" میں ہر جگہ کردار امنڈتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی منفرد زندگی کا واضح اور دلکش نقش ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ مگر ناول نگار کی عظیم تخلیقی قوت کا بیان بلا جھجک ان وہ فنی کرداروں کے ذریعہ خاص طور پر ہوتا ہے اور یہ کردار پہلو بدلتے۔ ارتقا کرتے حقیقت سے ہم کنار رہتے ہوئے حقیقت سے زیادہ حقیقی ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اردو ادب میں ان کا کوئی ثانی نہیں نظر آتا۔

علی احمد کا کردار سب میں پہلے سامنے آتا ہے اور پوری ناول پر ایک مستقل نہ بدلنے والے شخص کی طرح چھایا رہتا ہے۔ ان کی دلچسپی مقرر ہو کر ایک خاص ٹھپہ کی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے کام میں چوکس ہے۔ اس کے ابا عام طور پر ایک چٹائی پر بیٹھے ڈیسک پر رکھے ہوئے رجسٹر میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ وہ محض تار کر جیتا کرتے تھے اور ان کی ہوتی ملی ہونے کے سوا وہ بچی ہوتی تھی۔ اور اس کے پیروں کو ادھر ادھر مرے رہنے کی عادت تھی جو ایلی پر بے حد گراں گزرتی تھی۔

اس عالم میں وہ ہمیشہ بیٹھے نظر آتے ہیں اور بیٹھے بیٹھے آواز لگاتے ہیں۔ "ایلی حقہ بھر دو۔" حقہ بھی اس کے کردار کا ایک حصہ ہے اور پھر ان سب سے زیادہ دلچسپی عورتوں میں ہے ان کی ایک بیاہتا بیوی یا جو ایلی کی ماں ہیں۔ جو اب محض نوکرانی

ان کے نزدیک روپے پیسے کی احتیاط کا پہلو بے حد اہم تھا۔

حتیٰ کہ وہ عورت پر روپیہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے اور ان کا خیال تھا کہ عورت کو تسخیر کرنے کے لیے سب سے ضروری چیز وعدے ہیں روپے کا تصرف نہیں۔ ان کا یقین تھا کہ عورت کی خوشی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ محض تخیل سے وابستہ ہے اور اسے روپے پیسے جیسی ٹھوس چیز سے کیا تعلق۔

ان کے کردار پورے طور پر پہلودار (Round) کرنے کی مفتی صاحب کوشش کرتے ہیں اور ہمیں یہ محسوس کرا دیتے ہیں کہ ان کی زندگی کے سب ہی انسانی پہلو ہیں اور ہرگز کیریکچر نہیں کہے جا سکتے مگر ان کی جنسی زندگی کے منظر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہر ایک منفرد دنیا اور نہایت درجہ دلچسپ اور اس کے کردار کی تمام زندگی اس بات میں سمٹ آتی ہے۔ عورت دیکھتے ہی یہ ان کا آپ ہی کس طرح زندہ ہو جاتا ہے۔ کس ہوشیاری سے عورت کو تسخیر کر کے اپنے مخصوص کمرے میں لے جاتا ہے۔ یہ کمرہ ایک قلعہ ہے جس میں پکارے جانے پر بھی ایلی کو داخل ہوتے ہوئے بڑا ڈر لگتا ہے کیونکہ وہاں ہر وقت رجسٹر پر علی احمد کے قلم چلتے رہنے کے علاوہ کسی جنسی حرکت کے ہوتے رہنے کا بھی امکان ہے جس کو ذہن میں رکھنا رسم دیتا ہے۔

غرض علی احمد کا سارا قصہ اور اگر سارا نہیں تو اس کا اہم ترین اور دلچسپ ترین حصہ ان کی مختلف عورتوں کو ڈون کوہٹے کی طرح تسخیر کرنے کے واقعات کا احاطہ کرتا رہتا ہے۔ یہ واقعات بہت ہیں اور ہر ایک کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ان میں سے کسی کا اقتباس کرنا طول عمل ہے اور ان کا خلاصہ کرنے سے ان کی زندگی ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ان میں ایلی بھی اسی طرح شریک نظر آتا ہے۔ جیسے ڈون کوہٹے کے ساتھ سانکو پنزا سروانٹیز کے یہ دونوں کردار یورپ کی تمام ناول نگاری میں ڈکنز کے مسٹر پک وک اور سام ویلر تک ماحول کے حساب سے روپ بدل بدل کر آتے رہے ہیں۔ مفتی صاحب کے ہاں ان میں بھی وہ آتی ورلی ہی ناپ ہیں

ور ''علی پور کا ایلی۔'' میں وہ علی احمد اور ایلی کے ذریعہ پنجاب کے اس علاقے سے متعلق ہو کر جو ناول کا مخصوص ماحول پیش ہوتے ہیں۔ علی احمد ہر قسم اور ہر طبقہ کی عورت کے آتے ہی ڈوٹ ہوئے کی طرح اپنا بھالا تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ایلی سائیکو پیتھ کی طرح ان کی بیدلی سے مدد میں مصروف نظر آتا ہے۔ گھریلو لڑکیاں جیسے سارہ، صبورہ، شعمہ اور عورتیں جو بیویاں بن کر رہنا چاہتی ہیں اور رہ جاتی ہیں۔ کئی ایسی جو وقتی تعلق ہی کو کافی سمجھتی ہیں۔ ایک ہندو عورت جو علی احمد سے تعلق تو رکھ سکتی ہے مگر اس کے یہاں کا پانی نہیں پیتی اور ایلی کو اس کے لئے کنوئیں سے پانی نکال کر ایک بوتل میں بھر کر لانا پڑتا ہے۔ سب ہی ان کے دائرے میں آتی ہیں اور ان سے دم کے دم میں تسخیر ہو جاتی۔ اور وہ ان سے جس طرح لطف لیتے ہیں اس کا منظر عجیب ہے۔ وہ کھل کھیل کھلا انگاٹ کی ہنسی ہنستے ہیں اور شہزاد کا نام لیتے جاتے ہیں۔ خیر ان کا مرض نہ جاتا مگر ان کی جنسی ذات ایسی خوبی سے سامنے آتی ہے کہ جس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ مفتی صاحب نے جس تفصیل سے اور جتنے جزئیات کے ساتھ ان کے حالات بیان کئے ہیں وہ کردار نگاری کے لئے بڑے ضروری ہیں۔ خاص طور سے مزاحیہ کردار نگاری کے لئے شیکسپیر نے فالسٹاف کو پورے طور پر جاننے کے لئے ایک نہیں تین تین ڈرامے لکھے۔ ڈکنس نے پکوک کو پورا جاننے کے لئے ہزار صفحے کے قریب کالے کئے۔ ہمارے یہاں مرشد کا خوجی بھی اب تک اردو کا سب سے زیادہ مزاحیہ کردار اسی وجہ سے ہے کہ وہ ہزار صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ علی احمد خوجی سے تو کم ہی جگہ گھیرتے ہیں اور اس سے کہیں زیادہ پہلودار اور تہ دار ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے عظیم مضحک نمائندہ ہیں اور آفاقی مزاج کے بھی نمائندہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اردو ناول نگاری میں ان سے بہتر مزاحیہ کردار اب تک نہیں پیش ہوا تو غلط نہ ہوگا۔

''علی پور کا ایلی'' کا کردار نگاری میں دوسرا اہم شاہکار شہزاد ہے۔ یہ حسن جوانی

ور زندہ وں کی صورت ہے۔ ور حسین عورت کی یہا کی اس میں عجیب وغریب رشمہ
دکھاتی ہے۔ س کا سب میں پہلا نذر شریف سے اس ن شادی کے سلسلے میں آتا
ہے۔ س نے شریف پر تھیلی میں بند مینڈک پھینکا شریف بیان کرتا ہے۔

وقعی وہ شہز دی ہے۔ ہم با سی ہے۔ مجھے چھپ چھپ کر دیکھنے کے بعد یک
روزہ وہ مکان کی دہلیز سے باہر آگئی اور میرے روبرو اس نے یک مینڈک کے ذریعے
ظہار محبت کر دیا۔

______ س نے مینڈک کو تھیلی میں ہی رکھا تھا ور جب میں سو رہا تھا تو وہ
تھیلی میرے منہ پر پھینک دی ور ڈر کر اٹھ بیٹھا ور وہ ہنسنے لگی۔

ور پھر یلی کی نگاہوں تلے یک شوخ حسینہ آ کھڑی ہوئی ور پھر شادی میں رخصتی
کے بعد ریل کے ڈبے میں یک موتیا گٹھڑی سے دکھائی دیتی ہے۔

''موتیا گٹھڑی میں جنبش ہوئی وہ سفید خون میں بھیگے ہوئے ہاتھ یلی کی طرف
لپکا تازہ خون کی بو کا یک ریلا آیا۔ یلی بھاگنے کی سوچ رہا تھا۔ کہ گٹھڑی کے پٹ
کھل گئے دو گلابی جھیلیں جھلکیں جن میں سیاہ گلاب ابھر رہے تھے۔ مکھی پر بھنویں
رینگ رہی تھیں۔ ور ہاتھ یک چمکدار جسم ور یلی یوں کھڑا تھا جیسے] پتھر کا بن چکا
ہو ڈبے کے دوسرے لوگ جھملا کر معدوم ہو چکے تھے۔

شہز دی کی کردار نگاری س کے دوسرے لوگوں پر تاثر کے ذریعے ہوتی ہے۔ آصفیہ
محلّہ میں آتے ہی وہ ہر شخص کے لیے حسن و ناز کا عجیب کرشمہ ہو جاتی ہے۔ مگر یلی
س سے سب سے زیادہ متاثر آتا ہے۔ جسے اس کے حسن کی ہر ہر د روحانیت کا
مظاہرہ نظر آتی ہے۔ س کی چال جسم سے آجانا۔ اس کا دوپٹہ وڑھنے کا ند ز س
کے ماتھے پر تل۔ س کے گورے گورے کھلے بازو۔ س کے چھوٹے چھوٹے سنگ
مرمر کے پیر۔ س کا گاؤں کی بے نیازی۔ وہ چیز جسے محلے والے بے شرمی کہتے
ہیں۔ ور س کی بے پناہ ذہانت جس کی بنا پر وہ سب کے باوجود یلی سے شوخی کرتے

کا بہنا کمال یتی ہے بار بار بیان ہوتا ہے اور یہ سب ایک سچے عاشق کے نقطۂ نظر
سے جس کی بنا پر اس میں حد درجہ کا حسن جھلکنے لگتا ہے۔ مفتی صاحب شہزاد کو دنیا کی
حسین ترین چیز کی طرح پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایلی کے
تاثرات ہی کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ شہزاد سے انہیں خود ویسا ہی دلی تعلق
ہے۔ جیسے ایلی کو تھا۔ وہ ساری ناول ان کے تجربے کی چیز ہے ہی مگر اس تمام تجربے میں
جس چیز نے ان کے دل کو سب سے زیادہ چھوا ہے اور جس چیز نے ان کے تخیل کو
سب سے زیادہ اکسایا اور روشن کیا ہے۔ وہ شہزاد یا شہزاد کی طرح کی کوئی محبوبہ ہے۔ ایلی
کے شہزاد سے بڑھتے ہوئے تعلقات کی نفسیاتی تحلیل اس طرح ہوتی ہے کہ قاری کو
وہ اپنے خود کا حال معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی کردار نگاری کا کمال ہے۔ وہ اس تمام
معاملت میں حد سے زیادہ واقعیت کے ساتھ جو رومانی پیچیدگی عجب پیدا کرتی رہتی
ہے اس کے انکشاف میں مفتی صاحب کردار نگاری کے اعلیٰ ترین معیار پر پہنچ جاتے
ہیں۔ کتاب کے وہ مقامات جن میں شہزاد مجسم سے آجاتی ہے عجیب طرح روشن اور
دلکش ہو جاتے ہیں۔ ان کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور تکرار کے باوجود ان کا
لطف کم نہیں ہوتا۔ شریف کی اجازت سے پہلے پہلے ایلی کو چوبارے پر بلانے تک پھر
کیٹے میں ایلی سے بے باکانہ ملنا۔ مختلف ملاقاتوں میں ایک وقت تک قریب اور اس
وقت تک دور ہو جانا عجیب کرشمۂ قدرت کی طرح آنکھوں کے سامنے ابھرتا رہتا ہے۔
ایلی کے عشق میں جسمانی محبت کو دخل نہیں ہے۔ ایسی محبت سے اسے اپنے باپ کے
معاشقوں کی وجہ سے نفرت ہو چکی ہے۔ اور قاری بھی شہزاد کے جسمانی حسین
تاثرات کے باوجود اسے آسمانی چیز ہی کی طرح چاہنے لگتا ہے۔ وہ اسے قبول بھی
کرتی ہے ٹھکراتی بھی ہے۔ وہ اسے ستاتی بھی رہتی ہے۔ اس کے گالوں کو سہلاتی
ہے۔ اس کے چٹکی بھی لے لیتی ہے۔ مگر وہ شادی شدہ عورت ہے اور اپنے کو بے باک
نہیں ہونے دیتی۔ ناول کا وہ سین جس میں ایلی بند بیٹھک میں چھپ بیٹھتا ہے اور یہ

منتظر رہا ہے۔ شہزادہ وہاں آئے تو اس پر حملہ آور ہو شہزادہ کو پورے طور پر سامنے لے آنے کا کمال ہے۔

دروازہ کھلا شہزادہ اندر داخل ہوئی۔

یلی بجلی کی تیزی سے اپنی جگہ سے نکلا اور ایک کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ شہزادے ڈر کر ایک ہلکی سی چیخ ماری۔

کنڈی لگانے کے بعد وہ شہزادے کے روبرو ظاہر ہو گیا۔

ایک ساعت کے لئے وہ گھبرا گئی مگر اسے پہچان کر مطمئن ہو کر بولی۔ ''تم یہاں۔'' یلی کی خاموشی اور اس کے وحشت بھرے انداز کو دیکھ کر وہ از سر نو گھبرا گئی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' وہ بولی ''تمھیں کیا ہو گیا ہے؟''

یلی جواب دیے بغیر اس کی طرف بڑھا۔

''پاگل ہو گئے ہو کیا۔'' وہ زیر لب چلائی۔

وہ سمجھتی تھی کہ یلی اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ در اصل وہ اپنی شدید کمتری کی خفت مٹانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور اپنا اصلی روپ چھپانے کے لئے اس نے شیر کی کھال پہننے کی مضحکہ خیز کوشش کی ہے۔

''خدا کے لئے۔'' وہ چلائی۔ ''ہٹ جاؤ۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔''

''وہ چپ چاپ آگے بڑھتا گیا۔

''ضرور تم پاگل ہو گئے ہو۔'' وہ بولی۔ ''تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔''

''ہاں۔'' ——— یلی نے بھیانک آواز میں جواب دیا۔ ''نہیں ہوں۔''

''یلی کوئی سن لے گا۔ دیکھ لے گا۔ پاگل نہ بنو۔'' وہ چلائی۔ ''پاگل نہ بنو۔''

ایک رنگین دھند کا یلی کے قریب تر آتا گیا اور قریب اور وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے ہونٹ شہزادہ کا خون چوسنے کے لئے جونک کی طرح آگے

بڑھے۔ ہاتھ باندھ کر منہ سر جھکائے وہ دیوانہ وار اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چومنے لگا۔
پہلے تو شہزادی نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی پھر وہ تھک کر
ہار کر ایک لاش کی طرح میز پر پڑ رہی۔ بھیانک خاموشی طاری ہو گئی۔

علی نے محسوس کیا جیسے اس کی وحشت ختم ہوتی جا رہی ہو۔ اس نے دیوانہ وار بجھتی
میں ایندھن ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ تب اچانک ریشمی پردے کے پھٹنے کی آواز آئی۔

"علی پاگل نہ ہو۔" ایک بار پھر مرمریں جسم کے اس تودے میں حرکت ہوئی "پاگل نہ ہو۔" اٹھو۔ زمین پر نرم سا احتجاج دیکھ کر وہ اور بھی بپھر گیا۔

دھپ ______ ایک ہولی سی چیخ گونجی اور معاً فروزاں شمعیں تاریک ہو گئے۔ اس
نے محسوس کیا جیسے وہ ڈوب گیا ہو۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گھور اندھیرا۔ خفت
ناکامی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ خود ساختہ وحشت کا سہارا ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ
دیوانگی ختم ہو چکی تھی اور اس کے عقب میں معصومیت اور شکست کے مٹتی ہوئی ساعت کا
ریلا گزر رہا تھا۔ علی نے محسوس کیا جیسے اس کے منہ میں گھاس کا تنکا ہو۔ وہی تنکا
جو پورس اپنے منہ میں لے کر سکندر کے حضور میں حاضر ہوا تھا۔

اس نئی خفت کو مٹانے کے لئے علی ایک بار پھر آگے بڑھا اور دیوانہ وار شہزادی کے
بند بند چومنے لگا۔ اور بالآخر تھک کر بچے کی طرح اس کے قدموں میں سر رکھ کر
پڑ گیا۔ "مجھے تم سے محبت ہے شہزادی مجھے تم سے۔"

اپنے پاؤں پر آنسوؤں کے قطرے محسوس کر کے شہزادی اٹھ بیٹھی اور اس کا ہاتھ علی
کی طرف بڑھا اور اسے تھپکنے لگا۔

اس کیفیت میں کتنا حسین تھا۔ علی نے محسوس کیا جیسے ماں کا ہاتھ سرزنش کرنے
کی بجائے معاف کر دینے کے بعد تھپک رہا ہو

ماں کا ہاتھ عجیب نفسیاتی اشارہ ہے۔ شہزادی عورت کے تمام مناصب بڑی پیچیدگی
کے ساتھ ادا کر رہی ہے۔ وہ ماں بھی ہے۔ بیوی بھی محبوبہ بھی۔ معشوقہ انداز

میلانات۔ ٹوسٹوے کی نتاشا فلابیر کی ایما اور ہر عظیم ہیروئن کے ساتھ برابر کا مقابلہ کرتی ہے۔ روسی بساط کیا ہے ____ ہماری ناول نگاری میں سب سے بڑا فنی شاہکار ہے۔

مگر ناول کی ریڑھ کی ہڈی۔ روح رواں اور جان علی ہے اور مفتی صاحب اسی کی
طرف خاص طور سے متوجہ ہیں۔ دوسرے کردار اس کے ضمن میں آتے ہیں اور اس
کی طویل اور وسیع سرگزشت کی سطح پر چھوٹے چھوٹے نقوش بنا کر چلے جاتے ہیں۔
ان نقوش میں علی احمد شہزادے نقوش میں علی احمد شہزاد نقوش زیادہ حصہ گھیرتے ہیں۔
علی کے کردار کو سمجھنے کے لیے ہی ساری ناول لکھی گئی اور اس کو مفصل طور
سامنے لانے کے لیے پوری ناول کے خلاصے کی ضرورت ہے۔ اسی کے بہت چیش
لفظوں میں مفتی صاحب نے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی رائے میں علی ایک کردار
ہے تمام تجربے اور تعلیم کے باوجود نہیں بدلتا۔ جس کے خیالات اور جذبات میں
ہمیشہ کشمکش رہی جس کی بنا پر وہ اپنا کوئی کردار نہ بنا سکا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہر
اخلاقی اور نفسیاتی معیار سے بالکل بے کردار شخص ہے مگر پھر بھی وہ مستقل حقیقت
ہے۔ اسے پنجاب کے اس خطہ کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے جس کا مرکز بھی پور ہے اور
جس کا دائرہ امرتسر اور لاہور تک بھی جاتا ہے۔ وہ دلی اور بمبئی میں بھی مقیم رہتا ہے
مگر اپنی مخصوص پہچان اور صنعت نہیں کھوتا۔ ایسا پنچھی جو پانی میں ڈبکی لگاتا ہے مگر
پر جھاڑ کر جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔ شاید بلکہ یقیناً ایسے لوگ کسی خاص
جغرافیائی علاقے سے مخصوص نہیں کیے جا سکتے۔ شاید بلکہ یقیناً ہر شخص کے اندر وجود
شدید اختلاف کے ایک علی چھپا ہوا رہتا ہے۔ وہ معمولی نہایت ہی معمولی ہستی ہے
اور اسی سے نہایت درجہ معمولی ہے۔ ہمارے تصور میں ایک معمولی انسان ہے مگر یہ
معمولی انسان کہیں ڈھونڈے نہیں ملتا اس لیے اسے نایاب کہہ دیتے ہیں۔ علی وہ
نایاب معمولی انسان ہے۔ مفتی صاحب کو وہ مل گیا ہے اور انہوں نے صفحہ ناول
پر اتار دیا ہے۔ اس ناول کا شروع ہی سے یہ مقصد رہا کہ نارمل انسان کی شکل دکھائے۔
فیلڈنگ نے ٹوم جونز میں ایسا ہی کردار پیش کیا جو تمام ناول نگاروں کے لیے آج

بھی ماڈل ہے۔ مفتی صاحب نے بھی علی میں ایسا کردار پیدا کیا ہے۔ شاید وہ خود علی
میں اور ساری سرگزشت ان کی آپ بیتی ہے۔ ان میں ادیب کی تخلیقی صلاحیتیں بھی
ہیں جو علی میں نہیں ہیں مگر ان کی نظر اپنی صلاحیتوں پر ہے جو نہایت معمولی نہایت
عام ہیں اور جن میں پنجاب کا ہر آدمی، ہندوستان کا ہر آدمی اور دنیا کا ہر آدمی ان کا
حصہ دار ہے۔ دوسرے ناول نگار جب اپنے کو کسی ناول میں پیش کرتے ہیں تو کچھ
مخصوص صلاحیتوں کو سامنے لاتے ہیں یا کرداروں میں اپنے کو اصلیت سے بڑھا کر
پیش کر دیتے ہیں۔ مفتی صاحب کو نہ بڑھانے سے سروکار ہے نہ گھٹانے سے ان
کے ذاتی تجربے سے جو ادنیٰ شخص آدمی نکلتا ہے وہ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔
عموماً بڑے آدمی اور ان کا کوئی بڑا کام تخلیقی پیدا کرکے عام آدمی کے لئے دلچسپ ہو
جاتا ہے۔ علی میں کوئی بھی بڑائی چھوڑ کبھی میں نظر نہیں آتی اور نہ اس نے کوئی بڑا کام ہی
کیا۔ وہ نہایت معمولی گھر میں پیدا ہوا، نہایت معمولی ماحول سے زندگی بھر گزرتا
رہا۔ احساس کمتری کے سوا اسے کوئی احساس نہیں ہوا۔ قوت ارادی کا تو اس کے اندر
سوال ہی نہیں تھا۔ زمانے کے اثرات اسے جیسے بہاتے گئے وہ بہتا رہا۔ دوسرے جو شخص
مشکل ہے مگر تجربہ سے ہیرو بنا ہی دیتا ہے جو ان ناولوں میں جنہیں
ROMANBUILDING کہا جاتا ہے ایک معمولی لڑکا ارتقائی منزلیں طے
کرتا ہوا نظر آتا ہو اور آخر میں غیر معمولی مقام حاصل کر لیتا ہے۔ علی یوں بھی ارتقاء
نہیں کرتا۔ وہ ڈبکی لگانے کے پر جھاڑ دینے کا سپاہی رہ جاتا ہے۔ اسے کسی قسم کی
قدروں سے سروکار نہیں جو وہ اپنے کو بہتر بنائے۔ وہ مٹی میں لتھڑا ہوا پودا ہے جس کا
قد اور رنگ مٹی اور پانی کے اثر سے بڑھ جاتا ہے مگر جس میں ذہنی یا اخلاقی شعور یا
رجحان آنے کا سوال نہیں۔ باپ کا زور اگر نہ ہوتا تو وہ تعلیم بھی نہ حاصل کرتا۔ بسر
وقت کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ ملازمت بھی نہ کرتا۔ اگر وہ چاند رندھا دیا گیا ہوتا تو
وہ جیتا بھی نہیں۔ وہ ایسا آدمی ہے جس کو ہم چھوٹتے ہی بڑا گھٹیا کہہ دیں گے مگر وہ

اس حد سے زیادہ گھٹیا پن کی وجہ سے نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔

مفتی صاحب کے ہم وطنوں سے یعنی لاہور اور امرتسر کے جوہری لوگوں سے ملئے تو ان میں ہر شخص ہر شریف خاندان اوسط طبقہ کا فرد ہی معلوم ہوگا۔ ایک قصباتی ماحول کے ایک خاص گھر میں پلا ہوا۔ والد معمولی ملازمت پر رہے ہوں گے مگر معتقد اور کام میں چوکس ہوں گے جس کی وجہ سے ان کی زندگی ایک معمول ڈھرے پر لگ گئی ہوگی۔ بچپن کھیل میں یا گھر کے معمولی کام دھندے کرنے میں گزر ہو گا۔ زبردستی سکول اور کالج بھی گیا ہوگا۔ اور کسی نہ کسی طرح تعلیم نپٹا کر معمولی ملازمت پر بھی لگ گیا ہوگا۔ رسمی طور پر اس کی منگنی اور شادی بھی ہو گئی ہوگی۔ مگر اس میں غیر معمولی بات ہوگی تو وہ اس کی عورتوں کی طرف توجہ سے نمایاں ہوگی مگر یہ بات بھی غیر معمولی نہ کہی جا سکے گی کیونکہ اس کے خاندان میں ہر شخص اور اس کے ساتھیوں میں ہر شخص کو اسی طرح کی جنسی دلچسپی رہی ہوگی۔ عشق وحسن کا معیار کر پست نہیں تو اونچا بھی نہیں ہوگا۔ زندگی سے لگاؤ بھی نچلی سطح کا ہوگا اور اس میں ان خاص جذبات کے ابھرنے کی کوئی گنجائش نہ ہوگی جو اعلیٰ انسانیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسے ہم چھچھورا نہیں کہہ سکتے تو بڑا بھی نہیں کہیں گے۔ اس میں خودغرضی بھی واجبی واجبی ہوگی۔ وہ ایک گھٹیا سا معلوم ہوگا جو زمین پر اپنا جسم بڑھاتا گھسٹتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ چھچھوری اور بدنامیوں میں پڑنے کا بڑا اہل اور نا اہل ہوگا۔ ہم خاص جذباتی EVERYMAN کی تصویر ہے۔

اس کے حالات بھی ایسے ہی معلوم ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ ان شہروں اور ان قصبوں اور ان گاؤں سے مخصوص ہیں جہاں یہ چلا جاتا ہے۔ اس کی لاتعداد مردوں اور عورتوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ان میں وہ سب سے مختلف اور اس طرح مختلف نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص کے ساتھ تولے جا رہا ہے اور اس کا وزن سب سے کم نکل رہا ہے۔ اور ان لوگوں کے بیچ وہ اس سے دلچسپ ہوتے

ہیں کہ وہ وزن میں سب سے کچھ نہ کچھ زیادہ ضرور نکلتے ہیں۔ ایلی کی دلچسپی یہ ہے کہ وہ ہر کام میں نااہل ثابت ہوتا ہے اور ہر شخص سے ہر بات میں کم نظر آتا ہے۔ یہ ایک عجیب راز ہے جس کو مفتی صاحب نے دریافت کر لیا ہے۔ اور اسی کی بنا پر ہم ایلی کو حد سے زیادہ دلچسپ پاتے ہیں۔ اس کی باتیں حماقت میں مگر ہم کو ان پر ہنسی نہیں آتی۔ نہیں وہ ہرگز احمق نہیں ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا کوئی خاص تاثر بھی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی ہم اسے سپاٹ نہیں کہہ سکتے۔ اس میں بے پناہ سادگی ہے اور خلوص ہے۔ وہ تکرار برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ کسی کو برا نہیں سمجھتا۔ وہ مردم شناس بھی نہیں ہے مگر کسی کے دھوکے میں بھی نہیں آتا۔ شہزاد کے سلسلے میں اس کے اندر ڈھیلاہٹ کے باوجود ایک عزم اور استقلال آ جاتا ہے اور وہ اس سے بڑی شدت کے باوجود شادی کر لیتا ہے یوں تو اسے دل پھینک کہہ سکتے ہیں مگر شہزاد سے اس کی محبت میں استقلال ہے۔ وہ کسی سے جھگڑتا نہیں مگر شہزاد ہی سے اس کا جھگڑا ہوتا رہتا ہے شہزاد سے عشق اور آخر میں شہزاد سے جھگڑا ہی اسے جذباتی سطح پر بہت درجہ معمولی رویے کے انسان سے اوپر لے آتے ہیں۔ آخر میں اس کے ملاقاتیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اس کی "ذہنی" قسم کے لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں جن میں وہ کچھ زیادہ مستقل کردار دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مذہب کے بابت مفتی صاحب بتاتے ہیں۔

غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ وہ بے حد ڈرپوک تھا لیکن اللہ پر اس کا ایمان ڈر کی بنیاد پر قائم نہ تھا۔

اللہ کا تخیل جو اس کے دل میں قائم ہوا تھا۔ وہ جیمز جینز کی تصنیفات ہالوس ہکسلے کے سائنس کا عجز سے متعلق مضامین برٹرینڈ رسل کے فزکس سنتیانا کے جذبات کاؤنٹ کیزرلنگ کے مشاہدات اور ایچ۔ جی ویلز کی سائنٹیفک فکشن کتابوں سے ماخوذ تھا۔

ڈر کے بجائے اس کا دل اللہ کی عظمت کے جذبات سے معمور تھا ______ ہندومت اور عیسائیت کے مطابق اللہ کی محبت کا تخیل اس کے لئے قابل قبول تھا۔ اسلام کے مطابق تو صرف اللہ ہو اللہ ہو تھا، عظمت عظمت عظمت عظمت محبت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا اور اس بے پناہ عظمت کا اسے کچھ کچھ احساس تھا۔ جو اس نے مغربی ادبی تحریروں سے اخذ کیا تھا اسلام سے نہیں لیکن اس کی جذباتی دنیا ذہنی خیالات سے دور اپنے ہی رنگ میں بستی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایلی ویسا معمولی نہیں ہے جیسا کہ وہ اپنی سرگزشت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی دنیا بھی ہے اور وہ جدید ترین خیالات سے ہم آہنگ بھی ہے مگر وہ ایک واقعاتی دنیا میں ہے جہاں وہ محض انسان ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ ایلی کی اور اس دنیا کی ذہنی اور مرکزی تشخص ایک ہے۔ اس لئے وہ ماندہ اور نارمل انسان ہے۔ آخری دور میں وہ معمہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں خیال آتا ہے کہ کب وہ معمہ نہیں تھا۔ سب سے بڑا معمہ یہی ہے کہ ہر چیز صاف اور معمولی ہو مگر پھر بھی وہ ہمیں ہر قدم پر تعجب میں ڈالے اور معمہ ہوتی جائے۔ ایلی اپنی تمام سادگی کے باوجود اور سادگی کی وجہ ہی سے ایک ہی چیز ہے۔

سطحی نظر سے دیکھنے پر یہ محسوس ہوگا کہ یہ ایلی کی ظاہری سرگزشت ہے اور اس طرح کردار نگاری کے سلسلے میں بیسویں صدی سے پہلے ہی کی راہ پر چل رہی ہے مگر غور سے دیکھنے کی ایسی ضرورت نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جدید ناول کی طرح یہ مرکزی کردار کی اندرونی زندگی کو بھی ہر قدم پر سامنے لاتی ہے۔ ظاہری واقعات کے ساتھ ساتھ ایلی کی اندرونی دنیا بھی سامنے آتی رہتی ہے۔ شروع ہی سے اس کا اپنی سوتیلی ماں صفیہ کی طرف ردعمل اور اس کے مہندی لگے ہوئے ہاتھوں سے نفرت کا بھی تجزیہ ہوتا رہتا ہے۔ شہزاد کا عشق ایلی کی اندرونی یا ذہنی کشمکش کا ظہور ہے وہ گومگو کا عالم وہ یقین اور بے یقینی کا چکر جو اس کے دماغ میں چلا گیا ہے پوری

نفسیاتی تحلیل کے ساتھ یوں ہوتا رہتا ہے۔ شہزاد اس کے سر پر بری طرح سوار ہوتی ہے۔ اور جب وہ دوسری عورتوں کی طرف بھی متوجہ ہے اور ان سے عشق بھی کا ہوتا ہے۔ تو بھی شہزاد بچپن سے اس کے سامنے آتی رہتی ہے۔ اس کی اندرونی اور بیرونی دنیائیں ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں اور اس کی کردار نگاری اس طرح دو سطحوں پر کردار نگاری کی مثال ہے جیسی جدید ترین ناولوں میں خاص طور پر جیمس جوائس کی "جولیس" میں ملتی ہے۔ مفتی صاحب INTERNAL MONO LO GUC کے فن سے بھی واقف ہیں اور اسے بھی بڑی چابک دستی سے برتتے ہیں۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے جدید نفسیات کو افسانہ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس سلسلے میں کمال پر ایلی کے کردار کو واضح کرنے میں پہنچے ہیں۔ مر جانے کے بعد بھی شہزاد ایلی کے لئے ایک زندہ حقیقت بن جاتی ہے جگہ جگہ پر دکھائی دیتی ہے۔ جب وہ تقسیم کے نتیجے میں ترک وطن کر کے بھاگ رہا ہے تو اس کے تصور میں شہزاد اسی طرح آتی ہے۔

شہزاد کھڑکی سے چلا کر بولی۔ "میں رکاوٹ تھی۔ میں اب ہٹ گئی۔" وہ ہنس دی۔ "پگلی
پی نیون نیو۔ پی نیون نیو۔"

شہزاد کے بعد اس کی محبت کا ظاہری مرکز اس کا شہزاد سے لڑکا ہو جاتا ہے۔ وہ بمبئی میں ہے جب کہ گورداس پور ہندوستان میں آ گیا۔ پاگل سا ہو جاتا ہے۔ ہزار جتن کرتا ہے کہ مرتے وقت علی پور پہنچ جائے۔ تمام کوششیں ناکامیاب ہوتی ہیں۔ وہ تھک جاتا ہے۔

اس کی آنکھوں سے آنسو دونوں ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا ______

پرمٹ دفتر میں وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ "سادی جانی۔" اس کے دل میں کوئی زور زور سے جیسے کوئی بچہ بلک رہا تھا۔

بہر حال ناول کے آخری صفحات میں یہ دوہری کردار نگاری بڑی فراوانی سے

نمایاں ہے اور ناول کا خاتمہ یوں ہوتا ہے:۔ حضور حضور ______ ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

مفتی صاحب نے پیش لفظ میں اپنے فن کی طرف کوئی خاص اشارہ نہیں کیا۔ ناول میں ایک جگہ وہ دوستوفسکی کے "برادر کارامازوف" کا ذکر کرتے ہیں اور ہم کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کی ناول نگاری دوستوفسکی سے گہرے طریق پر متاثر ہے۔ ایلی کے کردار میں وہ دوستوفسکی کے فن کا والہانہ پن اور فن سے بے نیازی ہے مگر وہ اپنے کردار کی تحلیل نفسی میں جدید ناول نگاروں کے لیے ماڈل ہے۔ مفتی صاحب بھی اس ماڈل پر چلنے میں پورے کامیاب ہیں۔ اور یہ کامیابی کسی ملک کو ناول میں بھی عظیم ہو سکتی ہے۔ اردو ناول نگاری میں تو یہ ایک مستحکم جھنڈا گاڑ دیتی ہے۔

(۵)

مجھے محسوس ہوا کہ اس ناول پر تنقید کرنے میں تنقید کے پر جل ہی نہیں گئے بلکہ جل کر راکھ ہو گئے اور وہ راکھ بھی اڑ گئی۔ اس کا رخ واقعیت کی طرف ہے جو ناول کی جان اور واقعیت بھی یہاں انگریزی اور فرانسیسی والے سے زیادہ رواں ناول کی تفصیل اور جزئیات میں گہری دلچسپی کے ساتھ برتی گئی ہے اور پھر جدید واقعیت کی پیچیدگی یا پیچیدہ ماحول سے دلچسپی کا بھی خیال رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ناول کا ضخیم ہو جانا لازمی تھا اور اس دور میں ضخیم ترین ناول ہو بھی گئی ہے۔ مگر مفتی صاحب نے جو ناول لکھا ہے اسے جانچتے وقت تمام اصول ٹوٹ جاتے ہیں اور پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک فن اپنی پوری زندگی کے ساتھ موجود ہے اور اپنی تکمیل تک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یعنی اس ناول میں وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میتھو آرنلڈ کا سب سے اہم اصول یہ تھا کہ ادب کو زندگی پر تنقید ہونا چاہیے۔ مگر ٹولسٹوی کی "اناکارینینا" پر مضمون میں اسے اپنا اصول توڑتے ہوئے اس کی تعریف میں یہ کہنا پڑا کہ یہ تنقید حیات نہیں ہے بلکہ خود حیات ہے۔ مفتی صاحب کی واقعیت نگاری اور نفسیات نگاری کے بابت بھی یہاں کچھ کہنا پڑتا ہے۔ یہاں زندگی کا نقشہ نہیں ہے جس کے حدود ناپے جا سکیں یا جس کے تاثرات کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ لگایا جا سکے۔ یہاں زندگی ہے زندگی ہی ہے اور مکمل زندگی ہے۔ مفتی صاحب سے "ڈھیر" کہتے ہیں مگر یہ محض ڈھیر نہیں ہے اس میں ترتیب ہے مگر وہ ترتیب ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ وہ ہو بہو زندگی کی طرح ہے اور اسی طرح اپنے زور سے پڑھنے والے کو لپیٹا کرتی ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ وہ فنکاری میں ناکامیاب ہیں ان کا کوئی مقصد نہیں ہے اور وہ فضول کی بکواس کا ایک ڈھیر لگا گئے ہیں۔ مگر ان کی ناول کا مطالعہ ہمیں یہ کہنے سے روک دیتا ہے بلکہ منہ بند کر دیتا ہے اور ہم اس کے خلاف کچھ کہنا ہوا بھی مان لیتے ہیں۔ یہ ناول ہے۔ ان معنوں میں ناول

نہیں جو ایک دلچسپ قصہ سنا کر ہمیں محظوظ کرتی ہے بلکہ اس معنے میں ناول کہ یہ ایک زندگی اور ایک گروہ کی زندگی کی مکمل تصویر خاص طور پر ایک مرکزی کردار کے ضمن میں ابھاری گئی ہے۔ اس میں وہ پھیلاؤ ہے اور جزئیات کی طرف وہ توجہ ہے جس کے برتنے میں روسی ناول نگار سب سے آگے ہیں۔ اس میں زندگی کا سا چڑھاؤ اور اتار ہے اور قصہ ہیرو کے بچپن سے شروع ہو کر ایک نئی زندگی کے آغاز تک جاتا ہے۔ اس کی کوئی تنگ بندھی ہیئت نہیں ہے مگر وہ وسیع ہیئت کا تاثر ضرور دیتا ہے۔ یہ ایک عظیم دریا کی طرح ہے جس کا مخرج ایلی کا گھر ہے اور پھر وہ پھیلتا ہوا صفی محلے، علی پور امرتسر، لاہور تک جاتا ہے۔ وہ سارا خطہ جو گورداسپور سے لے کر لاہور تک ہے اس کی وسعت میں آ جاتا ہے۔ پھر یہ بمبئی تک پھیل کر سمندر کو بھی اپنے میں ملا لیتا ہے۔ اس کی سطح پر کثرت سے انسان پھیلے نظر آتے ہیں۔ جتنی وسعت بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی انسانوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے۔ کچھ انسان مرکزی ہو جاتے ہیں اور دور دور آتے رہتے ہیں۔ یہ ایلی کے قریبی عزیز ہیں۔ سب سے زیادہ ایلی خود ہے جس کو ہم اس سیلاب میں بہ جدوجہد ڈبکی کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس کو اس کا شعور رکھنے کو جی چاہتا ہے مگر وہ شعور کی تربیت اور مقصد نہیں رکھتا۔ وہ بہا چلا جاتا ہے سب لوگوں کی طرح کانپ کر سب سے مختلف ہے۔ وہ فرد بھی ہے مگر اس کی انفرادیت کی حد متعین نہیں ہو سکتی اور ہم اسے بہ جد اور بہ وقت محسوس ضرور کرتے ہیں۔ ناول میں بس وہی وہ ہے اور شہر تک اس کے خون کی پیداوار ہے۔

”یہ محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اور ایلی ایک ہی شخص اور مفتی صاحب کے جاننے والے یہ تصدیق کرتے ہیں کہ ’علی پور کا ایلی‘ ایک خود نوشت سوانح ہے۔ مگر میں سوال کرتا ہوں کہ کیا یہ ممکن ہے؟ یہ کتاب تاریخ نہیں ناول ہے اور ناول میں اس کا مصنف اپنے کو ضرور پیش کرتا ہے مگر وہ پورا کا پورا اپنے کو اتار نہیں سکتا۔ نام بدلنے سے اور تخیل کے دائرے میں آنے سے مصنف خود دوسرا آدمی ہو جاتا ہے۔ اس نے

علی اور مفتی صاحب ایک نہیں ہو سکتے اور علی تاریخ کا فرد نہیں بلکہ تخیل کی تخلیق
ہے اس سے اس کی سرگزشت کتنی ہی واقعات کا نقشہ ہو مگر وہ زندگی کے ایک نظریہ
حیات کے مطابق اور ایک فنی نظریے کے مطابق تعمیر ضرور ہے۔ علی پور کے مفتی محمد کی
مذہبی اخلاقی قدریں ہیں۔ ان کا مذہب عام اسلام ہے جو ہندویت اور تصوف سے
متاثر ہے۔ علی اس مذہب پر اٹھایا جاتا ہے۔ مگر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ اس
سے بالاتر ہو گیا ہے۔ وہ توہمات میں عقیدہ رکھنے سے انکار کرتا ہے۔ اسلام کا دینی
درجہ پر اسے کوئی علم نہیں ہے مگر جدید یورپین فلسفیوں سے اس نے عظیم تصور خدا
حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کے ساتھ اخلاق قدریں وابستہ نہیں کرتا مگر اس کی عظمت کا
احساس رکھتا ہے۔ اس کے والد عورتوں کے شائق ہیں۔ وہ ان کی عیاشی کو دیکھ رہا
ہے اور اسے عورت سے جسمانی تعلق سے نفرت ہو جاتی ہے۔ شہزادی کے حسن کا وہ
گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں اعلیٰ عشق اور پست عشق کے درمیان کشمکش
ہوتی ہے۔ اور وہ شوہر والی تین بچوں کی ماں سے شادی کر لیتا ہے۔ اس کا ادب کی
طرف دھیان ہے اور وہ اعلیٰ ترین شاہکار سے دلچسپی لیتا ہے اور آخر میں وہ صحافی ہو
جاتا ہے۔ وہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں پیش کرتا مگر ظلم زدوں سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اس
میں احساس کمتری کے باوجود ہمت اور استقلال بھی آ جاتا ہے۔ اسے سیاست سے تعرض
نہیں ہے مگر پاکستان بننے پر وہ خوش ضرور ہوتا ہے۔ اسے اپنے وطن سے لگاؤ ضرور
ہے مگر وہ پاکستان میں آ جانے کو نیا جیون سمجھتا ہے۔ اس کے ذریعہ کوئی مستقل نظریہ
حیات اس طرح سامنے نہیں آتا کہ خواہ مخواہ کوئی اس میں نقص معلوم ہو مگر اس کا ایک
جدید نظریہ حیات ضرور ہے۔ اس میں قوت ارادی صاف صاف نمایاں نہیں مگر
وہ اپنے رویے کا پکا بھی ہے۔ اسے اپنی طرح پر جو کچھ کرتا ہے وہ کر گزرتا ہے اور
اپنے ماحول کی خلاف ورزی کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ اس کے نقطۂ نظر کو
مفتی صاحب نے بالکل خارجی کر دیا ہے اور کہیں تجریدی نہیں ہونے دیا۔ اس کے

واقعات اور عمل نقطۂ نظر سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ واقعات ہی واقعات دکھائی دیتے ہیں اور نظریات بالکل چھپ جاتے ہیں یہ ڈرامہ نگاری اور ناول نگاری کی حد ہے۔ شیکسپیر کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کردار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنا اور اس کا نقطۂ نظر بالکل چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اسی طرح وہ تخلیق کے سلسلے میں بھی بڑی فن کاری سے اپنی بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ناول کو ایک ڈھیر کر دیتے ہیں یعنی فنکارانہ ترتیب۔ منتخب رنگ سے منہ موڑ لیتے ہیں مگر اس ناول کے مختلف حصوں میں بیانات میں جو بہت کم ہیں اور مکالموں میں جو بڑی فراوانی سے لائے گئے ہیں زبردست ڈرامہ نگاری کا شعور نظر آتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی قوت اور اس میں مشق مسلم ہے اور ہر طویل چیز کو رواں بنا دینے میں بھی کامیاب ہیں۔ وہ کسی فن کے تابع نہیں ہیں مگر فن ان کے سامنے ہاتھ باندھے نظر آتا ہے اور وہ اس کا احترام کرتے ہوئے جدھر چاہتے ہیں ادھر اس کی باگ موڑ دیتے ہیں۔ وہ صرف ایک اصول کے قائل ہیں جو حافظ کے اس شعر سے واضح ہوتا ہے۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

مگر وہ ایسی طوطی ہیں جس کو استاد ازل نے ناول نگار ہونے کی صلاحیت دی ہے اور پھر شعور اور مشق سے اس صلاحیت کو آگے بڑھا کر وہ اس مقام پر آ گئے ہیں۔ وہ بے ساختگی سے اور خاصہ بے پروائی سے لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے تجربہ کا دریا امڈتا چلا آ رہا ہے اور وہ اسے بغیر زور لگائے ہوئے فن میں تبدیل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ فن اپنی قدرتی جگہ لئے ہوئے ہے اور زندگی کے سیلاب میں وہ چھپ گیا ہے کہ اس کی طرف توجہ جانا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ فنکاری مشکل کام ہے اور اس میں کامیابی کی داد دی جا سکتی ہے مگر فن کو چھپانا محال ہے اور مفتی صاحب اس کمال پر پہنچ گئے ہیں۔ سطحی نظر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ "علی پور کا ایلی" میں کوئی فن

یولیس کے مصنف نے فن سے بے نیازی کا اعلان بھی کر دیا مگر غور کی نظروں کو یہاں بھی وہ فن نظر آئے گا جو بہت اوپر چلا جاتا ہے اور حقیقت کو اس طرح سامنے لاتا ہے جہاں فن کاری بول اٹھے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

آخر میں اس بات پر آتا ہوں کہ ''اسے آدم جی انعام نہیں دیا گیا۔'' ممکن ہے کہ اس بات پر مصنف سے شکایت مگر اس سے انعام دینے والوں کی کوتاہی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مصلحتوں کے ماتحت انعام دیتے ہیں اور اس کتاب کو کسی مصلحت سے انہوں نے انعام نہیں دیا ہوگا۔ اس بات کو طے کرنے والے ''نقاد'' ہوں گے اور میں ان کو ہی نہیں بلکہ ان کے پیچھے چھپوں کو ناول پر تنقید کرنے کا نا اہل قرار دینا چاہتا ہوں۔ وہ ناول کا کوئی ذوق نہیں رکھتے اور اسے کچھ لگے بندھے اصولوں سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ''علی پور کا ایلی'' جیسے اوریجنل شاہکار کو کیسے محسوس کر سکتے ہیں اور عام طور پر بھی نقاد کسی نئی راہ کو سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے۔ پروست نے اپنی عظیم اور ضخیم ناول کے بابت کہا ہے۔ ''مجھے اس کی قدر کرنے کی نقادوں سے کوئی امید نہیں البتہ ان صاحبان ذوق سے امید ہے جو بجائے اصولوں کے اپنے ''جی'' پر تکیہ کرتے ہیں۔'''' اکثر ''داستان پارو'' کی ضخامت سے لوگ ڈر گئے ہمارے نقاد بھی اس کی ضخامت کی شکایت کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے شکایت کی ان سے عرض ہے کہ ''آپ کو پڑھنے کا شوق تو ہے ہی نہیں ورنہ ضخامت اس کے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہوتی۔'' اصل بات یہی ہے کہ ہمارے پروفیسر نقاد کے سے دب گئے بندھے کاسود ہے اور وہ جو صاحب علم نہ الٹے رہے ہیں وہ بھی ان کے سے ہوتے ہیں۔ ''علی پور کا ایلی'' کو وہ مقبولیت بھی حاصل ہے جو آج دوسری ناولوں کو نہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی جائے گی اور اس سے لوگ ناول

کے گوشے اجاگر ہوتے جائیں گے۔ ممکن ہے کہ یہ ناول نگاری کے سلسلے میں اول ہو جائے کیونکہ یہ اس سب آلائش سے پاک ہے جو فن فکر کے بہت سے ناولوں سے وابستہ کی جا رہی ہے۔ میں نے ایک کتاب "ناول کیا ہے؟" پچیس برس پہلے لکھی تھی۔ اس وقت "علی پور کا ایلی" وجود میں نہیں آئی تھی۔ اب اگر کوئی شخص مجھ سے یہ سوال کرے تو اس کا جواب میں یہ دوں گا "علی پور کا ایلی کو پڑھو تو معلوم ہو جائے گا کہ ناول کیا ہے۔ کیا ہونا چاہئے کہ وہ عظیم ناول کے دائرے میں آ جائے۔

"حقیقت یہ ہے کہ کسی ناول میں ناول کی روح نہایت آزادی سے وسیع اور عظیم سفر طے کرتی نظر آتی ہے۔ اس دور کی ناولوں میں یہی اس کی انفرادی صفت ہے۔

مصنف کا نوٹ

اگرچہ علی پور کا ایلی ناول کی شکل میں لکھی گئی ہے لیکن دراصل یہ ممتاز مفتی کی خود نوشت سوانح حیات کا پہلا حصہ ہے۔ اس کتاب کی واحد خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر واقعہ سچ سچ بیان کر دیا گیا ہے۔ اخلاق، ادب، روایت اور کلچر سے بے نیاز ہو کر، عبارت آرائی سے پاک بناوٹ سجاوٹ سے بے نیاز مجھے یقین تھا کہ اس کتاب کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہو سکتی لیکن زبان دانوں اور ناقدوں نے اسے شرفِ قبولیت بخش دیا۔ یہ ان کی ذرہ نوازی ہے۔

مصنف کے آبائی شہر فیروز دولی اور احمد راست قلم سے قدیمی کتابوں سے اخذ

شدہ کوائف

شہر بٹالہ پاک و ہند برصغیر میں تقریباً ۷۵ طول بلد اور ۳۲ عرض بلد پر ۱۴۶۵ مطابق ۸۶۹ھ بہلول لودھی کے دورِ حکومت میں آباد ہوا۔ سولہویں صدی عیسوی میں نواب شمشیر خان گورنری ناظم علاقہ ماجھہ دوآبہ جالندھر نے بٹالہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور اس شہر میں عالیشان عمارات، خوبصورت باغات، وسیع تالاب تعمیر کروائے اور یوں شہر کو فروغ ملا۔ خاندان مغلیہ کے دورِ حکومت میں بٹالہ کو پرگنہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس کا انتظام ایک گورنری منصب دار کے سپرد تھا۔ سکھوں کے زمانے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بیوی مہتاب کور کی والدہ سدا کور اور مہاراجہ شیر سنگھ عرصہ تک بٹالہ میں سکونت پذیر رہے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ اکثر موقعوں پر بٹالہ آ کر نواب شمشیر خان کے بنوائے ہوئے تالاب کے قریب کئی روز متواتر قیام کرتا۔ برطانوی راج میں بٹالہ کافی عرصہ تک ضلع کا صدر مقام رہا اور بعد میں حکومت نے ضلع کا صدر مقام بٹالہ سے گورداسپور منتقل کیا اور بٹالہ کو تحصیل بنا دیا۔

آزادی برصغیر اور تقسیم صوبہ پنجاب کے وقت ۱۹۴۷ء میں بٹالہ شہر کی آبادی پچاس ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔ شہر بٹالہ کی جنوبی فصیل میں دروازہ کلاں ہے جسے تقسیم

پنجاب تک بڑ دروازہ یا ہاتھی دروازہ بھی کہا جاتا تھا۔ اس دروازہ کے اندر کچھ فاصلہ
پر شہر میں شمال کی جانب ایک قلعہ نما محلہ مفتیاں تھا جسے اب شیخاں حویلی بھی کہتے
تھے۔ یہ محلہ ستمبر ۱۹۴۷ء تک خاندان مفتیاں بٹالہ کی اقامت گاہ رہا اور تقسیم ملک
کے بعد اس کا نام پچوڑ رکھا گیا ہے۔

ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دور حکومت میں
ہندوستان میں چار درویش وارد ہوئے۔ چاروں عرب زادہ بزرگ ایران سے اپنے عقائد
کی حفاظت کی خاطر ہندوستان آئے۔ ان کے قافلہ میں ایک مرزا غیاث بیگ بھی
تھے۔ ان کے اس سفر کے دوران ایک لڑکی تولد ہوئی جس کا نام مہرالنساء رکھا گیا اور
جو بعد میں نور جہاں کے لقب سے ملکہ جہانگیر بنی۔ یہ چار بزرگ بٹالہ میں مقیم
ہوئے اور باقی قافلہ آگے دہلی کی طرف چل دیا۔ ان بزرگوں میں سے ایک فقیر
منش اور درویش صفت بزرگ نے شہر سے باہر شمال مشرق کی جانب ایک میل کے
فاصلہ پر گوشہ نشینی اختیار کی اور مصروف عبادت ہوئے۔ ان کی وفات پر یہیں ان کا
مقبرہ بنا جسے حجیرہ کہا جاتا ہے۔ دوسرے بزرگ وزیر صاحب کے شہر کے دروازہ قلعہ
کلاں کے باہر جنوب کی سمت تقریباً آدھے میل کے فاصلہ پر گوشہ نشین ہوئے اور
ان کی وفات کے بعد وہیں ان کی خانقاہ زیارت گاہ خاص و عام بنی۔ تیسرے بزرگ شہر
کے جنوب مشرقی حصہ (اندرون نصیر الحق دروازہ) میں سجادہ نشین ہوئے اور ان کی
اولاد میں قادریہ سلسلے کے کئی خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء اللہ ہوئے۔ چوتھے بزرگ
شیخ فیروز دون بن شیخ بہلول بن شیخ جلال تھے۔ شیخ فیروز دون کے بٹالہ پہنچتے ہی قاضی
عبداللہ خطیب ان کی علمیت اور قابلیت سے متاثر ہوئے اور انہیں اپنے مسجد میں
ایک مسجد کے قریب رہنے کی دعوت دی اور ملازمت حاکم کی ترغیب دلائی بلکہ شیخ
فیروز دون کی خواجہ معین تک رسائی کرائی۔ جس سے شیخ فیروز دون کا تقرر فوراً روزنامچہ
نرخ پر ہو گیا۔ شیخ فیروز دون مسجد کے نزدیک اپنی رہائش گاہ اور قریبی علاقے کے ارد

۱۵۸۹ء میں ن کے تیسرے صاحبزادے شیخ فتح اللہ صدیقی نے فیصل کھیتی رمحلہ
مفتیوں کی بنیاد رکھی۔

۱۹۱۹ء میں یک اور نظریہ فروغ پایا کہ شیخ ولی بن شیخ بہلول (بہیلو) بن شیخ جدل
(جبو) بن مودود بن نادر بن لکرو بن نجیل بن بانسل بن پہل بن شاہ توپ تومر چیوت
موضع بوہ پرگنہ بیت پور پٹی سے خضر خان گورنر لاہور کے ہاتھوں موضع بوہ کی تباہی کی
وجہ سے پنے موروثی علاقے سے تنگ سوگاد میش چھوڑ چلے، ور موضع گوبندوں ور موضع
رنے پور سے ہوتے ہوئے بٹالہ پہنچے تھے۔ باقی تفصیلات میں بہت کوئی فرق نہیں۔
شاید کوئی تحقیق حاب ن نظریات کی گتھی کو سلجھائے۔ جب کہ ہر دو نظریات بے کم و
کاست خاندان مفتیوں کے جد، کے بارے میں یہاں رقم ہیں۔

شیخ فیروز دین کے دوسرے فرزند شیخ احمد فیروز ۱۵۵۴ء میں شیخ فیروز دین کے ہاں
پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ کا نام مبارک سلیم خاتون تھا۔ اس وقت ان کے بڑے
بھائی شیخ محمود دین کی عمر دو یا تین سال تھی۔ آپ نے بٹالہ میں ہوش سنبھالا، مسجد کی
قرات ور والد کے علمی ذوق ور مشاغل کے درمیان اپنے بڑے بھائی شیخ ولی محمد
(تاریخ پیدائش ۱۵۵۶ء) ور چھوٹے بھائیوں مسمی شیخ فتح اللہ (تاریخ پیدائش
۱۵۵۸ء) ور شیخ نعمت اللہ (تاریخ پیدائش ۱۵۵۲ء) کے ساتھ حسن تربیت پائی۔
خوش طبیعت تھے۔ بچپن میں تبدیلی وطن کی صعوبت برداشت کی جس نے عمر بھر
کے لیے محنت ور کاوش کی عادت ڈال دی۔ رقوم ثلث، نسخ، تعلیق، نستعلیق، سیاق
ور دیوانی شکستہ میں کمال حاصل کیا۔ جدت پسند طبیعت نے ن میں نئی اختراعات پیدا
کیں۔ خاندانی روایت کے تحت فنون حرب میں بھی استعداد حاصل کی۔ مغل
ور افغان آپ کی تیر اندازی کی تعریف کرتے۔ آپ بیس سال کی عمر میں نواب
زرت پناہ قاضی علی سلطان کے سرخطوط نویس مقرر ہوئے پھر روزنامچہ پر ترقی پائی۔
ور دو جستی منصب پایا۔ نواب جالینوس الزمانی حکیم ابو الفتح ور حکیم ہمام گیلانی جیسے

نامور بزرگوں سے متقرب رہے۔ اور تقریباً تینتیس سال کی عمر ۹۹۶ھ میں وطن پر
گنج شہر کوٹ و پرگنہ فریدہ مقرر ہوئے۔ ۱۰۰۴ھ میں خواجہ جابر محمود ولد خواجہ جابر
محمود ولد خواجہ عماد الدین اور نواب آصف صفات آصف خاں کی وساطت سے
دربار اکبری پہنچے اور بادشاہ کے دہن مبارک سے "راست قلم" کا خطاب پایا۔ اکثر
امراء نے آپ کو مبارک باد دی۔ اس وقت آپ کے چھوٹے بھائی شیخ اللہ داد ہی تخت
کے پاس نواب آصف خان کی مسند کے عقب میں کھڑے تھے۔ چند روز بعد
بادشاہ نے منصب میں بھی ترقی دی۔ دو دفعہ شہر کا دورہ کیا۔ وہ حکیم ہمام کے ہمراہ
اردوئے شہنشاہ اکبر کے جلو میں۔ دکن، مالوہ اور برہان پور کی مہمات میں شامل ہوئے۔
نواب کا خطاب و بروزی منصب پایا۔ شاہی دربار میں آگرہ پہنچے تو وہاں دو سال اور
امراء آپ کی مہمان داری کا شرف چاہتے۔ ۱۰۲۹ھ مطابق ۱۶۲۰ء شہنشاہ جہانگیر اور
ملکہ نور جہاں کی مہمان داری چھ روز تک بٹالہ میں کی اور بارہ روز تک سرہند سے
کلانور بھجوائی۔ یہ تھی دنیاوی دولت عزت۔

شبیہ کا یہ عالم تھا کہ بسیار خوش صورت، پوشاک اور طریق یوں تھے کہ دربار
اکبری میں اکثر امراء آپ کو مغل زادہ سمجھتے۔ اخلاق حسنہ کی پابندی کا یہ حال کہ غرباء کی
مدد فرماتے۔ فقراء کو گھر بلاتے، مہمانداری کرتے اور عزت و احترام سے پیش آتے۔
پاکبازی، خشوع، پرہیزگاری، قربانی اور راست گفتاری میں مشہور وقت تھے جس کی
مندرجہ ذیل جھلکیاں زمانے کے خطوط میں ملتی ہیں۔

"شیخ احمد راست قلم و دوست کردار ـــــ"

"برگزیدہ نیکاں و پاکاں ہندوستان یعنی شیخ الشیوخ شیخ احمد محفوظ بود ہمیشہ
در کشش جذب و تصدق دوستاں راسخ، ثابت قدم ـــــ"

راستی شد چوں شعار قلمش احمد راست قلم شد علمش

"بے تکلف و مبالغہ ہیچ روزے نیست کہ از ہمین سال دوران خلوص حق ہیچ

تاریخ)(سولف ۹۶۹ء) میں صفحہ نمبر ۷ پر آیا ہے۔

تقسیم کے وقت بٹالے کے مسلمان شہر بدر کر دیے گئے۔ مفتیاں محلے کے لوگ یا تو رستے میں دم توڑ گئے یا پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے لیکن سب بکھر گئے۔

اس خود نوشت میں جس دور کا تذکرہ ہے۔ اس دور میں بٹالے کے مفتی شدید انحطاط کے شکار تھے۔

مصنف یا اس کے عزیز سے رشتہ	فرضی نام	اصلی نام	کیفیت
مصنف	ایلی۔ ایلیاس	ممتاز حسین	ممتاز مفتی کے نام سے معروف
ددی ,,	نواب	نواب بی بی	
پردادا	اولاد علی	میراں بخش	
دادا	محبوب علی	مولا بخش	نوجوانی میں فوت ہو گئے۔ مصنف کے والد کی پرورش ان کے دادا نے کی
نام خاندان	صفدی	مفتی	مغلیہ حکومت کے دوران اس خاندان کے اکثر بزرگ یکے بعد دیگرے مفتی کے عہدہ پر فائز رہے۔ اس لئے یہ خاندان مفتیاں مشہور رہوا۔
والد	علی احمد	ماسٹر محمد حسین	محکمہ کی تعلیم پنجاب میں ملازم تھے اس لیے ماسٹر کہا جاتا
والدہ نمبر 1	ہاجرہ	صغرا بیگم	

	۲ نفیسہ	جمیلہ بیگم	
	۳ ریحانہ	شکیلہ بیگم	
	۴ ناز	تمکین بیگم	
بیٹا	درویش	قیس	
	بیوی	پرویز	
میڈ سرونٹ	جانو	گلاب جتن	
		(عرف گلابو)	
دوسری بیوی سے	آصف	محمد یوسف	
ولد			
ہمشیرہ راحت بیگم	جمل	مظفر حسین	
سلطان کا خاندان			
بیٹا	۱ ریاض	ریاض احمد	
	۲ قیہ	قیہ	
	۳ اقبال	اسد اقبال	
پھوپھی	--	امتہ الکبریٰ	
		(عرف جھنڈ)	
پھوپھا	فیروز	ظہور احسن	
پھوپھی زاد بھائی	جمل	مظفر حسین	ہمشیرہ راحت بیگم کا شوہر
بہن	۱ نیاز	نذر بتول	زوجہ شیخ حسام الدین
	۲ نور، نوری	منور بیگم	زوجہ پروفیسر فضل شاہ گیلانی
	۳ راجہ	لطیف بیگم	زوجہ کرنل فیض حسن
	۴ سیدہ	سردار بیگم	زوجہ شیخ محمد فضل

پھوپھی زاد بہن صابرہ منور بیگم کی ساس	جالیہ بیگم	مصنف کے پھوپھا کی بہن
پھوپھی زاد بہن سرور منور بیگم کی نند	مختار بیگم	
پھوپھی زاد بہن خاور منور بیگم کی نند۲	بتول بیگم	
پھوپھی زاد بہن زینب منور بیگم کی نند۳	زہرا بیگم عرف ربی	
پھوپھی زاد بہن مینا منور بیگم کی بیٹی	بلند اختر (عرف نی)	
پھوپھی زاد بہن پرویز لطیف بیگم کا خاوند	ڈاکٹر فیض الحسن	۱۹۲۰ء میں عیسائی ہوگیا۔ نیا نام سیموئیل فیض تھا ڈاکٹری کرنے کے بعد فوج میں لیفٹیننٹ ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں پھر مسلمان ہوگیا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی (پہاڑ گنج) میں ڈیوٹی پر شہید کر دیا گیا اس وقت چیف میڈیکل [illegible] تھا
پھوپھی زاد بہن فضل سرور بیگم کا خاوند	شیخ محمد افضل	

پھوپھی زاد بہن	الطاف	شیخ محمد اسلم	
سردار بیگم کا جیٹھ			
پھوپھی زاد بہن	غفور	شیخ محمد اکرام	
سردار بیگم جیٹھ ۲			
پھوپھی زاد بہن	ظفر	شیخ محمد جعفر	
سردار بیگم کا جیٹھ ۳			
خالہ نمبر ۱	--	فیض بتول	زوجہ محمد حسین
خالہ کا خاوند	محسن علی	محمد حسن	
خالہ کا بیٹا	پرویز	ڈاکٹر فیض الحسن	متذکرہ بالا سہیل فیض مصنف کی پھوپھی زاد بہن لطیف بیگم کا خاوند
خالہ کی بیٹی	۱ آصفہ	مختار بیگم (عرف بی بی)	زوجہ سید عبدالمجید
خالہ کی بیٹی	۲ سعیدہ	حفیظ بیگم	زوجہ محمد طفیل (لاولد انتقال کیا)
	۳ کلثوم	رضیہ بیگم	زوجہ سید فضل کریم ہاشمی کلثوم باب ''عنفوان شباب (چوزے اور گدھ) میں زبیدہ لکھا گیا''
ڈاکٹر فیض الحسن اور ساحر		مظہر	ساحر کا نام باب ''دیواریں (خوفناک موڑ)'' میں عمادی (امی) لکھا گیا۔
لطیف بیگم کا بیٹا			

خالہ زاد بہن مختار	مولانا عبداللہ	سید عبد المجید	
بیگم کا خاوند		بخاری	
خالہ زاد بہن ممتاز	اجلیل	سید عبد الحمید	
بیگم کا بیٹا		شاکر بخاری	
خالہ زاد بہن مختار	۲وحید	سید عبد الوحید	
بیگم کا بیٹا		بخاری	
خالہ زاد بہن حفیظ	حسین دین	محمد طفیل	سلطان کے خاوند فضل حق کا
بیگم کا خاوند			بڑا بھائی
خالہ زاد بہن رضیہ	رحم علی	سید فضل کریم	
بیگم کا خاوند		ہاشمی	
خالہ زاد بہن رضیہ	اثرہ	ذکیہ بیگم	مصنف کی منسوبہ بعدہٗ زوجہ
بیگم کی بیٹی			چراغ دین عرف گورا
خالہ زاد بہن رضیہ	۲ ناصرہ	رقیہ بیگم	
بیگم کی بیٹی			
خالہ زاد بہن رضیہ	نور علی	چراغ دین	متذکرہ بالا ذکیہ بیگم کا خاوند
بیگم کا داماد		عرف گورا	
خالہ نمبر۲	--	فضل بتول	زوجہ داروغہ محمد شفیع مفتی تھے
		(عرف بتول)	مگر المشہور داروغہ
خالہ نمبر۲ کا خاوند	محمد اعظم	داروغہ محمد شفیع	
خالہ نمبر۲ کا بیٹا	یوسف	محمد رفیع	
والدہ کی چچی	مائی عمدہ	عمدہ بیگم	زوجہ احسان علی

مصنف یا اس کے فرضی نام	اصلی نام	کیفیت
والدہ نمبر ۳ کی استانی 'بیگماں	حسین بی بی	
والدہ		
عزیز سے رشتہ		
والدہ نمبر تین کی ۱ ناظمہ	کشور سلطانہ	مصنف کی سوتیلی بہن
بیٹی		
والدہ نمبر تین کی ۲ انجم	انور سلطانہ	مصنف کی سوتیلی بہن
بیٹے		
والدہ نمبر تین کا قاسم	فرزند علی قریشی	
بھائی		
والدہ نمبر تین کی شاد	فاطمہ بیگم	
بھابھی		
والدہ نمبر چار کی رحیمن	حلیمن	
والدہ		
والدہ نمبر چار کی ۱ ساجو	ساجو	
بہن		
والدہ نمبر چار کی بہن ۲ آجو	آجو	
والدہ نمبر چار کا شیر علی شیرو	مشتاق احمد	
پچھلگ بیٹا	(عرف چگا)	
بیٹا ۱ نصیر	امجد حسین	مصنف کا سوتیلا بھائی
۲ وزیر	ارشد حسین	مصنف کا سوتیلا بھائی
۳ کبیر	نوید حسین	مصنف کا سوتیلا بھائی

محلّہ مفتیاں کے عقب میں حویلی کا مالک	تھانیدار	ملک غلام اکبر (عرف لابھا)	والد عاشق حسین بٹالوی
حکیم	حکیم	حکیم فضل حق	
محلّہ مفتیاں کے	داڑھی والا	حاجی گلزار احمد	
چند کریکٹر			
	بالا	مبارک احمد (عرف باکھا)	حاجی گلزار احمد کا عزیز
	رضا	چراغ الدین (لنگا)	محلّہ میں مصنف کے ساتھی
	ضیاء	فدا حسین	چراغ الدین کا بھائی
	اکرم	محمد افضل	
	ارجمند	ڈاکٹر محمد رفیع	دو بھائی
	رفیق	سخاوت علی	متذکرہ بالا ماموں زاد بھائی مصنف
	جمیل	کرامت علی	متذکرہ بالا ماموں زاد بھائی مصنف
	جلیل	سید عبدالحمید شاکر بخاری	متذکرہ خالہ زاد بہن کا بیٹا
	یوسف	محمد رفیع	خالہ زاد بھائی
لاہور میں مصنف سے متعلق	انصار ملک	کرنل مجید ملک	